Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1/- per day, Over night book Re. 1/- per day.

قصص القرآن

جلد چہارم

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

باہتمام منیجر ندوۃ المصنفین دہلی قرولباغ

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
حضرت عیسیٰ علیہ السلام	۹	ولادتِ مبارک	۳۷	رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا	۸۷
قرآنِ عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام	۹	بشاراتِ ولادت	۴۵	قادیانی تلبیس اور اس کا جواب	۱۰۷
عمران وحنّہ	۱۳	حلیۂ مبارک	۴۶	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں	۱۲۲
مریم علیہا السلام کی ولادت	۱۴	بعثت و رسالت	۴۷	ولکن شبّہ لہم کی تفسیر	۱۲۳
حنّہ اور ایشاع	۱۷	آیاتِ بینات	۵۱	حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام	۱۲۶
مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ	۱۸	لائقِ توجہ بات اور حقیقتِ معجزات	۵۴	لیؤمنن بہ قبل موتہ	〃
مقبولیتِ خداوندی	〃	حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ	۷۴	حیات و نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اور احادیثِ صحیحہ	۱۳۲
کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟	۲۰	حواری عیسیٰ علیہ السلام	۷۶	حیات و نزولِ مسیح کی حکمت	۱۴۳
نبوۃ النسا اور ابنِ حزم	۲۳	حواری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ	۷۹		
آیت واصطفٰک علیٰ نساء العالمین کا مطلب	۳۱	نزولِ مائدہ	۸۲		
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشاراتِ کتب سابقہ	۳۳				

مضمون	صفحہ
واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں	۱۵۶
وفاتِ مسیح علیہ السلام	۱۵۸
ویوم القیامۃ یکون علیہم شہیدا	۱۵۹
فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم	۱۶۸
حضرت مسیح کی دعوتِ اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے	۱۷۲
اناجیل اربعہ	۱۷۴
قرآن اور انجیل	۱۸۲
انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام	۱۸۶
حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت	۱۸۸
تثلیث	۱۸۹
باپ	۱۹۳
روح القدس	۱۹۴
ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کنیسہ کی آواز	۱۹۷
قرآن اور عقیدۂ تثلیث	۲۰۰
حضرت مسیح خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں	۲۰۱
حضرت مسیح نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے	۲۰۲
لائقِ توجہ بات	۲۰۸
کفارہ	۲۰۹
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	۲۱۱
محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن	؍
بشارات النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۲۱۸
تورات اور بشارات	۲۲۶
صبح سعادت	۲۵۰
تاریخِ ولادت کی تحقیق	۲۵۴
نسبِ مبارک	۲۵۶
یتیمی	۲۶۲
بت پرستی سے نفرت خلوت پسندی اور عبادتِ الٰہی کا ذوق	۲۶۵
حقیقتِ وحی	۲۶۷
صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل	۲۸۳
بعثت	۲۸۷
حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی	۲۹۰
بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق	۲۹۳
نبی اور مصلح	۳۰۱
کیفیتِ وحی	۳۰۷
کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی	۳۱۱
نزولِ وحی کا پہلا دور	۳۱۳
نزولِ وحی کا دوسرا دور	۳۱۴
اعلانِ دعوت و ارشاد کی پہلی منزل	۳۱۶
دعوت و ارشاد کی دوسری منزل	۳۱۸
بعثتِ عامہ	۳۱۹
دعوتِ اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفرؓ کی تقریر	۳۲۰
قرآن اور تجدیدِ دعوت	۳۲۲
توحید	۳۲۵

مضمون	صفحہ
رسالت	۳۲۸
یوم آخرت	۳۳۱
اسراء (معراج)	۳۳۷
واقعہ کی وحدت	۳۳۸
تحقیق تاریخ و سنہ	"
قرآنِ عزیز اور واقعۂ معراج	۳۳۹
احادیث اور واقعۂ معراج کا ثبوت	۳۴۰
واقعہ کی نوعیت	۳۴۱
واقعۂ معراج و اسراء اور قرآنِ عزیز	"
سورۂ بنی اسرائیل اور واقعۂ معراج	۳۴۲
والنجم اور واقعۂ معراج	۳۵۳
واقعہ کی تفصیلات	۳۵۷
معراج میں رویتِ باری	۳۶۱
ہجرت	۳۶۲
ہجرتِ حبش	"
ہجرتِ مدینہ کے اسباب	۳۶۳
ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	۳۶۵
دار الندوہ	۳۶۵
قرآنِ عزیز اور ہجرتِ مدینہ	۳۶۷
ہجرت؟	۳۶۹
غزوات	۳۷۲
غزوۂ بدر	"
غزوہ	"
بدر	"
واقعہ	۳۷۳
دعائے نصرت	۳۸۲
غیبی نصرت و امداد	"
نتیجۂ جنگ	۳۸۴
جنگِ بدر نے تاریخِ عالم کا رُخ بدل دیا۔	"
قرآنِ عزیز کی روشنی میں غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر	۳۸۶
غزوۂ اُحد	۴۱۳
اُحد	"
غزوۂ اُحد	"
حضرت حمزہؓ کی شہادت	۴۱۷
قرآنِ عزیز اور غزوۂ احد	۴۱۸
غزوۂ احزاب (غزوۂ خندق)	۴۱۹
قرآنِ عزیز اور غزوۂ احزاب	۴۲۳
واقعہ حدیبیہ	۴۲۴
بیعتِ رضوان	۴۲۶
معاہدۂ صلح	۴۲۷
الفتح الاعظم	۴۳۰
فتح مکہ اور قرآنِ عزیز	۴۳۱
غزوۂ حنین	۴۴۱
غزوۂ حنین اور قرآن	۴۴۳
غزوۂ تبوک	
اور قبولِ توبہ کا عجیب واقعہ	۴۴۴
مالی استعانت	۴۴۵
عذر خواہی	۴۴۶
معاشرتی مقاطعہ	۴۴۷
ضبط و نظم کی عدیم النظیر مثال	"
قبولِ توبہ اور سورۂ توبہ	۴۵۱
قرآنِ عزیز اور غزوۂ تبوک	۴۵۲

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
اہم غزوات اور		**تبنّی**	٤٦١	**واقعۂ افک**	٤٧٦
نتائج وبصائر	٤٥٢	حضرت زید رضی اللہ عنہ	٤٦٢	موعظت	٤٨٠
بدر الکبریٰ	″	انسدادِ تبنّی	٤٦٥	**بنائے فاسق**	٤٨٢
اُحُد	٤٥٣	خرافی داستان	٤٦٨	موعظت	٤٨٣
غزوۂ احزاب	٤٥٥	بصائر	٤٧٠	**مسجدِ ضرار**	٤٨٥
صلح حدیبیہ	٤٥٧	**بنو نضیر**	٤٧٣	موعظت	٤٨٧
فتح مکہ	٤٥٨	قرآنِ عزیز	٤٧٥	**وفات یا وصل**	
حنین	٤٦٠	اور بنو نضیر		**بالرفیق الاعلیٰ**	٤٨٨
تبوک	″	بصیرت	″	عبرت وموعظت	٤٩٢

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ لیکون للعالمین نذیرا والصلوٰۃ والسلام علیٰ محمدن المبعوث کافۃ للناس بشیرا و نذیرا۔ اما بعد خدائے تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ آج قصص القرآن کی تالیف اپنی آخری منزل پر پہنچ کر کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گئی، میں کیا اور میری لیاقت اور میرا قلم کیا؟ یہ جو کچھ بھی ہوا خدا کے فضل اور قرآنِ حکیم کی برکت کی بدولت ہوا" فالحمد للہ علیٰ ذلک"

یہ جلد حضرت عیسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت و دعوت اور حیوٰۃِ طیبہ اور دیگر مباحثِ متعلقہ پر مشتمل، اور پہلی تین جلدوں کی خصوصیات و امتیازات کی حامل ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے مقدس حالات میں خصوصیت کے ساتھ وہ مباحث لائقِ مراجعت ہیں جو قرآنِ حکیم کے حکیمانہ دلائل و براہین کی روشنی میں "حیوٰۃِ عیسیٰ علیہ السلام" سے متعلق ہیں یا عہدِ قدیم و عہدِ جدید (توراۃ و انجیل) کے مضامینِ الٰہیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی "حیاتِ طیبہ" تو وہ مخدوم شے ہے کہ سلفاً تا خلف مسلسل ہر زندہ زبان اس خدمتِ پاک کو اپنا فرض یقین کرتی اور ادائے فرض سے

سبکدوشی کا شرف حاصل کرتی رہی ہے۔ خصوصاً عربی زبان کے بعد اردو زبان میں اس خدمت نے بہترین ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ اور مختصر، متوسط، مطول ہر نوع کی تالیفات اس سلسلہ میں موجود ہیں اس لئے اس تالیف میں کوشش کی گئی ہے کہ صرف ان ہی واقعات کو سپردِ قلم کیا جائے جس کا قرآنِ حکیم سے براہِ راست تعلق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر شعبۂ حیات قرآنِ حکیم کی جیتی جاگتی تصویر، اور آپ کا ہر اسوۂ حسنہ آیاتِ قرآن کی تفسیر ہے۔

قصص القرآن کی تالیف اپنی افادیت اور مقصدِ تالیف کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتی ہے؟ اس کا فیصلہ اربابِ ذوق کی نگاہِ بصیرت کے سپرد ہے۔ خدائے تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ وہو حسبی ونعم الوکیل۔

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہ

۹ صفر المظفر ۱۳۶۵ھ

مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۴۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)

قرآن اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) - عمران وحنہ - مریم علیہا السلام کی ولادت - حنہ اور ایشاع (الیشبع) - مریم (علیہا السلام) کا زہد وتقویٰ - مقبولیتِ خداوندی کیا عورت نبی ہوسکتی ہے؟ - نبوۃ النساء اور ابن حزم - آیت "وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ" - حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشاراتِ کتبِ سابقہ - ولادتِ مبارک - بشاراتِ ولادت - حلیہ مبارک - بعثت ورسالت - آیاتِ بینات لائق توجہ بات اور حقیقتِ معجزات - حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تعلیمات کا خلاصہ - حوارئ عیسیٰ (علیہ السلام) - حوارئ عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن وانجیل کا موازنہ - نزولِ مائدہ - رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اٹھالیا جانا - قادیانی تلبیس اور اُس کا جواب - حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں - کادیانی کی ایک کذب بیانی - حیاتِ عیسیٰ (علیہ السلام) لیؤمنن بہ قبل موتہ - تفسیر بالرائے کی نمایاں مثال - وانہ لعلم للساعۃ - ما المسیح بن مریم الا رسول - ورافعک الیّ - حیاتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اور احادیثِ صحیحہ - احادیثِ حیاۃ ونزول - حیاتِ مسیح اور اجماعِ امت - حیات ونزولِ مسیح کی حکمت - واقعاتِ نزول، صحیح احادیث کی روشنی میں - وفاتِ مسیح (علیہ السلام) - ویوم القیٰمۃ یکون علیہم شہیدا - فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم - نبی صادق اور متنبی کاذب - حضرت مسیح کی دعوتِ اصلاح - بنی اسرائیل کے فرقے - اناجیل اربعہ - قرآن اور انجیل - انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام - حضرت مسیح اور موجودہ مسیحیت - تثلیث ! - باپ، بیٹا، روح القدس - ازمنہ مظلمہ اور اصلاح کلیسہ کی آواز - حضرت مسیح خدا کے مقرب رسول ہیں - حضرت مسیح نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے - لائق توجہ بات - کفارہ؟

قرآن عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں اور جس طرح نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم انبیاء ورسل ہیں اُسی طرح

اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ کا مقدس ذکر مسطورۂ بالا خصوصیات و امتیازات کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

غرض قرآنِ عزیز نے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے حالات و واقعات کو بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُن کی حیاتِ طیبہ کے دیباچہ کے طور پر اُن کی والدہ حضرت مریم (علیہا السلام) کے واقعاتِ زندگی کو بھی روشن کیا ہے تاکہ قرآن کا مقصد "تذکیر بایام اللہ" پورا ہو۔

یہ ذکرِ پاک قرآنِ عزیز کی تیرہ سورتوں میں ہوا ہے، ان میں سے کسی جگہ نامِ مبارک عیسیٰ (یسوع) سے یاد کیا گیا ہے اور کسی جگہ "مسیح" اور "عبداللہ" کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت "ابنِ مریم" کے اظہار کے ساتھ۔

نقشۂ ذیل اس حقیقت کا کاشف اور اربابِ مطالعہ کی بصیرت کے لیے ممد و معاون ہے۔

شمار	سورہ	آیات	عیسیٰ	مسیح	عبداللہ	ابن مریم	تعداد آیات
۱	البقرہ	۸۷-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۲۵۳	۳	۰	۰	۲	۵
۲	آل عمران	۴۲-۶۴-۴۸-۸	۵	۱	۰	۱	۲۴
۳	النساء	۱۵۶-۱۵۹-۱۷۱-۱۷۲	۳	۳	۰	۲	۶
۴	المائدہ	۱۷-۴۶-۷۲-۷۵-۷۸-۱۱۰-۱۲۰	۶	۵	۰	۱۰	۱۸
۵	الانعام	۸۵	۱	۰	۰	۰	۱
۶	التوبہ	۳۰-۳۱	۰	۱	۰	۱	۲
۷	مریم	۱۶-۳۵	۱	۱	۱	۱	۱۹
۸	المومنون	۵۰	۱	۰	۰	۱	۱
۹	الاحزاب	۷-۸	۱	۰	۰	۱	۲

شمار	سورہ	آیات	عیسیٰ	مسیح	عبداللہ	ابن مریم	تعداد آیات
۱۰	الشوریٰ	۱۳	۱	۰	۰	۰	۱
۱۱	الزخرف	۵۷-۶۳	۱	۰	۰	۱	۲
۱۲	الحدید	۲۷	۱	۰	۰	۱	۱
۱۳	الصف	۶-۱۴	۲	۰	۰	۲	۲

عمران وحنہ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ (علیہما السلام) کے حالات میں گذر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں عمران ایک عابد و زاہد شخص تھے اور اپنی زہد و عبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی ان ہی کے سپرد تھی اور اُن کی بیوی حنہ بھی بہت پارسا اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ سے وہ دونوں بنی اسرائیل میں بہت زیادہ محبوب و مقبول تھے[۱]

محمد بن اسحٰق "صاحبِ مغازی" نے عمران کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے کہ عمران بن یاشم بن میشا بن حزقیا بن ابراہیم بن عزریا بن ناوش بن اجر بن یہوا بن نازم بن مقاسط بن ایشا بن اباز بن رخیعم (رحبعام) بن سلیمان بن داؤد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) اور حافظ ابن عساکرؒ نے ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام بیان کیے ہیں اور ان دونوں بیانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اس پر تمام علماءِ انساب کا اتفاق ہے کہ عمران حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہیں اور حنہ بنتِ فاقوذ بن قبیل بھی داؤد (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں[۲]۔

عمران صاحبِ اولاد نہیں تھے اور اُن کی بیوی حنہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ اُن کے اولاد ہو، وہ اس کے لیے درگاہِ الٰہی میں دست بدعا رہا اور قبولیتِ دعا کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حنہ صحن مکان میں چہل قدمی کر رہی تھیں، دیکھا کہ ایک

[۱] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ آل عمران [۲] البدایہ والنہایہ ج ۲ صفحہ ۵۶

پرند اپنے بچہ کو بھرا رہا ہے، حنّہ کے دل پر یہ دیکھ کر سخت چوٹ لگی اور اولاد کی تمنا نے بہت جوش مارا اور حالتِ اضطراب میں بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے اور عرض کیا: "پروردگار! اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطا کر کہ وہ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے" دل سے نکلی ہوئی دعا نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنّہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہیں، حنّہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ اُنھوں نے نذر مان لی کہ جو بچّہ پیدا ہوگا اُس کو ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی خدمت کے لیے وقف کر دونگی[1]۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی حنہ کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور وہ مسرت و شادمانی کے ساتھ اُمید بر آنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔

بشر بن اسحٰق کہتے ہیں کہ حنّہ ابھی حاملہ ہی تھیں کہ اُن کے شوہر عمران کا انتقال ہو گیا[2]۔

مریم علیہا السلام کی ولادت

جب مدتِ حمل پوری ہو گئی اور ولادت کا وقت آپہنچا تو حنّہ کو معلوم ہوا کہ اُن کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے، جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنّہ کے لیے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر اُن کو یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہوسکیگی اس لیے کہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کرسکیگی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز اور مبارک قرار پایا، حنّہ نے لڑکی کا نام مریم رکھا، سریانی میں اس کے معنی خادم[3] کے ہیں، چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کر دی گئیں اس لیے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔

---

[1] بنی اسرائیل کی مذہبی رسوم میں سے یہ رسم بہت مقدس سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کریں۔ البدایۃ والنہایۃ جلد ۲

[2] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۶۴۔ [3] ایضاً صفحہ ۳۶۵۔

قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو معجزانہ اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا	بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران
وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ	کو اپنے اپنے زمانہ میں) جہان والوں پر بزرگی عطا فرمائی
عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا	(ان میں سے) بعض بعض کی ذریت ہیں اور اللہ
مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ	سُننے والا، جاننے والا ہے، (وہ وقت یاد کرو) جب عمران
إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ	کی بیوی نے کہا "خدایا! میں نے نذر مان لی ہے کہ میرے
رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي	پیٹ میں جو بچہ ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے،
بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي	پس تو اُس کو میری جانب سے قبول فرما، بیشک
إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝	تو سُننے والا جاننے والا ہے"
فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ	پھر جب اُس نے جنا تو کہنے لگی: "پروردگار! میرے لڑکی
إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللّٰهُ	پیدا ہوئی ہے۔ اور اللہ خوب جانتا ہے جو اُس نے جنا ہے۔ اور
أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَ	لڑکا اور لڑکی یکساں نہیں ہیں (یعنی ہیکل کی خدمت لڑکی
لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ وَإِنِّي	نہیں کر سکتی لڑکا کر سکتا ہے) اور میں نے اس کا نام مریم
سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا	رکھا ہے، اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطانِ رجیم کے
بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ	فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں،
فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَ	پس مریم کو اُس کے پروردگار نے بہت اچھی طرح قبول فرمایا
أَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا	اور اُس کی نشو و نما اچھے طریق پر کی اور زکریا کو اُس کا نگران
زَكَرِيَّا ط (آل عمران)	کار بنا دیا۔

حضرت مریم (علیہا السلام) جب سنِ شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل

ے عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا بھی۔ یہاں والدِ مریم علیہا السلام مراد ہیں۔

کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں[۱] میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرت زکریا سے زیادہ کوئی نہ تھا، اس لیے کہ وہ مریم (علیہا السلام) کی خالہ ایشاع (الیشبع) کے شوہر بھی تھے اور مقدس ہیکل کے معزز کاہن اور خدائے برتر کے نبی بھی تھے، اس لیے سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے بھی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ کرلیا جائے، اور بقول روایاتِ بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی، وہ دریا میں اپنے قلم (پورے) ڈالتے مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ زکریا (علیہ السلام) ہی کا نام نکلتا، کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں زکریا (علیہ السلام) کے ساتھ تائید غیبی ہے تو انھوں نے بخوشی اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا اور اس طرح "یہ سعید امانت" حضرت زکریا کے سپرد کردی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ مریم (علیہا السلام) کی کفالت کا یہ معاملہ اس لیے پیش آیا کہ وہ یتیم تھیں اور مردوں میں سے کوئی اُن کا کفیل نہیں تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اُس زمانہ میں قحط کا بہت زور تھا اس لیے کفالت کا سوال پیدا ہوا[۲] لیکن یہ دونوں باتیں اگر نہ بھی ہوتیں تب بھی کفالت کا سوال اپنی جگہ پھر بھی باقی رہتا اس لیے کہ مریم (علیہا السلام) اپنی والدہ کی نذر کے مطابق "نذرِ ہیکل" ہوچکی تھیں اور چونکہ لڑکی تھیں اس لیے ازبس ضروری تھا کہ وہ کسی مرد نیک کی کفالت میں اس خدمت کو انجام دیتیں۔

غرض زکریا (علیہ السلام) نے حضرت مریم (علیہا السلام) کے صنفی احترامات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ اُن کے لئے مخصوص کردیا تاکہ وہ دن میں وہاں

۱؎ کاہن سے وہ مقدس ہستیاں مراد ہیں جو ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کراتی اور خدمتِ ہیکل پر مامور تھیں
۲؎ تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۳۶۰۔

رہ کر عبادت الٰہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو اُن کو اپنے مکان پر اُن کی خالہ ایشاع کے پاس لیجاتے اور وہ وہیں شب بسر کرتیں[۱]۔

حنہ اور ایشاع | ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ایشاع (الیشبع) مریم (علیہا السلام) کی ہمشیر تھیں اور حدیث معراج میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عیسیٰ اور یحییٰ (علیہما السلام) کے متعلق یہ فرما کر "وھما ابنا خالۃ" جو رشتہ ظاہر فرمایا ہے اُس سے بھی جمہور کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

لیکن جمہور کا یہ قول قرآنِ عزیز اور "تاریخ" دونوں کے خلاف ہے اس لیے کہ قرآن نے مریم (علیہا السلام) کی ولادت کے واقعہ کو جس اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ عمران اور حنہ، مریم (علیہا السلام) کی ولادت سے قبل اولاد سے قطعاً محروم تھیں، یہی وجہ ہے کہ حنہ نے مریم علیہا السلام کی ولادت پر یہ نہیں کہا: "خدایا! میرے تو پہلے بھی ایک لڑکی موجود تھی، اب تو نے دوبارہ بھی لڑکی ہی عطا فرمائی" بلکہ درگاہِ الٰہی میں یہ عرض کیا کہ جس شکل میں میری دعا، تو نے قبول فرمائی ہے اُس کو حسبِ وعدہ تیری نذر کیسے کروں؟ نیز توراۃ اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ عمران اور حنہ کے مریم (علیہا السلام) کے ماسوا کوئی اور اولاد بھی تھی بلکہ اس کے برعکس تاریخ

---

[۱] روح المعانی سورۂ آل عمران۔ مولانا آزاد ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں۔ قرآن میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ظہور کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ دو جگہ کیا ہے یہاں اور سورۂ آل عمران کی آیات (۳۵-۶۳) میں، یہاں یہ ذکر حضرت زکریا کی دعا، اور حضرت یحییٰ کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوا ہے اور اناجیل اربعہ میں سے سینٹ لوقا کی انجیل ٹھیک اسی طرح یہ تذکرہ شروع کرتی ہے لیکن سورۂ آلِ عمران میں یہ تذکرہ اس سے بھی پیشتر کے ایک واقعہ سے شروع ہوتا ہے یعنی حضرت مریم کی پیدائش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعہ سے اور اس بارہ میں چاروں انجیلیں خاموش ہیں، لیکن انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکان کے کتب خانہ سے برآمد ہوا، اُس نے حضرتِ مریم کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگذشت کا یہ ٹکڑا بھی اُسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کیے جاتے ہیں۔ جلد ۲ ص ۴۴۳۔

یہود اور اسرائیلیات کا مشہور قول یہ ہے کہ ایشاع، مریم (علیہا السلام) کی خالہ تھیں۔

در اصل جمہور کی جانب یہ منسوب قول صرف حدیثِ معراج کے مسطورہ بالا جملہ کے پیشِ نظر ظہور میں آیا ہے حالانکہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد (وھما ابنا خالۃ وہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں) مجاز متعارف کی شکل میں ہے یعنی آپ نے بہ طریق توسع والدہ کی خالہ کو عیسیٰ (علیہ السلام) کی خالہ فرمایا ہے اور اس قسم کا توسع عام بول چال میں شائع ذائع ہے۔

علاوہ ازیں ابنِ کثیر (رحمۃ اللہ) کا اس کو "قولِ جمہور" کہنا بھی محلِ نظر ہے اس لیے کہ محمد بن اسحٰق، اسحٰق بن بشر، ابن عساکر، ابن جریر اور ابن حجر (رحمہم اللہ) جیسے جلیل القدر اصحابِ حدیث وسیر کا رجحان اس جانب ہے کہ ایشاع، حنّہ کی ہمشیر اور مریم (علیہا السلام) کی خالہ ہیں، حنّہ کی بیٹی نہیں ہیں

مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ مریم (علیہا السلام) شب و روز عبادتِ الٰہی میں رہتیں اور جب خدمتِ ہیکل کے لیے اُن کی نوبت آتی تو اُس کو بھی بخوبی انجام دیتی تھیں حتّٰی کہ اُن کا زہد و تقویٰ بنی اسرائیل میں ضرب المثل بن گیا اور اُن کی زہادت و عبادت کی مثالیں دی جانے لگیں۔

مقبولیتِ خداوندی زکریا (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کی ضروری نگہداشت کے سلسلہ میں کبھی کبھی اُن کے حجرہ میں تشریف لیجایا کرتے تھے لیکن اُن کو یہ بات عجیب نظر آتی کہ جب وہ خلوتکدہ میں داخل ہوتے تو مریم (علیہا السلام) کے پاس اکثر بے موسم کے تازہ پھل موجود پاتے، آخر زکریا (علیہ السلام) سے نہ رہا گیا اور اُنہوں نے دریافت کیا: مریم! تیرے پاس یہ بے موسم پھل کہاں سے آتے ہیں؟ مریم (علیہ السلام) نے فرمایا: "یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے، وہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق پہنچاتا ہے" حضرت زکریا[۴] نے

---

[۴] یہ تفصیل اگرچہ تفسیری روایات سے ماخوذ ہے اور آیت میں صرف لفظ "رزق" آیا ہے لیکن آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ مریم کا یہ رزق انسانی داد و دہش کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ بطور کرامت من جانب اللہ تھا۔ (مؤلف)

یہ سُنا تو سمجھ گئے کہ خدائے برتر کے یہاں مریم کا خاص مقام اور مرتبہ ہے اور ساتھ ہی بے موسم تازہ پھلوں کے واقعہ نے دل میں یہ تمنا پیدا کر دی کہ جس خدا نے اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ پھل بے موسم پیدا کر دیے کیا وہ میرے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود مجھ کو بے موسم پھل (بیٹا) عطا نہ کریگا؟ یہ سوچ کر انھوں نے خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ ربانی میں دعا کی اور وہاں سے شرفِ قبولیت کا مژدہ عطا ہوا۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (آل عمران)

اور اُس (مریم) کی کفالت زکریا نے کی، جب اُس (مریم) کے پاس زکریا داخل ہوتے تو اُس کے پاس کھانے کی چیزیں رکھی پاتے۔ زکریا نے کہا: "اے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آئیں" مریم نے کہا "یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق دیتا ہے"۔

مریم (علیہا السلام) اسی طرح ایک عرصہ تک اپنے مقدس مشاغل کے ساتھ پاک زندگی بسر کرتی رہیں اور مقدس ہیکل کا سب سے مقدس مجاور حضرت زکریا (علیہ السلام) بھی اُن کے زہد و تقویٰ سے بےحد متاثر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی عظمت اور جلالتِ قدر کو اور زیادہ بلند کیا اور فرشتوں کے ذریعہ اُن کو برگزیدہ بارگاہِ الٰہی ہونے کی یہ بشارت سُنائی

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ ۝ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ

(اے پیغمبر وہ وقت یاد کیجیے) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بزرگی دی اور پاک کیا اور دنیا کی عورتوں پر تجھ کو برگزیدہ کیا، اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا اور سجدہ ریز ہو جا اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر" اور (تم اُس وقت اُن

اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ۝ — کاہنوں کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قلموں (پوروں) کو (قرعہ اندازی کے لیے) ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے اور تم اُس وقت (بھی) موجود نہ تھے جب وہ اس کفالت کے بارہ میں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ (آل عمران)

حضرت مریم (علیہ السلام) جبکہ نہایت مرتاض، عابد و زاہد، اور تقویٰ و طہارت میں ضرب المثل تھیں اور جبکہ عنقریب ان کو جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا تو من جانب اللہ اُن کی تقدیس و تطہیر کا یہ اعلان بلاشبہ حق بحقدار رسید کا مصداق ہے تاہم علمی اور تاریخی اعتبار سے بلکہ خود قرآن و احادیث کے مفہوم کے لحاظ سے یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے کہ آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کی مراد کیا ہے، اور کیا درحقیقت حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات کی تمام عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے؟ اور یہی نہیں بلکہ اس آیتِ فضیلت نے مریم (علیہا السلام) کی ذات سے متعلق علماءِ سلف میں چند اہم مسائل کو زیرِ بحث بنا دیا ہے مثلاً (۱) کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ (۲) کیا حضرت مریم نبی تھیں؟ (۳) اگر نبی نہیں تھیں تو آیت کے جملہ "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کا مطلب کیا ہے؟

کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ محمد بن اسحٰق، شیخ ابوالحسن اشعری، قرطبی، ابن حزم (نور اللہ مرقدہم) اس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے بلکہ ابن حزم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت حوا، سارہ، ہاجرہ، اُم موسیٰؑ، آسیہ اور مریم (علیہن السلام) یہ سب نبی تھیں، اور محمد بن اسحٰقؒ کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور قرطبی فرماتے ہیں کہ مریم (علیہا السلام) نبی تھیں۔

ان حضرات کے اقوال کے برعکس خواجہ حسن بصری، امام الحرمین شیخ عبدالعزیز اور قاضی عیاضؒ (نور اللہ مرقدہم) کا رجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور

اس لیے مریم (علیہا السلام) بھی نبی نہیں تھیں، قاضیؒ اور ابن کثیرؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام الحرمین تو اجماع تک کا دعویٰ کرتے ہیں۔

جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی وہ اپنی دلیل میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (النحل) — اور تم سے پہلے ہم نے نہیں بھیجے مگر مرد کہ وحی بھیجتے ہم اُن کی طرف۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم کی نبوت کے انکار پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن عزیز نے اُن کو "صدیقہ" کہا ہے، سورۂ مائدہ میں ہے

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ
صِدِّيْقَةٌ (مائدہ)

اور سورۂ نساء میں قرآن عزیز نے منعم علیہم کی جو فہرست دی ہے وہ اس کے لیے نصِ قطعی ہے کہ "صدیقیت" کا درجہ "نبوت" سے کم اور نازل ہے۔[1]

اور جو حضرات عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے حضرت سارہ، اُمِ موسیٰ، اور حضرت مریم (علیہن السلام) کے متعلق جن واقعات کا اظہار کیا ہے اُن میں بصراحت موجود ہے کہ اُن پر خدا کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے اور اُن کو منجانب اللہ بشارات سے سرفراز فرمایا اور اُن تک اپنی معرفت، عبادت کا حکم پہنچایا چنانچہ حضرت سارہ کے لیئے سورۂ ہود اور سورۂ الذٰریٰت اور اُمِ موسیٰ کے لیے سورۂ قصص میں اور مریم علیہا السلام کے لیے آلِ عمران اور سورۂ مریم میں بواسطۂ ملائکہ اور بلا واسطہ خطابِ الٰہی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان مقامات پر وحی کے لغوی معنی (وجدانی ہدایت یا مخفی اشارہ)

[1] اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا

کے نہیں ہیں جیسا کہ آیت "وَاَوْحیٰ رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ" میں شہد کی مکھی کے لیے وحی کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم (علیہا السلام) کے نبی ہونے کی یہ واضح دلیل ہے کہ سورۂ مریم میں ان کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ کیا گیا ہے، جس طریقہ پر دیگر انبیاء و رسل علیہم السلام کا تذکرہ کیا ہے مثلاً "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى" "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ" "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ" "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ" "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ" یا مثلاً "وَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا" ہم نے مریم کی جانب اپنے فرشتہ جبرئیل کو بھیجا۔ یا مثلاً قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ۔ میں بلاشبہ تیرے پروردگار کی جانب سے پیغامبر ہوں" نیز آل عمران میں مریم علیہا السلام کو ملائکۃ اللہ نے جس طرح خدا کی جانب سے پیغامبر بن کر خطاب کیا ہے وہ بھی اس دعوے کی روشن دلیل ہے۔

اور مریم (علیہا السلام) کے صدیقہ ہونے سے متعلق جو سوال ہے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر قرآن نے حضرت مریم (علیہا السلام) کو "صدیقہ" کہا ہے تو یہ لقب ان کی شانِ نبوت کے اسی طرح منافی نہیں ہے جس طرح حضرتِ یوسف (علیہ السلام) کے مسلم نبی ہونے کے باوجود آیت "يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ" میں ان کا صدیق ہونا ان کے نبی ہونے کو مانع نہیں ہے بلکہ ذکرِ پاک کی مقامی خصوصیت کی بناء پر مذکور ہوا ہے۔ کیونکہ جو نبی ہے وہ بہر حال "صدیق" ضرور ہے البتہ اس کا عکس ضروری نہیں ہے۔

ان علماءِ اسلام کی ترجمانی جس تفصیل کے ساتھ کتاب الفصل میں مشہور محدث ابن حزم (رحمہ اللہ) نے کی ہے اس تفصیل و قوت کے ساتھ دوسری جگہ نظر سے نہیں گذری اس لیے سطور ذیل میں اس پورے مضمون کا ترجمہ لائقِ مطالعہ ہے۔

۱؎ سورۂ ہود آیت ۷۰-۷۱، والذریت آیۃ ۳۰-۲۹ ۲؎ قصص آیۃ ۷ ۳؎ آل عمران آیۃ ۴۲-۴۳ و ۴۷-۴۵ ، و سورۂ مریم آیۃ ۱۶ تا ۲۲ ۴؎ سورۂ یوسف۔

نبوۃ النساء اور ابن حزم

یہ فصل ایسے مسئلہ کے متعلق ہے جس پر ہمارے زمانہ میں قرطبہ (اندلس) میں شدید اختلاف برپا ہوا، علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی اور جو ایسا کہتا ہے کہ عورت نبی ہوسکتی ہے وہ ایک نئی بدعت ایجاد کرتا ہے، اور دوسری جماعت قائل ہے کہ عورت نبی ہوسکتی ہے اور نبی ہوئی ہیں، اور ان دونوں سے الگ تیسری جماعت کا مسلک توقف ہے اور وہ اثبات ونفی دونوں باتوں میں سکوت کو پسند کرتے ہیں، مگر جو حضرات عورت سے متعلق منصبِ نبوت کا انکار کرتے ہیں اُن کے پاس اس انکار کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی البتہ بعض حضرات نے اپنے اختلاف کی بنیاد اس آیت کو بنایا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ

میں کہتا ہوں کہ اس بارہ میں کس کو اختلاف ہے اور کس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو ہدایتِ خلق کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے یا اس نے کسی عورت کو "رسول" بنایا ہے بحث رسالت کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ نبوت میں ہے پس طلبِ حق کے لیے ضروری ہے کہ اول یہ غور کیا جائے کہ لغتِ عرب میں لفظ "نبوت" کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم اس لفظ کو "انباء" سے ماخوذ پاتے ہیں جس کے معنی "اطلاع دینا" ہیں، پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کے ہونے سے قبل بذریعہ وحی اطلاع دے، یا کسی بھی بات کے لیے اُس کی جانب وحی نازل فرمائے وہ شخص مذہبی اصطلاح میں بلاشبہ نبی ہے آپ اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وحی کے معنی اس الہام کے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے متعلق خدائے برحق کا ارشاد ہے "واوحی ربك الى النحل" اور نہ وحی کے معنی ظن اور وہم کے لے سکتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں کو "علمِ یقین" سمجھنا

(جو وحی کا قدرتی نتیجہ ہی) مجنون کے سوا اور کسی کا کام نہیں ہی اور نہ یہاں وہ معنی مُراد ہو سکتے ہیں جو "باب کہانہ" سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی یہ کہ شیاطین آسمانی باتوں کو سُننے اور چرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن پر شہابِ ثاقب کے ذریعہ رجم کیا جاتا ہی اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہی "شیٰطِیْنَ الجن والانس یوحی بعضہم الیٰ بعض زخرف القول غرورا" کیونکہ یہ "باب کہانہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت سے مسدود ہو گیا۔ اور نہ اس جگہ وحی کے معنی نجوم کے تجرباتِ علمیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود انسانوں کے باہم سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں اور نہ اس کے معنی اُس رویا (خواب) کے ہو سکتے ہیں جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی علم نہیں ہی بلکہ ان تمام معانی سے جُدا "وحی بمعنی نبوۃ" یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قصد اور ارادہ سے ایک شخص کو ایسے امور کی اطلاع دے جن کو وہ پہلے سے نہیں جانتا اور مسطورۂ بالا ذرائع علم سے الگ یہ امورِ حقیقت ثابتہ بن کر اُس شخص پر اس طرح منکشف ہو جائیں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہی اور اللہ تعالیٰ اس علمِ خاص کے ذریعہ اُس شخص کو بغیر کسی محنت و کسب کے بداہتہً ایسا صحیح یقین عطا کر دے کہ وہ ان امور کو اس طرح معلوم کر لے جس طرح وہ حواس اور بداہتِ عقل کے ذریعہ حاصل کر لیا کرتا ہی اور اُس کو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور خدا کی یہ وحی یا تو اس طرح ہوتی ہی کہ فرشتہ آکر اُس شخص کو خدا کا پیغام سُناتا ہی اور یا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست اُس سے خطاب کرتا ہی

پس اگر اُن حضرات کے نزدیک — جو عورت کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں — نبوۃ کے معنی یہ نہیں ہیں تو وہ ہم کو سمجھائیں کہ آخر نبوت کے معنی

ہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے ماسوا اور کوئی معنی بیان ہی نہیں کرسکتے۔

اور جبکہ نبوت کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے تو اب قرآن کے اُن مقامات کو بغور مطالعہ کیجیے جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ عزوجل نے عورتوں کے پاس فرشتوں کو بھیجا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن عورتوں کو "وحیِ حق" سے مطلع کیا چنانچہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے امِ اسحٰق (سارہ علیہا السلام) کو اسحٰق (علیہ السلام) کی ولادت کی بشارت سُنائی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

"وامرأته قائمة فضحكت فبشرنها باسحٰق ومن وراء اسحٰق يعقوب قالت يويلتا أالد وانا عجوز وهذا بعلي شيخا ان هذا لشيء عجيب قالوا اتعجبين من امر الله رحمت الله وبركاته عليكم اهل البيت"

ان آیات میں فرشتوں نے اُمِ اسحٰق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسحٰق اور اُن کے بعد یعقوب (علیہما السلام) کی بشارت سنائی ہے اور سارہؑ کے تعجب پر یہ کہہ کر دوبارہ خطاب کیا ہے" اتعجبين من امر الله" تو یہ کیسے ممکن ہے کہ والدۂ اسحٰق (سارہ) علیہا السلام نبی تو نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اس طرح اُن سے خطاب کرے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ، جبرئیل فرشتہ کو مریم (امِ عیسیٰ علیہما السلام) کے پاس بھیجتا ہے اور اُن کو مخاطب کرکے یہ کہتا ہے "وَقَالَ لَهَا اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا" تو یہ "وحیِ حقیقی" کے ذریعہ نبوت نہیں تو اور کیا ہے اور کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا کہ مریم (علیہا السلام) کے پاس جبرئیل (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغامبر بن کر آئے! نیز زکریا (علیہ السلام) جب مریم (علیہا السلام) کے حجرہ میں آتے تو اُن کے پاس اللہ کا غیب سے دیا ہوا رزق پاتے تھے اور اُنھوں نے اسی رزق کو دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں صاحبِ

فضیلت لڑکا پیدا ہونے کی دعا کی تھی، اسی طرح ہم موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنے اس بچہ کو دریا میں ڈال دو اور ساتھ ہی اُن کو اطلاع دی کہ میں اس کو تمہاری جانب واپس کرونگا اور اُس کو "نبی مرسل" بناؤنگا، پس کون شک کر سکتا ہے کہ یہ "نبوت" کا معاملہ نہیں ہے، معمولی عقل وشعور رکھنے والا آدمی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ شرفِ نبوت سے وابستہ نہ ہوتا اور محض خواب کی بنا پر یا دل میں پیدا شدہ وسوسہ کی وجہ سے وہ ایسا کرتیں تو اُن کا یہ عمل نہایت ہی مجنونانہ اور متہورانہ ہوتا، اور اگر آج ہم میں سے کوئی ایسا کر بیٹھے تو ہمارا یہ عمل یا گناہ قرار پائیگا اور یا ہم کو مجنون اور پاگل کہا جائیگا اور علاج کے لیے پاگل خانہ بھیج دیا جائیگا یہ ایک ایسی صاف اور واضح بات ہے جس میں شک وشبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب یہ کہنا قطعًا درست ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا موسیٰ (علیہ السلام) کو دریا میں ڈال دینا اسی طرح وحی الٰہی کی بنا پر تھا جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے رؤیاؑ (خواب) میں اپنے بیٹے (اسمٰعیل علیہ السلام) کا ذبح کرنا بذریعہ وحی معلوم کر لیا تھا اس لیے کہ اگر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نبی نہ ہوتے اور اُن کے ساتھ وحی الٰہی کا سلسلہ وابستہ نہ ہوتا اور پھر وہ یہ عمل محض ایک خواب یا نفس میں پیدا شدہ ظن کی وجہ سے کر گذرتے تو ہر شخص اُن کے اس عمل کو یا گناہ سمجھتا یا نہائی جنون یقین کرتا۔ تو اب بغیر کسی تردد کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُم موسیٰ (علیہا السلام) نبی تھیں۔

علاوہ ازیں حضرت مریم (علیہا السلام) کی نبوت پر ایک یہ دلیل بھی پیش

ؑ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں ایسا ہی فرمایا ہے۔

کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ کھیعص میں اُن کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں کیا ہے اور اُس کے بعد ارشاد فرمایا ہے "اولئک الذین انعم اللہ علیھم من النبیین من ذریۃ آدم وممن حملنا مع نوح" یہی ہیں وہ انبیاء آدم کی نسل سے، وران میں سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا جن پر اللہ کا انعام واکرام ہوا، تو آیت کے اس عموم میں مریم (علیہا السلام) کی تخصیص کر کے ان کو انبیاء کی فہرست میں سے الگ کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر کرتے ہوئے مریم (علیہا السلام) کے لیے یہ کہا ہے "وَ اُمُّہٗ صدیقۃ" تو یہ لقب اُن کی نبوت کے لیے اُسی طرح مانع نہیں جس طرح حضرت یوسف (علیہ السلام) کے نبی اور رسول ہونے کے لیے یہ آیت مانع نہیں "یوسف ایھا الصدیق" اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ (وباللہ التوفیق)

اب حضرت سارہ، حضرت مریم، حضرت اُمِّ موسیٰ (علیہن السلام) کے مسئلہ نبوت کے ساتھ فرعون کی بیوی (آسیہ) کو بھی شامل کر لیجیے اس لیے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے۔

کمل من الرجال کثیر ولم یکمل	مردوں میں سے تو بہت سے آدمی کامل ہوئے
من النساء الا مریم بنت عمران	ہیں مگر عورتوں میں سے صرف یہی دو کامل
واسیۃ بنت مزاحم امراۃ فرعون	ہوئیں۔ مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم
(اوکما قال علیہ السلام)[1]	زوجۂ فرعون۔

[1] بخاری میں الفاظ حدیث یہ ہیں۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا آسیۃ امراۃ فرعون ومریم بنت عمران وان فضل عائشۃ علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام۔

اور واضح رہے کہ مردوں میں یہ درجۂ کمال بعض رسولوں (علیہم السلام) ہی کو حاصل ہوا ہے اور اگرچہ اُن کے علاوہ انبیاء و رسل بھی درجۂ نبوت و رسالت پر مامور ہیں لیکن ان مرسلین کاملین کے درجہ سے نازل ہیں اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اُن میں صرف ان دو عورتوں کو ہی درجۂ کمال تک پہنچنے کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں جس درجۂ کمال کا ذکر ہو رہا ہے جو ہستی بھی اس درجہ سے نازل ہے وہ کامل نہیں ہے۔

بہرحال اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگرچہ بعض عورتیں بہ نصِ قرآن نبی ہیں لیکن ان میں سے ان دو عورتوں کو بھی درجۂ کمال حاصل ہوا، درجات کے اس فرق کو خود قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے "تلك الرسل فضلنا بعضهم علىٰ بعضٍ" حقیقت یہ ہے کہ کامل اُس کو کہا جاتا ہے جس کی نوع میں سے کوئی دوسرا اُس کا ہمسر نہ ہو پس مردوں میں سے ایسے کامل خدا کے چند ہی رسول ہوئے ہیں جن کی ہمسری دوسرے انبیاء و رسل کو عطا نہیں ہوئی اور بلاشبہ ان ہی کاملین میں سے ہمارے پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہیں جن کے متعلق نصوصِ (قرآن و حدیث) نے اُن فضائل کمال کا اظہار کیا ہے جو دوسرے انبیاء و رسل کو حاصل نہیں ہیں، اسی طرح عورتوں میں سے وہی درجۂ کمال کو پہنچی ہیں جن کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کیا ہے۔[1]

ابن حزم (رحمہ اللہ) کے اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وحی کے اُن معانی کو نظر انداز کر کے "جن کا اطلاق بلحاظ عمومِ لغت جبلت، یا نفس میں ظن و وہم کے درجہ کا القاء و الہام پر ہوتا ہے" وہ اصطلاحی معنی لیے ہیں جن کو قرآن نے انبیاء و رسل کے لیے

---

[1] الفصل فی الملل والاہواء والنحل مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ جلد ۵ ص ۱۲-۱۳-۱۲، یہ بحث فتح الباری جلد ۶ ص ۳۴۸-۳۴۷ و ص ۳۶۸ مطبوعہ مصر میں بھی قابل مراجعت ہے۔

مخصوص کیا ہے تو اُس کی دو صورتیں ہیں ایک وہ (وحی) جس کا منشا مخلوقِ خدا کی رشد و ہدایت اور تعلیم اوامر و نواہی سے ہو اور دوسری یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی شخص سے براہِ راست یا فرشتہ کے واسطہ سے اس قسم کا خطاب کرے کہ جس سے بشارات دینا یا کسی ہونے والے واقعہ کی ہونے سے قبل اطلاع دینا، یا خاص اُس کی ذات کے لیے کوئی امر و نہی فرمانا مقصود ہو۔ اب اگر پہلی صورت ہے تو یہ "نبوۃ مع الرسالۃ"[1] ہے اور بالاتفاق سب کے نزدیک یہ درجہ صرف مردوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جیسا کہ سورۂ النحل کی آیت سے واضح ہے اور اس مسئلہ میں قطعاً دو رائے نہیں ہیں۔

اور اگر وحیِ الٰہی کی دوسری شکل ہے تو ابن حزم اور اُن کے مؤیدین علماء کی رائے میں یہ بھی نبوت ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ قرآنِ عزیز نے سورۂ شوریٰ میں انبیاء علیہم السلام پر نزولِ وحی کے جو طریقے بیان کیے ہیں وہ اس وحی پر بھی صادق آتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ میں ہے:-

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ	اُس سے (بالمشافہ) گفتگو کرے مگر یا وحی کے ذریعہ یا
اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ	پسِ پردہ کلام کے ذریعہ اور یا اس صورت سے کہ
بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ	اللہ کسی فرشتہ کو پیامبر بنا کر بھیجے اور وہ اس کی اجازت
	سے جس کو کہ وہ چاہے اُس بشر کو وحی لا کر سنا دے بلاشبہ
(شوریٰ)	وہ بلند و بالا ہے حکمت والا ہے۔

اور جبکہ قرآن نے وحی کی اس دوسری قسم کا اطلاق بہ نصِ صریح حضرت مریم حضرت سارہ حضرت اُمِ موسیٰ اور حضرت آسیہ (علیہن السلام) پر کیا ہے جیسا کہ سورۂ ہود قصص آلِ

---

[1] یہاں نبی اور رسول کے اُس فرق کو نظرانداز کر دیا گیا ہے جو علمِ کلام کی خاص اصطلاح ہے کیونکہ قرآن کثرت کے ساتھ نبی اور رسول کو مرادف معنی میں استعمال کرتا ہے۔

مریم سے ظاہر ہوتا ہے تو ان مقدس عورتوں پر "نبی کا اطلاق" قطعاً صحیح ہے اور اس کو بدعت کہنا سرتا سر غلط ہے۔

ابن حزم (رحمہ اللہ) کے موئد علماء نے اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے اس شبہ کا جواب بھی دیا ہے "کہ قرآن نے جس طرح صاف الفاظ میں مرد انبیاء کو نبی اور رسول کہا ہے، اس طرح ان عورتوں میں سے کسی کو نہیں کہا" جواب کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ "نبوۃ مع الرسالۃ" جو کہ مردوں کے لیے ہی مخصوص ہے کائنات انسانی کی رُشد و ہدایت اور تعلیم و تبلیغ نوعِ انسانی سے متعلق ہوتی ہے تو اس کا قدرتی تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اس شرف سے ممتاز فرمایا ہے اُس کے متعلق وہ صاف صاف اعلان کرے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا نبی اور رسول ہے تاکہ اُمت پر اُس کی دعوت و تبلیغ کا قبول کرنا لازم ہو جائے اور خدا کی حجت پوری ہو اور چونکہ نبوت کی وہ قسم جس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے خاص اُسی ہستی سے وابستہ ہوتی ہے جس کو یہ شرف ملا ہے تو اس کے متعلق صرف یہی اظہار کر دینا کافی ہے کہ جو "وحی من اللہ" انبیاء و رسل کے لیے ہی مخصوص ہے اُس سے ان چند عورتوں کو بھی مشرف کیا گیا ہے۔

عورتوں کی نبوت کے اثبات و انکار کے علاوہ تیسری رائے اُن علماء کی ہے جو اس مسئلہ میں "سکوت اور توقف" کو ترجیح دیتے ہیں ان میں شیخ تقی الدین سبکی (رحمہ اللہ) نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، فتح الباری میں ان کا یہ قول مذکور ہے۔

قال السبکی اختلف فی ھذہ المسئلۃ ولم یصح عندی فی ذالک شیء الخ [1]	سبکی فرماتے ہیں: "اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں اور میرے نزدیک اس بارہ میں اثباتاً یا نفیاً کوئی بات ثابت نہیں ہے۔

کیا حضرت مریم نبی ہیں

اس تفصیل سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی نبوت کے انکار پر

[1] فتح الباری جلد ۶ کتاب الانبیاء

امام الحرمین کا دعویٰ اجماع صحیح نہیں ہے نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فہرست انبیاء میں مسطورۂ بالا دوسری مقدس عورتوں کے مقابلہ میں حضرت مریم کی نبوت کے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام اشعری ابن حزم اور قرطبی (رحمہم اللہ) کے درمیان حضرت مریم ؑ کے علاوہ نبیات کی فہرست کے بارہ میں خاصہ اختلاف نظر آتا ہے[1]، اور حضرت مریم ؑ کی نبوت کے متعلق تمام مثبتین نبوت کا اتفاق ہے۔

ہم کو ابن کثیر رحمہ اللہ کے اس دعوے سے بھی اختلاف ہے کہ جمہور، انکار کی جانب ہیں البتہ اکثریت غالباً سکوت اور توقف کو پسند کرتی ہے

آیت "واصطفاكِ على نساءِ العٰلمين" کا مطلب

جو علماء عورتوں میں نبوت کے قائل ہیں اور حضرت مریم (علیہا السلام) کو نبی تسلیم کرتے ہیں اُن کے مسلک کے مطابق تو آیت "وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعٰلَمِينَ" کا مطلب صاف اور واضح ہے وہ یہ کہ حضرت مریم کو کائنات کی تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، جو عورتیں نبی نہیں ہیں اُن پر اس لیے کہ مریم (علیہا السلام) نبی ہیں اور جو عورتیں نبی ہیں اُن پر اس لیے کہ وہ اُن قرآنی نصوص کے پیشِ نظر جو اُن کے فضائل و کمالات سے تعلق رکھتی ہیں باقی نبیات پر برتری رکھتی ہیں۔

لیکن جو علماء عورتوں کی نبوت کا انکار فرماتے ہیں اور حضرت مریم کو "نبیہ" نہیں تسلیم کرتے وہ اس آیت کی مراد میں دو جدا جدا خیال رکھتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ آیت کا جملہ "نساء العٰلمین" عام ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے، اس لیے بلا شبہ حضرتِ مریم کو بغیر کسی استثناء کے کائناتِ انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ "العٰلمین" سے کائنات کی وہ تمام عورتیں مراد ہیں جو حضرت مریم (علیہا السلام) کی معاصر تھیں، یعنی قرآنِ عزیز حضرت مریم (علیہا السلام) کے زمانہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ بشارت دی

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۸۔

کروہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں میں برگزیدہ اور صاحبِ کمال ہیں اور ہم نے اُن سب میں سے اُن کو چُن لیا ہو اور "العٰلمین" کا یہ اطلاق وہی حیثیت رکھتا ہو جو حضرت موسیٰ کی اُمت (بنی اسرائیل) کے لیے اس آیت میں اختیار کی گئی ہو۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔ (دخان) اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے اُن (بنی اسرائیل) کو جہان والوں کے مقابلہ میں پسند کر لیا ہو۔

حالانکہ باتفاق نصوص قرآن وحدیث یہ مسلّم ہو کہ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ کو علی الاطلاق کائنات کی تمام اُمتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہو، ارشاد باری ہو

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران) (اے اُمتِ محمدیہ) تم بہترین اُمت ہو جو کائنات انسانی (کی خدمت) کے لیے پیدا کی گئی ہو۔

اور جبکہ باتفاق آرا، بنی اسرائیل کی فضیلت کے متعلق یہ کہا جاتا ہو کہ "العٰلمین" سے اُن کی معاصر امم واقوام مُراد ہیں کہ اُن میں سے اُمتِ موسیٰ علیہ السلام کو فضیلت حاصل ہو تو حضرت مریم (علیہا السلام) کی فضیلت کے باب میں بھی یہی معنی مراد لینے چاہئیں۔

حضرت مریم کا تقدس اور تقویٰ وطہارت، حضرت عیسیٰ جیسے جلیل القدر کی والدہ ہونے کا شرف، مرد کے ہاتھ لگائے بغیر معجزہ کے طور پر اُن کے مشکوٰۂ محلّی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت بلاشبہ ایسے اُمور ہیں جن کی بدولت اُن کو معاصر عورتوں پر فضیلت وبرتری حاصل تھی۔

پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ باب فضیلت ایک وسیع باب ہو اور جس طرح کسی شی کی حقیقت بیان کرنے میں بلیغ اور عمدہ طریق بیان یہ ہو کہ وہ جامع ومانع ہو یعنی اُس کی حقیقت پر اس طرح حاوی ہو کہ تمام دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے نہ ایسی کمی رہ جائے کہ اصل حقیقت پوری طرح بیان نہ ہو سکے اور نہ ایسا اضافہ ہو کہ بعض دوسری حقائق بھی اُس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اسی طرح اس کے برعکس بیانِ فضیلت کے لیے

فصاحت و بلاغت کا تقاضہ یہ ہے کہ اُس کو بیانِ حقیقت کی طرح حدود و قیود میں نہ جکڑ دیا جائے کیونکہ اس مقام پر حقیقتِ شئ نہیں بلکہ فضیلت شے کا اظہار ہو رہا ہے جو اگر اسی طرح کے دوسرے افراد پر بھی صادق آجائے تو بیانِ حقیقت کی طرح اُس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس موقع پر وسعتِ بیان ہی از بس ضروری ہوتا ہے تاکہ مخاطب کے دل میں اظہارِ فضیلت سے جو نفسیاتی اثر پیدا کرنا ہے وہ دل نشین اور موثر ہو سکے۔

تو ایسی صورت میں "علیٰ نساء العٰلمین" کے معنی یہ نہیں ہونگے کہ حضرت مریم (علیہا السلام) کے علاوہ دوسری کوئی مقدس عورت اس شرف کو نہیں پہنچ سکتی یا نہیں پہنچی بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مریم کو فضائل و کمالات میں بلندت بلند مرتبہ حاصل ہے، باب فضائل کی یہی وہ حقیقت ہے جس کے فراموش کر دینے پر فضائلِ صحابہ وغیرہ میں اکثر ہم کو لغزش ہو جاتی اور چند مقدس اشخاص سے متعلق فضائل کے باہمی تضاد اور تناقص نظر آنے لگتا ہے، البتہ اُن فضائل کی حدود سے گذر کر جب ہم صاحبِ فضائل افراد کی انفرادی و اجتماعی اعمال کا جائزہ لے کر فرقِ مراتب بیان کرتے ہیں تو وہ ضرور ایک دوسرے کے لیے حدِ فاصل ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرات صحابہ و صحابیات کے فضائل کے پیشِ نظر فرقِ مراتب کا صحیح فیصلہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ اُن کے اُن فضائل کے ساتھ ساتھ جو زبانِ وحی ترجمان سے نکلے ہیں اُن سے متعلق خصوصی ارشاداتِ قرآنی و حدیثی، اُن کی اسلامی خدمات، اسلام سے متعلق اُن کی سرفروشیاں و جاں سپاریاں، نصرتِ حق میں مالی فداکاریاں، اسلام کے نازک ترین لمحات میں اُن کے علم و تدبر کی عقدہ کشائیاں اور اُن کی عملی جد و جہد کی رفیع سرگرمیاں ان سب کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور بشاراتِ کتبِ سابقہ

ادیان و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دینِ حق اور ملتِ بیضاء کی تبلیغ و دعوت کا سلسلہ اگرچہ آدم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر جاری رہا ہے لیکن اس سلسلہ

کو مزید قوت پہنچانے اور سر بلند کرنے کے لیے سنۃ اللہ یہ رہی ہے کہ صدیوں بعد ایک ایسے اولوالعزم اور جلیل القدر پیغمبر کو بھیجے جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے پیدا شدہ عام روحانی اضمحلال کو دور کر کے قبولِ حق کے افسردہ رجحانات میں تازگی بخشے اور ضعیف روحانی عواطف کو قوی سے قوی تر بنا دے گویا مذہب کی خوابیدہ دنیا میں حق و صداقت کا صور پھونک کر ایک انقلابِ عظیم بپا کر دے اور مردہ دلوں میں نئی رُوح ڈال دے اور اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ جن اقوام و امم میں اُس عظیم المرتبہ پیغمبر کی بعثت ہونے والی ہوتی ہے صدیوں پہلے اُن کے ہادیانِ ملت اور داعیانِ حق (انبیاء علیہم السلام) اُس مقدس رسول کی آمد کی بشارات وحی الٰہی کے ذریعہ سُناتے رہتے ہیں تاکہ اُس کی دعوتِ حق کے لیے زمین ہموار رہے اور جب اُس نورِ حق کے روشن ہونے کا وقت آجائے تو اُن اقوام و اُمم کے لیے اُس کی آمد غیر متوقع حادثہ نہ بن جائے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بھی ان چند اولوالعزم، جلیل القدر اور مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں اور اسی بنا پر انبیاء بنی اسرائیل میں سے متعدد انبیاء علیہم السلام اُن کی آمد سے قبل اُن کے حق میں منادی کرتے اور آمد کی بشارت سُناتے نظر آتے ہیں۔ اور ان ہی بشارات کی وجہ سے بنی اسرائیل مدّت مدید سے منتظر تھے کہ مسیحِ موعود کا ظہور ہو تو ایک مرتبہ وہ پھر موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ کی طرح اقوامِ عالم میں معزز و ممتاز ہوں گے اور رشد و ہدایت کی خشک کھیتی میں رُوحِ تازہ پیدا ہوگی اور خدا کے جاہ و جلال سے اُن کے قلوب ایک مرتبہ پھر چمک اُٹھیں گے۔ بائبل (توراۃ و انجیل) اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود آج بھی اُن چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہے جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ توراۃ استثناء میں ہے۔

> اور اس نے (موسیٰ نے) کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (ساعیر) سے اُن پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔ (باب ۳۳۔ آیت ۲)

اس بشارت میں "سینا سے خدا کی آمد" حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور "ساعیر سے طلوع ہونا" نبوت عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہے، کیونکہ ان کی ولادت باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام "بیت اللحم" میں ہوئی ہے اور یہی وہ بابرکت جگہ ہے جہاں سے نورِ حق طلوع ہوا اور "فاران پر جلوہ گر ہونا" آفتابِ رسالت کی بعثت کا اعلان ہے کیونکہ فاران حجاز کے مشہور پہاڑی سلسلہ کا نام ہے[1]

اور حضرت یسعیاہ نبی (علیہ السلام) کے صحیفہ میں ہے:-

دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیار کریگا، بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ طیار کرو، اس کے راستے سیدھے بناؤ[2]۔

اس بشارت میں "پیغمبر" سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہیں اور بیابان میں پکارنے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے منادی تھے اور ان کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل میں ان کی بعثت و رسالت کا مژدۂ جانفزا سناتے تھے

اور متّی کی انجیل میں ہے

"جب یسوع، ہیرودیس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت لحم میں پیدا ہوا تو دیکھو کئی مجوس پورب سے یروشلم میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ یہودیوں کا بادشاہ جو پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے؟ .... یہ سن کر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھ یروشلم کے سب لوگ گھبرائے اور اس نے قوم کے سب سردار کاہنوں اور فقیہوں کو جمع کرکے ان سے پوچھا کہ مسیح کی پیدائش کہاں ہونی چاہیے؟ انہوں نے اس سے کہا کہ یہودیہ کے بیت لحم میں کیونکہ نبی (یسعیاہ علیہ السلام) کی معرفت یوں لکھا گیا ہے اے بیت لحم یہوداہ کے علاقہ! تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں۔ کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلیگا جو میری امت اسرائیل کی گلہ بانی کریگا[3]

[1] تفصیل اپنے موقعہ پر آئیگی [2] باب ۴۰ آیات ۳-۸ [3] باب ۲ آیات ۱-۶

اور دوسری جگہ ہے :-

"اور جب وہ یروشلم کے نزدیک پہنچے اور زیتون کے پہاڑ پر بیت فگے کے پاس آئے تو یسوع نے دو شاگردوں کو یہ کہہ کر بھیجا کہ اپنے سامنے کے گاؤں میں جاؤ وہاں پہنچتے ہی ایک گدھی بندھی ہوئی اور اُس کے ساتھ بچہ تمہیں ملیگا انہیں کھول کر میرے پاس لے آؤ اور اگر کوئی تم سے کچھ کہے تو کہنا کہ یہ خداوند کو درکار ہیں وہ فی الفور اُنہیں بھیج دیگا یہ اس لیے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ "صیہون کی بیٹی سے کہو کہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے وہ حلیم ہے اور گدھے پر سوار ہے بلکہ لادو بچہ پر"[1]

اور یوحنا کی انجیل میں ہے :-

اور یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لیے اُس (یحییٰ علیہ السلام) کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اُس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں اُنہوں نے اُس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے، اُس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اُس نے جواب دیا نہیں۔ پس اُنہوں نے اُس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اُس نے کہا "میں جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا ہے۔ بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔"[2]

اور مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں ہے۔

وہ لوگ منتظر تھے اور سب اپنے اپنے دل میں یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی بابت سوچتے تھے کہ آیا وہ مسیح ہے یا نہیں تو یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) نے اُن سب کے

---

[1] باب آیات ۱-۶ [2] باب آیات ۲۳-۱۵

جواب میں کہا، میں تو تمہیں پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں مگر جو مجھ سے زور آور ہو وہ آنے والا ہے، میں اُس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں وہ تمہیں روح القدس سے بپتسمہ دیگا۔[1]

ان ہر دو بشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود اپنی مذہبی روایات کی بنا پر جن اولو العزم پیغمبروں کی بعثت کے منتظر تھے اُن میں مسیح علیہ السلام بھی تھے، اور حضرت یحییٰ (علیہ السلام) نے اُن کو بتایا کہ وہ نہ ایلیا ہیں نہ وہ نبی اور نہ مسیح (علیہم السلام) بلکہ مسیح علیہ السلام کی بعثت کے منادا اور مبشر ہیں۔

قرآنِ عزیز نے بھی حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ (علیہما السلام) کے واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی تمہید قرار دیا ہے اور یحییٰ (علیہ السلام) کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا مبشر اور منادی بتایا ہے۔ آل عمران میں ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ	پس فرشتوں نے اُس (زکریا) کو اُس وقت پکارا جبکہ
يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ	وہ حجرہ میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا، بیشک اللہ تعالیٰ
يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ	تجھ کو یحییٰ (فرزند) کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے کلمہ
مِّنَ اللّٰهِ .	(عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کریگا۔

ولادتِ مبارک

عابدو زاہد اور عفت مآب مریم (علیہا السلام) اپنے خلوتکدہ میں مشغولِ عبادت رہتی اور ضروری حاجات کے علاوہ کبھی اُس سے باہر نہیں نکلتی تھیں، ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ (ہیکل) کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک خدا کا فرشتہ (جبرئیل) انسانی شکل میں ظاہر ہوا حضرت مریم نے ایک اجنبی شخص کو اس طرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں اور فرمانے

---

[1] لوقا باب ۳ آیات ۱۶-۱۵۔ [2] عہد نامہ جدید (انجیل) میں یوحنا دو جدا جدا شخصیتیں ہیں، ایک یحییٰ علیہ السلام اور دوسری عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور شاگرد۔

لگیں: اگر تجھ کو کچھ بھی خدا کا خوف ہے تو میں خدائے رحمان کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں" فرشتہ نے کہا: "مریم! خوف نہ کھا میں انسان نہیں بلکہ خدا کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور تجھ کو بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں" حضرت مریم نے یہ سُنا تو از راہِ تعجب فرمانے لگیں: "میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مجھ کو آج تک کسی بھی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا اس لیئے کہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ میں زانیہ ہوں" فرشتہ نے جواب دیا: میں تو تیرے پروردگار کا قاصد ہوں اُس نے مجھ سے اسی طرح کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں اس لیے کرونگا کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ کے اعجاز کا "نشان" بنا دوں اور لڑکے میں میری جانب سے "رحمة" ثابت ہوگا اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے، مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اُس کا کلمہ[1] ہوگا، اُس کا لقب "مسیح[2]" اور اُس کا نام عیسیٰ (یسوع) ہوگا، اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوجاہت اور صاحبِ عظمت رہیگا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے نشان کے طور پر بحالت شیر خوارگی لوگوں سے باتیں کریگا اور سِنِ کہولت (بڑھاپے کا ابتدائی دور) بھی پائیگا تاکہ کائنات کی رشد و ہدایت کی خدمت کی تکمیل کرے اور یہ سب کچھ اس لیے ضرور ہو کر رہیگا کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب وہ کسی شئے کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اُس کا محض یہ ارادہ اور حکم کہ "ہو جا" اُس شئے کو نیست سے ہست کر دیتا ہے لہذا یہ یونہی ہو کر رہیگا اور اللہ تعالیٰ اُس کو اپنی کتاب عطا کریگا، اس کو حکمت سکھائیگا اور اُس کو بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے رسول اور اولو العزم پیغمبر بنائیگا۔

قرآنِ عزیز نے ان واقعات کا معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ سورۂ آل عمران

---

[1] یعنی توالد و تناسل کے عام قانون سے جدا قانونِ اعجاز کے مطابق محض حکمِ الٰہی اور ارادہ باری سے ہی رحم مریم میں وجود پذیر ہو جائیگا [2] مسیح بمعنی مبارک یا سیاح جس کا کوئی گھر نہ ہو۔

اور سورۂ مریم میں اس طرح ذکر کیا ہے

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ
يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ
عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ وَ
يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا
وَّمِنَ الصّٰلِحِينَ ۝ قَالَتْ رَبِّ
أَنّٰى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِي
بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا
يَشَاءُ إِذَا قَضٰٓى أَمْرًا فَإِنَّمَا
يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ وَيُعَلِّمُهُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَ
الْإِنْجِيلَ ۝ وَرَسُولًا إِلٰى بَنِي
إِسْرَآءِيلَ ۝ الآية (آل عمران)

(وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب فرشتوں نے مریم سے
کہا: "اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے کلمہ کی بشارت
دیتا ہے، اُس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا، وہ دنیا
و آخرت میں صاحب وجاہت اور ہمارے مقربین
میں سے ہوگا اور وہ (ماں کی) گود میں اور کہولت
کے زمانہ میں لوگوں سے کلام کریگا اور وہ نکوکاروں
میں سے ہوگا۔ مریم نے کہا: میرے لڑکا کیسے ہو سکتا
ہے جبکہ مجھ کو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا" فرشتہ
نے کہا: "اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اسی طرح پیدا کر دیتا
ہے، وہ جب کسی شی کے لیے حکم کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے،
"ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے، اور (اللہ) اُس کو کتاب،
حکمت، اور توراۃ و انجیل کا علم عطا کریگا اور (وہ) بنی
اسرائیل کی جانب اللہ کا رسول ہو۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ إِذِ
انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا
شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ
حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا
فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝
قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ
مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ

اور اے پیغمبر! کتاب میں مریم کا واقعہ ذکر کرو اُس وقت
کا ذکر جب وہ ایک جگہ کہ پورب کی طرف تھی اپنے گھر
کے آدمیوں سے الگ ہوئی، پھر اُس نے اُن لوگوں
کی طرف سے پردہ کر لیا، پس ہم نے اُس کی طرف اپنا
فرشتہ بھیجا اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں
نمایاں ہو گیا، مریم اُسے دیکھ کر (گھبرا گئی وہ) بولی: اگر تو
نیک آدمی ہے تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ

اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۔ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۔ قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۔

(مریم)

مانگتی ہوں" فرشتہ نے کہا میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور اس لیے نمودار ہوا ہوں کہ تجھے ایک فرزند دیدوں" مریم بولی: "یہ کیسے ہوسکتا ہے میرے لڑکا ہو حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدچلن ہوں!" فرشتہ نے کہا: ہوگا ایسا ہی، تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں، وہ کہتا ہے، یہ اس لیے ہوگا کہ اس (مسیح) کو لوگوں کے لیے ایک نشان بنادوں اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے ہوچکا ہے"

جبرئیل امین نے مریم (علیہ السلام) کو یہ بشارت سنا کر اُن کے گریبان میں پھونک دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ اُن تک پہنچ گیا۔ مریم (علیہا السلام) نے کچھ عرصہ کے بعد خود کو حاملہ محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشری اُن پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی، اور اس کیفیت نے اُس وقت شدید صورت اختیار کرلی، جب اُنھوں نے دیکھا کہ مدتِ حمل ختم ہو کر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے، اُنھوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ وہ حقیقتِ حال سے واقف نہیں ہے اس لیے نہیں معلوم وہ کس کس طرح بدنام اور بہتان طرازیوں کے ذریعہ کس درجہ پریشان کرے اس لیے مناسب یہ ہے کہ لوگوں سے دور کسی جگہ چلے جانا چاہیے، یہ سوچ کر وہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل کوہِ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اب "بیت اللحم" کے نام سے مشہور ہے یہاں پہنچ کر چند روز بعد دردِ زہ شروع ہوا تو تکلیف و اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنہ کے سہارے بیٹھ گئیں اور پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور پریشانی کی حالت میں

کرنے لگیں "کاش کہ میں اس سے پہلے مرچکی ہوتی اور میری ہستی کو لوگ یک قلم فراموش کر چکے ہوتے" تب نخلستان کے نشیب سے خدا کے فرشتہ نے پھر پکارا "مریم! غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر[1] جاری کر دی ہے اور کھجور کا تنہ پکڑ کر اپنی جانب ہلا تو پکے اور تازہ خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے پس تو کھا پی اور اپنے بچہ کے نظارہ سے آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج و غم کو بھول جا!"

حضرت مریم (علیہا السلام) پر تنہائی، تکلیف، اور نزاکت حال سے جو خوف طاری اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا فرشتہ کی تسلی آمیز پکار اور عیسیٰ (علیہ السلام) جیسے برگزیدہ بچہ کے نظارہ سے کافور ہو گیا اور وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیکھ دیکھ کر شاد کام ہونے لگیں۔

تاہم یہ خیال پہلو میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ اگرچہ خاندان اور قوم میری عصمت و پاکدامنی سے ناآشنا نہیں ہے پھر بھی اُن کی اس حیرت کو کس طرح مٹایا جا سکیگا کہ بن باپ کے کس طرح ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے؟

مگر جس خدائے برتر نے اُن کو یہ بزرگی اور برتری بخشی وہ کب اُن کو اس کرب و بے چینی میں مبتلا رہنے دیتا، اس لیے اُس نے فرشتہ کے ذریعہ مریم (علیہا السلام) کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کرے تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارہ سے اُن کو بتانا کہ میں روزہ دار ہوں اور اس لیے آج کسی سے بات نہیں کر سکتی تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے اس بچہ سے دریافت کر لو تب تیرا پروردگار اپنی قدرتِ کاملہ کا نشان ظاہر کر کے اُن کی حیرت کو دور اور اُن کے قلوب کو مطمئن کر دیگا۔

مریم (علیہا السلام) وحیِ الٰہی کے ان پیغامات پر مطمئن ہو کر بچہ کو گود میں لے بیت المقدس کو

---

[1] سری لغت عرب میں نہر کو بھی کہتے ہیں اور بلند ہستی کو بھی، جمہور نے اس جگہ پہلے معنی مُراد لیے ہیں اور حسن بصری، ربیع بن انس اور ابن اسلم رحمہم اللہ سے دوسرے معنی منقول ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے تیرے تلے ایک بلند ہستی پیدا کر دی ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲)

روانہ ہوئیں، جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چار جانب سے اُن کو گھیر لیا اور کہنے لگے "مریم! یہ کیا؟ تو نے تو بہت ہی عجیب بات کر دکھائی اور بھاری تہمت کا کام کر لیا، اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدچلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی"

مریم (علیہا السلام) نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہو اُس سے معلوم کر لو میں تو آج روزہ[1] سے ہوں۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب کے ساتھ کہا: "ہم کس طرح ایسے شیرخوار بچہ سے باتیں کر سکتے ہیں جو ابھی ماں کی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہو" مگر بچہ فوراً بول اٹھا: "میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے (اپنے فیصلۂ تقدیر میں) مجھ کو کتاب (انجیل) دی ہے اور نبی بنایا ہے اور اُس نے مجھ کو مبارک بنایا خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ بھی ہوں اور اُس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا شعار رہے اور اُس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گذار بنایا اور خود سر اور نافرمان نہیں بنایا اور اُس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ میں مرونگا اور جس دن کہ پھر زندہ اُٹھایا جاؤں گا۔

اللہ تعالیٰ نے ان تفصیلات کو سورۂ انبیاء، تحریم اور سورۂ مریم میں ذکر فرمایا ہے

وَالَّتِیۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا فَنَفَخۡنَا فِیۡهَا مِنۡ رُّوۡحِنَا وَجَعَلۡنٰهَا وَ ابۡنَهَاۤ اٰیَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (انبیاء)	اور اُس عورت (مریم) کا معاملہ جس نے اپنی پاکدامنی کو قائم رکھا، پھر ہم نے اُس میں اپنی "روح" کو پھونک دیا اور اُس کو اور اُس کے لڑکے کو جہان والوں کے لیے "نشان" ٹھہرایا ہے۔
ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجها فنفخنا فیه من روحنا (تحریم)	اور عمران کی بیٹی مریم کہ جس نے اپنی عصمت کو برقرار رکھا پس ہم نے اُس میں اپنی روح کو پھونک دیا۔

[1] بنی اسرائیل کے یہاں روزہ میں خاموشی بھی داخل عبادت تھی۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا	پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا وہ اپنی حالت
قَصِيًّا ۝ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ	چھپانے کے لیے) لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئی پھر
اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ	اُسے دردِ زہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت نیچے
مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا	لے گیا (وہ اس کے تنہ کے سہارے بیٹھ گئی) اُس نے کہا:
مَّنْسِيًّا ۝ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ	کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی، میری ہستی لوگ یکلم
اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ	بھول گئے ہوتے!" اُس وقت (ایک پکارنے والے
سَرِيًّا ۝ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ	فرشتہ نے) اُسے نیچے سے پکارا "غمگین نہ ہو تیرے پروردگا
النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا	نے تیرے تلے نہر جاری کردی ہے، اور کھجور کے درخت
جَنِيًّا ۝ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ	کا تنہ پکڑ کے اپنی طرف ہلا، تازہ اور پکے ہوئے پھلوں
عَيْنًا فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ	کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے، کھا پی (اور اپنے بچہ کے نظار
اَحَدًا فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ	سے) آنکھیں ٹھنڈی کر، پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے (اور
لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ	پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہدے، میں نے
الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۝ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا	خدائے رحمان کے حضور روزہ کی منت مان رکھی ہے،
تَحْمِلُهٗ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ	میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کرسکتی" پھر
شَيْـًٔا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ	ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے پاس آئی،
مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا	لڑکا اس کی گود میں تھا، لوگ (دیکھتے ہی) بول اُٹھے
كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ فَاَشَارَتْ	"مریم! تو نے عجیب ہی بات کر دکھائی اور بڑی تہمت کا
اِلَيْهِ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ	کام کر گذری۔ اے ہارونؑ کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا
كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ	نہ تیری ماں بدچلن تھی" (تو یہ کیا کر بیٹھی) اس پر مریم نے لڑکے
اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ	کی طرف اشارہ کیا کہ یہ تمہیں بتلا دیگا کہ حقیقت کیا ہے) لوگوں
وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَجَعَلَنِيْ	نے کہا: بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا

مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّا بِۢوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۝ (مریم)

شیرخوار بچہ ہی" گویا وہ بول اُٹھا" میں اللہ کا بندہ ہوں اُس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا، اُس نے مجھے بابرکت کیا خواہ میں کسی جگہ ہوں، اُس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کہ جب تک زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو، اُس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گذار بنایا، ایسا نہیں کیا کہ خود سر اور نافرمان ہوتا، مجھ پر اُس کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہو جس دن پیدا ہوا جس دن مرونگا اور جس دن پھر زندہ اُٹھایا جاؤنگا"

قوم نے ایک شیرخوار بچہ کی زبان سے جب یہ حکیمانہ کلام سُنا تو حیرت میں رہ گئی اور اُس کو یقین ہوگیا کہ مریم (علیہا السلام) کا دامن بلا شبہ ہر قسم کی بُرائی اور تلویث سے پاک ہو اور اس بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً منجانب اللہ ایک "نشان" ہو۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ پوشیدہ رہ جاتی، قریب اور بعید سب جگہ اس حیرت زا واقعہ اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے اور طبائع انسانی نے اس مقدس ہستی کے متعلق شروع سے ہی مختلف کروٹیں بدلنی شروع کر دیں، اصحاب خیر نے اُس کے وجود کو اگرچہ یُمن وسعادت کا ماہتاب سمجھا تو اصحابِ شر نے اُس کی ہستی کو اپنے لیے فالِ بد جانا اور بغض وحسد کے شعلوں نے اندر ہی اندر ان کی فطری استعداد کو کھانا شروع کر دیا۔

غرض اسی متضاد فضا کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچہ کی تربیت اور حفاظت کرتا رہا تاکہ اُس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مردہ قلوب کو حیاتِ تازہ بخشے اور اُن کی روحانیت کے شجرِ خشک کو ایک مرتبہ پھر بارآور اور مثمر بنائے۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّ اور ہم نے عیسیٰ بن مریم اور اُس کی ماں (مریم) کو اپنی

ملہ کہتے ہیں کہ ہارون، مریم علیہا السلام کے خاندان میں ایک عابد وزاہد انسان اور بہت نیک نفس مشہور تھا۔

وَآوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۝ (المومنون) — قدرت کا) نشان بنا دیا اور ان دونوں کا ایک بلند مقام (بیت اللحم) پر ٹھکانا بنایا جو سکونت کے قابل اور چشمہ والا ہے

بشاراتِ ولادت قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بچپن کے حالات میں سے صرف اسی اہم واقعہ کا ذکر کیا ہے باقی بچپن کے دوسرے حالات کو جن کا ذکر قرآن کے مقصدِ تذکیر و موعظت سے خاص تعلق نہیں رکھتا تھا نظر انداز کر دیا ہے لیکن اسرائیلیات کے مشہور ناقل حضرت وہب بن منبہ (رضی اللہ عنہ) سے جو واقعات منقول ہیں اور متی کی انجیل میں بھی جن کا ذکر موجود ہے اُن میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی تو اُسی شب میں فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن دیکھا، بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ اس ستارہ کا طلوع کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے جو ملک شام میں پیدا ہوئی ہے، تب بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے دے کر ایک وفد کو ملک شام روانہ کیا کہ وہ اس بچہ کی ولادت سے متعلق حالات و واقعات معلوم کریں، وفد جب شام پہنچا تو اُس نے

---

[1] عن ابن عباس فی قولہ "وآویناھما الی ربوۃ ذات قرار ومعین" قال المعین الماء الجاری وھو النھر الذی قال اللہ تعالیٰ "قد جعل ربک تحتک سریا" وکذا قال الضحاک و قتادۃ الی ربوۃ ذات قرار و معین ھو بیت المقدس فھذا واللہ اعلم ھو الاظھر لانہ المذکور فی الآیۃ الاخری والقرآن یفسر بعضہ بعضا وھذا اولیٰ ما یفسر بہ ثم الاحادیث الصحیحۃ ثم الآثار (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۴۶)

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے آیت "وآویناھما الی ربوۃ ذات قرار و معین" کی تفسیر میں منقول ہے کہ "معین" سے نہر جاری مراد ہے اور یہ اسی نہر کا ذکر ہے جس کو آیت "قد جعل ربک تحتک سریا" میں بیان کیا گیا ہے اور ضحاک اور قتادہ (رحمہما اللہ) کا بھی یہی قول ہے کہ "الیٰ ربوۃ ذات قرار و معین" سے بیت المقدس کی سرزمین مراد ہے، اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے اس لیے کہ دوسری آیت میں بیت المقدس (کی نہر) کا ہی ذکر ہے اور قرآن کا بعض حصہ خود ہی دوسرے حصہ کی تفسیر کر دیا کرتا ہے اور تفسیر آیات میں پہلی جگہ اسی طریق تفسیر کو حاصل ہے اس کے بعد صحیح احادیث کے ذریعہ تفسیر کا اور اُس کے بعد آثار کے ذریعہ تفسیر کا درجہ ہے (تفسیر ابن کثیر)

تفتیشِ حال شروع کی اور یہودیوں سے کہا کہ ہم کو اُس بچہ کی ولادت کا حال سُنا ؤ جو مستقبل قریب میں روحانیت کا بادشاہ ثابت ہوگا، یہود نے اہل فارس کی زبان سے یہ کلمات سُنے تو اپنے بادشاہ ہیرودیس کو خبر کی، بادشاہ نے وفد کو دربار میں بلا کر استصواب حال کیا اور اُن کی زبانی واقعہ کو سُن کر بہت گھبرایا اور پھر وفد کو اجازت دی کہ وہ اس بچہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں، پارسیوں کا یہ وفد بیت المقدس پہنچا اور جب حضرت یسوع (علیہ السلام) کو دیکھا تو اپنے رسم ورواج کے مطابق اوّل اُن کو سجدہ تعظیم کیا اور پھر مختلف قسم کی خوشبوئیں اُن پر نثار کیں اور چند روز وہیں قیام کیا، دورانِ قیام میں وفد کے بعض آدمیوں نے خواب میں دیکھا کہ ہیرودیس اس بچہ کا دشمن ثابت ہوگا اس لیے تم اب اس کے پاس نہ جاؤ اور بیت اللحم سے سیدھے فارس کو چلے جاؤ صبح کو وفد نے فارس کا ارادہ کرتے وقت حضرت مریم (علیہا السلام) کو اپنا خواب سُناتے ہوئے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی نیت خراب ہے اور وہ اس مقدس بچہ کا دشمن ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم اس کو ایسی جگہ لیجا کر رکھو جو اُس کی دسترس سے باہر ہو، اس مشورہ کے بعد حضرت مریم (علیہا السلام) یسوع مسیح (علیہ السلام) کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس مصر لے گئیں اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں اور جب عیسیٰ (علیہ السلام) کی عمر مبارک تیرہ سال کی ہوئی تو اُن کو ساتھ لے کر دوبارہ بیت المقدس واپس آئیں۔ یہی روایات یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے بچپن کے حالات زندگی بھی غیر معمولی تھے اور اُن سے طرح طرح کے کرامات کا صدور ہوتا رہتا تھا۔[۱] (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حلیۂ مبارک | بخاری حدیث معراج میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری ملاقات حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے ہوئی تو میں نے ان کو میانہ قد سُرخ سپید پایا، بدن ایسا صاف

---

[۱] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۶۵ و انجیل متی باب ۲

شفاف تھا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر آئے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ کے کاکل کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے، اور بعض احادیث میں ہے کہ رنگ کھلتا ہوا گندم گوں تھا بخاری کی روایت اور اس روایت میں ادا و تعبیر کا فرق ہے حُسن میں اگر صباحت کے ساتھ ملاحت کی آمیزش بھی ہوتی ہے تو اُس رنگ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کسی وقت اگر سُرخی جھلک آئی تو صباحت نمایاں ہو جاتی ہے اور اگر کسی وقت ملاحت غالب آگئی تو چہرہ پرحسن ولطافت کے ساتھ کھلتا ہوا گندم گوں رنگ چمکنے لگتا ہے۔

بعثت ورسالت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے اور انفرادی واجتماعی عیوب ونقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو اُن سے بچ رہا ہو، وہ اعتقاد اور اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز ومحور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے، یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق معلوم کر چکے ہو کہ اُس نے حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کو اپنی محبوبہ کے اشارہ پر کیسے عبرتناک طریقہ پر قتل کرا دیا تھا اور اُس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لیے کیا کہ وہ حضرت یحییٰ کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر اُن کے نہی عن المنکر (برائی سے بچانے کی ترغیب) کی تاب نہ لا سکا اور یہ عبرتناک سانحہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی زندگیِ مبارک ہی میں اُن کی بعثت سے قبل پیش آچکا تھا۔

دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا للبستانی) میں یہود سے متعلق جو مقالہ ہے اُس کے تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم وعقائد کو جزوِ مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب، بغض وحسد جیسی بداخلاقیوں کو تو عملاً اخلاقِ کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اسی بنا پر بجائے شرمسار ہونے کے وہ اُن پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور اُن کے علماء واحبار نے تو دنیا

کے لالچ و حرص میں کتاب اللہ (توراۃ) تک کو تحریف کیے بغیر نہ چھوڑا اور درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کر ڈالا یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور اس طرح قانونِ الٰہی کو مسخ کر ڈالا۔

یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر اور مکمل نقشہ ہم کو شعیا (علیہ السلام) کی زبانی خود توراۃ نے اس طرح دکھایا ہے۔

خداوند فرماتا ہے: یہ اُمت (بنی اسرائیل) زباں سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ یہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے ہیں۔

بہرحال ان ہی تاریک حالات میں جب حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کے قتل کا واقعہ بھی ہو گذرا اور بنی اسرائیل نے خدا کے حکموں کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کر دی تب وہ وقتِ سعید آپہنچا کہ جس مبارک بچہ نے حضرت مریم کی آغوش میں پیغام حق سُنا کر بنی اسرائیل کو حیرت میں ڈال دیا تھا سن رشد کو پہنچ کر اس نے یہ اعلان کر کے "کہ وہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور رشد و ہدایتِ خلق اُس کا فرض منصبی" قوم میں ہلچل پیدا کر دی، وہ شرفِ رسالت سے مشرف ہو کر اور حق کی آواز بن کر آیا اور اپنی صداقتِ و حقانیت کے نور سے تمام اسرائیلی دنیا پر چھا گیا اُس مقدس ہستی نے قوم کو للکارا اور احبار کی علمی مجلسوں، راہبوں کے خلوتکدوں، بادشاہ اور امرا کے درباروں، اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ کوچہ و برزن اور بازاروں میں شب و روز یہ پیغامِ حق سُنایا۔

لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد فرمائی ہے میں اُس کی جانب سے پیغامِ ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون (توراۃ) ہے اور جس کو تم نے اپنی جہالت اور کجروی سے پس پشت ڈال دیا ہے میں اُس کی تصدیق کرتا اور اُس کی مزید تکمیل

کے لیے خدا کی کتاب (انجیل) لے کر آیا ہوں، یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کر گئی، اور آج جھوٹ و سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہیگا سنو اور سمجھو اور اطاعت کے لیے خدا کے حضور جھک جاؤ کہ یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔

اب ان حقائق اور اُن کے عواقب و نتائج کو قرآن کی زبانی سُنیئے اور "احقاقِ حق و ابطالِ باطل" کے لطف سے بہرہ مند ہو کر عبرت و موعظت حاصل کیجیے، کیونکہ "تذکیر بایام اللہ" سے قرآن کا مقصد عظیم یہی بصیرت و عبرت ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ	اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب (توراۃ) عطا کی اور اس
قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ	کے بعد ہم (تم میں) پیغمبر بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	کو واضح معجزے دے کر بھیجا اور ہم نے اُس کو روحِ پاک
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ	(جبرئیل) کے ذریعہ قوت و تائید عطا کی، کیا جب تمہارے
الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ	پاس (خدا کا) پیغمبر ایسے احکام لے کر آیا جن پر عمل کرنے
رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ	کو تمہارا دل نہیں چاہتا تو تم نے غرور کو شیوہ (نہیں) بنا
اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ	لیا؟ پس (پیغمبروں کی) ایک جماعت کو جھٹلاتے ہو اور ایک
وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَقَالُوْا	جماعت کو قتل کر دیتے ہو، اور کہتے ہو کہ ہمارے دل (قبولِ
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ	حق کے لیے) غلاف میں ہیں (یہ نہیں) بلکہ اُن کے کفر کرنے
اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا	پر خدا نے اُن کو ملعون کر دیا ہے پس بہت تھوڑے سے ہیں
يُؤْمِنُوْنَ ۝ (البقرہ)	جو ایمان لے آتے ہیں۔
وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور (اے عیسیٰ!) جب میں نے بنی اسرائیل (کی گرفت و ارادۂ قتل)
عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ	کو تجھ سے باز رکھا اُس وقت جبکہ تو اُن کے پاس کھلے معجزات
فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ	لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے، یہ کچھ نہیں
اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (المائدہ)	ہے مگر کھلا جادو ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ ۝ (آل عمران)

اور میں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے، اور (اس لیے آیا ہوں) تاکہ تمہارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کردوں جو (تمہاری کجروی کی وجہ سے) تم پر حرام کردی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر آیا ہوں پس اللہ کا خوف کرو اور میری پیروی کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔ پس جبکہ عیسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کفر محسوس کیا تو فرمایا اللہ کے لیے کون میرا مددگار ہے تو شاگردوں نے جواب دیا ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ (حدید)

پھر ان کے بعد (نوح و ابراہیم علیہم السلام کے بعد) ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم کو رسول بنا کر بھیجا اور اس کو کتاب (انجیل) عطا کی۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ (مائدہ)

(وہ وقت یاد کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہیگا "اے عیسیٰ ابن مریم! میری اس نعمت کو یاد کر جو میری جانب سے تجھ پر اور تیری والدہ پر نازل ہوئی جبکہ میں نے روح القدس (جبرئیل) کے ذریعہ تیری تائید کی کہ تو کلام کرتا تھا آغوشِ مادر میں اور بڑھاپے میں اور جبکہ میں نے تجھ کو سکھائی کتاب، حکمت، توراۃ اور انجیل

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم

اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا: "اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ ہوں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے
وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي سامنے ہے اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر
اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (الصف) کی جو میرے بعد آئیگا اس کا نام احمد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

آیاتِ بینات | قصص القرآن جلد اول معجزات کی بحث میں گذر چکا ہے کہ حق و صداقت کے تسلیم و انقیاد میں انسانی فطرت ہمیشہ سے دو طریقوں سے مانوس رہی ہے ایک یہ کہ "مدعیِ حق" کی حقانیت و صداقت، دلائل کی قوت اور براہین کی روشنی کے ذریعہ ثابت اور واضح ہو جائے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ منجانب اللہ اس کی صداقت کی تائید میں عام قانونِ قدرت سے جُدا بغیر اسباب و وسائل اور تحصیلِ علم و فن کے اس کے ہاتھ پر امورِ عجیبہ کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ عوام و خواص اُس کے مقابلہ سے عاجز و درماندہ ہو جائیں اور اُن کے لیے اسباب و وسائل کے بغیر اُن امور کی ایجاد ناممکن ہو، پہلے طریق کے ساتھ یہ دوسرا طریق انسان کے عقل و فکر اور اس کی نفسیاتی کیفیات میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ اُن کا وجدان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ داعیِ حق (نبی و پیغمبر) کا یہ عمل در اصل خود اُس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خدا کی قوت کام کر رہی ہے اور بلاشبہ یہ اس کے صادق ہونے کی مزید دلیل ہے چنانچہ قرآن عزیز میں آیت "وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى"[1] میں اسی حقیقت کا اظہار مقصود ہے مگر ان ہر دو طریقوں میں سے اُن اصحابِ علم و دانش پر جو قوتِ فہم و ادراک میں بلند مقام رکھتے ہیں پہلا طریقہ زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے اور وہ دوسرے طریقہ کو پہلے طریقہ کی تائید و تقویت کی حیثیت سے قبول کرتے اور داعیِ حق (نبی و پیغمبر) کے دعوئے نبوت و رسالت کی صداقت کا مزید عملی ثبوت یقین کرکے اُس پر ایمان لے آتے ہیں۔ اور ان حضرات اربابِ عقل و فکر کے برعکس اربابِ قوت و اقتدار اور اُن کی ذہنیت سے متاثر عام انسانی قلوب دوسرے طریقہ تصدیق سے زیادہ متاثر ہوتے

[1] اور اے پیغمبر (بدر کے غزوہ میں) جب تو نے (دشمنوں پر) مٹھی بھر خاک پھینکی تھی تو تو نے وہ مشت خاک نہیں پھینکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔ مفصل بحث جلد اول میں گذر چکی ہے۔

اور نبی و پیغمبر کے معجزانہ افعال کو کائنات کی طاقت و قوت کے دائرہ سے بالاتر ہستی کا ارادہ و قوتِ فعل یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان امور کو "خدائی نشان" باور کر کے دعوتِ حق و صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں

قرآنِ عزیز نے اکثر و بیشتر مقامات پر پہلے طریقِ دلیل کو "حجۃ اللہ" "برہان" اور "حکمۃ" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ انعام میں خدا کی ہستی اُس کی وحدانیت، معاد و آخرت اور دین کے بنیادی عقائد کو دلائل، نظائر اور شواہد کے ذریعہ سمجھانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے، اللہ کے لیے ہی ہے حجتِ کامل (یعنی مکمل اور روشن دلیل)

اور اس سورۃ میں دوسری جگہ حضرت ابراہیم کے تذکرہ میں ہے

تِلْكَ حُجَّتُنَا اٰتَيْنٰهَا اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ — اور یہ ہماری "دلیل" ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی۔

اور سورۂ نساء میں ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ — (ہم نے بھیجے) پیغمبر خوشخبری سُنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کی جانب سے خدا پر پیغمبر بھیجنے کے بعد کوئی حجت (دلیل) باقی نہ رہے (کہ ہمارے پاس دلائل کے ذریعہ راہِ مستقیم بتانے کوئی نہ آیا تھا اس لیے ہم دینِ حق کی معرفت سے محروم رہے)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (نساء) — اے لوگو! بیشک تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برہان (قرآن) آ گیا۔

اور سورۂ یوسف میں ہے۔

لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ اگر نہ ہوتی یہ بات کہ دیکھ لی تھی اُس (یوسف) نے اپنے پروردگار کی دلیل

اور سورۂ نحل میں ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِيْلِ رَبِّكَ اپنے پروردگار کے راستہ کی جانب دعوت دو حکمت
بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور تبادلۂ خیالات کرو اُن
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (مخالفین) کے ساتھ اچھے طریق گفتگو سے

اور سورۂ نساء میں ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اور اللہ تعالیٰ نے اُتارا تجھ پر کتاب کو اور حکمت کو

اسی طرح "حکمت" کا یہ ذکر سورۂ بقرہ، آلِ عمران، مائدہ، لقمان، ص، زخرف، احزاب اور قمر میں بکثرت موجود ہے اور دوسرے طریق دلیل کو اکثر "آیۃ اللہ" اور "آیات اللہ" اور بعض مقامات پر "آیات بینات" اور "بینات" کہا ہے۔

ناقۂ صالح (علیہ السلام) کے متعلق ارشاد ہے۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (اعراف) یہ اونٹنی تمہارے لیے (خدا کی جانب سے) ایک نشان ہے

اور حضرت مسیح اور اُن کی والدہ مریم (علیہما السلام) کے متعلق ارشاد ہے۔

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَاۤ اٰيَةً اور ہم نے کر دیا مریم اور اُس کے لڑکے عیسیٰ (علیہما السلام) کو جہان
(انبیاء) والوں کے لیے "نشان" (معجزہ)

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے واقعات میں ارشادِ باری ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ (بنی اسرائیل) اور ہم نے موسیٰ کو نو نشان (معجزات) عطا کیے

اور حضرت مسیح (علیہ السلام) کو جو معجزات دیے گئے تھے اُن کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ (بقرہ) اور دیے ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات
اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ اُس وقت جبکہ تو اُن کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا
كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (مائدہ) بنی اسرائیل میں سے منکروں نے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

ہم نے اس مقام پر اکثر و بیشتر کا لفظ قصداً اختیار کیا ہے کیونکہ قرآنِ عزیز کے اسلوبِ بیان سے واقف و دانا اس سے بے خبر نہیں ہے کہ اس نے ان الفاظ کے استعمال میں وسعتِ تعبیر سے کام لیا ہے یعنی جبکہ "معجزہ" بھی ایک خاص قسم کا "برہان" ہے اور قرآن اور آیاتِ قرآن جس طرح سرتاسر "علم و برہان" ہیں اُسی طرح "معجزہ" بھی ہے اس لیے معجزہ پر برہان کا اطلاق اور کتاب اللہ کے جملوں پر آیت اور آیات اللہ کا اطلاق مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دو معجزوں عصاء اور ید بیضاء کے متعلق سورۂ قصص میں ہے:

فَذَانِكَ بُرْهَانَانِ مِنْ رَبِّكَ پس تیرے رب کی جانب سے یہ دو دلیلیں ہیں۔

اور کتاب اللہ اور اس کے جملوں پر آیت اور آیات کے اطلاقات سے تو قرآن کی کوئی طویل سورۃ ہی خالی ہو گی، تمام قرآن میں جگہ جگہ اس کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے کہ اس کی فہرست مستقل موضوع بن سکتا ہے۔

اسی طرح "آیات بینات" کا اگرچہ بکثرت اطلاق کتاب اللہ (قرآن، توراۃ، زبور، انجیل) اور اُن کی آیات پر ہوا ہے مگر مسطورۂ بالا مقامات کی طرح بعض بعض جگہ اس کو "معجزات" کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

لائق توجہ بات اور حقیقتِ معجزات

نبی اور رسول کی بعثت کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی فلاح و خیر کی رہنمائی ہے اور وہ منجانب اللہ وحی کی روشنی میں اس فرضِ منصبی کو انجام دیتا اور علم و برہان اور حجۃ حق کے ذریعہ راہِ صداقت دکھلاتا ہے، وہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فطرت اور ماوراء فطرت امور میں تصرف و تغیر بھی اُس کا کارِ منصبی ہے بلکہ وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے بشیر و نذیر اور داعی الی اللہ بن کر آیا ہوں، میں انسان ہوں اور خدا کا ایلچی، اس سے زاید اور کچھ نہیں ہوں تو پھر اس کے دعوۓ صداقت کے امتحان اور پرکھ کے لیے اُس کی تعلیم، اُس کی تربیت اور اُس کی شخصیت کا زیرِ بحث آنا یقیناً معقول لیکن اُس سے ماوراءِ فطرت اور خارقِ عادات عجائبات

دعویٰ نبوت کا مطالبہ خلاف عقل اور بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے اور یوں نظر آتا ہے جیسا کہ کسی طبیب حاذق کے دعوئے حذاقتِ طب پر اُس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ طلسمی کھٹکے کی ایک عمدہ الماری یا لکڑی کا ایک عجیب قسم کا کھلونا بنا کر دکھائے، طبیب نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ ماہر لوہار یا بڑھئی ہے بلکہ اُس کا دعویٰ تو امراض جسمانی کے علاج کا ہے، اسی طرح پیغمبرِ خدا کا یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی طرح کائنات پر ہر قسم کے تصرف و تغیر کا مالک و قادر ہے بلکہ اُس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ تمام امراض روحانی کے لیے طبیب کامل اور حاذق و ماہر ہے۔

پس دعوئے نبوت اور معجزات (خارق عادات امور) کے درمیان کیا تعلق ہے؟

اور کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "معجزہ" لوازم نبوت میں سے نہیں ہے؟

بلا شبہ یہ سوال بہت زیادہ قابل توجہ ہے اور اس لیے علم کلام میں اس مسئلہ کو کافی اہمیت دی گئی ہے لیکن ہم نے "آیات بینات" عنوان کے ماتحت ابتداءِ کلام میں دعوئے نبوت کی صداقت سے متعلق دلائل کی جو تقسیم انسانی طبائع اور اُن کے فطری رجحانات کے پیش نظر کی ہے وہ بھی ایک ناقابل انکارِ حقیقت ہے اور جوہر عقل کے تفاوتِ درجات نے بلا شبہ انسانوں کی قوتِ فکریہ کو جُدا جُدا دو طریقوں کی جانب مائل کر دیا ہے، ان حالات میں جب ایک نبی اور رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ایک ایسے منصب پر مامور ہے جو ریاضات و مجاہدات اور نیک عملی کی قوت سے نہیں بلکہ محض خدا کی موہبت اور عطا سے حاصل ہوتا ہے اور یہ "منصب نبوت و رسالت" ہے اور اس کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور تعلیم حق و صداقت ہے تو بعض انسانی دماغ اور اُن کا جوہر عقل اس جانب متوجہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس ہستی کا یہ دعویٰ صحت پر مبنی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اُس کو خدائے برتر کے ساتھ اُس درجہ قربت حاصل ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے ناممکن ہے پس جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُس کی صدائے اصلاح اور اُس کی تعلیم ہمارے قدیم رسم و رواج یا مذہب و دھرم کے اُن عقائد و اعمال کے خلاف ہے جس کو ہم حق سمجھتے آئے ہیں تو ان متضاد اور متخالف

تعلیمات کی صداقت وبطالت کے امتحان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ ہستی کوئی ادراء فطرت یا خارق امر کر دکھلائے تو ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائیگا کہ بغیر اسباب و وسائل کے اس ہستی کے ہاتھ ایسے امر کا صدور یقیناً اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ خاص قرب حاصل ہے، تب ہی تو خدائے برحق نے یہ "نشان" دکھا کر اس کی صداقت پر مُہر لگادی، نیز وہ صاحب قوت واقتدار انسان جن کے غور وفکر کی قوت ایسے سانچہ میں ڈھل گئی ہے کہ ان پر کوئی امر حق اس وقت تک مؤثر ہی نہیں ہوتا جب تک کہ ان کی متکبرانہ طاقت کو غیبی ٹھوکر سے بیدار نہ کیا جائے وہ بھی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ مدعیِ نبوت ورسالت اپنی صداقت کو دلیل وبرہان کے ساتھ ساتھ ایک ایسے "کرشمہ" کے ذریعہ ناقابل انکار بنا دے کہ جس کا صدور دوسرے انسانوں سے یا تو ممکن ہی نہ ہو اور یا بغیر اسباب ووسائل کے استعمال کیے وجود پذیر نہ ہو سکتا ہو تاکہ یہ باور کیا جاسکے کہ بلاشبہ اس ہستی کی تعلیم وتبلیغ کو خدائے برتر کی تائید حاصل ہے۔ اسی لیے علماءِ کلام نے دعوئے نبوت اور معجزہ کے درمیان تعلق پر بحث کرتے ہوئے یہ مثال بیان کی ہے کہ ایک شخص جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو بادشاہِ وقت نے اپنا نائب مقرر کر کے بھیجا ہے تو اس ملک یا صوبہ کے باشندے خواستگار ہوتے ہیں کہ مدعیِ نیابت اپنے دعوے کی صداقت کے لیے کوئی سند اور علامت پیش کرے چنانچہ مدعیِ نیابت ایک جانب اگر سند دکھاتا ہے تو دوسری جانب ایسی "نشانی" بھی پیش کرتا ہے جس کے متعلق یہ یقین کیا جاسکے کہ بادشاہ کی عطا کردہ یہ نشانی اس کے عطیہ اور اس منصب کی تصدیق کے علاوہ اور کسی طرح بھی حاصل نہیں کی جاسکتی مثلاً بادشاہ کی انگشتری (مہر حکومت) یا ایسا خاص عطیہ جو صرف اس منصب پر فائز ہستی کو عطا کیا جاتا ہو

تو اگرچہ بظاہر دعویِ نیابت اور انگشتری یا عطیہ خاص کے درمیان کوئی مطابقت نہیں ہے تاہم اس تعلقِ خاص نے جو شاہی تصدیق سے وابستہ ہے ان دونوں کے درمیان اہم

ربط پیدا کردیا ہے"

لیکن چونکہ یہ طریقِ تصدیق، معیارِ صداقت وحقانیت میں دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقۃً معیاری حیثیت صرف طریقِ اول "حجۃ وبرہانِ حق" کو ہی حاصل ہے اس لیے معجزہ کے وقوع وصدور کا معاملہ پہلے طریق کے وجود وصدور سے قطعاً جُدا ہے اور وہ یہ کہ ہرایک مدعیٔ نبوت ورسالت کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویٰ حق وصداقت کو حجۃ وبرہان کی روشنی اور علم یقین کی قوت کے ذریعہ ثابت کرے اور اپنی تعلیم، تربیت اور شخصی حیات کے ہر پہلو میں دعویٰ اور دلیل وبرہان کی مطابقت کو واضح کرے اور انسانی جوہرِ عقل کے فکر وتدبر کی رہنمائی کا فرض اس طرح انجام دے کہ ہر قسم کے ظن ووہم اور فاسد وکاسد خیالات کے مقابلہ میں "یقینِ محکم" روزِ روشن کی طرح نمودار ہوجائے۔ اور اس ادائے فرض کے لیے کسی کی جانب سے نہ مطالبہ شرط ہے اور نہ جستجو لازم بلکہ یہ نبی اور رسول کا براہِ راست وہ فرض ہے جس کے لیے خدائے تعالیٰ نے اُس کو منتخب اور مامور کیا ہے، اور اگر ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو گویا اپنے فرض کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھ سے برباد کردیتا ہے

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ	اے پیغمبر! جو تم پر نازل کیا گیا ہے تم اُس کو پورا
وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ	پورا پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو منصب
(البقرہ)	رسالت کو ادا نہ کیا۔

اس کے برعکس معجزہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ نبی اور رسول اس کو ضرور ہی دکھائے یا مخالفین کے ہر مطالبہ پر اُس کی تعمیل کرے بلکہ "معجزہ" حجت وبرہان کی وہ قسم ہے جو اکثر معاندین کے مطالبہ پر وقوع پذیر .... ہوتا ہے، اور اس لیے اُس کا صدور صرف عالم الغیب کی اپنی "حکمت ومصلحت" پر ہی موقوف رہتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ معجزہ کے بارہ میں کس کا سوال جویائے حق کی حیثیت میں ہے اور کس کا تعنت اور انکار

مزید کے لیے، کن سعید روحوں پر اس کا یہ اثر پڑیگا کہ وہ کہہ اُٹھینگی "اٰمَنَّا بِرَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْن"
اور کن بدبختوں پر اس طرح اثر انداز ہوگا کہ یوں گویا ہونگے "اِنْ ھٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْن"

پس قرآنِ عزیز نے اگر ایک جانب بہ نصوص قطعیہ یہ ظاہر کیا ہے کہ اُس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو حجۃ و برہان کے ساتھ مزید تائید و تقویت کے لیے معجزات عطا کیے ہیں تو دوسری جانب یہ بھی صاف صاف نبی کی زبانی کہلا دیا ہے کہ میں خدا کی جانب سے فقط "نذیر مبین" "بشیر و نذیر" اور "رسول و نبی" ہوں میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں کائنات خداوندی کے تصرفات و تغیرات اور ماوراءِ فطرت امور پر قادر ہوں۔ ہاں خدائے برتر اگر چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اُس نے ایسا کیا بھی ہے، مگر وہ جب ہی کرتا ہے کہ اُس کی حکمت و مصلحت اس کی متقاضی ہو۔

چنانچہ حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو منطق الطیر، اور تسخیر ہوا، طیور و جن کے نشان دیے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "تسع آیات بینات۔ نو کھلے نشان" عطا کیے گئے جن میں سے دو نشان عصا، اور ید بیضاء کو قرآن نے "بڑے نشان" کہا ہے۔ اور بحر قلزم میں غرقِ فرعون اور نجاتِ قوم موسیٰ کا عجیب و غریب واقعہ مستقل ایک "نشانِ عظیم" ہے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر دہکتی آگ کے شعلوں کو "برد و سلام" بنا دیا، حضرت صالح (علیہ السلام) کی قوم کے سبب "ناقۃ صالح" کو نشان بنایا کہ جونہی اس کو کسی نے ستایا اُسی وقت خدا کا عذاب قوم کو تباہ و برباد کر جائیگا چنانچہ ٹھیک اُسی طرح پیش آیا، حضرت ہود اور حضرت نوح (علیہما السلام) سے اُن کی قوموں نے عذاب طلب کیا اور کافی سمجھانے کے بعد بھی جب اُن کا اصرار قائم رہا تو اُن پیغمبروں نے عذاب الٰہی کی جو وعیدیں سنائی تھیں وہ ٹھیک اپنے اپنے وقت پر پوری ہوئیں حالانکہ ان سب مواقع میں بہ ظاہر اسباب نزولِ عذاب اور وقوعِ حوادث و ہلاکت کے کوئی سامان نہیں تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو مختلف نشان (معجزات) دیے گئے اُن کو بھی قرآن نے صاف صاف بیان کر دیا ہے جو ابھی زیر بحث

آئینگے اور آخر میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی معجزہ قرآن عطا کیا جس کی تحدی (مقابلہ کے چیلنج) کا کوئی جواب نہ دے سکا، نیز بدر کے معرکہ میں فرشتوں کا نزول اور اُن کے ذریعہ مسلمانوں کی نصرت و یاوری اور "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی" کے اعلان سے اُس مشہور معجزہ کا اظہار فرمایا جس نے بدر کے میدان میں مٹھی بھر خاک، کو ایک ہزار دشمنوں کی آنکھوں کا آزار بنادیا اور "شق القمر" کا معجزہ عطا فرمایا

معاملۂ زیر بحث کا یہ ایک پہلو یا ایک رُخ ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ ارشاد و تبلیغِ حق کے روشن دلائل و براہین کا کوئی جواب مخالفین سے نہ بن پڑا تو ازرہِ تعنت و سرکشی عجائبات اور خارق عادات امور کا مطالبہ کرنے لگے۔ تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ ان کا مقصد طلب حق اور جستجوئے صداقت نہیں ہے بلکہ یہ جو کہہ رہے ہیں سرکشی، ضد اور تعصب کی راہ سے کہتے ہیں اس لیے ان کا جواب یہ نہیں ہے کہ خدا کے نشانات کو بھان متی کا تماشہ یا مداری کا کھیل بنا دیا جائے بلکہ اصل جواب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو، میں ان تصرفات کا مدعی نہیں ہوں میں تو نیک و بد امور میں تمیز پیدا کرنے، خدا کے بندوں کا خدا کے ساتھ رشتہ ملانے اور نیک و بد کاموں کے انجام کو واضح کرنے کے لیے "نذیر مبین" اور "نبی رسول" ہوں۔

وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ	اور انھوں نے (مشرکوں نے) کہا ہم اُس وقت تک ہرگز
لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ	تیری بات نہیں مانینگے کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ
تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ	اُبال دے یا تیرے واسطے کھجوروں کا اور انگوروں کا
وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا	باغ ہو اور تو اس کے درمیان زمین پھاڑ کر نہریں بہا
تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ	دے یا تو جیسا گمان کرتا ہے ہمارے اوپر آسمان گرادے
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا	یا تو اللہ اور اس کے فرشتوں کو (ہمارے) مقابل لا دے

أَوْ تَأْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيلًا — یا تیرے واسطے ایک سونے کا (طلائی) مکان
أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ — ہو اور یا تو چڑھ جائے آسمان پر اور ہم تیرے چڑھ جانے
أَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَن نُّؤْمِنَ — کو بھی ہرگز اس وقت تک نہیں تسلیم کرینگے تاوقتیکہ
لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا — تو ہمارے پاس (آسمان سے) کتاب لے کر آئے کہ
كِتٰبًا نَّقْرَؤُهُ قُلْ سُبْحَانَ — اس کو ہم پڑھیں (اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے
رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا — پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے میں اس کے سوا کچھ نہیں
رَّسُولًا ۝ (الاسراء) — کہ انسان ہوں، خدا کا پیغامبر ہوں۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ — اور اگر کھول دیں ہم ان پر آسمان کا ایک دروازہ
فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ لَقَالُوا إِنَّمَا — اور یہ اس پر چڑھنے لگیں تب بھی ضرور یہی کہینگے کہ اس
سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ — کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مست کر دی گئی ہیں ہماری آنکھیں
مَّسْحُورُونَ ۝ (الحجر) — بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا — اور اگر یہ ہر قسم کے نشان بھی دیکھ لیں تب بھی ضد اور
بِهَا. (الانعام) — تعصب کی بنا پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

اب ان تفصیلات سے یہ بھی بخوبی روشن ہو گیا کہ علم کلام میں جن علماء کی رائے یہ ظاہر کی گئی ہے کہ "معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہے" ان کی مراد کیا ہے؟ وہ دراصل دعویٰ نبوت کی صداقت سے متعلق مسطورہ بالا ہر دو دلائل کے فرق کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو ہستی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرتی ہے اس پر لازم اور ضروری ہے کہ اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے "حجۃ و برہان" پیش کرے اور دلائل کی روشنی میں اپنی حقانیت کو ثابت کرے اور وحی الٰہی کی جو تعلیم وہ کائنات کی ہدایت کے لیے پیش کرتی ہے برہان و حجت کے ذریعہ اس کی حقیقت کو واضح کرے، تو گویا اس طرح نبوت و رسالت اور حجہ و برہان صداقت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس کے برعکس نبوت کے ساتھ معجزات اور آیات اللہ (نشانات خداوندی

کا تعلق اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مخالفین کے مطالبہ پر یا بہ تقاضائے حکمتِ الٰہی نبی اور رسول از خود اپنی صداقت کی تائید میں کوئی نشان (معجزہ) دکھلائے تو بلا شبہ وہ اس ہستی کے نبی و رسول ہونے کی ناقابلِ انکار "دلیل" ہے اور اُس کا انکار درحقیقت اُس رسول کی صداقت کا انکار ہے کیونکہ اس صورت میں یہ انکار حقیقت اور واقعہ کا انکار ہے اور حقیقت کا انکار "حق" نہیں بلکہ "باطل" ہوتا ہے جو نبوت و رسالت کے مقصد کے ساتھ کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہو کہ تعلیم حق کی روشنی وحی الٰہی پر دلائل و براہین کا یقین، اور اصولِ دین پر حجۃ و برہان کا قیام ہوتے ہوئے اب مخالفین کے بار بار طلبِ معجزات و عجائبات کی پرواہ نہ کی جائے اور نبی و رسول، وحی الٰہی کی روشنی میں حجۃ و برہان کے ذریعہ تعلیمِ حق کو جاری رکھے اور مخالفین کے جواب میں صاف صاف کہہ دے کہ میں نے ماوراء فطرت پر قدرت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا تو اس صورت میں بندوں پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور کسی اُمت اور قوم کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ تعلیمِ حق کے دلائل و براہین اور روشن حجت و بیّنہ سے اس لیے منہ پھیرے اور اس لیے اُس کا انکار کر دے کہ اُس کی طلب پر اچنبھوں اور عجائبات کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا گیا۔

پس قرآنِ عزیز نے جن انبیاء و رسل کے واقعات و حالات "تذکیر بایام اللہ" کے سلسلہ میں بیان کرتے ہوئے نصوصِ قطعیہ کے ذریعہ صراحت و وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم نے اُن کی صداقت کے نشان کے طور پر نشانات (معجزات) کو عطا اور مخالفین کے سامنے اُن کا مظاہرہ کیا تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بے چون و چرا اُن کو قبول اور اُن کی تصدیق کریں اور عجائب پرستی کے الزام سے خائف ہو کر عالمِ غیب کی اس تصدیق سے گریز نہ کریں اور نہ رکیک و باطل تاویلات کے پردہ میں اُن کے انکار پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ ایسا کرنا اس آیت کا مصداق بن جانا ہے۔

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيدُونَ أَنْ يَّتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا (النساء)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کتاب الٰہی کے بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے درمیان میں ایک راہ بنالیں۔

اور ظاہر ہے کہ یہ مومن و مسلم کی نہیں بلکہ کافر و منکر کی راہ ہے، مومن و مسلم کی راہ تو سیدھی راہ یہ ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ٥ (البقرہ)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ (اور اعتقاد و عمل کی ساری باتوں میں مسلم بن جاؤ، مسلم ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ زبان سے اسلام کا اقرار کرلو) اور دیکھو شیطانی وسوسوں کی پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

بہر حال "سنۃ اللہ" یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت یا تمام کائناتِ انسانی کی فوز و فلاح کے لیے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو اُس کو من جانب اللہ محکم دلائل و براہین اور آیات اللہ (معجزات) دونوں سے نوازا جاتا ہے، وہ ایک جانب وحی الٰہی کے ذریعہ کائنات کے معاش و معاد سے متعلق اوامر و نواہی اور بہترین دستور و نظام پیش کرتا ہے تو دوسری جانب حسب مصلحتِ خداوندی "خدائی نشانات" کا مظاہرہ کرکے اپنی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے، نیز ہر ایک پیغمبر کو اُسی قسم کے معجزات و نشانات عطا کیے جاتے ہیں جو اُس زمانہ کی علمی ترقیوں یا قومی و ملکی خصوصیتوں کے مناسب حال ہونے کے باوجود معارضہ کرنے والوں کو عاجز و درماندہ کردیں اور کوئی اُن کے مقابلہ میں تابِ مقاومت نہ لاسکے اور اگر تعصب و ضد درمیان میں حائل نہ ہوں تو اپنی اکتسابی ترقیوں اور خصوصیتوں کے حقائق سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اس اعتراف پر مجبور ہو جائیں کہ یہ جو کچھ سامنے ہے انسانوں کی قدرت سے بالاتر، اس کی دسترس سے باہر اور صرف

خدائے واحد ہی کی جانب سے ہے۔

مثلاً حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانہ میں علم نجوم (Astronomy) اور علم کیمیا (Chemistry) کا بہت زور تھا اور ساتھ ہی اُن کی قوم کواکب و نجوم کے اثرات کو اُن کے ذاتی اثرات سمجھتی اور اُن کو موثر حقیقی یقین کر کے خدائے واحد کی جگہ اُن کی پرستش کرتی تھی اور اُن کا سب سے بڑا دیوتا شمس (سورج) تھا کیونکہ وہ روشنی اور حرارت دونوں کا حامل تھا اور یہی دونوں چیزیں اُن کی نگاہ میں کائنات کی بقاء و فلاح کے لیے اصل الاصول تھیں اور اسی بنا پر کرۂ ارضی میں "آگ" کو اس کا مظہر مان کر اس کی بھی پرستش کی جاتی تھی، علاوہ ازیں اُن کو اشیاء کے خواص و اثرات اور اُن کے ردِ عمل پر بھی کافی عبور تھا گویا آج کی علمی تحقیقات کے لحاظ سے وہ کیمیاوی طریقہائے عمل سے بھی بڑی حد تک واقف تھے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اُن کی قوم کی ہدایت اور خدا پرستی کی تعلیم و تلقین کے لیے ایک جانب ایسے روشن حجۃ و برہان عطا فرمائے جن کے ذریعہ وہ قوم کے غلط عقائد کے ابطال اور احقاق حق کی خدمت انجام دیں اور مظاہر پرستی کی وجہ سے حقیقت کے چہرہ پر تاریکی کا جو پردہ پڑ گیا تھا اس کو چاک کر کے حقیقت کے رُخِ روشن کو نمایاں کر سکیں "وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ" اور دوسری جانب جب کواکب پرست اور بت پرست بادشاہ سے لے کر عام افراد قوم نے اُن کے دلائل و براہین سے لاجواب ہو کر اپنی مادی طاقت کے گھمنڈ پر دہکتی آگ میں جھونک دیا تو اُسی خالق اکبر نے جس کی دعوت و ارشاد کی خدمت حضرت ابراہیمؑ انجام دے رہے تھے "كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا" کہہ کر اپنی قدرت کا وہ عظیم الشان نشان (معجزہ) عطا کیا جس نے باطل کے پرہیبت ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا اور تمام قوم اس خدائی مظاہرہ سے عاجز، حیران و پریشان اور ذلیل و خاسر ہو کر رہ گئی" وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ"

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں سحر (Magic) مصری علوم وفنون میں بہت زیادہ نمایاں اور امتیازی شان رکھتا تھا اور مصریوں کو فنِ سحر میں کمال حاصل تھا، اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو قانونِ ہدایت (توراۃ) کے ساتھ ساتھ "یدِ بیضاء" اور "عصا" جیسے معجزات دیے گئے اور حضرت موسیٰ نے ساحرینِ مصر کے مقابلہ میں جب اُن کا مظاہرہ کیا تو سحر کے تمام اربابِ کمال اُس کو دیکھ کر یک زبان ہو کر پکار اُٹھے کہ بلا شبہ یہ سحر نہیں یہ تو اُس سے جُدا اور انسانی طاقت سے بالاتر مظاہرہ ہے جو خدائے برحق نے اپنے سچے پیغمبر کی تائید کے لیے اُن کے ہاتھ پر کرایا ہے کیونکہ ہم سحر کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور یہ کہہ کر اُنہوں نے فرعون اور قومِ فرعون کے سامنے بے خوفی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ آج سے موسیٰ اور ہارون کے خدائے واحد ہی کے پرستار ہیں "فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ" مگر فرعون اور امراءِ دربار اپنی بدبختی سے یہی کہتے رہے "قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ" "فَلَمَّا جَاءَهُم مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ"

اسی طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں علم طب (Medical Science) اور علم الطبیعات (Physics) کا بہت چرچا تھا اور یونان کے اطباء و حکماء (فلاسفر) کی طب و حکمت گرد و پیش کے ممالک و امصار کے اربابِ کمال پر بہت زیادہ اثر انداز تھی اور ملکوں میں صدیوں سے بڑے طبیب اور فلسفی اپنی حکمت و دانش اور کمالاتِ طب کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر خدائے واحد کی توحید اور دینِ حق کی تعلیم سے خواص و عوام یکسر محروم تھے اور خود بنی اسرائیل بھی جو کہ نبیوں کی نسل میں ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہتے تھے جن گمراہیوں میں مبتلا تھے سطور گزشتہ میں اُن پر روشنی پڑ چکی ہے۔

پس ان حالات میں "سنۃ اللہ" نے جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو رشد و ہدایت کے لیے منتخب کیا تو ایک جانب اُن کو حجۃ و برہان (انجیل) اور حکمت سے نوازا

تو دوسری جانب زمانہ کے مخصوص حالات کے مناسب چند ایسے نشان (معجزات بھی عطا فرمائے جو اس زمانہ کے ارباب کمال اور اُن کے پیروؤں پر اس طرح اثر انداز ہوں کہ جویائے حق کو اس اعتراف میں کوئی جھجک باقی نہ رہے کہ بلا شبہ یہ اعمال اکتسابی علوم سے جُدا محض خدائے تعالیٰ کی جانب سے رسولِ برحق کی تائید میں رونما ہوئے ہیں اور متعصب و متمرد کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ رہے کہ اُن کو "صریح جادو" کہہ کر اپنے بغض و حسد کی آگ کو اور مشتعل کرے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کے اُن معجزات میں سے جن کا مظاہرہ اُنھوں نے قوم کے سامنے کیا قرآن عزیز نے "چار معجزات" کا بصراحت ذکر کیا ہے۔ (۱) وہ خدا کے حکم سے مردہ کو زندہ (۲) اور پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو چنگا کر دیا کرتے تھے (۳) وہ مٹی سے پرند بنا کر اُس میں پھونک دیتے تھے اور خدا کے حکم سے اُس میں روح پڑ جاتی تھی۔ (۴) وہ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا اور خرچ کیا اور کیا گھر میں ذخیرہ محفوظ رکھا ہے؟

قوموں میں ایسے مسیحا موجود تھے جن کے علاج و معالجے اور اکتسابی تدابیر سے مایوس مریض شفا پاتے تھے، اُن میں ماہر طبعیات ایسے فلسفی بھی کم نہ تھے جو روح و مادہ کے حقائق اور ارضی و سماوی اشیاء کی ماہیات پر بے نظیر نظریات و تجربیات کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ اور حقائقِ اشیاء ان کی باریک بینی اور مہارت اربابِ کمال کے لیے باعث صد ناز ش تھی لیکن جب اُن کے سامنے عیسیٰ (علیہ السلام) نے اسباب و وسائل اختیار کیے بغیر ان امور کا مظاہرہ کیا تو اُن پر بھی ہدایت و ضلالت کی قدرتی تقسیم کے مطابق ہی اثر پڑا کہ جس شخص کے قلب میں حق کی طلب موجزن تھی اُس نے اقرار کیا کہ بلا شبہ اس قسم کا مظاہرہ انسانی دسترس سے باہر اور نبی برحق کی تائید و تصدیق کے لیے منجانب اللہ ہے اور جن دلوں میں رعونت، حسد اور بغض و عناد تھا اُن کے تعصب نے وہی کہنے پر مجبور کیا جو اُن سے پیشرو انبیاء و رسل سے کہتے آ رہے تھے۔ "اِنْ ھٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْن"

چوتھے معجزے کے بارہ میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے مظاہرہ کی وجہ یہ پیش آئی کہ مخالفین جب اُن کی دعوتِ رشد و ہدایت سے نفور ہو کر اُن کو جھٹلاتے اور اُن کے پیش کردہ آیات بینات (معجزات) کو سحر اور جادو کہتے تو ساتھ ہی از رہ تمسخر یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر تم خدائے تعالیٰ کے ایسے مقبول بندے ہو تو بتاؤ آج ہم نے کیا کھایا ہے اور کیا بچا رکھا ہے تب عیسیٰ (علیہ السلام) اُن کے تمسخر کو سنجیدگی سے بدل دینے اور وحی الٰہی کی نصرت سے اُن کے سوال کا جواب دے دیا کرتے تھے۔[۱]

مگر قرآنِ حکیم نے اس معجزہ کو جس انداز میں بیان کیا ہے اُس کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "نشان" کے مظاہرہ کی وجہ مفسرین کے بیان کردہ توجیہ سے زیادہ دقیق اور وسیع معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) پیغامِ ہدایت و تبلیغِ حق کی خدمت انجام دیتے ہوئے اکثر و بیشتر لوگوں کو دنیا میں انہماک، دولت و ثروت کے لالچ، اور عیش پسند زندگی کی رغبت سے باز رکھنے پر مختلف اسالیبِ بیان کے ذریعہ توجہ دلایا کرتے تھے تو جس طرح بعض سعید روحیں اس کلمۂ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی تھیں اس کے برعکس شریر النفس انسان اُن کے مواعظِ حسنہ سے قلبی نفرت و اعراض کے باوجود امتثالِ امر کرنے والی ہستیوں سے زیادہ اُن کو یہ باور کراتیں کہ ہم تو ہمہ وقت آپ کے اس ارشاد کی تعمیل میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں لہٰذا قدرتِ حق نے یہ فیصلہ کیا کہ ان منافقین کی منافقت کی مضرت کو زائل کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو ایسا "نشان" عطا کیا جائے کہ اس ذریعہ سے حق و باطل منکشف ہو جائے اور حقوق اللہ اور حقوقِ انسانی کے اتلاف پر جو ذخیرہ اندوزی کا سامان کیا جا رہا ہے اُس کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

ان چارگانہ خدائی نشان (معجزات) کے علاوہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش بھی ایک عظیم الشان "خدائی نشان" تھا، جس کے متعلق ابھی تفصیلات

[۱] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ص ۸۲۔

سُن چکے ہو۔

حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ہاتھ پر جن معجزات کا ظہور ہوا یا اُن کی ولادت جس معجزانہ طریق پر ہوئی، یہود نے ازرو حسد اُن کا انکار کیا تو کیا لیکن بعض فطرت پرست مدعیِ اسلام حضرات نے بھی اُن کے انکار کے لیے راہ پیدا کرنے کی ناکام سعی فرمائی ہے اُن میں سے بعض حضرات وہ ہیں جنھوں نے اس انکار کو ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ فطرت پرست اور منکرین خدا یورپین علماءِ جدید سے مرعوبیت کی بنا پر یہ روش اختیار کی ہے تاکہ اُن کی مذہبیت پر عجائب پرستی کا الزام عائد نہ ہو سکے، ان میں سرسید اور مولوی چراغ علی صاحب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں اور بعض وہ یہود صفت اشخاص ہیں جو اپنی ذاتی غرض اور ناپاک مقصد کی خاطر از رہِ حسد و بغض حضرت مسیح کے ان معجزات کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ تاویلاتِ باطل کے پردہ میں اُن کا مضحکہ اُڑاتے ہیں، ان میں سے متنبی کاذب مرزا کادیانی اور مسٹر محمد علی لاہوری خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

کادیانی اور لاہوری نے تو یہ ظلم کیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے معجزہ "اِنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ" کے متعلق یہ کہہ دیا کہ مسیح کا یہ عمل ایک تالاب کی مٹی کا رہینِ منت تھا معجزہ کچھ نہیں تھا اُس تالاب کی مٹی کی یہ خاصیت تھی کہ جس کسی پرند کی شکل بنائی جاتی اور منہ سے دم تک سوراخ رکھ دیا جاتا تو ہوا بھر جانے سے اُس میں آواز بھی پیدا ہو جاتی تھی اور حرکت بھی گویا العیاذ باللہ ان بدبختوں کے نزدیک حضرت مسیحؑ کی جانب سے منکروں کے مقابلہ میں یہ معجزانہ صداقت نہیں تھی بلکہ مداری یا شعبدہ باز کا تماشہ تھا۔

اسی طرح احیاء موتیٰ (مردہ کو زندہ کر دینا) کے معجزہ کا بھی انکار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآنِ عزیز نے یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کسی کو اس دنیا میں قبل از قیامت زندگی نہیں بخشیگا، لیکن لطف یہ ہے کہ اگر پورے قرآن کو از اوّل تا

آخر پڑھ جائیے تو کسی ایک آیت میں بھی آپ کو یہ فیصلہ نہیں ملیگا بلکہ اس دعویٰ کے خلاف متعدد مقامات پر اس کا اثبات پائیگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت کے بعد حیاتِ تازہ بخشی ہے، مثلاً سورہ بقرہ کی آیات ذبح بقرہ کے واقعہ میں ارشاد ہے۔ "فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ" یا سورہ بقرہ ہی کی اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے "فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ" (الآیہ) یا اسی سورہ میں تیسری جگہ مذکور ہے وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا۔ چنانچہ ان تمام واقعات میں احیاءِ موتیٰ کے صاف اور صریح معانی ثابت ہیں اور جن حضرات نے ان مقامات میں احیاءِ موتیٰ سے مجازی یا کنائی معنی لیے ہیں اُن کو طرح طرح کی تاویلات کی پناہ لینی پڑی ہے مگر اُن کی تاویلات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احیاءِ موتیٰ کی یہ تاویل اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اس کا دنیا میں وقوع ممنوع ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آیات مسطورہ بالا کے سیاق و سباق کے پیشِ نظر یہی معنی مناسب حال ہیں۔

غرض یہ دعویٰ کہ قرآن ممنوع قرار دیتا ہے کہ دار دنیا میں "احیاء موتیٰ" وقوع پذیر ہو صرف مرزا کادیانی اور مسٹر لاہوری کے دماغ کی اُپج ہے جو قطعاً باطل اور غیر ثابت ہے اور اس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے، رہا یہ امر کہ خدا کے عام قانونِ فطرت کے ماتحت ایسا نہیں پیش آتا رہتا سو اگر ایسا ہوتا رہتا تو پھر یہ "معجزہ" ہرگز نہ کہلاتا اور خدا نے برزخ کا قانون خاص جو تصدیق انبیاء علیہم السلام کے مقصد سے کبھی کبھی مخالفین کے مقابلہ میں بطور

لہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بحث گذر چکی ہے ۔ ملاحظہ ہو قصص القرآن جلد ۲۔
لہ ایضاً
سہ قصص القرآن جلد اول میں بحث گذر چکی۔

تحدی (چیلنج) کے پیش آتا رہا ہے کوئی خصوصیت نہ رکھتا۔

اسی طرح حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش کے مسئلہ کا بھی انکار کیا گیا ہے اور کادیانی اور لاہوری نے بھی اس کے خلاف بے دلیل ہرزہ سرائی کی ہے لیکن اس مسئلہ کی موافق و مخالف آراء سے قطع نظر ایک غیر جانبدار منصف جب حضرت مسیح کی پیدائش سے متعلق تمام آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جائیگی کہ قرآن حضرت مسیح سے متعلق یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط دونوں کے خلاف اپنا وہ فرض منصبی ادا کرنا چاہتا ہے جس کے لیے قرآن کی دعوتِ حق کا ظہور ہوا ہے، یہود اور نصاریٰ اس بارہ میں دو قطعاً مخالف اور متضاد سمتوں میں چلے گئے ہیں، یہود کہتے ہیں کہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) مفتری اور کاذب اور شعبدہ باز تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ خدا، خدا کے بیٹے یا ثالث ثلٰثہ تھے، ان حالات میں قرآن نے ان اوہام وظنون کے خلاف علم و یقین کی راہ دکھلاتے ہوئے دونوں کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ راہِ حق افراط اور تفریط کے درمیان ہے اور صراطِ مستقیم کی یہی سب سے بڑی شناخت ہے۔

وہ کہتا ہے واضح رہے کہ حضرت مسیح مفتری اور کاذب نہیں تھے بلکہ خدا کے سچے پیغمبر اور راہِ حق کے داعی صادق تھے، انہوں نے دعوتِ حق کی تصدیق کے لیے جو بعض عجیب باتیں کر دکھائیں وہ معجزات انبیاء کی فہرست میں شامل ہیں نہ کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی، اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی مگر اس سے یہ کیسے لازم آسکتا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہو گئے، کیا جو شخص پیدائش کا محتاج ہو اور پیدائش میں بھی ماں کے پیٹ کا محتاج اور جو شخص بشری لوازم کھانے پینے کا محتاج ہو وہ عبد اور بشر کے ماسوا خدا یا معبود ہو سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق الوہیت کا جو عقیدہ قائم کیا تھا اس کا بہت بڑا سہارا یہی

واقعہ تھا جیسا کہ وفد نجران اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے

تو جبکہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے اُن تمام باطل عقائد کی واضح الفاظ میں تردید کر کے جو اُنہوں نے حضرت مسیح کے متعلق قائم کر لیے تھے اپنا فریضۂ اصلاح انجام دیا، یہ کیسے ممکن تھا کہ اگر بن باپ کی پیدائش کا واقعہ باطل اور غیر واقعی تھا اور جو سہارا بن رہا تھا الوہیت مسیح کا اُس کے متعلق واضح طور سے قرآن تردید نہ کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ جگہ جگہ اس واقعہ کو ٹھیک اُس طرح بیان کرتا جاتا جیسا کہ متّی کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے، اُس کا فرض تھا کہ سب سے پہلے اسی پر ضرب کاری لگاتا اور صرف اس قدر کہہ کر کہ حضرت مسیح کا باپ فلاں شخص تھا اُس ساری عمارت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتا جس پر الوہیت مسیح کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مگر اُس نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ یہ بات کسی طرح بھی مسیح کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں؟ اس لیے کہ "مثلہ کمثل ادم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون" پس اگر "بن باپ کی پیدائش مسیح کو درجہ الوہیت دے سکتی ہے تو آدم کو اُس سے زیادہ الوہیت کا حق حاصل ہے کہ وہ بن ماں باپ کے پیدا ہوئے"

بہر حال جن تاویل پرستوں نے حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش سے متعلق آیات کے جملوں کو جدا جدا کر کے غلط احتمالات پیدا کیے ہیں وہ اس لیے باطل ہیں کہ جب اس واقعہ سے متعلق آیات کو یکجا کر کے مطالبہ کیا جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی آیات کے معانی میں بن باپ پیدائش کے معنی کے ماسوا دوسرے کسی بھی احتمال کی گنجائش باقی نہیں رہتی مگر یہ کہ عربی زبان کے الفاظ کے معین مدلولات و اطلاقات میں تحریف معنوی پر بے جسارت کی جائے۔

نیز بقول مولانا ابوالکلام جن اصحاب نے بغیر باپ کے پیدائش سے متعلق آیات میں تاویلِ باطل کی ہے اُن کی دلیل کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ حضرت مریم کا نکاح اگرچہ یوسف سے ہو چکا تھا مگر رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی، ایسی صورت میں میاں بیوی کے

درمیان مقاربت گو شریعت موسوی کے خلاف نہیں تھی تاہم وقت کے رسم ورواج کے قطعاً خلاف تھی اس لیے حضرت مسیح کی پیدائش لوگوں پر گراں گذری"[1] لیکن اوّل تو اس واقعہ کا ثبوت ہی موجود نہیں سب بے سند بات ہے دوسرے یہودیوں نے حضرت مریم پر جو بہتان لگایا تھا[2] انسائیکلوپیڈیا آف بائیبل میں تصریح ہے کہ اس بہتان کی نسبت ایک شخص پینتھر اٹالی کی جانب کی تھی نہ کہ یوسف نجار کی جانب، اس لیے تاویل باطل کی یہ بنیاد ہی از سرتا پا غلط اور بے اصل ہے۔

علاوہ ازیں جہاں تک اس مسئلہ کا عقلی پہلو ہے سو عقل بھی اس کے امکان کو ممنوع اور محال قرار نہیں دیتی بلکہ اس کو ممکن الوقوع تسلیم کرتی ہے، کیا سائنس کی موجودہ دنیا سے آشنا حضرات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج جبکہ سائنس کی جدید تحقیق نے نظریوں سے آگے قدم بڑھا کر مشاہدہ اور تجربہ سے یہ ثابت کر دیا کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان کی خلقت و پیدائش بھی بیضہ سے ہوتی ہے اور اس کو اصطلاح میں خلیۂ[3] تخم کہتے ہیں، یہ خلیہ مرد اور عورت دونوں میں ہوتا ہے اور حمل قرار پا جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد کے خلیاتِ تخم عورت کے بیضہ میں داخل ہو جاتے ہیں، یہی خلیہ زندگی اور حیات کا تخم ہے اور قدرتِ حق نے اس کو بہت باریک جثہ عطا فرمایا ہے۔ تو اس تحقیق نے امریکہ اور انگلینڈ کے سائنسدانوں کو اس جانب متوجہ کر دیا ہے کہ کیوں وہ ایک ایسی کوشش نہ کریں کہ بغیر مرد کی مقاربت کے جنس رجال کے خلیاتِ تخم کو آلات کے ذریعہ جنس اناث کے بیض میں داخل کر کے "وجود انسانی" حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سائنس والوں کا یہ تخیل ابھی عملی حیثیت سے کتنا ہی دور ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عقل یہ ممکن سمجھتی ہے کہ انسانی پیدائش، آنکھوں دیکھے عام طریق ولادت کے علاوہ بعض دوسرے

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۲

[2] اس کا قطر انچ کا ہوتا ہے۔

[3] خلیہ کو انگریزی میں (Cell) کہتے ہیں۔

طریقوں سے بھی ہو سکتی ہو اور اُن کو قانونِ قدرت کے خلاف اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے قدرت کے تمام قوانین کا احاطہ نہیں کرلیا ہو بلکہ انسان جس قدر علم و دانش کی جانب بڑھتا جاتا ہو اُس کے سامنے قدرتِ حق کے قانون کے نئے نئے گوشے کھلتے جاتے ہیں۔

پس اگر یہ صحیح ہو کہ جو بات کل ناممکن نظر آتی تھی آج وہ ممکن کہی جارہی ہو اور جلد یا بہ دیر اس کے وقوع پر یقین کیا جارہا ہو تو نہیں معلوم پھر اُس قانونِ قدرت سے انکار کردینے کے کیا معنی ہیں جس کا علم اگرچہ ابھی تک ہم کو حاصل نہیں ہو مگر انبیاء و رسل جیسے قدسی صفات ہستیوں پر اس علم کی حقیقت آشکارا ہو تو کیا علمی دلیل کا یہ بھی کوئی پہلو ہو کہ جس بات کا ہم کو علم نہ ہو اور عقل اُس کو ناممکن اور محال نہ ثابت کرتی ہو اُس کا انکار صرف "عدم علم" کی وجہ سے کردیا جائے۔ خصوصاً جب یہ انکار ایک مدعی مسیحت و نبوت کی جانب سے ہو تو اُس کے لیے تو یہی کہا جاسکتا ہو

اب ان "آیات بینات" کو قرآن حکیم سے سُنیے اور موعظت و عبرت کے حصول کا سروسامان کیجیے کہ ماضی کے ان واقعات کی تذکیر سے قرآن کا یہی عظیم مقصد ہو۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ	اور خدا سکھاتا ہو اس (عیسیٰ) کو کتاب، حکمت، توراۃ
وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ	اور انجیل، اور وہ رسول ہو بنی اسرائیل کی جانب
اِسْرَآءِيْلَ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ	(وہ کہتا ہو) کہ بیشک میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار
مِّنْ رَّبِّكُمْ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ	کی جانب سے "نشان" لے کر آیا ہوں، وہ یہ کہ میں
الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ	تمہارے لیے مٹی سے پرند کی شکل بناتا پھر اُس میں
فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ	پھونک دیتا ہوں اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرند
اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ	بن جاتا ہو اور پیدائشی اندھے کو سوانکھا کردیتا اور
الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ	سپید داغ کے جذام کو اچھا کردیتا ہوں اور خدا
بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ	کے حکم سے مردہ کو زندہ کردیتا ہوں اور تم کو بتادیتا

بُيُوتِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ (آل عمران)

ہوں جو تم کھا کر آتے ہو اور جو تم گھروں میں ذخیرہ رکھ آتے ہو، سو اگر تم حقیقی ایمان رکھتے ہو تو بلاشبہ ان امور میں (میری صداقت اور منجانب اللہ ہونے کے لیے) "نشان" ہے اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے بھیجا گیا ہوں) تاکہ بعض اُن چیزوں کو جو تم پر حرام ہو گئی ہیں تمہارے لئے حلال کر دوں تمہارے لئے پروردگار ہی کے پاس سے "نشان" لایا ہوں پس تم اللہ سے ڈرو اور (اسکے دیے ہوئے احکام میں) میری طاعت کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے سو اُسکی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے"

وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۔ (مائدہ)

اور (اے عیسیٰ بن مریم!) تو میری اس نعمت کو یاد کر جبکہ تو میرے حکم سے گارے سے پرند کی شکل بنا دیتا اور پھر اس میں پھونک دیتا تھا اور وہ میرے حکم سے زندہ پرند بن جاتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے پیدائشی اندھے کو سوانکھا اور سپید داغ کے کوڑھ کو اچھا کر دیتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے مردہ کو زندہ کر کے قبر سے نکالتا تھا۔

فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (الصف)

پھر جب وہ (عیسیٰ علیہ السلام) اُن کے پاس کھلے نشان لے کر آیا تو اُنہوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا: "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے"

انبیاء (علیہ السلام) نے جب کبھی بھی قوموں کے سامنے آیات اللہ کا مظاہرہ کیا ہے

تو منکروں نے ہمیشہ ان کے متعلق ایک بات ضرور کہی ہے "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے" بس کیا ایک جویائے حق اور غیر متعصب انسان کے لیے یہ جواب اس جانب رہنمائی نہیں کرتا کہ انبیاء علیہم السلام کے اس قسم کے مظاہرے ضرور عام قوانین قدرت سے جُدا ایسے علم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے تھے جو صرف ان قدسی صفات ہستیوں کے لیے ہی مخصوص رہا ہے اور اُن کے علاوہ انسانی دنیا اُس کے فہم حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہوئی تب ہی اُن لوگوں کے پاس "جواز رہ عناد و ضد انکار پر تلے ہوئے تھے" اس کے انکار کے لیے اس سے بہتر دوسری تعبیر نہیں تھی کہ وہ ان امور کو "سحر و جادو" کہہ دیں لہٰذا ان امور کو سحر و جادو کہنا بھی ان کے "معجزہ" اور "نشان خداوندی" ہونے کی زبردست دلیل ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کی تعلیمات کا خلاصہ

بہر حال حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو حجۃ و برہان اور آیات اللہ کے ذریعہ دینِ حق کی تعلیم دیتے رہتے اور اُن کے بھولے ہوئے سبق کو یاد دلا کر مردہ قلوب میں حیاتِ تازہ بخشتے رہتے تھے۔

خدا اور خدا کی توحید پر ایمان، انبیاء و رسل (علیہم السلام) کی تصدیق، آخرت و معاد پر ایمان، ملائکۃ اللہ پر ایمان، قضاء و قدر پر ایمان، خدا کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان اخلاقِ حسنہ کے اختیار، اعمال سیئہ سے پرہیز و اجتناب، عبادت الٰہی سے رغبت، دنیا میں انہماک سے نفرت اور خدا کے کنبہ (مخلوق خدا) سے محبت و مودت یہی وہ تعلیم و تلقین تھی جو اُن کی زندگی کا مشغلہ اور فرض منصبی بنا ہوا تھا، وہ بنی اسرائیل کو توراۃ، انجیل اور حکیمانہ پند و نصائح کے ذریعہ ان امور کی جانب دعوت دیتے مگر بدبخت یہود اپنی فطرت کج، صدیوں کی مسلسل سرکشی اور تعلیم الٰہی سے بغاوت کی بدولت اس درجہ تشدد ہو گئے تھے اور انبیاء و رسل کے قتل نے اُن کے قلوب کو حق و صداقت کے قبول میں اس درجہ سخت بنا دیا تھا کہ ایک مختصر سی جماعت کے علاوہ اُن کی جماعت کی بڑی اکثریت نے اُن کی مخالفت اور اُن کے ساتھ حسد و بغض کو اپنا شعار اور اپنی جماعتی زندگی کا معیار

بنا لیا اور اس لیے انبیاء کی سنتِ راشدہ کے مطابق رشد و ہدایت کے حلقہ بگوشوں میں دنیوی جاہ و جلال کے لحاظ سے کمزور و ناتواں اور زیردست پیشہ ور طبقہ کی اکثریت نظر آتی تھی ضعفاء کا یہ طبقہ اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ حق کی آواز پر لبیک کہتا تو بنی اسرائیل کا وہ سرکش و مغرور حلقہ اُن پر اور خدا کے پیغمبر پر پھبتیاں کستا، توہین و تذلیل کا مظاہرہ کرتا اور اپنی عملی جد و جہد کا بڑا حصہ معاندت و مخالفت میں صرف کرتا رہتا تھا

وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۔ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ (زخرف)

اور جب عیسیٰ ظاہر دلائل لے کر آئے تو کہا: بلاشبہ میں تمہارے پاس "حکمت" لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں تاکہ ان بعض باتوں کو واضح کر دوں جن کے متعلق تم آپس میں جھگڑ رہے ہو، پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو بیشک اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردہ ہے، سو اس کی پرستش کرو یہی سیدھی راہ ہے" پھر وہ آپس میں گروہ بندی کرنے لگے سو ان لوگوں کے لیے دردناک عذاب کے ذریعہ ہلاکت اور خرابی ہے۔

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ (صف)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا "اے بنی اسرائیل: بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیگا نام اس کا احمد ہے" پس جب عیسیٰ علیہ السلام آیا اُن کے پاس معجزات لے کر تو وہ (بنی اسرائیل) کہنے لگے، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

فَلَمَّا اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ	پھر جب عیسیٰ نے اُن (بنی اسرائیل) سے کفر محسوس
قَالَ مَنْ اَنْصَارِىْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ	کیا تو کہا: "اللہ کی جانب میرا کون مددگار ہوتا ہے"
قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ	حواریوں نے جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے (دین کے)
اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا	مددگار، ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور تم گواہ رہنا
مُسْلِمُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ	کہ ہم مسلمان ہیں، اے ہمارے پروردگار جو تونے
وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ	اُتارا ہے ہم اُس پر ایمان لے آئے اور ہم نے رسول
الشّٰهِدِيْنَ ۝	کی پیروی اختیار کرلی پس تو ہم کو (دین حق کی)
(آل عمران)	گواہی دینے والوں میں سے لکھ لے

حواری عیسیٰ علیہ السلام | مگر عیسیٰ (علیہ السلام) معاندین و مخالفین کی دراندازیوں اور ہرزہ سرائیوں کے باوجود اپنے فرض منصبی "دعوۃ الی الحق" میں سرگرم عمل رہتے اور روز و شب بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغامِ حق سناتے اور روشن دلائل اور واضح آیات اللہ کے ذریعہ لوگوں کو قبولِ حق و صداقت پر آمادہ کرتے رہتے تھے اور خدا اور حکم خدا سے سرکش اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں ایسی سعید روحیں بھی نکل آتی تھیں جو عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوتِ حق پر لبیک کہتی اور سچائی کے ساتھ دین حق کو قبول کرلیتی تھیں، ان ہی پاک بندوں میں وہ مقدس ہستیاں بھی تھیں جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے شرفِ صحبت سے فیضیاب ہوکر نہ صرف ایمان ہی لے آئی تھیں بلکہ دینِ حق کی سربلندی اور کامیابی کے لیے انہوں نے جان و مال کی بازی لگاکر خدمت دین کے لیے خود کو وقف کردیا تھا اور اکثر و بیشتر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ساتھ رہ کر تبلیغ و دعوت کو سرانجام دیتی تھیں اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ حواری[1]

---

[1] حواری، ناصح، رفیق، مددگار کو کہتے ہیں اور دھوبی کو بھی، آخری معنی میں یہ مناسبت ہے کہ جس طرح دھوبی کپڑے کو سپید کردیتا ہے اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے حواری دل کے میل صاف کردیا کرتے تھے۔

رفیق، اور "انصار اللہ" (اللہ کے دین کے مددگار) کے مقدس القاب سے معزز و ممتاز کی گئیں۔ چنانچہ ان بزرگ ہستیوں نے پیغمبر خدا کی حیاتِ پاک کو اپنا اسوہ بنایا اور سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں بھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر طرح معاون و مددگار ثابت ہوئیں

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ	اور (اے عیسیٰ وہ وقت یاد کرو) جبکہ میں نے حواریوں
اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْا	کی جانب (تیری معرفت) یہ وحی کی کہ مجھ پر اور میرے
اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا	پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انھوں نے جواب دیا "ہم ایمان
مُسْلِمُوْنَ (مائدہ)	لائے اور اے خدا! تو گواہ رہنا کہ ہم بلا شبہ مسلمان ہیں"
یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ	اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو
اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ	جاؤ جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے جب حواریوں سے کہا:
لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى	"اللہ کے راستہ میں کون میرا مددگار ہے" تو حواریوں نے
اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ	جواب دیا "ہم ہیں اللہ (کی راہ) کے مددگار۔ پس
اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ	بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لائی اور ایک
اِسْرَآءِیْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ	گروہ نے کفر اختیار کیا سو ہم نے مومنوں کی ان کے
فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ	دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی پس وہ (مومن)
فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ (الصف)	غالب رہے۔

گزشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے یہ حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقہ میں سے تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ "سنۃ اللہ" یہی جاری رہی ہے کہ اُن کی صدائے حق پر لبیک کہنے اور دینِ حق پر جان سپاری کا مظاہرہ کرنے کے لیے اوّل غریب اور کمزور طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے اور زیر دست ہی فداکاری کا ثبوت دیتے ہیں اور رعونت کی صاحب اقتدار اور زبردست ہستیاں اپنے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ مقابلہ اور

اور معارضہ کے لیے سامنے آتی اور معاندانہ سرگرمیوں کے ساتھ اعلاءِ کلمۃ اللہ کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتی ہیں لیکن جب خدائے تعالیٰ کا قانون پاداشِ عمل اپنا کام کرتا ہے تو نتیجہ میں فلاح و کامرانی ان کمزور فدایانِ حق ہی کا حصہ ہو جاتا ہے اور متکبر و مغرور ہستیاں یا ہلاکت کے قعرِ مذلت میں جا گرتی ہیں اور یا مقہور و مغلوب ہو کر سرنگوں ہو جانے کے ماسوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتیں ۔

حواریِ عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ

قرآنِ عزیز نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواریوں کی منقبت بیان کی ہے، سورۂ آلِ عمران کی آیات تمہارے سامنے ہیں، حضرت مسیح (علیہ السلام) جب دینِ حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارتے ہیں تو سب سے پہلے جنہوں نے "نحن انصار اللہ" کا نعرہ بلند کیا وہ یہی پاک ہستیاں تھیں، سورۂ صف میں اللہ رب العلمین نے جب مسلمانوں کو مخاطب کر کے "کونوا انصار اللہ" کی ترغیب دی تو "تذکیر بایام اللہ" کے پیشِ نظر ان ہی مقدس ہستیوں کا ذکر کیا اور اُن ہی کی مثال اور نظیر دے کر نصرتِ حق کے لیے برانگیختہ کیا اور سورۂ مائدہ میں اُن کے قبولِ ایمان اور دعوتِ حق کے سامنے انقیاد و تسلیم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی اُن کے خلوص، حق طلبی اور حق کوشی کی زندہ جاوید تصویر ہے۔ یہ سب کچھ تو اُس وقت کا حال ہے جب تک حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اُن کے درمیان موجود ہیں لیکن آپ کے "رفع الی السماء" کے بعد بھی اُن کی پُر استقامت اور دینِ قویم کی فداکارانہ خدمت کے متعلق سورۂ صف کی آیت "فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا عَلٰی عَدُوِّھِمْ فَاَصْبَحُوا ظٰھِرِیْنَ" میں کافی اشارہ موجود ہے اور شاہ عبد القادر (نور اللہ مرقدہ) نے اسی بنا پر آیت زیرِ بحث کی تفسیر کرتے ہوئے تاریخی شہادت کا اس طرح ذکر فرمایا ہے

> حضرت عیسیٰ کے بعد ان کے یاروں (حواریوں) نے بڑی محنتیں کی ہیں تب اُن کا دین نشر ہوا، ہمارے حضرت کے پیچھے بھی خلیفوں نے اس سے زیادہ کیا۔

مگر اس کے برعکس بائبل (انجیل)، بعض مقامات میں اگر اُن کی منقبت اور مدح سرائی میں رطب

اللسان ہے تو دوسری جانب ان کو بزدل اور منافق ثابت کرتی ہے۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے مشہور و معتمد علیہ حواری یہودا کے متعلق اُس وقت کا حال جب حضرت یسوع (علیہ السلام) کو یہودی گرفتار کرنا چاہتے ہیں" اس طرح مذکور ہے۔

یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑوا دیگا، شاگرد شبہ کر کے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ...... ایک شخص جس سے یسوع محبت کرتا تھا....

.... اُس نے یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا اے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دیدونگا وہی ہے۔ پھر اُس نے نوالہ ڈبو دیا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دیدیا اور اُس نوالہ کے بعد شیطان اُس میں سما گیا[1]

اور انجیل متی میں اُس شمعون پطرس حواری کے متعلق "جو بقول اناجیل ساری عمر حضرت یسوع کا پیارا اور معتمد علیہ رہا" یہ مسطور ہے:

شمعون پطرس نے اُس سے کہا، اے خداوند تو کہاں جاتا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ جہاں میں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آسکتا مگر بعد میں میرے پیچھے آئیگا۔ پطرس نے اُس سے کہا اے خداوند میں اب تیرے پیچھے کیوں نہیں آسکتا میں تو تیرے لیے اپنی جان دونگا۔ یسوع نے جواب دیا، کیا تو میرے لیے اپنی جان دیگا؟ میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دیگا جب تک کہ تو تین بار میرا انکار نہ کریگا۔[2]

اور اسی متی کی انجیل میں تمام شاگردوں (حواریوں) کی بزدلی اور حضرت یسوع کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جانے کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] باب ۱۳ آیات ۲۷-۲۱ [2] متی باب ۲۷ آیات ۴۶

"اس پر سارے شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے"[1]

اِن حوالجات سے تین ایسی باتیں ثابت ہوتی ہیں جن کو کسی طرح بھی عقل و نقل تسلیم کرنے کو طیار نہیں اول یہ کہ جو شاگرد اور حواری حضرت یسوعؑ کے زیادہ قریب، اُن کے معتمد علیہ اور اُن کی نگاہوں میں محبوب تھے وہ نتیجہ میں نہ صرف بزدل بلکہ "منافق" نکلے مگر عقل و نقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر ایک پیغمبر اور مصلح کی جماعت میں ایک چھوٹا سا گروہ منافقین کا عموماً ہوتا ہے جو اپنی دنیوی اغراض کی خاطر بہ کراہتِ قلب ظاہر داری کے طور پر شریک جماعت ہونا مفید سمجھتا ہے، مگر ایک مصلح اور پیغمبر کے درمیان ہمیشہ سے یہ فرق رہا ہے کہ مصلح خواہ اپنی جماعت کے منافقین سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے لیکن نبی اور پیغمبر کو "وحی الٰہی" کے ذریعہ شروع سے ہی مخلص اور منافق کی اطلاع دیدی جاتی ہے تاکہ ایک منکر و کافر سے زیادہ جس گروہ سے جماعتِ حق اور اُس کی دعوتِ اصلاح کو ضرر پہنچ سکتا ہے نبی اُس کے حالات سے غافل نہ رہے۔ پس اسی پر کوئی منافق کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نبی اور پیغمبر کا محبوب، معتمد علیہ اور مقرب نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ایک جُدا امر ہے کہ نبی، دینِ حق کی مصالح کی وجہ سے اُس کے ساتھ اغراض اور درگذر کا طریقِ عمل مناسب سمجھے جیسا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ایک صحابی کے اس سوال پر کہ "جب آپ منافقین کے حالاتِ منافقت سے آگاہ ہیں تو اُن کا مقابلہ کر کے کیوں اُن کو کیفر کردار تک نہیں پہنچا دیتے تاکہ جماعتِ مسلمین کو اُن کی منافقت سے نجات ملے" یہ جواب دیا اس لیے کہ اُن کے قبول ایمان کی ظاہر داری کے بعد ہمارے سخت گیر طریقہ کے متعلق غیر مسلموں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ وہ کہہ اٹھیں "محمد، اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے"

دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ یہوداہ کے اندر شیطان نے اُس وقت حلول کیا جب حضرت یسوعؑ نے اپنے ہاتھ سے اُس کو نوالہ ڈبو کر دیا، مگر یہ بات بھی اس لیے

[1] باب ۲۶ آیت ۵۶۔

عقل و نقل کے خلاف ہے کہ بزرگوں اور مقدس انسانوں کے ہاتھوں سے جو کچھ ہوتا ہے اُس کا اثر برکت، طہارت، اور تقدیس تو ہوا کرتا ہے لیکن شیطان کا حلول اور بدی کا نفوذ نہیں ہوا کرتا، بیشک یہ درست ہے کہ جب حق کا ترازو قائم ہوتا ہے تو اُس سے کھرا اور کھوٹا دونوں کی حقیقت کا انکشاف ہوجایا کرتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس پیمانہ کے مس کرنے سے کسی کھرے میں کھوٹ پیدا ہو جائے اور انجیل کے اس بیان میں صورتِ حال پہلی نہیں بلکہ دوسری ہے

تیسری بات یہ کہ حضرت یسوع کے تمام اُن حواریوں میں سے جن کی مدح و ستائش میں جگہ جگہ بائبل رطب اللسان ہے" ایک، دو یا دس، پانچ نہیں سب کے سب نہایت بزدلی اور غداری کے ساتھ اُس وقت حضرت مسیح سے کنارہ کش ہو گئے جب دینِ حق کی حمایت و نصرت کے لیے سب سے زیادہ اُن کی ضرورت تھی اور جبکہ پیغمبر خدا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔

مگر انجیل کی اس شہادت کے خلاف، سورہ آلِ عمرآن میں قرآن عزیز نے یہ شہادت دی ہے کہ اس نازک وقت میں جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے حواریوں کو دینِ حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارا تو سب نے اولوالعزمی اور فداکارانہ جذبہ کے ساتھ یہ جواب دیا "نحن انصار اللّٰہ" اور پھر حضرت مسیح کے سامنے اپنی استقامتِ دین اور اپنے مخلصانہ ایمان کے متعلق شہادت دے کر نصرت کا پورا پورا یقین دلایا اور پھر سورہ صف میں قرآنِ عزیز نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان حواریوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے جو کچھ کہا تھا اُن کی موجودگی میں اور اُن کے بعد سچی وفاداری کے ساتھ نباہا اور بلاشبہ مومنین صادقین ثابت ہوئے اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کی مدد فرمائی اور اُن کو دشمنانِ حق کے مقابلہ میں کامیاب کیا۔

انجیل اور قرآن کے اس موازنہ کو دیکھ کر ایک انصاف پسند یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کہ اس معاملہ میں "حق" قرآن کے ساتھ ہے اور علماء نصاریٰ نے انجیل میں تحریف کر کے اس قسم کے گڑھے ہوئے واقعات کا اضافہ اس لیے کیا ہے تاکہ صدیوں بعد کے خود ساختہ عقیدہ عقیدہ "صلیبِ مسیح" سے متعلق یہ داستان صحیح ترتیب پر قائم ہو سکے کہ جب مسیح (علیہ السلام) کو صلیب پر لٹکایا گیا تو انہوں نے یہ کہتے کہتے جان دیدی "ایلی ایلی لما سبقتنی" اے خدا! اے خدا! تو نے مجھے کیوں یکہ و تنہا چھوڑ دیا" اور کسی ایک شخص نے بھی مسیح کا ساتھ نہ دیا۔ بہرحال حواریوں سے متعلق بائبل کی یہ تصریحات محرّف اور خود ساختہ داستان سرائی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

نزول مائدہ مخلص اور فداکار حواریوں کی جماعت اگرچہ صادق الایمان اور راسخ الاعتقاد تھی مگر علمی و مجلسی تکلفات گفت و شنید کے لحاظ سے سادہ لوح اور ضروریات زندگی کے سر و سامان کے اعتبار سے غرباء اور ضعفاء کی جماعت تھی اس لیے انہوں نے از راہ سادگی و سادہ دلی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے یہ درخواست کی کہ جس خدائے برتر میں یہ لامحدود طاقت ہے کہ اس کا ایک نمونہ آپ کی ذاتِ اقدس اور وہ نشان (معجزات) ہیں خدائے تعالیٰ نے جن کو آپ کی تصدیق نبوت و رسالت کے لیے آپ کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا اس خدا میں یہ طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ ہمارے لیے غیب سے ایک دسترخوان نازل کر دیا کرے تاکہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو کر باطمینانِ قلب یادِ خدا اور دینِ حق کی دعوت و تبلیغ میں مصروف رہا کریں۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ سن کر ان کو نصیحت فرمائی کہ اگرچہ خدا کی طاقت بے غایت اور بے نہایت ہے لیکن کسی سچے بندہ کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ اس طرح خدا کو آزمائے پس خدا سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو، یہ سن کر حواریوں نے جواب دیا "ہم اور خدا کو آزمائیں، حاشا ہمارا یہ مقصد نہیں ہمارا تو یہ مطلب ہے کہ رزق کی جد و جہد سے دل کو مطمئن کر کے خدا کے اس عطیہ کو زندگی کا سہارا بنالیں اور آپ کی تصدیق میں ہم کو حق الیقین کا اعتقاد راسخ حاصل ہو جائے اور ہم اس خدائی پر کائنات انسانی کے لیے شاہد عدل بن جائیں۔"

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب اُن کا بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں دعا کی۔ اے خدا! تو ان کے سوال کو پورا کر اور آسمان سے ایسا مائدہ (دسترخوانِ نعمت) نازل فرما کہ وہ ہمارے لیے تیرے غضب کا مظہر ثابت نہ ہو بلکہ ہمارے اول و آخر سب کے لیے خوشی کی یادگار (عید) بن جائے اور تیرا "نشان" کہلائے اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنے غیبی رزق سے شادکام کرے کیونکہ تو ہی بہتر رزق رساں ہے" اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی: عیسیٰ! تمہاری دعا قبول ہے، میں اس کو ضرور نازل کرونگا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھلی نشانی نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو عذاب بھی ایسا ہولناک دونگا جو کائنات کے کسی انسان کو نہیں دیا جائیگا۔

قرآن عزیز نے نزول مائدہ کے واقعہ کا اس معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى	اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا اے
ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ	عیسیٰ بن مریم! کیا تمہارا پروردگار ایسا کرسکتا ہے کہ آسمان سے
اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ	ہم پر ایک خوان اُتار دے؟ (یعنی ہماری غذا کے لیے
السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ	آسمان سے غیبی سامان کردے) عیسیٰ نے کہا خدا سے ڈرو
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ	(اور ایسی فرمائشیں نہ کرو) اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اُنہوں نے
نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا	کہا: مقصود اس سے قدرت الٰہی کا امتحان نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے
وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ	ہیں (ہمیں غذا میسر آئے، تو) اس میں سے کھائیں اور ہمارے
نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ	دل آرام پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہمیں سچ بتلایا تھا،
قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ	اور اس پر ہم گواہ ہو جائیں۔ اس پر عیسیٰ بن مریم نے دعا کی
رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ	"اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک
السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا	خوان بھیج دے کہ اس کا آنا ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں اور
وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا	پچھلوں سب کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ قَالَ	(فضل و کرم کی) ایک نشانی ہو، ہمیں روزی دے تو سب
اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ	سے بہتر روزی دینے والا ہو! اللہ نے فرمایا میں تمہارے
يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ	لیے خوان بھیجونگا، لیکن جو شخص اس کے بعد بھی (نا) وقت
عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ	سے) انکار کریگا تو میں اُسے (پاداش عمل میں) عذاب دونگا
الْعٰلَمِيْنَ ۝ (مائدہ)	ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی آدمی کو بھی ویسا عذاب نہیں دیا جائیگا۔

یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں؟ قرآن عزیز نے اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہو البتہ آثارِ صحابہ و تابعین (رضی اللہ عنہم) میں ضرور تفصیلات مذکور ہیں۔

مجاہد اور حسن بصری (رحمہم اللہ) فرماتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا اس لیے کہ خدائے تعالیٰ نے اس کے نزول کو جس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا طلب کرنے والوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انسان ضعیف البنیان اور کمزوریوں کا مجسمہ ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی بدولت اس دردناک عذاب کے سزاوار ٹھیریں اپنے سوال کو واپس لے لیا، علاوہ ازیں اگر مائدہ کا نزول ہوا ہوتا تو ایسا نشانِ الٰہی (معجزہ) تھا کہ نصاریٰ اس پر جس قدر بھی فخر کرتے وہ کم تھا اور اُن کے یہاں اس کی جس قدر بھی شہرت ہوتی وہ بے جا نہیں ہوتی تاہم اُن کے یہاں اس نزول مائدہ کا اس طرح کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا۔[1]

اور حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہو کہ یہ واقعہ پیش آیا اور مائدہ کا نزول ہوا جمہور کا رجحان اسی جانب ہو البتہ اس کے نزول کی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں، مثلاً صرف ایک دن نازل ہوا، یا چالیس روز تک نازل ہوتا رہا؟ اور پھر اُترنا بند ہو گیا تو کیوں؟ اور صرف یہی ہوا کہ نازل

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۱۱۶ - مگر یوحنا کی انجیل باب ۶ میں تو یہ اشارہ پایا جاتا ہو کہ یہ واقعہ "عید فصح" کے موقعہ پر پیش آیا

نہ ہوا یا جن لوگوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے بند ہوا اُن پر سخت قسم کا عذاب بھی آپہنچا، جو نقول یہ کہتی ہیں کہ مائدہ کا نزول صرف ایک دن نہیں بلکہ چالیس دن تک برابر جاری رہا وہ بند ہو جانے کا سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ نزولِ مائدہ پر حکم یہ ہوا کہ اُس کو فقیر، مسکین اور مریض ہی کھائیں تونگر اور بھلے چنگے نہ کھائیں مگر چند روز تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کی خلاف ورزی شروع کردی یا یہ حکم ملا تھا کہ اس کو کھائیں سب مگر اگلے روز کے لیے ذخیرہ نہ کریں مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی خلاف ورزی ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مائدہ کا نزول ہی بند ہو گیا بلکہ خلاف ورزی کرنے والے خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے[1]

بہرحال ان آثار میں جو قدر مشترک ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعا قبول فرمائی تو مشیت باری کا یہ حکم ہوا کہ مائدہ طیار ہو چنانچہ لوگوں کی آنکھوں دیکھتے خدا کے فرشتے فضاءِ آسمانی سے اُس کو لے کر اترے ادھر فرشتے آہستہ آہستہ اُس کو لیے ہوئے اُتر رہے تھے اور اُدھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا تھے کہ مائدہ آپہنچا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اوّل دو رکعت نماز شکر ادا کی اور پھر مائدہ (خوان) کو کھولا تو اُس میں تلی ہوئی مچھلیاں، اور تر و تازہ پھل اور روٹیاں موجود پائیں اور خوان کھولتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اس کی مہک نے سب کو مست کر دیا، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں مگر لوگوں نے اصرار کیا کہ ابتدا آپ کریں، آپ نے ارشاد فرمایا، یہ میرے لیے نہیں ہے تمہاری طلب پر نازل ہوا ہے، یہ سُن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو کہ خدا کا رسول تو نہ کھائے اور ہم کھائیں آپ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا "اچھا فقرا، مساکین، معذوریں اور مریضوں کو بلاؤ یہ اُن کا حق ہے"

[1] نزول مائدہ کا سوال اگرچہ کہا تھا حواریوں نے مگر کیا تھا سب کی جانب سے اس لیے یہ واضح رہے کہ جن نقول میں خلاف ورزی اور اس سے متعلق عذاب کا ذکر ہے اُن کا اشارہ حواریوں میں سے کسی کی جانب مطلق نہیں ہے کیونکہ یہ بات نصوص قرآنی کے خلاف ہے۔

تب ہزا بندگانِ خدا نے شکم سیر ہوکر کھایا مگر مائدہ کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آیا۔[1]

اس مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہٗ) مجاہد اور حسن بصری (رحمہم اللہ) کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں اور نزول مائدہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے:۔

(ھل یستطیع) "ہوسکے" یہ معنی کہ ہمارے واسطے تمہاری دعا سے اس قدر خرق عادت کرے یا نہ کرے۔ فرمایا (اتقوا اللہ) "ڈرو اللہ سے" یعنی بندہ کو چاہیے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہا مانتا ہے یا نہیں اگرچہ خاوند (آقا و مالک) بہتیری مہربانی کرے۔ "ونکون علیھا من الشٰھدین" یعنی برکت کی اُمید پر مانگتے ہیں اور (تاکہ) معجزہ ہمیشہ مشہور رہے، آزمانے کو نہیں۔ کہتے ہیں وہ خوان اُترا یکشنبہ کو وہ نصاریٰ کی عید ہے جیسے ہم کو روز جمعہ۔

بعضے کہتے ہیں وہ خوان اُترا چالیس روز تک اور پھر بعضوں نے ناشکری کی یعنی حکم ہوا تھا کہ فقراء اور مریض کھاویں نہ مخلوط (تونگر) اور چنگے پھر قریب اسی آدمی سور اور بندر ہوگئے (دگر) یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا پیچھے کسی کو نہیں ہوا۔[2]

اور بعضے کہتے ہیں (مائدہ) نہ اُترا، تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے نہ مانگا لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام (قرآن) میں نقل کرنا بے حکمت نہیں، شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی امت (نصاریٰ) میں آسودگی مال سے ہمیشہ رہی اور جو کوئی اُن میں ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پاوے اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہے پھر اُس کی شکرگذاری بہت مشکل ہے، اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے اس قصہ

---

[1] یہ واقعات بڑی تفصیل [illegible] کتب تفسیر میں موجود ہیں۔
[2] شاہ صاحب کا مسلک یہ ہے کہ واقعۂ مسخ صحیح نہیں ہے۔

میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی[1]

اس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) موعظت و بصیرت سے متعلق بہت خوب بات ارشاد فرمائی ہے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) سے اُن کی قوم نے نزول مائدہ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ملا "تمہاری درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی جاتی ہے کہ نہ اس میں خیانت کرنا، نہ اس کو چھپائے رکھنا، اور نہ اس کو ذخیرہ کرنا ورنہ یہ بند کر دیا جائیگا اور تم کو ایسا عبرتناک عذاب دونگا جو کسی کو نہ دیا جائیگا"

اے معشر عرب! تم اپنی حالت پر غور کرو کہ اونٹوں اور بکریوں کی دم پکڑ کر جنگلوں میں چراتے پھرتے تھے، پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے درمیان ہی سے ایک برگزیدہ رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب سے تم اچھی طرح واقف ہو اس نے تم کو یہ خبر دی کہ عنقریب تم عجم پر غالب آجاؤگے اور اس پر چھا جاؤگے اور اُس نے تم کو سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ مال و دولت کی فراوانی دیکھ کر ہرگز تم چاندی اور سونے کے خزانے جمع نہ کرنا مگر قسم بخدا کہ زیادہ لیل و نہار نہ گذرینگے کہ تم ضرور سونے چاندی کے خزانے جمع کروگے اور اس طرح خدائے برتر کے دردناک عذاب کے مستحق بنوگے[2]

رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے نہ شادی کی اور نہ بود و ماند کے لیے گھر بنایا، وہ شہر شہر اور گاؤں، گاؤں خدا کا پیغام سناتے اور دینِ حق کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے اور جہاں بھی رات آپہنچتی وہیں کسی سر و سامانِ راحت کے بغیر شب بسر کر دیتے تھے اور چونکہ ان کی ذاتِ اقدس سے مخلوقِ خدا جسمانی و روحانی دونوں طرح کی شفاء اور تسکین پاتی تھی اس لیے جس جانب بھی اُن کا گذر ہو جاتا خلقت کا انبوہ حسنِ عقیدت

---

[1] موضح القرآن سورۂ مائدہ

[2] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ سورۂ مائدہ

کے ساتھ جمع ہوجاتا اور والہانہ محبت کے ساتھ اُن پر نثار ہوجانے کو طیار رہتا تھا۔

یہود کو اس دعوتِ حق کے ساتھ جو بغض و عناد تھا اُس نے اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو انتہائی حسد اور سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور جب اُن کے مسخ شدہ قلوب کسی طرح اس کو برداشت نہ کر سکے تو اُن کے سرداروں، نقیہوں، فریسیوں، اور صدوقیوں نے ذاتِ اقدس کے خلاف سازش شروع کی اور طے یہ پایا کہ اس ہستی کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کی بجز اُس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ بادشاہِ وقت کو مشتعل کر کے اُس کو دار پر چڑھا دیا جائے۔

گذشتہ چند صدیوں سے یہود کے ناگفتہ بہ حالات کی بدولت اُس زمانہ میں یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی حکومت اپنے باپ دادا کے علاقہ میں سے بمشکل ایک چوتھائی پر قائم تھی اور وہ بھی برائے نام اور اصل حکومت و اقتدار وقت کے بت پرست شاہنشاہ قیصر روم کو حاصل تھا اور اس کی نیابت میں پلاطیس (..........) یہودیہ کے اکثر علاقہ کا گورنر یا بادشاہ تھا۔

یہود اگرچہ اس بت پرست بادشاہ کے اقتدار کو اپنی بدبختی سمجھ کر اُس سے متنفر تھے مگر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے خلاف قلوب میں مشتعل حسد کی آگ نے اور صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ پست ذہنیت نے ایسا اندھا کر دیا کہ انجام اور نتیجہ کی فکر سے بے پروا ہو کر پلاطیس کے دربار میں جا پہنچے اور عرض کیا: "عالی جاہ! یہ شخص نہ صرف ہمارے لئے بلکہ حکومت کے لیے بھی خطرہ بنتا جا رہا ہے اگر فوراً ہی اس کا استیصال نہ کر دیا گیا تو نہ ہمارا دین ہی صحیح حالت میں باقی رہ سکیگا اور اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے اس لیے کہ اس شخص نے عجیب و غریب شعبدے دکھا کر خلقت کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں لگا ہے کہ عوام کی اس طاقت کے بل پر قیصر اور آپ کو شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دینی راہ سے ہی

گمراہ نہیں کیا بلکہ اُس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بددین بنانے میں منہمک ہے پس اس فتنہ کا انسداد ازبس ضروری ہے تاکہ بڑھتا ہوا یہ فتنہ ابتدائی منزل ہی میں کچل ڈالا جائے"

غرض کافی گفت وشنید کے بعد پیلاطیس نے اُن کو اجازت دیدی کہ وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کو گرفتار کرلیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں، بنی اسرائیل کے سردار، فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کرکے بیحد مسرور ہوئے اور فخر و مباہات کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور ہماری تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقعہ کا منتظر رہا جائے اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقعہ پر اس طرح اُس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔ انجیل یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق یہ کہا گیا ہے۔

پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کرکے کہا ہم کرتے کیا ہیں؟ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے، اگر ہم اُسے یونہی چھوڑ دیں تو سب اُس پر ایمان لے آئینگے اور رومی آکر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کرلینگے اور اُن میں سے کائفا نام ایک شخص نے جو اُس سال سردار کاہن تھا اُن سے کہا تم کچھ نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی اُمت کے واسطے مرے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو[1]

یہ اُس مشورہ کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے قبل آپس میں ہوا اور یہ خطرہ ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو بادشاہِ وقت (قیصر) کہیں سلطنت کے لیے خطرہ سمجھ کر رہی سہی برائے نام حکومتِ یہود کا بھی خاتمہ نہ کردے۔

اور مرقس کی انجیل میں ہے۔

دو دن کے بعد فسح اور عید فطیر ہونے والی تھی اور سردار کاہن اور فقیہ موقعہ ڈھونڈھ رہے تھے کہ کیسے

---

[1] باب ۱۱ آیات ۴۷ تا ۵۱۔

کیونکر قریب ہے پکڑ کر قتل کریں کیونکہ کہتے تھے کہ عید کو نہیں ایسا نہ ہو کہ بلوہ ہو جائے ؎۱

دوسری جانب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کے حواریوں کے مکالمہ کو سورۂ آلِ عمران اور سورۂ صف کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب یہود کے کفر و انکار اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا تو ایک جگہ اپنے حواریوں کو جمع کیا اور اُن سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کی معاندانہ سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں اب وقت کی نزاکت اور کڑی آزمائش و امتحان کی گھڑی کی قربت تقاضا کرتی ہے کہ میں تم سے سوال کروں کہ تم میں کون وہ افراد ہیں جو اس کفر و انکار کے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر خدا کے دین کے ناصر و مددگار بنیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشادِ مبارک سُن کر سب نے بڑے جوش و خروش اور صداقتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے مددگار، خدائے واحد کے پرستار، آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم وفا شعار ہیں، اور درگاہِ باری میں اپنی اس اطاعت کوشی پر استقامت کے لیے یوں دست بدعا ہیں، اے پروردگار! ہم تیری اُتاری ہوئی کتاب پر ایمان لے آئے اور صدقِ دل کے ساتھ تیرے پیغمبر کے پیرو ہیں، خدایا! تو ہم کو صداقت و حقانیت کے فداکاروں کی فہرست میں لکھ لے"

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کے فریضۂ دعوت و تبلیغ کے خلاف یہود بنی اسرائیل کی مخالفانہ سرگرمیوں سے متعلق حالات کا یہ حصّہ تو اکثر و بیشتر ایسا ہے کہ قرآن اور انجیل کے درمیان اصولاً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے مابعد کے پورے حصّۂ بیان میں دونوں کی قطعاً جُدا جُدا راہیں ہیں اور اُن کے درمیان اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی ایک کو دوسری راہ کے قریب نہیں لایا جا سکتا۔ البتہ اس جگہ پہنچ کر یہود اور نصاریٰ دونوں کا باہمی اتحاد ہو جاتا ہے اور دونوں کے بیانات واقعہ سے متعلق ایک ہی عقیدہ پیش کرتے ہیں، فرق ہے تو یہ کہ یہود اس واقعہ کو اپنا کارنامہ اور اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں اور نصاریٰ اُس کو یہود بنی اسرائیل

؎۱ باب ۱۴ آیات ۲-۱

کی ایک قابلِ لعنت جدوجہد یقین کرتے ہیں۔

یہود اور نصاریٰ دونوں کا مشترک بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس وقت یسوع (علیہ السلام) لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں، یہ موقع بہترین ہے، اس کو ہاتھ سے نہ دیجیے، فوراً ہی یہ لوگ موقع پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے یسوع (علیہ السلام) کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے پیلاطیس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ اُن کو سولی پر لٹکائے اور اگرچہ پیلاطیس نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا مگر بنی اسرائیل کے اشتعال پر مجبوراً سپاہیوں کے حوالہ کر دیا، سپاہیوں نے اُن کو کانٹوں کا تاج پہنایا، مُنہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین و تذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا اور اس کس مپرسی کی حالت میں اُنھوں نے یہ کہتے ہوئے جان دے دی "ایلی ایلی لما سبقتنی" انجیلِ متی میں اس واقعہ کی تفصیلات کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:-

سردار کاہن نے اُس سے کہا: میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ یسوع نے اُس سے کہا: تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادرِ مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھو گے، اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اُس نے کفر بکا ہے، اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی، دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے تمہاری کیا رائے ہے، اُنھوں نے جواب میں کہا: وہ قتل کے لائق ہے، اس پر اُنھوں نے اُس کے مُنہ پر تھوکا اور اُس کے مُکّے مارے، اور بعض نے طمانچے مار کے کہا "اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا ...... جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اُسے مار ڈالیں اور اُسے باندھ کر

لے گئے اور پیلاطیس حاکم کے حوالہ کیا .... اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں (بنی اسرائیل) کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا، اُس وقت برابا نام اُن کا ایک مشہور قیدی تھا پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطیس نے اُن سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں؟ برابا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟ .... وہ بولے برابا کو پیلاطیس نے اُن سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں؟ سب نے کہا اُس کو صلیب دیجائے اُس نے کہا کیوں؟ اُس نے کیا بُرائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دیجائے، جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا اُلٹا بلوہ ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا "میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں تم جانو" سب لوگوں نے جواب دے کر کہا "کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر" اس پر اس نے برابا کو اُن کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لیجا کر ساری پلٹن اُس کے گرد جمع کی اور اُس کے کپڑے اُتار کر اُسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اُس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اُس کے دہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک، اُسے ٹھٹھوں میں اُڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ۔ آداب۔ اور اُس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اُس کے سر پر مارنے لگے اور جب اُس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغے کو اُس پر سے اُتار کر پھر اُس کے کپڑے اُسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے، اُس وقت اُس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے ایک دہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اُس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا، اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اُتر آ اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کے ٹھٹھے کے ساتھ کہتے تھے اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں نہیں بچا سکتا .... اور دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا "ایلی ایلی

لما سبقتنی" (اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا) جو وہاں کھڑے تھے ان میں سے بعض نے سن کر کہا یہ ایلیا کو پکارتا ہے .... یسوع پھر بڑی آواز سے چلایا اور جان دیدی[1]

تفصیلات میں کم وبیش فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی مذکور ہے، چاروں انجیلوں کی یہ متفقہ مگر مفروضہ داستان کو مطالعہ کرنے کے بعد طبیعت پر قدرتی اثر یہ پڑتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی موت انتہائی بیکسی اور بے بسی کی حالت میں دردناک طریقے سے ہوئی اور اگرچہ خدا کے پاک اور مقدس بندوں کے لیے یہ کوئی اچنبھی بات نہ تھی بلکہ مقربین بارگاہِ صمدی کے لیے اس قسم کی کڑی آزمائشوں کا مظاہرہ اکثر ہوتا رہا ہے لیکن اس واقعہ کا یہ پہلو اس کے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے پر روزِ روشن کی طرح شاہد ہے کہ حضرت یسوع نے ایک اولو العزم پیغمبر بلکہ مرد صالح کی طرح اس واقعہ کو صبر ورضاءِ الٰہی کے ساتھ انگیز نہیں کیا بلکہ ایک انتہائی مایوس انسان کی طرح خدا سے شکوہ کرتے کرتے جان دیدی "ایلی، ایلی لما سبقتنی" کہتے ہوئے جان دے دینا مایوسی اور شکوہ کی وہ صورت حال ہے جو کسی طرح بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کے شایانِ شان نہیں کہی جا سکتی، پھر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت زا نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ درخواست کی "اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ (موت کا) پیالہ مجھ سے ٹل جائے" اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہ ہوئی تو مایوس ہو کر یہ کہنا پڑا "اگر یہ میرے پیے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو" باعث حیرت یہ بات ہے کہ جبکہ عقیدۂ "کفارہ" کے مطابق حضرت مسیح کا یہ معاملہ خدا اور اُس کے بیٹے (العیاذ باللہ) کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا معنی، اور اگر لوازم بشریت کی بنا پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اُس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے صبر اور مایوس

---

[1] باب ۲۷ آیات ۴۵ تا ۵۰۔

انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟

یہود کی گڑھی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کرلیا تو یہود ازرہِ فخر و غرور اس پر بیحد مسرور ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیح ناصری اگر "مسیح موعود" ہوتا تو خدائے تعالیٰ اس بے بسی اور بےکسی کے ساتھ اُس کو ہمارے ہاتھ میں نہ دے دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا کہ اُس کو بچائے مگر خدا نے اُس کی کوئی مدد نہ کی حالانکہ ہمارے باپ دادا اُس وقت بھی کافی اشتعال دیتے رہے کہ اگر تو حقیقۃً خدا کا بیٹا اور مسیحِ موعود ہے تو کیوں تجھ کو خدا نے ہمارے ہاتھوں اس ذلت سے نہ بچالیا۔

واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس جبکہ اس چبھتے ہوئے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا اور واقعہ کی ان تفصیلات کو مان لینے کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی تھی تب اُنھوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد ایک پارۂ بیان کا اور اضافہ کیا یوحنا کی انجیل میں ہے:-

"لیکن جب اُنھوں نے یسوع کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مرچکا ہے تو اُس کی ٹانگیں نہ توڑیں مگر اُن میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اُس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اُس سے خون اور پانی بہ نکلا .....

ان باتوں کے بعد ارمتیہ کے رہنے والے یوسف نے جو یسوع کا شاگرد تھا، یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر پیلاطس سے اجازت چاہی کہ یسوع کی لاش لیجائے، پیلاطس نے اجازت دیدی پس وہ آکر اُس کی لاش لے گیا اور نیکدیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مُر اور عود ملا ہوا لایا، پس اُنھوں نے یسوع کی لاش لے کر اسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس جگہ اُسے مصلیب دی گئی وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا پس اُنھوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع کو وہیں رکھ دیا۔

ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا

پس وہ شمعون پطرس اور اُس کے دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوعؑ عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور اُن سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اُسے کہاں رکھ دیا.....

لیکن مریم باہر قبر کے پاس کھڑی روتی رہی اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کے اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سفید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سرہانے اور دوسرے کو پائنتی بیٹھے دیکھا جہاں یسوعؑ کی لاش پڑی تھی اُنہوں نے اُس سے کہا۔ اے عورت، تو کیوں روتی ہے؟ اُس نے اُن سے کہا اس لیے کہ میرے خداوند کو اُٹھا لے گئے اور معلوم نہیں کہ اُسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے پھری اور یسوعؑ کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچانا کہ یہ یسوعؑ ہے۔

یسوعؑ نے اُس سے کہا مریم! وہ پھر کر اُس سے عبرانی زبان میں بولی "ربونی" یعنی اے اُستاد! یسوعؑ نے اُس سے کہا مجھے نہ چھو کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر اُن سے کہو کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں، مریم مگدلینی نے آکر شاگردوں کو خبر دی کہ میں نے خداوند کو دیکھا اور اُس نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔

پھر اُسی دن جو ہفتہ کا پہلا دن تھا شام کے وقت جب وہاں کے دروازے جہاں شاگرد تھے یہودیوں کے ڈر سے بند تھے یسوعؑ آکر بیچ میں کھڑا ہوا اور اُن سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو اور یہ کہہ کر اُس نے اپنے ہاتھ اور پسلی اُنہیں دکھائی پس شاگرد خداوند کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ یسوعؑ نے پھر اُن سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے اُسی طرح میں بھی تمہیں بھیجتا ہوں اور یہ کہہ کر اُن کو پھونکا اور اُن سے کہا "روح القدس" لو[۱]۔

ہر ایک شخص معمولی غور و فکر کے بعد بسہولت سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارۂ بیان پہلے حصۂ بیان کے ساتھ غیر مربوط اور قطعاً بے جوڑ ہے بلکہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں، کیونکہ پہلا پارۂ بیان ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو بے بس، بیکس

---

[۱] انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۴-۳۳-۳۲ و آیت ۴۲-۳۸ و باب ۲۰ آیات ۱ تا ۲۲۔

مایوس اور خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصّہ بیان ایسی ہستی کا رُخ روشن پیش کرتی ہے جو خدائی صفات سے متصف، ذاتِ باری کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن و مسرور ہے بلکہ اُن کے وقوع کی متمنی اور اُن کو اپنے ادا فرض کا اہم جزو سمجھتی ہے۔

ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

بہرحال حقیقت چونکہ دوسری تھی اور ایک عرصۂ دراز کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی بدعت نے نصاریٰ کو اُس کے خلاف اس گڑھے ہوئے افسانہ کی تصنیف پر مجبور کر دیا اس لیے قرآنِ عزیز نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقت حال کے رُخ روشن کو جلوہ آرا کرنا ضروری سمجھا اور اُس نے اپنا وہ فرض انجام دیا جس کو مذاہب عالم کی تاریخ میں "قرآن کی دعوت تجدید و اصلاح" کہا جاتا ہے۔

اُس نے بتایا کہ جس زمانہ میں بنی اسرائیل پیغمبرِ حق اور رسولِ خدا (عیسیٰ بن مریم) کے خلاف خفیہ تدبیروں اور سازشوں میں مصروف اور اُن پر نازاں تھے اُسی زمانہ میں خدائے برتر کے قانونِ قضاء و قدر نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا کہ کوئی طاقت اور مخالف قوت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) پر قابو نہیں پا سکتی اور ہماری محکم تدبیر اُس کو دشمنوں کے "مکر" سے محفوظ رکھیگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب بنی اسرائیل نے اُن پر نرغہ کیا تو اُن کو پیغمبرِ خدا پر کسی طرح دسترس حاصل نہ ہو سکی اور اُن کو بحفاظت تمام اُٹھا لیا گیا اور جب بنی اسرائیل مکان میں گھسے تو صورتِ حال اُن پر مشتبہ ہو گئی اور وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور اس طرح خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا جو عیسیٰ بن مریم کی حفاظت کے لیے کیا گیا تھا،

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ محسوس فرمایا کہ اب بنی اسرائیل کے کفر و انکار کی سرگرمیاں اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ وہ میری توہین و تذلیل بلکہ قتل کے لیے سرگرم سازش ہیں تو اُنھوں نے خاص طور سے ایک مکان میں اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان

کے سامنے صورتِ حال کا نقشہ پیش فرما کر ارشاد فرمایا: امتحان کی گھڑی سر پر ہے، کڑی آزمائش کا وقت ہے، حق کو مٹانے کی سازشیں پورے شباب پر ہیں، اب میں تمہارے درمیان زیادہ نہیں رہونگا اس لیے میرے بعد دینِ حق پر استقامت، اُس کی نشر و اشاعت، اور یاری و نصرت کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ وابستہ ہو جانے والا ہے، اس لیے مجھے بتلاؤ کہ خدا کی راہ میں میرا مددگار کون کون ہے؟ حواریوں نے یہ کلامِ حق سُن کر کہا "ہم سب ہی خدا کے دین کے مددگار ہیں، ہم سچے دل سے خدا پر ایمان لائے ہیں اور اپنی صداقت ایمانی کا آپ ہی کو گواہ بناتے ہیں۔ اور یہ کہنے کے بعد انسانی کمزوریوں کے پیش نظر اپنے دعویٰ پر ہی بات ختم نہیں کر دی بلکہ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو گئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تو اس پر ہم کو استقامت عطا فرما اور ہم کو اپنے دین کے مددگاروں کی فہرست میں لکھ لے .... اس جانب سے مطمئن ہو کر اب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اپنے فریضۂ دعوۃ و ارشاد کے ساتھ ساتھ منتظر رہے کہ دیکھیے معاندین کی سرگرمیاں کیا رُخ اختیار کرتی ہیں اور خدائے برحق کا فیصلہ کیا صادر ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں قرآنِ عزیز کے ذریعہ یہود و نصاریٰ کے ظنون و اوہامِ فاسدہ کے خلاف "علم و یقین کی روشنی" بخشتے ہوئے یہ بھی بتلایا کہ جس وقت معاندین اپنی خفیہ تدبیروں میں سرگرمِ عمل تھے اُسی وقت ہم نے بھی اپنی قدرتِ کاملہ کی مخفی تدبیر کے ذریعہ یہ فیصلہ کر لیا کہ عیسیٰ بن مریم کے متعلق معاندینِ حق کی تدبیر کا کوئی گوشہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جائیگا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی پوشیدہ تدابیر کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہیں جائیگی اس لیے کہ اُس کی تدبیر سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۔ (آلِ عمران)

اور اُنہوں نے (یہود نے) عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے (یہود کے مکر کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کا مالک ہے۔

لغتِ عرب میں "مکر" کے معنی "خفیہ تدبیر اور دھوکا کرنے کے" ہیں اور علمِ معانی کے قاعدۂ "مشاکلہ" کے مطابق جب کوئی شخص کسی کے جواب یا دفاع (Defence) میں خفیہ تدبیر کرتا ہے

تو خواہ وہ اخلاق اور مذہب کی نگاہ میں کتنی ہی عمدہ تدبیر کیوں نہ ہو اُس کو بھی "مکر" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ ہر ایک زبان کے محاورہ میں بولا جاتا ہے "بُرائی کا بدلہ بُرائی ہے" حالانکہ ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ بُرائی کرنے والے کے جواب میں اُسی قدر مقابلہ کا جواب دینا اخلاق اور مذہب دونوں کی نگاہ میں "بُرائی" نہیں ہے تاہم تعبیر میں دونوں کو ہم شکل ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اسی کو "مشاکلہ" کہتے ہیں اور یہ فصاحت و بلاغت کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔

غرض خفیہ تدبیر دونوں جانب سے تھی ایک جانب بُرے بندوں کی بُری تدبیر اور دوسری جانب خدائے برتر کی بہترین تدبیر، نیز ایک جانب قادرِ مطلق کی تدبیر کامل تھی جس میں نقص و خامی کا امکان نہیں، اور دوسری جانب دھوکے اور فریب کی خام کاریاں تھیں جو نا...

آخر وہ وقت آ پہنچا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں، کاہنوں اور فقیہوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا، ذاتِ اقدس اور حواری مکان کے اندر بند ہیں اور دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کیے ہوئے ہیں لہٰذا اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کیا صورت ہوئی کہ جس سے دشمن ناکام رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کسی طرح کا بھی گزند نہ پہنچا سکے تاکہ خدائے قادر کا وعدۂ حفاظت اور دعویٰ تدبیرِ خیر پورا ہو تو اس کے متعلق قرآن نے بتلایا کہ بیشک خدا کا وعدہ پورا ہوا اور اُس کی تدبیرِ محکم نے عیسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رکھا اور صورت یہ پیش آئی کہ اس نازک گھڑی میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو وحی الٰہی نے یہ بشارت سُنائی "عیسیٰ! خوف نہ کر تیری مدت پوری کی جائیگی (یعنی تم کو دشمن قتل نہیں کر سکینگے۔ اور نہ تم اس وقت موت سے دوچار ہو گے) اور ہوگا یہ کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اُٹھا لونگا اور ان کافروں سے ہر طرح تجھ کو پاک رکھونگا (یعنی یہ تجھ پر کسی قسم کا قابو نہ پا سکینگے) اور تیرے پیروؤں کو ان کافروں پر ہمیشہ غالب رکھونگا (یعنی بنی اسرائیل کے مقابلہ میں قیامت تک عیسائی اور مسلمان غالب رہینگے، اور ان کو کبھی ان دونوں پر حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں

ہوگا پھر انجام کار میری جانب (موت کے بعد) لوٹ آنا ہی پس میں اُن باتوں پر فیصلہ حق دونگا جن کے متعلق تم سب آپس میں اختلاف کر رہے ہو۔

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسٰى إِنِّى مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ إِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (آل عمران)

(وہ وقت ذکر کے لائق ہی) جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ سے کہا اے عیسیٰ! بے شبہ میں تیری مدت کو پوری کرونگا اور تجھ کو اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو کافروں (بنی اسرائیل) سے پاک رکھنے والا ہوں اور جو تیری پیروی کرینگے اُن کو تیرے منکروں پر قیامت تک کے لیے غالب رکھنے والا ہوں، پھر میری جانب ہی لوٹنا ہی، پھر میں اُن باتوں کا فیصلہ کرونگا جن کے بارہ میں (آج) تم جھگڑ رہے ہو۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِىٓ إِسْرَآءِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ (مائدہ)

(قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے احسانات شمار کراتے ہوئے فرمائیگا) اور وہ وقت یاد کر جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ کو سے روک دیا (یعنی وہ کسی طرح تجھ پر قابو نہ پا سکے) جبکہ تو اُن کے پاس معجزات لے کر آیا اور اُن میں سے کافروں نے کہہ دیا: یہ تو جادو کے ماسوا اور کچھ نہیں ہی۔

تو اب جبکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ اطمینان دِلا دیا گیا کہ اس سخت محاصرہ کے باوجود دشمن نہ تم کو قتل کر سکینگے اور تم کو غیبی ہاتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھائیگا، اور اس طرح دشمنانِ دین کے ناپاک ہاتھوں سے آپ ہر طرح محفوظ کر دیے جائینگے تو اس جگہ پہنچ کر ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ کس طرح ہوا اور واقعہ نے کیا صورت اختیار کر لی؟ کیونکہ یہود و نصاریٰ تو کہتے ہیں کہ مسیح کو سولی پر بھی لٹکایا اور مار بھی ڈالا تب قرآن نے تبلایا کہ مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے قتل و صلیب کی پوری داستان سرتاسر غلط اور جھوٹ ہی بلکہ اصل معاملہ یہ ہی کہ جب مسیح علیہ

السلام کو بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور اس کے بعد دشمن مکان کے اندر گھس پڑے تو ان پر صورتِ حال مشتبہ کر دی گئی اور وہ کسی طرح نہ جان سکے کہ آخر اس بند مکان میں سے مسیح (علیہ السلام) کہاں چلا گیا۔

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى
ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ
وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ وَ
إِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي
شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ
إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ
يَقِينًا بَلْ رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ
وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝
(نساء ع)

اور (یہود ملعون قرار دیے گئے) اپنے اس قول پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم پیغمبرِ خدا کو قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ (خدا کی خفیہ تدبیر کی بدولت) اصل معاملہ ان پر مشتبہ ہو کر رہ گیا اور جو لوگ اس کے قتل کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں بلاشبہ وہ اس (عیسیٰ) کی جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس حقیقتِ حال کے بارہ میں ظن (اٹکل) کی پیروی کے سوا علم کی روشنی نہیں ہے اور انہوں نے عیسیٰ کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اٹھا لیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

قرآنِ عزیز کا یہ وہ بیان ہے جو یہود و نصاریٰ کے اختراعی فسانہ کے خلاف اس نے حضرت مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے متعلق دیا ہے اب دونوں بیانات آپ کے سامنے ہیں اور عدل و انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں، پہلے حضرت مسیح (علیہ السلام) کی شخصیت اور ان کے دعوت و ارشاد کے مشن کو تاریخی حقائق کی روشنی میں معلوم کیجیے اور اس کے بعد ایک مرتبہ پھر ان تفصیلی واقعات پر نظر ڈالیے جو ایک اولو العزم پیغمبر، مقرب بارگاہِ الٰہی اور نصاریٰ کے عقیدۂ باطل کے مطابق خدا کے بیٹے کو خدا کے فیصلہ کے سامنے مایوس، مضطرب، بے یار و مددگار اور خدا سے شاکی ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس تضادِ بیان پر بھی غور فرمائیے کہ ایک جانب عقیدۂ کفارہ کی بنیاد صرف اس پر قائم ہے کہ حضرت مسیح خدا کا بیٹا بن کر آیا

ہی اس غرض سے تھا کہ مصلوب ہو کر دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور دوسری جانب صلیب اور قتل مسیح کی داستان اس اساس پر گھڑی گئی ہے کہ جب وہ وقت موعود آپہنچا ہے تو خدا کا یہ فرضی بیٹا اپنی حقیقت اور دنیا میں وجود پذیری کو یکسر فراموش کر کے "ایلی۔ ایلی لما سبقتنی" کا حسرتناک جملہ زبان سے کہتا اور مرضی الٰہی پر اپنی ناخوشی کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا کسی شخص کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے کہ اگر نصاریٰ کے بیان کردہ واقعات کے دونوں حصے صحیح اور درست ہیں تو ان دونوں کے باہم یہ تضاد کیسا اور اس عدم مطابقت کے کیا معنی؟

پس اگر ایک حقیقت بیں اور دور رس نگاہ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور واقعات و حالات کی ان تمام کڑیوں کو باہم جوڑ کر اس مسئلہ کا مطالعہ کرے تو وہ تصدیق حق کے پیش نظر بلا تامل یہ فیصلہ کریگی کہ بائبل کی یہ داستان تضاد کی حامل اور گھڑی ہوئی داستان ہے اور قرآن نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ دیا ہے وہی حق اور مبنی بر صداقت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد سے سینٹ پال سے قبل تک نصاریٰ یہود کی اس خرافی داستان سے قطعاً بے تعلق تھے لیکن جب سینٹ پال (پولوس رسول) نے تثلیث اور کفارہ پر جدید عیسائیت کی بنیاد رکھی تو کفارہ کے عقیدہ کی استواری کے لیے یہود کی اس خرافی داستان کو بھی مذہب کا جزء بنا لیا گیا۔

لیکن واقعہ سے متعلق حد درجہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جبکہ چودہ صدیوں سے قرآن حکیم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کی عظمت و جلالت قدر کا اعلان کرتے ہوئے اُن کے "رفع الی السماء" کی حقیقت کو یہود و نصاریٰ کی خرافی داستان کے خلاف علم و یقین کی روشنی میں نمایاں اور یہود و نصاریٰ کو دلائل و براہین کے ذریعہ لاجواب اور سرنگوں کر دیا تھا تو اُس کے مقابلہ میں آج ایک مدعیِ اسلام، دعوائے نبوت و مسیحیت کے شوق یا ہندوستان پر مسلط عیسائی حکومت کی خود غرضانہ خوشامد میں یہود و نصاریٰ کے اُسی عقیدہ کو دوبارہ زندہ کرنا اور اُس پر اپنے "باطل عقیدۂ نبوت" کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اور پنجاب (قادیان) کا یہ متنبی قرآنِ عزیز کی تصریحات

سے بے نیاز ہو کر نہایت جسارت کے ساتھ اُن تمام واقعات کی تصدیق کرتا ہے جو اس سلسلہ میں یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے باطل مزعومہ عقائد کی تکمیل کے لیے اختراع کیے ہیں، وہ کہتا ہے کہ بلا شبہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہود نے اسیر کیا، اُن کا ٹھٹھا اُڑایا، اُن کے مُنہ پر تھوکا اُن کے طمانچے بھی لگائے، اُن کو کانٹوں کا تاج بھی پہنایا، اور ان کے علاوہ ہر قسم کی توہین و تذلیل کا سلوک کرنے کے بعد اُن کو صلیب پر بھی چڑھایا اور اپنے زعم میں اُن کو قتل بھی کر ڈالا البتہ یہود و نصاریٰ کی حرف بحرف تصدیق کے بعد بغیر کسی قرآنی نص، حدیثی روایت اور تاریخی شہادت کے اپنی جانب سے یہ اضافہ کرتا ہے کہ جب شاگردوں کے مطالبہ پر نعش اُن کے حوالہ کر دی گئی اور وہ تجہیز و تکفین کے لیے آمادہ ہوئے تو دیکھا کہ جسم میں جان باقی ہے تب انہوں نے خفیہ طور پر ایک خاص مرہم کے ذریعہ اُن کے زخموں کا علاج کیا اور جب وہ چنگے ہو گئے تو پوشیدہ رہ کر کشمیر کو چلے گئے اور وہاں بھی حیات کے آخری لمحوں تک خود کو چھپائے رکھا اور گمنامی ہی میں وہیں انتقال پا گئے گویا یوں کہیے کہ یہود و نصاریٰ کی مفروضہ داستان میں حضرت مسیح (علیہ السلام) سے متعلق توہین و تذلیل کے جس قدر بھی پہلو تھے وہ سب تو متنبی کاذب نے قبول کر لیے باقی اُن کی عظمتِ شان اور جلالتِ مرتبہ سے متعلق پہلو کو داستان سے خارج کر کے اُس کے ساتھ ایک ایسا فرضی حصّہ جوڑ دیا جس سے ایک جانب نیچر پرستوں کو اپنی جانب مائل کرنے کا سامان مہیا ہو سکے اور دوسری جانب عیسیٰ (علیہ السلام) کی باقی زندگیِ مبارک کو گمنامی کے ساتھ وابستہ کر کے توہین و تذلیل کا ایک گوشہ جو تشنہ سامان رہ گیا تھا اُس کی تکمیل ہو جائے (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن)

متنبی پنجاب کو یہ سب کچھ کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کی جانب ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے اور اس کی تفصیل کے لیے پروفیسر برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" لائق مطالعہ ہے یا خود متنبی کاذب کی تصنیفی ہفوات اس حقیقت کو عریاں کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر تو یہ مسئلہ ہے کہ متنبی پنجاب نے کس طرح قرآنِ حکیم کی نصوصِ قطعیہ کے خلاف

یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ "توہین، تصلیب اور قتل عیسیٰ علیہ السلام" کی تائید پر بے جا جسارت کا اقدام کیا اور جس حد تک اختلاف کیا اس میں بھی دعویٰ قرآنی کے خلاف اُن کی حیاتِ طیبہ کو نامراد و ناکام اور گمنام ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی۔

آپ ابھی سن چکے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدائے تعالیٰ کی نجات سے دعوئے حفاظت و برتری کو کس قوتِ بیان کے ساتھ نمایاں کیا ہے "ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین" "انی متوفیک ورافعک الیّ ومطھرک من الذین کفروا" اور پھر کس زور کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دعوئے حفاظت کو اس شان کے ساتھ پورا کیا کہ دشمن کسی حیثیت سے بھی مسیح بن مریم (علیہما السلام) پر قابو نہ پا سکے اور ہاتھ تک نہ لگا سکے "واذ کففت بنی اسراءیل عنک" "وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم وما قتلوہ یقینًا بل رفعہ اللہ الیہ"

تو اب قابلِ غور یہ بات ہے کہ ہم دنیا میں روز و شب یہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ اگر کسی صاحبِ قوت واقتدار ہستی کے عزیز، دوست، یا مصاحب کے خلاف اُن کا دشمن درپئے آزار یا قتل کے درپے ہوتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ہم صاحبِ اقتدار ہستی کی اعانت کے بغیر دشمن کے مقابلہ میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے وہ صاحبِ اقتدار کی جانب رجوع کرتے ہیں اور یہ ہستی اُن کو پوری طرح اطمینان دلاتی ہے کہ دشمن اُن کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ اُن تک اس کی دسترس ہی نہیں ہونے دیجائیگی تو ہر ایک اہلِ عقل اس کا یہی مطلب لیتا ہے کہ اب کسی بھی حالت میں اُن کو دشمن کا خطرہ باقی نہیں رہا مگر یہ کہ صاحبِ اقتدار ہستی یا اپنے وعدہ کا ایفا نہ کرے اور جھوٹا ثابت ہو اور یا دشمن کی طاقت اتنی زیادہ ہو کہ وہ خود بھی اس حمایت نصرت میں مغلوب و مقہور ہو کر رہ جائے۔

پس جب انسانی دنیا میں یہ اطلاع موصول ہو کہ صاحبِ اقتدار ہستی کے عزیز، دوست، یا مصاحب کو اُس کے دشمن نے گرفتار کر لیا، مارا پیٹا، منہ پر تھوکا اور ہر طرح ذلیل و رسوا کر کے اپنے

گمان میں مار بھی ڈالا اور مردہ سمجھ کر نعش اُس کے عزیزوں کے سپرد کردی مگر حسبِ اتفاق نبض دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کہیں جان اٹکی رہ گئی ہے لہٰذا علاج معالجہ کیا گیا اور وہ روبصحت ہو گیا تو دنیائے انسانی اس صاحبِ اقتدار ہستی کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی جس نے اس مظلوم کی حمایت و نصرت کا وعدہ کیا تھا؟ یہ کہ اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں کیا خواہ قصداً نہیں کیا یا اس لیے کہ وہ مجبور رہا۔

پس اگر دنیائے انسانی کے معاملات میں صورتِ حال یہ ہے تو معلوم نہیں کہ متنبی پنجاب کے عقل و دماغ نے قادرِ مطلق خدا کے متعلق کس ذہنیت کے ماتحت یہ فیصلہ کیا کہ خدا نے عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کو ہر قسم کی حفاظت و صیانت کے وعدہ کے باوجود دشمن کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہونے دیا جس کو یہود و نصاریٰ کی اندھی تقلید میں متنبی پنجاب نے تسلیم کر لیا اور اشک شوئی کے لیے صرف اس قدر اضافہ کر دیا کہ اگرچہ یہود نے صلیب و قتل کے بعد سمجھ لیا تھا کہ روح قفسِ عنصری سے نکل چکی ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ رمق جان ابھی غیر محسوس طور پر باقی تھی اس لیے اُسی طرح ان کی جان بچ گئی جس طرح موجودہ زمانہ میں اب سے چند سال قبل جیلوں میں پھانسی دینے کا جو طریقہ رائج تھا اُس کی وجہ سے کبھی پھانسی پانے کے بعد رمق جان باقی رہ جاتی تھی اور نعش کی سپردگی کے بعد علاج معالجہ سے وہ اچھا ہو جاتا تھا۔

بہرحال ہم تو اُس ذاتِ واحد، قادرِ مطلق خدا پر ایمان رکھتے ہیں جس نے جب کبھی بھی اپنے خاص بندوں (نبیوں اور رسولوں) سے اس قسم کا وعدۂ حفاظت و صیانت کیا ہے تو پھر اُس کو پورا بھی ایسی شان سے کیا ہے جو قادرِ مطلق ہستی کے لیے شایاں اور لائق ہے حضرت صالح (علیہ السلام) اور اُن کی قوم کے منکرینِ حق کا معاملہ سورۂ نمل میں جس معجزانہ شان کے ساتھ بیان ہوا ہے اُس پر غور فرمائیے۔ ارشادِ باری ہے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ　　اور شہر میں نو شخص تھے جو (بہت) مفسد تھے اور کوئی

يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ
قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ
وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا
مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝
وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا
وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ
وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ فَتِلْكَ
بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا إِنَّ
فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ
وَأَنْجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا
يَتَّقُونَ ۝ (نمل)

کام صلاح کاری کا نہیں کرتے تھے، انہوں نے آپس میں کہا: "باہم قسمیں کھاؤ کہ ہم ضرور صالح اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریںگے اور پھر اس کے وارثوں سے کہدینگے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت تو پر موجود ہی نہیں تھے اور قسم بخدا ہم ضرور سچے ہیں" اور انہوں نے (صالح کے خلاف) خفیہ سازش کی اور ہم نے (بھی اُن کی سازش کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور وہ ہماری مخفی تدبیر کو نہیں سمجھتے تھے پس (اے محمد) دیکھو! کہ اُن کی خفیہ سازشی تدبیر کا کیا حشر ہوا! یہ کہ ہم نے اُن کو (مفسدوں کو) اور اُن کی سرکش قوم کو سب کو ہلاک کر دیا (نگاہ اُٹھا کر) دیکھو یہ (قریب ہی) ہیں اُن کے گھروں کے کھنڈر ویران ہیں اُن کے ظلم کی وجہ سے، بیشک اس واقعہ میں نشانی ہے سمجھ والوں کے لیے اور ہم نے نجات دی ایمان والوں کو جو کہ پرہیزگار تھے

اور پھر مطالعہ کیجیے اس عظیم الشان واقعہ کا جو ہجرتِ خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تعلق رکھتا ہے اور سورۂ انفال میں دشمنانِ حق کی ذلت و رسوائی کا ابدی اعلان ہے۔

ان دونوں واقعات میں حق و باطل کے معرکوں، دشمنوں کی خفیہ سازشوں اور انبیاء علیہم السلام کی حفاظت کے لیے وعدۂ الٰہی اور اس کے بے غل و غش پورا ہونے کا جو نقشہ قرآنِ عزیز نے پیش کیا ہے، تاریخی نگاہ سے اُن پر غور فرمائیے اور فیصلہ کیجیے کہ جب خدا نے صالح (علیہ السلام) اور خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اپنے وعدۂ حفاظت

کو اس شانِ رفیع کے ساتھ پورا کیا ہو کیا متنبی پنجاب کے عقیدہ کے مطابق اسی شانِ معجزانہ کے ساتھ وہ عیسیٰ (علیہ السلام کے حق میں پورا ہوا؟ نہیں ہرگز نہیں" حالانکہ آیاتِ قرآنی شاہد ہیں کہ ان دونوں واقعات کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) سے کیے گئے وعدے زیادہ واضح تفصیلات رکھتے ہیں اور اُن میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ خدا کے بہترین مخفی فیصلہ کے مطابق حضرت مسیح (علیہ السلام کے دشمن اُن کو ہاتھ تک نہ لگا سکینگے تب ہی تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے جن احسانات و انعامات کو شمار کرائیگا اُن میں سے ایک بڑا انعام و احسان یہ بھی ہوگا "واذ کففتُ بنی اسرائیل عنك - اور جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا تھا" متنبی پنجاب کو اگر اپنی نبوت اور مسیحیت کے افترا اور ڈھونگ کو مضبوط کرنے کے لیے حضرت مسیح (علیہ السلام) کے زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے کے خلاف اس درجہ ناگواری تھی جیساکہ متنبی کاذب کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے، تب بھی ہوا و نفسانیت کی اس اندھی تقلید کے لیے مقابلہ میں جو نصوصِ قرآنی کے خلاف "کفر بواح" تک پہنچتی اور حضرت مسیح کی شان رفیع کے حق میں باعثِ توہین و تذلیل اور وعدہ الٰہی کی تکذیب کرتی ہے" کیا یہ کافی نہیں تھا کہ تاویلِ باطل[1] کے پردہ میں اتنا ہی کہہ دیا جاتا کہ وہ اگرچہ بقید حیات آسمان پر نہیں اُٹھائے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے بند مکان سے کسی طریق پر اُن کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر محفوظ کر دیا اور دشمن کسی طرح اُن کو نہ پا سکے، لیکن وائے بر حالِ متنبی قادیان کہ خدا کے سچے پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کے ساتھ بغض و عناد نے "خسر الدنیا والآخرہ" کا مصداق بنا کر ہی چھوڑا۔

---

[1] تاویلِ باطل اس لیے کہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دیگر نصوص قرآنی، حدیثی اور اجماع اُمت کے پیش نظر اس مقام پر یہ تاویل بلا شبہ "باطل ہے مگر اس سے کم از کم حضرت مسیح (علیہ السلام کی توہین اور وعدہ الٰہی کی تکذیب کا پہلو نہیں نکلتا۔

قادیانی تلبیس اور اس کا جواب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معرکۃ الآرا مسئلہ میں "جو ان کی عظمت اور جلالت کا زبردست نشان ہے" سورۂ آلِ عمران کی آیات کا باہمی ربط اور ترتیب ذکری خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے کہ متنبی کاذب نے اس میں بھی "تلبیس الحق بالباطل" کا ثبوت دے کر ناواقف کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآنِ عزیز سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کے دشمنوں کے نرغہ میں گھر جانے سے متعلق جس تسلی اور وعدہ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطری تشکیل و صورت یہ پیش آئی کہ جب دشمنانِ دین نے حضرت مسیح (علیہ السلام) کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا تو ایک اولوالعزم پیغمبر اور خدائے برحق کے درمیان تقرب کا جو رشتہ قائم ہے اس کے پیشِ نظر قدرتی طور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب کیا پیش آنے والا ہے، راہِ حق میں جاں سپاری یا قدرتِ الٰہی کا کوئی اور کرشمہ! اور اگر دشمنوں سے تحفظ کے لیے کوئی کرشمہ پیش آنے والا ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی کیونکہ بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا! اور اگر تحفظ ہوا بھی تو کیا کچھ مصائب و آلام اٹھانے کے بعد تحفظِ جان ہوگا یا دشمن کسی بھی صورت میں قابو نہ پاسکینگے؟ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے قلب میں فطری طور پر پیدا ہونے والے سوالات کا ترتیب وار اس طرح جواب دیا "عیسیٰ! میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں تیری مقررہ مدتِ حیات پوری کرونگا یعنی مطمئن رہو کہ تجھ کو دشمن قتل نہ کر پائینگے" (اِنِّی مُتَوَفِّیكَ)" اور صورت یہ ہوگی کہ اس وقت میں تجھ کو اپنی جانب یعنی ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لونگا" (وَرَافِعُكَ اِلَیَّ) "اور یہ بھی اس طرح نہیں کہ پہلے سب کچھ مصائب ہو گذرینگے اور پھر ہم تجھ کو آخر میں علاج معالجہ کرا کر اٹھائینگے نہیں بلکہ یوں ہوگا کہ تو دشمن کے ناپاک ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رہیگا اور کوئی دشمن تجھ کو ہاتھ تک نہ لگا سکیگا" (وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا) یہ تو تمہارے فطری سوالات کا جواب ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ ہم یہ کرینگے کہ جو تیرے پیرو ہیں (خواہ غلط کار ہوں جیسا

کہ نصاریٰ اور خواہ صحیح العقیدہ ہوں جیسا کہ مسلمان، اُن کو قیامت تک یہود پر غالب رکھینگے اور تاقیام قیامت کبھی ان کو حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، باقی رہا تمام معاملات کا فیصلہ سو اس کے لیے (قیامت کا) دن مقرر ہے اُس روز سب اختلافات ختم ہو جائینگے اور حق و باطل کا دوٹوک فیصلہ کر دیا جائیگا۔

زیرِ بحث آیات کی یہ تفسیر جس طرح سلف صالحین اور اجماعِ اُمت کے مطابق ہے اُسی طرح اس میں آیات میں کیے گئے متعدد وعدوں کی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر مرزائے قادیانی نے اپنی "مسندِ مسیحیت و نبوت" کو قائم کرنے کے لیئے قرآن، احادیث صحیحہ، اور اجماعِ اُمت کے خلاف جبکہ یہ دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی موت ہو چکی تو اس سلسلہ کی آیات میں تحریفِ معنوی کی ناکام سعی کو بھی ضروری سمجھا اور دعویٰ کیا کہ اگر مسیح (علیہ السلام) کی موت کے وقوع کو رفع الی السماء اور تطہیر اور تفوق المطیعین علی الکافرین سے قبل تسلیم نہ کیا جائیگا تو ترتیب ذکری میں فرق آجائیگا اور مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم ماننا پڑیگا اور یہ قرآنِ عزیز کی شانِ بلاغت کے خلاف ہے لہذا یہ ماننا چاہیے کہ "انی متوفیك" کے وعدہ کا وقوع ہو چکا اور عیسیٰ (علیہ السلام) پر موت آچکی۔

مرزائے قادیانی کی "یہ تلبیس" اگرچہ اُن حضرات سے تو پوشیدہ نہیں رہ سکتی جو عربیت اور قرآن کے اسلوب بیان کا ذوق رکھتے ہیں، لیکن عوام کو مغالطہ میں ڈال سکتی ہے اس لیے اس عنوان کے شروع ہی میں آیات کی تفسیر کو اس طرح بیان کر دیا گیا کہ مرزا کی جانب سے جو تلبیس کی گئی ہے وہ خود بخود زائل ہو جائے تاہم مزید تشریح کے لیے یہ اور اضافہ ہے کہ ترتیب ذکری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اگر چند باتیں ترتیب وار ذکر کی گئی ہیں تو اُن کا وقوع بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ اُس کلام میں ذکر کردہ ترتیب بگڑنے نہ پائے اور مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کرنا نہ پڑے اور یہ جب ضروری ہے کہ کلام کی فصاحت و

بلاغت کا تقاضہ ہی یہ ہو کہ ترتیب ذکری میں فرق نہ آنے پائے ورنہ تو بعض مقامات پر تقدیم وتاخیر تو بھی فصاحت کی جان سمجھا جاتا ہو اور یہ علم معانی کا مشہور مسئلہ ہو۔

پس قرآن کی ان آیات میں جمہور اہل اسلام کی تعبیر کے مطابق ترتیب ذکری بحالہ قائم ہو اس لیے کہ خدا کی جانب سے پہلا وعدہ یہ ہو کہ میں تمہاری مقررہ مدت پوری کرونگا "اِنّی مُتوفیک" یعنی تمہاری موت ان دشمنوں کے ہاتھ سے نہیں ہوگی بلکہ تم اپنی طبعی موت سے مروگے۔ مگر اس پہلے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے متعدد صورتیں ہوسکتی تھیں یہ کہ دشمنوں پر باہر سے اچانک حملہ ہوجائے اور وہ فرار ہوجائیں یا سب وہیں کھیت رہیں اور حضرت مسیح (علیہ السلام) اُن کی زد سے بچ جائیں، یا یہ کہ قوم عاد وثمود کی طرح زمین یا آسمان سے قدرتی عذاب آکر ان سب کو ہلاک کردے، یا یہ کہ حضرت مسیح کسی ترکیب سے اُن کے زغہ میں سے محفوظاً نکل جائیں اور ان کی دسترس سے باہر ہوجائیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرشمۂ قدرت سے عیسیٰ (علیہ السلام) کو مکان بند رہتے ہوئے ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھالے وغیرہ وغیرہ تو قرآن نے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خبر دی کہ پہلے وعدہ کا ایفاء مسطورۂ بالا آخری شکل یعنی "ورافعك الیّ" کی شکل میں ہوگا اور ہوگا بھی ایسی قدرتِ کاملہ کے ہاتھوں کہ اس محاصرہ کے باوجود دشمن اپنے ناپاک ہاتھ تجھ کو نہیں لگا سکینگے اور میں ان کافروں کے ہاتھ سے تجھ کو پاک رکھونگا "ومطھرك من الذین کفروا" اور ان باتوں کے علاوہ یہ بھی ہوگا کہ میں تیرے پیروؤں کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھونگا۔

بہرحال بعد کے یہ تینوں وعدے بالترتیب جب ہی عمل میں آئینگے کہ پہلے وعدہ اول کا وقوع پذیر ہوجائے یعنی تیری موت ان کے ہاتھوں نہ ہو بلکہ اپنی مقررہ مدت پر پہنچ کر طبعی موت آئے۔ ان آیات میں پہلے وعدہ کے تعلق یہ نہیں کہا گیا کہ میں اوّل تجھ کو مارونگا اور پھر بالترتیب یہ سب امور انجام دونگا کیونکہ یہ قول صرف جاہل ہی کہہ سکتا ہو لیکن جس کو گفتگو کا معمولی بھی سلیقہ ہو وہ ہرگز ایسا کہنے کی جرأت نہیں کریگا کیونکہ ترتیب ذکری کے لیے یہ تو ہونا چاہیے

کہ ان امور کے وقوع میں ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ترتیب میں فرق لاکر تقدیم و تاخیر کا عمل جراحی کرنا پڑے لیکن اگر کوئی شے زمانہ کا امتداد اور طوالت چاہتی ہے اور اُس کے آخری حصہ کا وقوع اُن تمام امور کے بعد پیش آتا ہے جو اُس کے بعد مذکور رہتے مگر ترتیب ذکری میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا تو ایسی شکل میں اُس وقوع کے متاخر ہو جانے سے کسی عالم کے نزدیک بھی کلام کی فصاحت و بلاغت میں نقص واقع نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کے وقوعِ ترتیبی کا ترتیب ذکری کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے۔

پس مسئلہ زیرِ بحث میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طبعی موت کا وقوع کبھی بھی ہو اُس کا ترتیبِ ذکری سے مطلق کوئی علاقہ نہیں ہے، یہاں تو "اِنّی متوفیك" کہہ کر یہ بتلایا گیا ہے کہ دیے گئے متعدد وعدوں میں پہل اور اولیت اس وعدہ کو حاصل ہے کہ تمہاری موت کا سبب یہ یہود بنی اسرائیل نہیں ہونگے بلکہ جب بھی یہ مقررہ مدت پوری ہوگی اُس طریق پر ہوگی جو عام طور سے میری جانب منسوب کی جاتی ہے (یعنی طبعی موت) اور یہ وعدہ بہرحال باقی تین وعدوں سے پہلے ہی رہا تب ہی تو یہ تینوں وعدے وقوع میں آسکے اور اگر کہیں دشمن حضرت مسیح (علیہ السلام) کی موت کا سبب بن گئے ہوتے تو پھر "رفع" اور "تطہیر" کے لیے کوئی صورت ہی نہ رہ جاتی اور مرزا قادیانی کی طرح باطل اور رکیک تاویلات کی آڑ لینی پڑتی اور آیات زیرِ بحث کی "روح" فنا ہو کر رہجاتی۔ اور یہ اس لیے کہ اگر "رفع" سے رفع روحانی اور "تطہیر" سے روحانی پاکی مُراد لیے جائیں تو یہ قطعًا بے محل اور بے موقع ہوگا کیونکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق یہ وعدے حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کو دیے جا رہے ہیں تو حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کو یہ تبلانا کہ تمہارے متعلق یہود کا یہ اعتقاد "کہ تم کاذب اور ملعون ہو" غلط ہے اور تم مطمئن رہو کہ میں تمہارا رفع روحانی کرنے والا ہوں قطعًا عبث تھا کیونکہ حضرت عیسٰی (علیہ السلام) پیغمبر خدا ہیں اور جانتے ہیں کہ یہود کا افتراء کیا حقیقت رکھتا ہے نیز یہود کو حضرت مسیح کے رفعِ روحانی کا پتہ نہیں ہو سکتا

کیونکہ یہ معاملہ عالم غیب سے متعلق ہے تو خدائے برتر کا یہ ارشاد نہ حضرت مسیح کی برمحل تسلی کا باعث
ہو سکتا تھا اور نہ یہود کے لیے سود مند اور یہی حال دوسرے وعدہ تطہیر کا ہے بلکہ جب
بقول کادیانی یہود کے ہاتھوں حضرت مسیح صلیب پر چڑھا دیے گئے تو نعش پالینے کے بعد
شاگردوں کا مرہم عیسیٰ لگا کر چنگا کر لینے اور پھر منجانب اللہ جن کی ہدایت وارشاد کے لیے
مامور کیے گئے تھے اُن سے جان بچا کر بھاگ جانے اور زندگی بھر گمنامی میں زندگی بسر کرتے
رہنے کے بعد "رافعك الیّ" اور "مطهرك من الذين كفروا" کہدینے سے نہ یہود کے عقیدہ
متعلق مسیح (علیہ السلام) کی ہی تردید ہوگی اور نہ ایک غیر جانبدار انسان ہی یہ سمجھ سکیگا کہ
ایسے موقعہ پر جبکہ عیسیٰ (علیہ السلام) دشمنوں کے نرغے میں ہیں اور جبکہ اُن کو یقین ہے کہ میں
خدا کا پیغمبر ہوں اور موت کے بعد، رفع روحانی اور تطہیر لازم شئے ہے" ان تسلیوں اور وعدوں کا
کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ اُن کے ساتھ دشمن نے وہ سب کچھ کر لیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

البتہ جمہور اہلِ حق کی تفسیر کے مطابق آیاتِ قرآن کی رُوح اپنی معجزانہ بلاغت کے
ساتھ پوری طرح ناطق ہے کہ یہ وعدے حضرت مسیح سے جس طرح کیے گئے وہ برمحل اور فطری
اضطراب کے لیے بلاشبہ باعثِ تسکین ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کا وقت
کے یہود و نصاریٰ کے وراثتی عقائد باطلہ کی تردید کے لیے کافی اور مدلل۔

جمہور اہلِ حق کی یہ تفسیر "توفی" کے معنی "مقررہ مدت پوری کرنا" اختیار کرکے کی گئی ہے
جس کا حاصل (توفی بمعنی موت) نکلتا ہے لیکن توفی کے یہ حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ بطور کنایہ
کے مستعمل ہوئے ہیں کیونکہ لغتِ عرب میں اس کا مادہ (میٹر) وفی، یفی، وفاءً ہے
جس کے معنی "پورا کرنے" کے آتے ہیں اور اس کو جب باب تفعل میں لیجا کر "توفی" بناتے
ہیں تو اس کے معنی "کسی شئے کو پورا پورا لے لینا" یا "کسی شئے کو سالم قبضہ میں کر لینا" آتے ہیں
(توفی۔ اخذہ وافیاً تاماً یقال "توفیت من فلان مالی علیہ") اور چونکہ موت میں بھی۔ اسلامی
عقیدہ کے مطابق۔ رُوح کو پورا لے لیا جاتا ہے اس لیے کنایہ کے طور پر کہ جس میں حقیقی معنی

بحالہ محفوظ رہا کرتے ہیں" توفی بمعنی موت مستعمل ہوتا ہے اور کہتے ہیں "توفاہ اللہ ای اماتہ"
لیکن اگر کسی موقعہ پر دوسرے دلائل ایسے موجود ہوں جن کے پیش نظر توفی کے حقیقی معنی
لیے جا سکتے ہوں یا حقیقی کے ماسوا دوسرے معنی بن ہی نہ سکتے ہوں تو اُس مقام پر خواہ فاعل
"اللہ تعالیٰ" اور مفعول" ذی روح انسان" ہی کیوں نہ ہو وہاں حقیقی معنی" پورا لے لینا" ہی
مراد ہونگے۔ مثلاً آیت" اللہ یتوفی الانفس حین موتہا والتی لم تمت فی منامہا[۱]" اللہ پورا
لے لیتا ہے جانوں کو اُن کی موت کے وقت اور اُن جانوں کو جن کو ابھی موت نہیں آئی
ہی پورا لے لیتا ہے نیند میں" میں "والتی لم تمت" کے لیے بھی لفظ "توفی" بولا گیا یعنی ایک جانب
یہ صراحت کی جا رہی ہے کہ یہ وہ جانیں (نفوس) ہیں جن کو موت نہیں آئی اور دوسری جانب
یہ بھی بصراحت کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیند کی حالت میں اُن کے ساتھ "توفی" کا معاملہ کرتا
ہے، تو یہاں اللہ تعالیٰ فاعل ہے" متوفی" اور نفس انسانی مفعول ہے" متوفی" مگر پھر بھی کسی صورت
سے "توفی بمعنی موت" صحیح نہیں ہیں ورنہ تو قرآن کا جملہ" والتی لم تمت" العیاذ باللہ مہمل ہو کر
رہ جائیگا۔ یا مثلاً "وھو الذی یتوفکم باللیل ویعلم ما جرحتم بالنہار۔ اور وہی اللہ
ہے جو پورا لے لیتا یا قبضہ میں کر لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو تم کماتے ہو دن میں[۲]" میں
بھی کسی طرح توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے حالانکہ توفی کا فاعل اللہ اور مفعول انسانی نفوس
ہیں، یا مثلاً آیت "حتی اذا جاء احدکم الموت توفتہ رسلنا[۳]۔ یہاں تک کہ جب آتی
ہے تم میں سے ایک کسی کو موت قبض کر لیتے ہیں یا پورا لے لیتے ہیں اُس کو ہمارے بھیجے ہوئے
(فرشتے)" میں ذکر موت ہی کا ہو رہا ہے لیکن پھر بھی "توفتہ" میں توفی کے معنی موت کے نہیں
بن سکتے ورنہ بے فائدہ تکرار لازم آئیگا یعنی "احدکم الموت" میں جب لفظ "موت" کا
ذکر آ چکا تو اب "توفتہ" میں بھی اگر توفی کے معنی موت ہی کے لیے جائیں تو ترجمہ یہ ہوگا،
"یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، موت لے آتے ہیں ہمارے بھیجے

---

[۱] زمر [۲] انعام [۳] انعام۔

ہوئے (فرشتے) اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوبارہ لفظ موت کا ذکر بے فائدہ ہے اور کلام فصیح و بلیغ اور معجز تو کیا روزمرہ کے محاورہ اور عام بول چال کے لحاظ سے بھی پست اور لاطائل ہو جاتا۔ البتہ اگر "توفی" کے حقیقی معنی "کسی شے پر قبضہ کرنا یا اس کو پورا لے لینا" مراد لیے جائیں تو قرآن عزیز کا مقصد ٹھیک ٹھیک ادا ہوگا اور کلام بھی اپنے حدِ اعجاز پر قائم رہیگا۔

اب ہر ایک عاقل غور کر سکتا ہے کہ یہ دعویٰ کرنا کہ "توفی" کے حقیقی معنی موت کے ہیں خصوصاً جبکہ فاعل خدا ہو اور مفعول ذی روح کہاں تک صحیح اور درست ہے۔

بہرحال اس موقعہ پر "موت" اور "توفی" دونوں کا ساتھ ساتھ بیان ہونا، اور دونوں کا ایک ہی معمول ہونا اور پھر دونوں کے معنی میں فرق و تفاوت اس بات کے لیے واضح دلیل ہے کہ یہ دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں اور جس طرح لیث و اسد (بمعنی شیر) ابل و جمل (بمعنی اونٹ) نون و حوت (بمعنی مچھلی) وغیرہ اسماء کا اور جمعٌ، شملٌ، کسبٌ (بمعنی جمع ہونا) اور لبث، مکثٌ (بمعنی ٹھہرنا) اور عطشٌ، ظمأ (پیاس) اور جوعٌ، سغبٌ (بمعنی بھوک) مصادر کا حال ہے، موت اور توفی کے درمیان وہ معاملہ نہیں ہے بلکہ اُن کے حقیقی معانی میں نمایاں فرق ہے۔

اور مثلاً آیۃ "فامسکوھن فی البیوت حتّٰی یتوفّٰھن الموت" پس روکے رکھو اُن (عورتوں) کو گھروں میں یہاں تک کہ لے لے اُن کو موت" میں موت کو فعلِ توفی کا فاعل قرار دیا گیا ہے۔ اور ہر ایک زبان کی نحو (گرامر) کا یہ مسلّمہ مسئلہ ہے کہ فاعل اور فعل ایک نہیں ہوتے، کیونکہ فعل، فاعل سے صادر ہوتا ہے، عین ذاتِ فاعل نہیں ہوا کرتا تو اس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ توفی کے حقیقی معنی "موت" کے ہرگز نہیں ہیں، ورنہ اس کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا تھا۔

اِن تین مقامات کے علاوہ سورۂ بقر کی آیت

ثُمَّ توفّٰی کل نفسٍ بما کسبت — پھر پورا دیا جائیگا ہر ایک نفس کو جو کچھ اُس نے کمایا ہے

اور سورۂ نحل کی آیت

وتوفّٰی کل نفس ما عملت — اور پورا دیا جائیگا ہر نفس کو جو کچھ اُس نے کمایا ہے۔

میں بھی توفّی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول "نفس انسانی" ہے تاہم یہاں بھی توفّی بمعنی موت نہیں بن سکتے اور یہ بہت واضح اور صاف بات ہے۔

غرض ان آیات میں باوجود اس امر کے کہ "توفّی" کا فاعل اللہ تعالیٰ اور اُس کا مفعول "انسان یا نفس انسانی" ہے، پھر بھی باجماع اہل لغت وتفسیر "موت کے معنی" نہیں ہو سکتے خواہ اس لیے کہ دلیل اور قرینہ اس معنی کے خلاف ہے اور یا اس لیے کہ اُس مقام پر توفّی کے حقیقی معنی (پورا لے لینا یا قبض کر لینا) کے ماسوا "موت کے معنی" کسی طرح بن ہی نہیں سکتے۔

تو مرزا کے کادیانی کا یہ دعویٰ کہ "توفّی" اور "موت" مرادف الفاظ ہیں یا یہ کہ توفّی کا فاعل اگر اللہ تعالیٰ اور مفعول، انسان یا نفس انسانی ہو تو اُس جگہ صرف "موت" ہی کے معنی ہونگے۔ دونوں دعوے باطل اور نصوصِ قرآن کے قطعًا مخالف ہیں۔ فھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین"

توفّی اور موت یقینًا مرادف الفاظ نہیں ہیں اور توفّی کے حقیقی معنی "موت" نہیں بلکہ "پورا لے لینا یا قبض کر لینا" ہیں۔ قرآن عزیز سے اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی موت کا فاعل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا مگر اس کے برعکس توفّی کا فاعل متعدد مقامات پر ملائکہ (فرشتوں) کو ٹھہرایا ہے مثلًا سورۂ نساء میں ہے "ان الّذین توفّٰھم الملٰئکۃ۔ بیشک وہ لوگ جن کو فرشتوں نے قبض کر لیا یا پورا پورا لے لیا" اور سورہ انعام میں ہے "توفتہ رسلنا۔ قبض کر لیا یا پورا لے لیا اُس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتوں) نے۔ اور سورہ سجدہ میں ہے "قُل یتوفّٰکم ملک الموت" (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) کہدیجیے قبض کریگا تم کو موت کا فرشتہ" اور سورۂ انفال میں ہے۔

مولو تری اذ یتوفی الذین کفروا الملئکۃ۔ اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ قبض کرتے ہیں، فرشتے اُن لوگوں (کی روحوں) کو جنھوں نے کفر کیا ہے۔

اِن تمام مقامات پر اگرچہ توفیٰ "کنایۃً" بمعنی موت استعمال ہوا ہے لیکن پھر بھی چونکہ اُس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی بجائے ملائکہ اور ملک الموت کی جانب ہو رہی تھی اس لیے لفظ "توفی" کا اطلاق کیا گیا اور لفظ "موت" استعمال نہیں کیا گیا اور یہ صرف اس لیے کہ موت تو اللہ کا فعل ہے اور موت کے وقت انسان کا یعنی روحِ انسانی کا قبض کرنا اور اُس کو پورا پورا لے لینا یہ فرشتوں کا عمل ہے، تو جن مقامات میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ جب خدا کسی کی اجل پوری کر دیتا اور موت کا حکم صادر فرماتا ہے تو اس کی صورتِ عمل کیا پیش آتی ہے ان مقامات میں موت کا اطلاق ہرگز موزوں نہیں تھا بلکہ "توفی" کا لفظ ہی اُس حقیقت کو ادا کر سکتا تھا۔

موت اور توفی کے درمیان قرآنی اطلاقات کے پیشِ نظر ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ قرآنِ عزیز نے جگہ جگہ "موت" اور "حیات" کو تو مقابل ٹھہرایا ہے لیکن "توفی" کو کسی ایک مقام پر بھی "حیات" کا مقابل قرار نہیں دیا۔ مثلاً سورۂ ملک میں ہے "ھو الذی خلق الموت و الحیوٰۃ۔ خدا ہی وہ ذات ہے جس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو" اور سورۂ فرقان میں ہے "ولا یملکون موتا ولا حیوٰۃ۔ اور وہ نہیں مالک ہیں موت کے اور نہ حیات کے" اور اسی طرح ان دونوں کے مشتقات کو مقابل ٹھہرایا ہے مثلاً "کیف تحیی الموتٰی[1]" "یحیی الارض بعد موتھا[2]" "فاحیا بہ الارض بعد موتھا[3]" "واحی الموتی باذن اللہ[4]" و "ھو یحیی الموتٰی[5]" (وغیر ذلک کثیرا)۔ البتہ توفی کے حقیقی معنی میں چونکہ یہ وسعت موجود ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے موت کی جو حقیقت ہے بطریق کنایہ اُس پر بھی حسب موقعہ اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ تو یہ استعمال اور اطلاق بھی جائز ٹھہرا اور اس میں کسی کو بھی

---

[1] بقرہ [2] روم [3] بقرہ، نحل، جاثیہ [4] آل عمران [5] شوریٰ

اختلاف نہیں۔

"توفی" کے معنی کی اس مفصل تشریح و توضیح کا حاصل یہ ہوا کہ لغت عرب اور قرآنی اطلاقات دونوں اس کے شاہد ہیں کہ توفی اور موت دونوں کے حقیقی معنی میں بھی اور دونوں کے اطلاقات میں بھی واضح فرق ہے اور دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ خواہ توفی کا فاعل "اللہ تعالیٰ" اور مفعول "انسان اور روح انسانی" ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اسلامی نقطۂ نظر سے چونکہ موت ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس پر بطریق "توسع" اور "کنایہ" توفی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے، پس جس مقام پر قرینہ اور محلِ استعمال کا تقاضہ یہ ہو گا کہ وہاں توفی بول کر کنایۃً موت کے معنی لیے جانے چاہئیں تو اس جگہ "موت" کے معنی مراد ہونگے لیکن اس کے برعکس اگر دلیل، قرینہ اور محلِ استعمال حقیقی معنی کا متقاضی ہے تو اُس جگہ وہی معنی مراد ہونگے اور اُن ہی کو مقدم سمجھا جائیگا خواہ کنائی معنی وہاں قطعاً نہ بن سکتے ہوں اور خواہ بن سکتے ہوں مگر محلِ استعمال اور دوسرے دلائل اُس کو مرجوح یا ممنوع قرار دیتے ہوں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد لغت کے مشہور امام ابو البقاء نے یہ تصریح کی ہے کہ عوام میں توفی کے معنی اگرچہ "موت" کے سمجھے جاتے ہیں مگر خواص کے نزدیک اُس کے معنی "پورا لے لینا اور قبض کرنا" ہیں۔ فرماتے ہیں۔ التوفی الاماتۃ وقبض الروح و الحاصل، سورۂ مائدہ کی آیت "انی متوفیک" میں اگر حقیقی معنی مراد ہوں۔ جیسا کہ جلیل القدر علماء تفسیر و لغت نے اختیار کیے ہیں ۔۔۔ تب بھی مرزا کے کادیانی کے علی الرغم آیات زیر بحث کا یہ مطلب ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو تسلی دی گئی "اے عیسیٰ! میں تجھ کو پورا پورا لے لینے والا ہوں یا تجھ کو قبض کرنے والا ہوں اور صورت یہ ہو گی کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اُٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک رکھنے والا ہوں الخ" یعنی جب شروع میں یہ تبلایا کہ تجھ

عليه استعمال العامة او الاستيفاء واخذ الحق وعليه استعمال البلغاء۔

کو قبض کر لیا جائیگا یا پورا لے لیا جائیگا تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ قبض کرنے اور پورا لے لینے کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ایک یہ کہ موت آجائے اور روح کو قبض کر لیا جائے اور پورا لے لیا جائے اور دوسری یہ کہ زندہ ملاءِ اعلیٰ کی جانب (اپنی جانب) اٹھا لیا جائے۔ تو یہاں کونسی صورت پیش آئیگی پس اس کو صاف اور واضح کرنے کے لیے کہا گیا کہ دوسری شکل اختیار کی جائیگی تاکہ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلہ میں معجزانہ تدبیر کے ذریعہ وعدۂ الٰہی" ومکروا ومکراللہ واللہ خیر الماکرین" پورا ہو اور "واذ کففت بنی اسرائیل عنک" کا عظیم الشان مظاہرہ ہو جائے۔ اور "توفی" اور "رفع" ہو جانے پر نتیجہ یہ نکلے کہ ذاتِ اقدس کافروں کے ہاتھ سے ہر طرح محفوظ ہو جائے اور اس طرح وعدۂ ربانی "ومطھرک من الذین کفروا" بغیر کسی تاویل کے صحیح ہو جائے، اور تاویل باطل کے ذریعہ شک اور تردد یا حقیقتِ حال سے انکار صرف اُن ہی قلوب کا حصہ رہ جائے جو قرآن سے علم حاصل کرنے کی بجائے اوّل اپنے ذاتی اوہام وظنون کو راہنما بنانے اور پھر قرآن کے منطوق ومفہوم کے خلاف اُس کے مُنہ میں اپنی زبان رکھ دینا چاہتے ہیں اور اُس سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جو وہ خود کہنا نہیں چاہتا مگر وہ قرآن عزیز کی اس صفت سے غافل رہتے ہیں "لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔ اس قرآن کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے (کسی جانب سے بھی) باطل نہیں پھٹک سکتا، یہ اُتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والی، خوبیوں والی ہے"

متنبی پنجاب کو جب قرآن عزیز کی ان نصوص سے متعلق تحریف معنوی میں ناکامی ہوئی اور خسران کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو مجبور ہو کر اور قرآن عزیز کے اطلاقات، احادیث صحیحہ کی اطلاعات اور اجماعِ اُمت کے فیصلہ کو پس پشت ڈال کر "فلسفہ" کی آغوش میں پناہ لینے کا ارادہ کیا اور اپنی تصانیف میں یہ ہرزہ سرائی کی کہ اگر حضرت مسیح آسمان پر زندہ اُٹھا لیے گئے تو یہ عقل کے خلاف ہے اس لیے کہ کوئی مادی جسم ملاءِ اعلیٰ تک پرواز نہیں کر سکتا اور

کر بھی جاتا تو اتنی طویل مدت کیسے زندہ رہا اور وہاں کھانے، پینے اور رفع حاجت کرنے کی صورت کیسے عمل میں آسکتی ہے؟

قدرتِ الٰہی کے معجزانہ افعال کو خلافِ عقل کہہ کر بات اگر ختم ہو سکتی تو شاید کادیانی کی یہ فلسفیانہ موشگافی درخورِ اعتنا سمجھی جا سکتی لیکن آج فلسفہ جدید بہ شکل سائنس ترقی کر کے جس حد تک پہنچ چکا ہے وہاں نظریات (Thioris) نہیں بلکہ مشاہدات اور عملیات (Practices) اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ فضا کے موانعات کو اگر آہستہ آہستہ ہٹا دیا جائے یا اُن کو ضبط (Control) میں لے آیا جائے تو مادی جسم کے لیے غیر معلوم بلندی تک پہنچنا ممکن العمل ہو جائیگا اور اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اُس کو ممکن العمل سمجھ کر ہی کر رہے ہیں اور سائنٹیفک (Scientific) طریقہ پر کر رہے ہیں، پس اگر آج کا انسان میلوں اوپر ہوائی جہاز کے ذریعہ جا سکتا ہے اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہزاروں میل سے مادی انسان کے ساتھ باتیں کرتے وقت اُس کے جسم کی تصویر لے سکتا ہے اور ہوا اور آفتاب کی لہروں اور شعاعوں پر کنٹرول کر کے ہزاروں میل تک اپنی آواز کو بذریعہ ریڈیو نشر کر سکتا ہے اور ہزاروں برس کے گذرے ہوئے واقعات کو فضا میں منظم کر کے آج اس طرح سُنا سکتا ہے گویا وہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے تو اس انسان کے خالق بلکہ خالقِ کائنات کے متعلق اندھا تفلسف یہ کہنا کہ وہ مادی جسم کو ملاءِ اعلیٰ تک کیسے لے جا سکتا ہے اپنی غباوت پر مہر کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

اور اگر ادویات اور غذاؤں اور حفظانِ صحت کے مختلف طریق سے عمرِ طبعی کو دوگنا اور تین گنا کیا جا سکتا اور کیا جا رہا ہے نیز اگر مختلف غذاؤں کے اثرات و نتائج میں یہ فرق ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ کسی سے فضلہ زیادہ بنے اور کسی سے بہت کم بنے اور کسی سے قطعاً نہ بنے بلکہ وہ خالص خون کی شکل میں تحلیل ہو جائے اور اگر انسان اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ روحانی قوت کو بڑھا کر آج اس دنیا میں دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں بغیر خورد و نوش زندہ رہ سکتا ہے تو مجبور انسانوں کی ان کامیاب کوششوں کو صحیح سمجھنے کے باوجود خالقِ ارض و سماء

کی جانب حضرت مسیح کی رفعت آسمانی پر مسطورہ بالا شکوک پیش کرنا یا اُن کے پیش نظر ان کے جسد عنصری ملاءِ اعلیٰ تک پہنچنے اور وہاں زندہ رہنے کا انکار کرنا اگر جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص علمی حقائق سے ناآشنا اور علومِ قرآن سے محروم ہے وہ "خلافِ عقل" اور "ماوراءِ عقل" ان دونوں باتوں کے درمیان فرق کرنے سے عاجز ہے اور اس لیے ہمیشہ ماوراءِ عقل کو خلافِ عقل کہہ کر پیش کرتا رہتا ہے۔

دراصل انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ صرف دو ہی باتیں ہیں ایک یہ کہ انسان "عقل" سے اس درجہ بے بہرہ ہو جائے کہ ہر ایک بات بے سمجھے بوجھے مان لے اور اندھوں کی طرح ہر ایک راہ پر چلنے لگے دوسری بات یہ کہ جو حقیقت بھی عقل سے بالا نظر آئے اُس کو فوراً جھٹلا دے اور یہ یقین کر لے کہ جس شے کو اُس کی سمجھ یا چند انسانوں کی سمجھ ادراک نہیں کر سکتی وہ شے حقیقۃً وجود نہیں رکھتی اور تکذیب کے لائق ہے حالانکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو ایک دور کے تمام عقلاء کے نزدیک ماوراءِ عقل سمجھی جاتی ہیں، اس لیے کہ اُن کی عقلیں اُن باتوں کا ادراک کرنے سے عاجز رہیں مگر وہی باتیں علمی ترقی کے دوسرے دور میں جا کر نہ صرف ممکن الوقوع قرار پاتی، بلکہ مشاہدہ اور تجربہ میں آجاتی ہیں پس اگر ہر ایک وہ شی جو کسی ایک انسان یا جماعت یا اُس دور کے تمام اہل عقل کے نزدیک ماوراءِ عقل تھی "خلافِ عقل" کہلانے کی مستحق تھی تو وہ دوسرے دور میں کیوں عقل کے لیے ممکن ہوئی بلکہ مشاہدہ میں آگئی۔

قرآن عزیز نے گمراہی کی اس پہلی حالت کو (جہل، ظن، خرص (اٹکل)) سے تعبیر کیا ہے اور دوسری حالت کو "الحاد" کہا ہے "اور یہ دونوں حالتیں" علم و عرفان "سے محرومی نتیجہ ہوتی ہیں۔

خلافِ عقل، اور ماوراءِ عقل کے درمیان یہ فرق ہے کہ خلافِ عقل بات وہ ہو سکتی ہے جس کے نہ ہو سکنے کے متعلق علم و یقین کی روشنی میں مثبت دلائل و براہین موجود ہوں

اور عقل، دلیل و برہان اور علم یقین سے یہ ثابت کرتی ہو کہ ایسا ہونا ناممکن اور محال ذاتی ہو اور ماوراءِ عقل اُس بات کو کہتے ہیں کہ بعض باتوں کے متعلق عقل ہی کا یہ فیصلہ ہو کہ چونکہ انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا اور حقیقت اِسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی لہٰذا ہر وہ بات جو عقل کے احاطہ میں نہ آسکتی ہو مگر اُس کے انکار پر علم و یقین کے ذریعہ برہان و دلیل بھی نہ دی جاسکتی ہوں تو ایسی بات کو خلاف عقل نہیں بلکہ ماوراء عقل کہینگے۔

خلافِ عقل اور ماوراء عقل کے درمیان امتیاز ہی کا یہ نتیجہ ہو کہ جن چیزوں کو کل کی دنیا میں عام طور پر خلاف عقل کہا جاتا رہا اُن کو اہل دانش و بینش نے خلاف عقل نہ سمجھتے ہوئے موجودہ دور میں ممکن بلکہ موجود کر دکھایا اور کل یہی عقل کی ترقی آج کی بہت سی ماوراء عقل باتوں کو احاطۂ عقل میں لاسکیگی اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہیگا۔

پس جو شخص حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بجسد عنصری رفع الی السماء کا اس لیے منکر ہو کہ عقلی فلسفہ اُس کا انکار کرتا ہو تو اُس کا یہ دعویٰ "برہان و دلیل اور علم و یقین کی جگہ محض جہل، ظن، اٹکل کے ماتحت ہو اور ایسے حضرات کے لیے پھر عالم غیب کی تمام ماوراء عقل باتوں مثلاً وحی، فرشتہ، جنت، جہنم، حشر، معاد، معجزہ وغیرہ تمام باتوں کو خلافِ عقل کہہ کر جھٹلا دینا چاہیے،

قرآنِ عزیز نے ان ہی جیسے منکرینِ حق کے متعلق صاف صاف مکذبین کا لقب تجویز کر دیا ہو

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ. (یونس ۱)	نہیں یہ بات نہیں ہو (جیسا کفار کہتے ہیں) اصل حقیقت یہ ہو کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کرسکے، اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہوگئے۔ ٹھیک اسی طرح اُنہوں نے بھی جھٹلایا تھا جو اُن سے پہلے گذر چکے ہیں تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا

آیت میں کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ کہہ کر جس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے یعنی انسان کی عقل جس بات کا ادراک نہ کر سکے اُس کو دلیل و برہان اور علم یقین کے بغیر ہی جھٹلا دینا اور صرف اس بناء پر انکار کر دینا کہ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے" اس کی ایک نظیر مرزائے قادیان کا وہ انکار ہے جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے" رفع الی السماء" سے متعلق ہے اور اس کے خلیفہ مسٹر لاہوری کی فلسفیانہ موشگافیاں بھی اسی بے دلیل انکار و جحود کا شعبہ ہیں۔

اس حربہ کو بھی کمزور سمجھ کر متنبی پنجاب نے پھر رُخ بدلا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس موقعہ کے علاوہ قرآن کے کسی مقام سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ" رفع" سے" رفع روحانی" کے اسوا کوئی معنی لیے گئے ہیں یعنی مادی شے کی جانب رفع کی نسبت کی گئی ہو لہذا اس مقام پر بھی رفع روحانی کے علاوہ معنی لینا قرآن کے اطلاق و استعمال کے خلاف ہے۔

مگر متنبی کاذب کا یہ دعویٰ اول تو بنیاداً ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی لفظ کے محلِ استعمال سے یا قرآن ہی کی دوسری نصوص سے ایک معنی متعین ہیں تب یہ سوال پیدا کرنا کہ" جب استعمال دوسرے کسی مقام پر جب تک ثابت نہیں ہوگا قابل تسلیم نہیں" صد درجہ کی نادانی ہے تاوقتیکہ دلیل سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ لغتِ عرب میں اس لفظ کا اس معنی میں استعمال جائز ہی نہیں، اور اگر اتمام حجت کے طور پر اس قسم کے لچر سوال یا دعوے کو قابلِ جواب یا لائق رد سمجھا ہی جائے تو سورہ والنازعٰت کی یہ آیت کافی و وافی ہے۔

ءَ انتم اشد خلقاً ام السماءُ بنٰھا رفع سمکھا (الآیۃ) ولے افرادِ نسل انسانی! خلقت اور پیدائش کے لحاظ سے کیا تم زیادہ بھاری اور بوجھل ہو یا آسمان جس کو خدا نے بنایا اور اُس کے بوجھل جسم کو بلند کیا۔

اور ایک آسمان پر ہی کیا موقوف ہے یہ ہم سے لاکھوں اور کروڑوں میل دور فضا میں سورج، چاند اور ستاروں کو خدائے برتر نے جو بلندی اور رفعت عطا کی ہے کیا یہ سب کے سب مادی اجسام نہیں ہیں؟ اور اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو جس خالقِ ارض و سماوات نے

الی مادی اجسام کا رفع کیا ہے وہ اگر ایک انسانی مخلوق کا رفع آسمانی کر دے تو اس کو قرآن کے اطلاق و استعمال کے خلاف کہنا غباوت اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے البتہ ثبوت درکار ہے تو اس کے لیے قرآنِ عزیز کی نصوص، صحیح احادیث اور اجماع اُمت سے زیادہ موثق ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں

مرزائے قادیانی نے اگرچہ اس مسئلہ میں جمہور کے خلاف یہود و نصاریٰ کی پیروی میں تحریفِ مطالب کی کافی سعی ناکام کی ہے اور مسٹر لاہوری نے بھی تفسیر قرآن میں تحریفِ معنوی کے ذریعہ اپنے مقتدا کی مدد کی تاہم دل کا چور اُن کو مطمئن نہیں کر سکا اور اس لیے انھوں نے دلائل و براہین کی جگہ جذبات کو دلیلِ راہ بنایا اور کبھی تو یہ کہا کہ جو لوگ حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کو آسمان پر زندہ تسلیم کرتے ہیں وہ اُن کو خاتم الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دیتے ہیں کہ آپ زمین پر ہوں اور حضرت عیسٰی آسمان پر، یہ تو سخت توہین کی بات ہے۔

لیکن علمی حلقوں میں اس لچر اور پوچ جذبہ کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جبکہ ہر ایک مذہبی انسان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ اگرچہ فرشتے ہمیشہ بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ میں موجود اور سکونت پذیر ہیں تاہم اُن سب کے مقابلہ میں بلکہ اُن کی جلیل القدر ہستیوں مثلاً جبرئیل و میکائیل کے مقابلہ میں بھی ایک مفضول سے مفضول نبی کا رتبہ بہت بلند اور عالی ہے حالانکہ وہ نبی زمین پر مقیم رہا ہے اور جبرئیل کا قیام ملاءِ اعلیٰ کے بھی بلند تر مقام پر رہتا ہے چہ جائیکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ جلیل کہ جس کی عظمت "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" میں مضمر ہے، علاوہ ازیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شبِ معراج میں "قاب قوسین او ادنیٰ" کا جو تقرب پایا ہے وہ نہ کسی ملک اور فرشتہ کو حاصل ہوا اور نہ کسی نبی اور رسول کو اس لیے حضرت مسیح کا رفع آسمانی اُس "رفعت" کو پہنچ ہی نہیں سکتا جو اسریٰ میں آپ کو حاصل ہوئی بہر حال فاضل و مفضول کے درمیان فرقِ مراتب کے لیے تنہا ملاءِ اعلیٰ کا قیام معیارِ فضیلت

نہیں ہو خصوصاً اس "افضل ہستی" کے مقابلہ میں جس کی فضیلت کا معیار خود اس کا وجود با جود ہو اور جس کی ذاتِ قدسی صفات خود ہی منبعِ فضائل اور مرجعِ کمالات ہو، ایسی ہستی سے تو "مقام" عزت و مرتبہ پاتا ہو نہ کہ وہ ذاتِ گرامی ؎

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور کبھی یہ کہا کہ جو شخص عیسیٰ (علیہ السلام) کو زندہ تسلیم کرتا ہو وہ "العیاذ باللہ" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، کی اس لیے توہین کرتا ہو کہ وہ بقید حیات نہیں رہے اور اس طرح حضرت عیسیٰ کو پھر ذاتِ اقدس پر برتری حاصل ہو گئی۔

یہ مقولہ پہلے سے بھی زیادہ بے کیف اور بے معنی ہو بلکہ سرتاسر غلط بنیاد پر قائم، اس لیے کہ کون اہلِ عقل اور ذی ہوش کہہ سکتا ہو کہ "زندگی" بھی فاضل و مفضول کے درمیان معیارِ فضیلت ہو، اس لیے کہ زندگی کی قیمت ذاتی کمالات و فضائل سے ہو نہ اس لیے کہ وہ زندگی ہو پھر "معیارِ فضیلت" کی اس بحث سے قطع نظر اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلہ فضیلت کو درمیان لانا اس لیے بھی قطعاً بے محل ہو کہ جبکہ قرآن عزیز کی نصوص نے تمام کائنات پر آپ کی برتری کو ثابت کر دیا اور آپ کی سیرت نے زندہ شہادت بن کر ان نصوص کی تصدیق کر دی تو کسی بھی انسان کی "زندگی" یا "رفعِ آسمانی" یا اور کوئی "وجہ فضیلت" اس کے مقابلہ میں نہیں لائی جا سکتی، اور ہر ایک حالت و صورت میں "فضلِ کلی" اسی جامع کمالات ہستی کو حاصل رہیگا۔

ولکن شبہ لھم کی تفسیر

اس مسئلہ کو ختم کرنے سے پہلے اب ایک بات باقی رہ جاتی ہو کہ سورۂ نساء کی مسطورہ بالا آیت میں "ولکن شبہ لھم" کی کیا تفسیر ہو؟ یعنی وہ کیا اشتباہ تھا جو یہودیوں پر طاری کر دیا گیا، تو قرآن عزیز اس کا جواب اس مقام پر بھی اور آلِ عمران میں بھی ایک ہی دیتا ہو اور وہ "رفع الی السماء" ہے، آلِ عمران میں اس کو وعدہ کی شکل میں ظاہر کیا "ورافعک الیّ" اور نساء میں ایفاءِ وعدہ کی صورت میں یعنی "بل رفعہ اللہ الیہ"

جس کا ماحصل یہ نکلتا ہے کہ محاصرہ کے وقت جب منکرینِ حق گرفتاری کے لیے اندر گھسے تو وہاں عیسیٰ (علیہ السلام) کو نہ پایا یہ دیکھا تو سخت حیران ہوئے اور کسی طرح اندازہ نہ لگا سکے کہ صورت حال کیا پیش آئی اور اس طرح "ولکن شبہ لھم" کا مصداق بن کر رہ گئے اس کے متعلق قرآن کہتا ہے "اِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا" تو یہ اشتباہ کے بعد جو صورت حال پیش آئی اُس کا نقشہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے دو باتیں بصراحت ظاہر ہوتی ہیں ایک یہ کہ یہود اس سلسلہ میں اس طرح شک میں پڑ گئے تھے کہ گمان اور اٹکل کے ماسوا اُن کے پاس علم و یقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی اور دوسری بات یہ کہ انہوں نے کسی کو قتل کر کے یہ مشہور کیا کہ انہوں نے "مسیح علیہ السلام" کو قتل کر دیا۔ اور یا پھر آیت زمانۂ نبوتِ محمدی کے یہود کا حال بیان کر رہی ہے

پس قرآن عزیز کے اُن واضح اعلانات کے بعد جو حضرت مسیح کی حفاظت و صیانت کے سلسلہ میں کیے گئے ہیں اور جن کو تفصیل کے ساتھ سطور بالا میں بیان کر دیا گیا ہے ان مع باتوں کی جزئی تفصیلات کا تعلق آثار صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور تاریخی روایات پر رہ جاتا ہے اور اس سلسلہ میں صرف اُن ہی روایات و آثار کو قابل تسلیم سمجھا جائیگا جو اپنی صحتِ روایت کے ساتھ ساتھ ان بنیادی تصریحات سے نہ ٹکراتی ہوں جن کا ذکر متعدد مقامات پر قرآنِ عزیز نے بصراحت کر دیا ہے اور "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی خود ہی تفسیر کر دیتا ہے" کے اصول پر جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو دشمن ہاتھ تک نہ لگا سکے اور وہ محفوظ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لیے گئے اور جیسا کہ حیوۃ عیسیٰ (علیہ السلام) کی بحث میں ابھی نصوص قرآنی سے ثابت ہوگا کہ وہ وقوع قیامت کے لیے "نشان" ہیں اور اس لیے دوبارہ کائنات ارضی میں واپس آ کر اور مفوضہ خدمت انجام دے کر پھر موت سے دوچار ہونگے۔

شخصِ مقتول و مصلوب سے متعلق آثار و تاریخ کی جو ملی جلی روایات ہیں اُن کا

حاصل یہ ہے کہ "سبت کی شب" میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بیت المقدس کے ایک بند مکان میں اپنے حواریوں کے ساتھ موجود تھے، بنی اسرائیل کی سازش سے دمشق کے بت پرست بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے لیے ایک دستہ بھیجا اس نے آکر محاصرہ کر لیا۔ اسی اثنا میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لیا جب سپاہی اندر داخل ہوئے تو انہوں نے حواریوں میں ایک ہی شخص کو حضرت عیسیٰ کے ہم شبیہ پایا اور اس کو گرفتار کر کے لے گئے اور پھر اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ ان ہی روایات میں بعض اس کا نام یودس بن کریا یوطا بیان کرتے ہیں اور بعض جرجس اور دوسرے داؤد بر) نوزا کہتے ہیں۔

پھر ان روایات میں سے بعض میں ہے کہ یہ شخص مقتول اپنی خلقت ہی میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کا مشابہ اور ان کا نقش ثانی تھا، اسرائیلیات انجیلی میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے یہودا اسخر یوطی حضرت عیسیٰ کا شبیہ تھا، اور بعض روایات میں ہے کہ جب یہ نازک گھڑی آپہنچی تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے حواریوں کو دعوت و تبلیغ حق سے متعلق تلقین و ہدایات کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھ کو مطلع کر دیا ہے کہ میں ایک مدت تک کے لیے ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جاؤنگا اور یہ واقعہ مخالفین اور متبعین دونوں کے لیے سخت آزمائش و امتحان بن جانے والا ہے لہٰذا تم میں سے جو شخص اس پر آمادہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرا شبیہ بنا دے اور وہ خدا کی راہ میں جام شہادت پیے اس کو جنت کی بشارت ہے، تب ایک حواری نے پہل کی اور خود کو اس کے لیے پیش کیا اور منجانب اللہ وہ حضرت کا ہم شکل ہو گیا اور سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔[۱]

یہ تفصیلات نہ قرآن میں مذکور ہیں اور نہ احادیثِ مرفوعہ میں اس لیے وہ صحیح ہوں یا غلط نفس مسئلہ اپنی جگہ اٹل ہے اور قرآن کی آیات میں منصوص، اس لیے اصحاب

---

[۱] واقعات کی یہ تفصیلات تاریخ ابن کثیر جلد ۲ اور کتب تفسیر میں منقول ہیں۔

ذوق کو اختیار ہے کہ وہ صرف قرآن کے اس اجمال پر ہی قناعت کریں کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کا رفع الی السماء اور ہر طرح دشمنوں سے تحفظ نیز یہود پر معاملہ کا مشتبہ ہو کر کسی دوسرے کو قتل کرنا یہود و نصاریٰ کے پاس اس سلسلہ میں علم و یقین سے محروم ہو کر ظن و تخمین اور شک و شبہ میں مبتلا ہو جانا اور قرآن کا حقیقتِ واقعہ کو علم و یقین کی روشنی میں ظاہر کر دینا یہ سب حقائق ثابتہ ہیں یا "ولکن شبہ لھم" اور "ان الذین اختلفوا فیہ لفی شك منہ" (الآیہ) کی تفسیر میں ان روایات کی تفصیلات کو بھی قبول کرلیں اور یہ سمجھ کر تسلیم کریں کہ زیرِ بحث آیات کی تفسیر ان تفصیلات پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ امرِ زائد ہے جو آیات کی تفسیرِ صحیح کے لیے مؤید ہے۔

حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام | سورۂ آل عمران، مائدہ اور نساء کی زیرِ بحث آیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق حکمتِ الٰہی کا یہ فیصلہ صادر ہوا کہ اُن کو بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لیا جائے اور وہ دشمنوں اور کافروں سے محفوظاً اٹھا لیے گئے۔

لیکن قرآن نے اس مسئلہ میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حسب موقعہ اُن کی حیاتِ امروزہ پر نصوصِ قطعیہ کے ذریعہ متعدد جگہ روشنی ڈالی ہے اور ان مقامات میں اس جانب بھی اشارے کیے ہیں کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی حیاتِ طویل اور رفع الی السماء میں کیا حکمت مستور تھی تاکہ اہلِ حق کے قلوب تازگیِ ایمان سے شگفتہ ہو جائیں اور باطل کوش اپنی کور باطنی پر شرمائیں۔

لیؤمنن بہ قبل موتہ

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	اور کوئی اہل کتاب میں سے باقی نہ رہیگا مگر یہ کہ وہ
اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ	ضرور ایمان لائیگا عیسیٰ پر اُس (عیسیٰ) کی موت سے
مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ	پہلے اور وہ (عیسیٰ) قیامت کے دن اُن پر (اہل کتاب
عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (نساء)	پر) گواہ بنیگا۔

اس آیت سے قبل آیات میں وہی مسطورۂ بالا واقعہ مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صلیب پر چڑھایا گیا اور نہ قتل کیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب اُٹھا لیا یہود و نصاریٰ

کے اس عقیدہ کی تردید ہی جو اُنھوں نے اپنے باطل زعم اور اٹکل سے قائم کر لیا تھا۔ اُن سے کہا جا رہا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کیے جانے کا دعویٰ قابلِ لعنت ہی کیونکہ بہتان اور لعنت توام ہیں اس کے بعد اس آیت میں امرِ متعلق کی تصدیق میں اس جانب توجہ دلائی جا رہی ہے کہ آج اگر اس ملعون عقیدہ پر فخر کر رہے ہو تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) خدائے برتر کی حکمت و مصلحت کو پورا کرنے کے لیے کائنات ارضی پر واپس تشریف لائینگے اور اس علمی مشاہدہ کے وقت اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے ہر ایک موجودہستی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہیگا اور پھر جب وہ اپنی مدتِ حیات ختم کر کے موت کی آغوش سے دوچار ہو جائینگے تو قیامت کے دن اپنی اُمت (اہل کتاب) پر اُسی طرح گواہ ہونگے جس طرح تمام انبیاء و مرسلین اپنی اپنی اُمتوں پر شاہد بنینگے۔

یہ حقیقت کچھ مخفی نہیں ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعۂ صلیب و قتل پر متفق ہیں لیکن اس سلسلہ میں دونوں کے عقائد کی بنیاد قطعاً متضاد اصولوں پر قائم ہے، یہود، حضرت مسیح (علیہ السلام) کو مفتری و کاذب کہتے اور دجّال[1] سمجھتے ہیں اور اس لیے فخر کرتے ہیں کہ اُنھوں نے یسوع مسیح کو صلیب پر بھی چڑھایا اور پھر اس حالت میں مار بھی ڈالا۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کا پہلا انسان آدم (علیہ السلام) گنہگار تھا اور ساری دنیا گنہگار تھی اس لیے خدا کی صفتِ "رحمت" نے ارادہ کیا کہ دنیا کو گناہوں سے نجات دلائے اس لیے اُس کی صفتِ "رحمت" نے ابنیت (بیٹا ہونے) کی شکل اختیار کی اور اُس کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ یہود کے ہاتھوں سولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح ساری کائناتِ ماضی و مستقبل

---

[1] دجّال دجل سے ماخوذ ہے دجل کے معنی فریب ہیں

کے گناہوں کا "کفارہ" بن کر دنیا کی نجات کا باعث بنے۔

سورۂ نساء کی آیات میں قرآن عزیز نے صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت مسیح کے قتل کے دعویٰ کی بنیاد کسی بھی عقیدہ پر مبنی ہو لائق لعنت اور باعث ذلت و خسران ہے، خدا کے سچے پیغمبر کو مفتری سمجھ کر یہ عقیدہ رکھنا بھی لعنت کا موجب اور خدا کے بندے اور مریم کے بطن سے پیدا انسان کو خدا کا بیٹا بنا کر اور "کفارہ" کا باطل عقیدہ تراش کر مسیح (علیہ السلام) کو مصلوب و مقتول تسلیم کرنا بھی گمراہی اور علم و حقیقت کے خلاف اٹکل کا تیر ہے اور اس سلسلہ میں صحیح اور مبنی بر حقیقت فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد "علم و یقین اور وحیِ الٰہی" پر قائم ہے۔

پس آج جبکہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے جو شک و ظن کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا علم و یقین کی روشن آچکی ہے پھر بھی تم اپنے ظنونِ کاسدہ اور اوہام فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو اور حضرت مسیح سے متعلق باطل عقیدہ کو ترک کرنے کے لیے طیار نہیں ہوتے ہو تو قرآن کا ایک دوسرا فیصلہ اور وحیِ الٰہی کا یہ اعلان بھی سن لو کہ تمہاری نسلوں پر وہ وقت بھی آنے والا ہے جب قرآن کے اس صحیح فیصلہ اور اعلانِ حق کے مطابق حضرت مسیح ملاءِ اعلیٰ سے کائنات ارضی کو واپس ہونگے اور ان کی یہ آمد ایسی مشاہد ہوگی کہ یہود و نصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہیگا جو بادلِ خواستہ یا بادل ناخواستہ اس ذاتِ گرامی پر یہ ایمان نہ لے آئے کہ بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، خدا کے بیٹے نہیں، برگزیدہ انسان ہیں، مصلوب و مقتول نہیں ہوئے تھے بقید حیات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں" وان من اھل الکتٰب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ"

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ کی طرح اس جگہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے لیے لفظ "توفی" نہیں بولا گیا بلکہ بصراحت لفظ "موت"

استعمال کیا گیا ہے، یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اُن دونوں مقامات پر جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اُس کے لیے "توفی" ہی مناسب ہے جیسا کہ سورہ آل عمران سے متعلق آیات کی تشریح و تعبیر میں گذر چکا اور سورۂ مائدہ سے متعلق آیت کی تفسیر میں عنقریب بیان ہوگا اور اس جگہ چونکہ براہِ راست "موت" ہی کا تذکرہ مطلوب ہے، اور اُس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرت مسیح (علیہ السلام) بھی "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" کا مصداق بننے والے ہیں، اس لیے یہاں "موت" کو بصراحت لانا ہی از بس ضروری تھا، اور یہ مزید برہان ہے اس دعویٰ کے لیے کہ آل عمران اور مائدہ میں لفظ "موت" کی جگہ "توفی" کا اطلاق بلاشبہ خاص مقصد رکھتا ہے ورنہ جس طرح ان دونوں مقامات پر توفی کا اطلاق کیا گیا تھا اُسی طرح یہاں بھی کیا جاتا یا جس طرح اس جگہ لفظ "موت" کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح اُن دونوں مقامات پر بھی لفظ موت ہی کا استعمال ہونا چاہیے تھا، مگر قرآن عزیز کے ان دقیق اسالیبِ بیان کے فرق کا فہم طالبینِ حق کا ہی حصہ ہے نہ کہ مرزائے قادیانی اور مسٹر لاہوری جیسے اصحابِ زیغ کا جو اپنی خاص اغراضِ ذاتی کے پیشِ نظر پہلے ایک نظریہ ایجاد کر لیتے ہیں اور بعد ازاں اُس سلسلہ کی تمام آیاتِ قرآنی کو اُسی کے سانچہ میں ڈھال کر اُس کا نام "تفسیرِ قرآن" رکھتے ہیں

بہر حال جمہور کے نزدیک آیت زیرِ عنوان کی تفسیر یہی ہے جو سپردِ قلم کی جا چکی، مشہور محدث، جلیل القدر مفسر اور اسلامی مؤرخ عماد الدین بن کثیر (رحمہ اللہ) اس تفسیر کو حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور حسن بصری (رحمہ اللہ) سے بسند صحیح نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

> قتادہ، عبد الرحمن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی قول حق ہے جیسا کہ عنقریب ہم دلیلِ قاطع سے اس کو ثابت کریں گے (ان شاء اللہ تعالیٰ)[1]

اور سرتاجِ محدثین ابنِ حجر عسقلانی (رحمہ اللہ) بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں

[1] ابن کثیر جلد اول

اسی تفسیر پر حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نے یقین کیا ہے اور ابن عباسؓ کی اس تفسیر کو ابن جریر نے بروایت سعید بن جبیر اور ابو رجاء نے بھی حسنؒ سے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا "قبل موتہ" یعنی قبل موت عیسیٰ (علیہ السلام) قسم بخدا بیشک وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بقید حیات ہیں اور جب وہ آسمان سے اتریں گے تو سب اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے، اور ابن جریر (رحمہ اللہ) نے اسی تفسیر کو اکثر اہل علم سے نقل کیا ہے اور ابن جریرؒ وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے[1]

مگر اس صحیح تفسیر کے علاوہ کتب تفسیر میں احتمال عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں۔ مگر وہ دونوں بلحاظِ سند ضعیف اور ناقابل اعتماد اور بلحاظ سیاق و سباق (یعنی آیت زیر بحث سے قبل اور بعد کی آیات کے لحاظ سے) غلط اور ناقابل التفات ہیں یعنی ایسے احتمالاتِ عقلی ہیں جو نقل اور آیات کے باہمی نظم و ترتیب کے خلاف ہیں۔

ان ہر دو معانی میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ "موتہ" میں جو ضمیر ہے اُس کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بجائے اہل کتاب کی جانب لوٹایا جائے اور آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے "اور اہل کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰؑ پر ایمان نہ لے آتا ہو" یعنی اگرچہ یہود و نصاریٰ اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے عقیدے پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہیں، لیکن جب اُن کو "موت" آدباتی ہے تو وہ اُس آخری حالت میں "جو نزع کا وقت کہلاتا ہے" صحیح عقیدہ کے مطابق ایمان لے آتے ہیں اور اہل کتاب کے ہر ایک فرد پر بلا استثناء یہی حالت گذرتی ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ "اہل کتاب کا ہر ایک فرد اپنی موت سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے" یعنی جب وہ عالمِ دنیا سے منقطع ہو کر عالمِ غیب سے وابستہ ہو رہا ہوتا ہے اُس وقت اُس پر اصل حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ خدا کے سچے پیغمبر تھے۔

[1] فتح الباری شرح بخاری جلد ۶ ص ۳۸۴۔

پس اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقل روایت کے اعتبار سے ناقابل اعتماد اور غیر صحیح اور آیات کے سیاق و سباق کے خلاف ہیں عقلی نقطہ نظر سے بھی غلط ہیں اس لیے کہ اگر آیت کے معنی یہ ہیں جو سطور بالا میں نقل کیے گئے تب یہ آیت اپنے مقصد بیان کے خلاف بے معنی اور بے نتیجہ ہو جاتی ہے والعیاذ باللہ کیونکہ قرآنِ عزیز دوسرے مقامات پر یہ صاف کہہ چکا ہے کہ جب انسان عالمِ دنیا سے کٹ کر عالمِ غیب سے وابستہ ہو جاتا ہے اور نزع کی یہ کیفیت اُس پر طاری ہو جاتی ہے کہ جو معاملات اس ساعت سے قبل تک اُس کے لیے غیب کے معاملات تھے وہ مشاہدہ میں آنے شروع ہو جاتے ہیں تو اُس وقت اُس کے اعمال و کردار کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور اب تبدیلیِ اعتقاد کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اُس وقت کا نہ اقرار و اعتراف معتبر اور نہ انکار مستند۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ — پس جب آئے اُن کے پاس پیغمبر واضح دلائل لے کر تو
فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَ — اُس چیز سے خوش ہوئے جو اُن کے پاس علم سے تھی اور
حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ — گھیر لیا اُن کو اُس چیز نے جس کی وہ مذاق بناتے تھے
فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا — پس جب اُنہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو اُنہوں نے
بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ — کہا ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں
مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ — کو ہم اُس کا شریک بناتے تھے اُس سے منکر ہوئے
اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ — پس نہیں نافع ہوا اُن کا یہ ایمان جب اُنہوں نے
الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ — ہمارے عذاب کا مشاہدہ کر لیا، یہ اللہ کی سنت ہے جو
هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (المومن) — اُس کے بندوں میں ہمیشہ جاری رہی ہے اور اُس موقع پر
وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ — لیکن اُن لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں ہے جو ساری عمر تو
السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓي اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ — برائیاں کرتے رہے لیکن جب اُن میں سے کسی کے آگے
قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـــٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ — موت آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا "اب میں توبہ کرتا ہوں"

توبہ نزع سے پہلے

يُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۔ (النساء)

(ظاہر ہے کہ ایسی توبہ بھی توبہ نہیں ہوئی) اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہو جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں ان تمام لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب طیار کر رکھا ہے۔

تو ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان جب اُس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے سامنے سے غیب کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور برزخ، ملائکۃ اللہ، عذاب یا راحت، جنت جہنم غرض دینِ حق کی تعلیم کردہ غیب کی ساری حقیقتیں اُس پر منکشف ہو جاتی ہیں اور اس میں یہود و نصاریٰ کی ہی خصوصیت کیا ہے یہ حالت تو ہر ایک ابن آدم پر گذرنے والی ہے، نیز جب اس قسم کا ایمان قابلِ قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اُسی اسلوب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا جو غرقِ فرعون کے وقت فرعون کے ایمانی اعتراف واقرار کے لیے اختیار کیا گیا اور جس میں اُس وقت کی ایمانی پکار کی بے وقعتی ظاہر کی گئی ہے نہ کہ ایسے اسلوب بیان کے ساتھ گویا مستقبل میں ہونے والے کسی ایسے عظیم الشان واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے جو مخاطبین (یہود و نصاریٰ) کے عقائد وعزائم کے خلاف حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق قرآن کی تصدیق اور اس کے اٹل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش آنے والا ہے۔ ورنہ تو ایک عیسائی اور یہودی پنجہ موت میں آجانے کے وقت جان عزیز سپرد کر دینے سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لایا تب کیا اور نہ لایا تب کیا اُس کی یہ تصدیق کائناتِ انسانی کے علم وادراک سے باہر صرف اُس کے اور خدا کے درمیان تعلق رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی بات کا ایسے موقعہ پر تذکرہ کرنا قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو اس کے ایک خاص عقیدہ پر ملزم و مجرم بنانے کے لیے فیصلۂ حق کی تائید کے لیے ماضی اور مستقبل میں کائنات ارضی پر پیش آنے والے واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے جیسا کہ آیت کے سیاق

و سباق سے واضح ہو رہا ہے، علاوہ ازیں ان احتمالات کی یہاں اس لیے بھی گنجائش نہیں ہو کہ غزوہ کے وقت حضرت عیسیٰ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قسم کا ایمان تو ہر اس اہلِ کتاب سے متعلق ہو جو اس آیت کے نزول سے کچھ دن قبل یا صدیوں قبل گذر چکے اور مر کھپ چکے ہیں۔ لہذا اگر آیت میں یہ مضمون بیان کرنا مقصود تھا تو اس کے لیے موکد مستقبل کی یہ تعبیر "لیؤمنن" فصاحت و بلاغتِ کلام کے بالکل خلاف ہو۔ اس کے لیے تو ایسی تعبیر کی ضرورت تھی جو ماضی، حال اور استقبال تینوں زمانوں پر حاوی ہوتی تاکہ قرآن کا مفہوم اپنے توسع کے لحاظ سے پوری طرح ادا ہوتا۔

نیز دوسرے معنی تو اس لیے بھی قطعاً غلط اور بے محل ہیں کہ اس آیت سے قبل اور بعد کی آیات میں یعنی سیاق و سباق میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہی نہیں ہے کیونکہ شروع آیات میں صرف حضرت مسیح (علیہ السلام) کا ذکر ہو رہا ہے اور اس آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہوا ہے "ویوم القیمۃ یکون علیھم شھیدا" اور واضح ہے یہ بات کہ اس جگہ شاہد سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہیں اور علیہم کی ضمیر سے اُن کی اُمت تو پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیے بغیر درمیان کی کسی ضمیر کا مرجع ذاتِ اقدس کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت و بلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدۂ عربیت کے قطعاً خلاف ۔۔ بلاشبہ رضائرکا مرجع

غرض بے غل و غش صحیح معنی وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔

ؔ اس مقام کے علاوہ سورۂ زخرف کی آیت "ما المسیح بن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل" اور سورۂ آلِ عمران کی ابتداء سے بیاسی آیات تک جو وفدِ نجران سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب مقامات دلالۃ النص یا اشارۃ النص کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لیے دلیل و برہان ہیں اور اگرچہ ان کی تفصیلات اور وجوہ استشہاد میرے پاس مدون و مرتب ہیں تاہم کتاب کی طوالت کے خوف سے اس جگہ اُن کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بوقت فرصت اِن شاء اللہ مستقل مضمون کی صورت میں ہدیۂ ناظرین ہوگا اور یا پھر حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ کی کتاب "عقیدۃ الاسلام فی حیوٰۃ عیسیٰ علیہ

حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ

قرآن عزیز نے جس معجزانہ اختصار کے ساتھ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے رفع سماوی، حیات امروز، اور علامت قیامت بن کر نزول من السماء کے متعلق تصریحات کی ہیں صحیح ذخیرۂ احادیث نبوی میں ان آیات ہی کی تفصیلات بیان کر کے ان حقائق کو روشن کیا گیا ہے، چنانچہ امام حدیث بخاری اور مسلم نے صحیحین (صحیح بخاری[1] صحیح مسلم) میں حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) یہ روایت متعدد طریقہائے سند سے نقل کی کہ

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: والذى نفسى بيده ليوشكن ان ينزل فيكم ابن مريم حكما عدلا فيكسر الصليب ويقتل الخنزير ويضع الجزية ويفيض المال حتى لا يقبله احد وحتى يكون السجدة خير له من الدنيا وما فيها ثم قال ابو هريرة اقرؤا ان شئتم وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور وہ وقت آنے والا ہے کہ تم میں عیسیٰ بن مریم حاکم عادل بن کر اتریں گے وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (یعنی موجودہ عیسائیت کو مٹائیں گے) اور جزیہ اٹھا دیں گے (یعنی نشانِ الٰہی کے مشاہدہ کے بعد اسلام کے سوا کچھ بھی قبول نہیں ہوگا اور اسلامی احکام میں بارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیہ کا حکم اسی وقت تک کے لیے ہے) اور مال کی اس درجہ کثرت ہوگی کہ کوئی اس کو قبول کرنے والا نہیں ملیگا اور خدا کے سامنے ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمت رکھیگا (یعنی مال کی کثرت کی وجہ سے خیرات و صدقات کے مقابلہ میں عبادتِ نافلہ کی اہمیت بڑھ جائیگی) پھر ابوہریرہ نے فرمایا اگر تم (قرآن سے اس کا استشہاد) چاہو تو یہ آیت پڑھو وان من اهل الكتاب (الآیہ) اور کوئی اہل کتاب میں سے نہ ہوگا مگر (عیسیٰ کی) موت سے پہلے اس پر (عیسیٰ پر) ضرور ایمان لے آئیگا اور وہ (عیسیٰ) قیامت کے دن

[1] کتاب الانبیاء۔

(٢) بخاری اور مسلم میں بسند نافع مولیٰ ابوقتادہ انصاری (رضی اللہ عنہ) حضرت ابوہریرہ سے یہ روایت بھی منقول ہے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم میں ابنِ مریم اتریں گے اور اس حالت میں اتریں گے کہ تم ہی میں سے ایک شخص تمہاری امامت کر رہا ہوگا۔

ان دونوں روایات کے علاوہ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے متعدد طریقہائے سند سے اور روایات بھی صحیحین: مسند احمد اور سُنن[2] میں درج ہیں جو یہی مفہوم و معنی ادا کرتی ہیں ان میں سے ایک زیادہ مفصل ہے اور مسئلہ زیرِ بحث کے بعض دوسرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مسند احمد میں ہے:-

(٣) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الانبیاء اخوة لعلات امهاتهم شتّٰی ودینهم واحد وانی اولی الناس بعیسی بن مریم لانه لم یکن نبی بینی وبینه وانه نازل فاذا رأیتموه فاعرفوه رجل مربوع الی الحمرة والبیاض علیه ثوبان ممصّران کان رأسه یقطر ان لم یصبه بلل فیدق الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیة ویدعوا الناس الی الاسلام و

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمام انبیاء اصولِ دین میں علاتی بھائیوں کی طرح ہیں دین سب کا ایک اور فروعِ دین مختلف اور میں دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم سے زیادہ قریب ہوں اس لیے کہ اُن کے اور میرے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور بلاشبہ وہ کائنات ارضی پر اُتریں گے پس جب تم اُن کو دیکھو تو اس حلیہ سے پہچان لینا۔ میانہ قد، سُرخ و سپید رنگ ہوگا ان کے جسم پر زرد سرخی مائل رنگ کی چادریں ہونگی ایسا معلوم ہوگا گویا فی الحال غسل کر کے آ رہے ہیں اور سر سے پانی کے قطرے موتی کی طرح ٹپک پڑنے والے ہیں۔ وہ صلیب کو توڑ دینگے اور خنزیر کو قتل کرینگے (موجودہ عیسائیت کا خاتمہ کر دینگے) اور

---

[1] کتاب الانبیاء [2] ابوداؤد، النسائی، ترمذی، ابن ماجہ

يملك الله في زمانه المسيح الدجال ثم تقع الامانة على الارض حتى ترتع الاسود مع الابل والنمار مع البقر والذئاب مع الغنم ويلعب الصبيان بالحيات لاتضرهم فيمكث اربعين سنة ثم يتوفى و يصلي عليه المسلمون"	جزیہ اٹھا دینگے اور لوگوں کو اسلام ہی کی دعوت دینگے اور اللہ تعالیٰ اُن کے زمانہ میں تمام ادیان و ملل کو مٹا دیگا، اور صرف ایک ہی دین دینِ اسلام باقی رہ جائیگا اور اللہ تعالیٰ اُن ہی کے زمانہ میں مسیح دجال کو ہلاک کریگا، پھر کائنات میں امانت (امن) ہر جگہ کریگی حتیٰ کہ شیر اونٹوں کے ساتھ، چیتے گائے بیلوں کے ساتھ، بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چرتے نظر آئینگے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلینگے اور اُن کو کوئی گزند نہیں پہنچیگا، پس عیسیٰ (علیہ السلام) چالیس سال اس زمین پر زندہ رہینگے پھر وفات پا جائینگے اور مسلمان انکے جنازہ کی نماز ادا کرینگے

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے ایک طویل حدیث روایت کی گئی ہے اس میں خروج دجال کا ذکر کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک مذکور ہے۔

(۴) فاذا جاؤا الشام خرج فبيناهم يعدون للقتال يسوون الصفوف اذ اقيمت الصلوة فينزل عيسى بن مريم الخ	پس جب مسلمان ملک شام پہنچینگے تو دجال کا خروج ہوگا ابھی مسلمان اس کے مقابلہ میں جنگ کی تیاریاں کر رہے ہونگے صفیں درست کرتے ہونگے کہ نماز کے لیے اقامت ہونے لگے گی اُس درمیان میں عیسیٰ بن مریم کا نزول ہوگا اور وہ مسلمانوں کی امامت کا فرض انجام دینگے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت منقول ہے جس میں یہ مذکور ہے:-

---

[۱] مسند احمد جلد اول

اذ بعث اللہ المسیح بن مریم (علیہ السلام)، فینزل عند المنارۃ البیضاء شرقی دمشق بین مہرودتین واضعاً کفیہ علیٰ اجنحۃ ملکین اذا طأطأ راسہ قطر واذا رفعہ تحدر منہ جمان کاللؤلؤ (الخ)

(ابھی دجال ایک مسلمان پر اپنے شیطانی کرشموں کی آزمایش کر ہی رہا ہوگا) کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم کو بھیج دیگا، وہ جب کہ منارۃ البیضاء شرقی دمشق کے مشرقی جانب کے سپید منارہ پر اُتر ینگے اور اُن کے بدن پر (سرخی مائل) گہری زرد رنگ کی دو چادریں ہونگی (یعنی ایک بدن کے اوپر کے حصہ پر اور دوسری زیریں حصہ بدن پر لپٹی ہوگی)) اور دو فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا لیے ہونگے، جب سر جھکائینگے تو سر سے پانی ٹپک پڑنے لگیگا اور جب سر اٹھائینگے تو پانی کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپکینگے (یعنی غسل کیے آرہے ہونگے)

اور مختلف طرقہائے سند سے امام احمد نے مسند میں اور ترمذی (رحمۃ اللہ) نے سنن میں حضرت مجمع بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) سے بسند صحیح یہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

یقتل ابن مریم الدجال بباب لُدّ[۱] ابن مریم، دجال کو بابِ لُد پر قتل کرینگے۔

امام ترمذی اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں "ہٰذا حدیث صحیح" اور اس کے بعد اُن حضراتِ صحابہ کی فہرست شمار کراتے ہیں جن سے نزول عیسیٰ بن مریم اور اُن کے ہاتھوں قتلِ دجال سے متعلق روایات کتبِ حدیث میں منقول ہیں۔ فرماتے ہیں

اور اس باب میں حضرت عمران بن حصین، نافع بن عیینہ، ابو برزہ اسلمی، حذیفہ بن اسید، ابوہریرہ، کیسان، عثمان بن العاص، جابر بن عبداللہ، ابوامامہ باہلی، ابن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، سمرہ بن جندب، نواس بن سمعان، عمرو بن عوف، حذیفہ بن الیمان (رضی اللہ عنہم) سے بھی روایات منقول ہیں[۲]۔—

---

[۱] شہر دمشق کی شہر پناہ کا ایک دروازہ ہے۔ [۲] ترمذی باب نزول عیسیٰ بن مریمؑ

اور امام احمد نے مسند میں، امام مسلم نے صحیح میں، اور اصحاب سُنن نے سُنن میں بروایت حضرت حذیفہ بن الاُسید، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے۔

قال اشرف علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من غرفۃ ونحن نتذاکر الساعۃ فقال: "لا تقوم الساعۃ حتی تروا عشر آیات طلوع الشمس من مغربھا والدخان، والدابۃ، وخروج یاجوج وماجوج ونزول عیسیٰ بن مریم والدجال وثلٰثۃ خسوف خسف بالمشرق وخسف بالمغرب وخسف بجزیرۃ العرب ونار تخرج من قعر عدن تسوق او تحشر الناس تبیت معھم حیث باتوا وتقیل معھم حیث قالوا"

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں، ہم (صحابہ) ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے قیامت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالا خانہ سے جھانکا اور ارشاد فرمایا: "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشان نہ دیکھ لوگے، آفتاب کا مغرب سے طلوع، دخان (دھواں)، دابۃ الارض، خروج یاجوج و ماجوج، عیسیٰ بن مریم کا نزول، دجال کا خروج، تین مقامات میں خسوف کا پیش آنا (زمین میں دھنس جانا) مشرق میں مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں، آگ کا قعر عدن سے نکلنا جو لوگوں کو سمیٹ لے جائیگی اور جب رات کو لوگ آرام کرینگے تو وہ بھی ٹھہر جائیگی اور جب دوپہر کو قیلولہ کرینگے تب بھی وہ ٹھہری رہیگی"۔

اور محدث ابن ابی حاتم نے اور جلیل القدر محدث و مفسر ابن جریر طبریؒ نے بروایت حسن بصری (رحمہ اللہ) بسند صحیح حیات و نزولِ عیسیٰ بن مریم سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے اس میں ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم للیھود ان عیسیٰ لم یمت و

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا: "عیسیٰ (علیہ السلام) مرے نہیں اور بلاشبہ وہ قیامت سے پہلے

لہ اس حدیث میں جن علامات کا ذکر ہے وہ سب تشریح طلب ہیں مگر یہاں ان کی تشریحات بے محل ہیں اس لیے نظر انداز کر دی گئیں، عام تشریحات کتب تفسیر و حدیث میں اور شاہ رفیع الدین دہلوی نور اللہ مرقدہ کے رسالہ "علامات قیامت" میں قابل مطالعہ ہیں۔

وانہ راجعٌ الیکم قبل یوم القیٰمۃ تمہاری جانب لوٹ کر آئینگے۔

اسی طرح ابن ابی حاتم اور ابن جریر (رحمہما اللہ) نے سورۂ نسا، کی آیات متعلقہ وفد نجران کی تفسیر کرتے ہوئے اصولِ حدیث کے نقطۂ نظر سے بہ سندِ حسن ایک طویل روایت ربیع بن انس رح سے نقل کی ہے اس میں بھی بصراحت یہ مذکور ہے۔

فقال لھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم الستم تعلمون ان ربنا حیٌّ لایموت وان عیسیٰ یأتی علیہ الفناء[1]	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد سے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ بلاشبہ ہمارا پروردگار زندہ ہے جس کے لیے موت نہیں ہے اور بلاشبہ عیسیٰ علیہ السلام کو فنا (موت) سے دوچار ہونا ہوگا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس جگہ لفظ "یأتی" فرمایا ہے جو مستقبل کے لیے بولا جاتا ہے لفظ "اتی" نہیں فرمایا جو ماضی کے لیے مخصوص ہے۔

اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں اور محدث علی متقی گجراتی نے کنز العمال میں باسناد حسن وصحیح اس سلسلہ میں جو روایات نقل فرمائی ہیں اُن میں نزولِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے ذکر کے ساتھ "من السماء" کا لفظ صراحت سے موجود ہے[2]۔

یا اور اسی قسم کا کثیر ذخیرۂ حدیث ہے جو حیات ونزولِ عیسیٰ بن مریم پیغمبر بنی اسرائیل (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے متعلق کتبِ حدیث وتفسیر میں منقول ہے اور جو قوتِ سند کے لحاظ سے صحیح اور حسن سے کم رتبہ نہیں رکھتا اور باعتبار شہرت وتواترِ روایات جن کا یہ حال ہے کہ حسب تصریح امام ترمذی، حافظ حدیث عماد الدین ابن کثیر، حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی اور دیگر ائمہ حدیث سولہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو روایت کیا ہے جن میں سے بعض صحابہ کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصریحات سیکڑوں صحابہ کے مجمع میں خطبے دے کر فرمائیں اور یہ صحابۂ کرام بغیر کسی انکار واجنبیت کے ان روایات کو خلفاء راشدین (رضی اللہ عنہم) کے دورِ خلافت میں علیٰ رؤس الاشہاد سُناتے تھے چنانچہ ان جلیل القدر صحابہ

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۵ [2] کتاب الاسماء والصفات صفحہ ۳۰۱ و کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۲۶۸

(رضی اللہ عنہ) سے جن ہزارہا شاگردوں نے سنا اُن میں سے یہ عظیم المرتبہ ہستیاں قابل ذکر ہیں جن میں ہر فرد روایتِ حدیث میں ضبط وحفظ، ثقاہت، علمی تبحر کے پیش نظر امامت وقیادت کا درجہ رکھتا ہے۔ مثلاً سعید بن المسیب، نافع مولیٰ ابو قتادہ، حنظلہ بن علی الاسلمی، عبدالرحمٰن بن آدم، ابو سلمہ، ابو عمرہ، عطاء بن یسار، ابو سہیل، مؤثر بن عفارہ، یحییٰ بن ابی عمرو، جبیر بن نضیر، عروہ بن مسعود ثقفی، عبداللہ بن زید انصاری، ابو زرعہ، یعقوب بن عاصم، ابو نضرہ، ابو الطفیل (رحمہم اللہ)

پھر ان علماءِ کبار اور محدثینِ اعلام سے جن بے شمار تلامذہ نے سنا اُن میں سے راویانِ حدیث کے طبقہ میں جن کو حدیث اور علوم قرآن کا رتبۂ بلند حاصل ہے اور جو اپنے وقت کے "امام فی الحدیث" اور "امیر المومنین فی الحدیث" تسلیم کیے گئے ہیں، بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں:۔ ابن شہاب زہری، سفیان بن عیینہ، لیث، ابن ابی ذئب، اوزاعی قتادہ، عبدالرحمٰن بن ابی عمرہ، سہیل، جبلہ بن سحیم، علی بن زید، ابو رافع، عبدالرحمٰن بن جبیر، نعمان بن سالم، معمر، عبداللہ بن عبیداللہ (رحمہم اللہ)

غرض ان روایات واحادیثِ صحیحہ کا صحابہ، تابعین، تبع تابعین یعنی خیر القرون کے طبقات میں اس درجہ شیوع ہو چکا تھا اور وہ بغیر کسی انکار کے اس درجہ لائق قبول ہو چکی تھیں کہ ائمہ حدیث کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات ونزول سے متعلق ان احادیث کو مفہوم ومعنی کے لحاظ سے درجۂ "تواتر" حاصل تھا اور اسی لیے وہ بے جھجک اس مسئلہ کو "احادیث متواترہ" سے ثابت اور مسلّم کہتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ روایتِ حدیث کے تمام طبقات ودرجات میں ان روایات کو "تلقی بالقبول" کا یہ درجہ حاصل رہا ہے کہ ہر دور میں اس کے رواۃ میں "ائمہ حدیث" اور روایت حدیث کے "مدار" نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان مرفوع وموقوف بر صحابہ (رضی اللہ عنہم) احادیث وروایات کے ناقلین میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ جیسے

اصحاب صحیح و سنن ائمہ حدیث کے اسماءِ گرامی شامل ہیں اور وہ باتفاق ان روایات کی صحت و حسن کے قائل ہیں۔ چنانچہ یہ اور اسی قسم کی احادیث صحیحہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور محدث و مفسر ابن کثیر اپنی تفسیر میں اوّل یہ عنوان قائم کرتے ہیں۔

ذکر الاحادیث الواردة فی نزول عیسیٰ بن مریم علیہما الصلوٰة والسلام الی الارض من السماء فی آخر الزمان قبل یوم القیٰمة[1]	اُن احادیث کا ذکر جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے آسمان سے زمین پر اترنے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

اور اس کے بعد سلسلہ کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

فھٰذہ احادیث متواترة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من روایة ابی ھریرة وابن مسعود وعثمان بن العاص وابی امامة والنواس بن السمعان وعبد اللہ بن عمرو بن العاص ومجمع بن حارثة وابی شریحة وحذیفة بن أسید رضی اللہ عنھم وفیھا دلالة علی صفة نزولہ ومکانہ[2]	پس یہ ہیں وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے درجہ تک منقول ہوئی ہیں اور یہ نقل روایت (آپ کے صحابہ) ابوہریرہ، ابن مسعود، عثمان بن العاص، ابوامامہ، نواس بن سمعان، عبداللہ بن عمرو بن العاص، مجمع بن حارثہ، ابی شریحہ حذیفہ بن اسید (رضی اللہ عنہم) سے ثابت ہے۔ اور ان روایات میں عیسیٰ بن مریم کے طریقۂ نزول اور مکانِ نزول سے متعلق بھی رہنمائی موجود ہے

اور حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی (نور اللہ مرقدہٗ) علّامہ ابوالحسین آبری (رحمہ اللہ) سے نزول عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق احادیث کے تواتر کو فتح الباری میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

قال ابوالحسن الخسعی الابری	ابوالحسن خسعی ابری سے منقول ہے کہ احادیث رسول

---

[1] تفسیر جلد اول ابن کثیر ص ۵۸۲ [2] ص ۵۷۸

بان المهدی من هذہ الامة وان عیسیٰ یصلی خلفہ الخ[1]

اس بارہ میں تواتر کو پہنچ چکی ہیں کہ مہدی اسی اُمت میں سے ہونگے اور عیسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے نماز پڑھینگے

اور تلخیص الجبیر کتاب الطلاق کے ضمن میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

واما رفع عیسیٰ فاتفق اصحاب الاخبار والتفسیر علی انہ رفع ببدنہ حیاً الخ

لیکن رفع عیسیٰ (علیہ السلام) کا معاملہ تو تمام علماء حدیث وتفسیر کا اس پر اجماع ہے کہ وہ اپنے جسد عنصری کے ساتھ ہنوز زندہ ہیں (اور وہی قریب قیامت نازل ہونگے)

اور محدث عصر محقق وقت علامہ سید محمد انور شاہ "عقیدۃ الاسلام" میں اس "تواتر" کی تائید میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

وللمحدث العلامۃ الشوکانی رسالۃ سماھا التوضیح فی تواتر ما جاء فی المنتظر والدجال والمسیح ذکر فیہا تسعۃ وعشرین حدیثاً فی نزولہ علیہ السلام ما بین صحیح وحسن وصالح ھذا وازید منہ مرفوع واما الآثار فتفوت الاحصاء الخ[2]

اور محدث علامہ شوکانیؒ نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے جس کا نام یہ رکھا ہے "التوضیح فی التواتر ما جاء فی المنتظر والدجال والمسیح" اس رسالہ میں انہوں نے انتیس[3] احادیث حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول سے متعلق نقل کی ہیں جو اصول حدیث کے لحاظ سے صحیح، حسن، صالح تینوں درجات کو شامل ہیں، اور مرفوع احادیث اس تعداد سے بھی زیادہ موجود ہیں اور آثار صحابہ (رضی اللہ عنہم) تو بے شمار ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی اور حیات ونزول من السماء پر اُمتِ محمدیہ (علیہا الصلوٰۃ والسلام) کا اجماع منعقد ہو چکا ہے چنانچہ علم عقائد وکلام کی مشہور ومستند کتاب عقیدۂ سفارینی میں امت کے اس اجماع کی تصریح موجود ہے

---

[1] جلد ۶ ص ۳۸۵ [2] صفحہ ۴ [3] حضرت اُستاذ کا یہ رسالہ اپنے موضوع میں بے نظیر تصنیف ہے۔ عربی زبان میں تحریر ہے اور علماء وطلبہ دونوں کے لیے لائق مطالعہ ہے مصنف قصص القرآن اس سلسلہ کے اکثر مباحث میں اسی رسالہ کا خوشہ چین رہا ہے۔

ومنها ای من علامات الساعة	اور علامات قیامت میں سے تیسری علامت یہ ہے کہ
العظمیٰ العلامة الثالثة ان	حضرت (مسیح) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) آسمان سے
ینزل من السماء سید (المسیح)	اتریں گے اور ان کا آسمان سے اترنا کتاب (قرآن)
عیسیٰ بن صاحبہ (علیہ السلام)	سنت (حدیث) اور اجماع امت سے قطعاً ثابت ہے
ونزوله ثابت بالکتاب والسنة	...... (قرآن و حدیث سے نزول ثابت
واجماع الامة .... واما	کرنے کے بعد فرماتے ہیں) جہاں تک اجماع امت
الاجماع فقد اجمعت الامة علیٰ	کا تعلق ہے تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ
نزوله ولم یخالف فیه احد من	السلام کے آسمان سے نازل ہونے پر امت کا اجماع
اهل الشریعة وانما انکر ذلك	ہے اور اس بارہ میں پیروان شریعت اسلامی میں سے
الفلاسفة والملاحدة ممالا	کسی ایک کا بھی خلاف موجود نہیں البتہ فلسفیوں اور
یعتد بخلافه[1]	ملحدوں نے نزول عیسیٰ کا انکار کیا ہے اور اسلام میں ان
	کا انکار قطعاً بے وقعت ہے۔

حیات و نزول مسیح کی حکمت

گزشتہ سطور میں حیات و نزول مسیح (علیہ السلام) کو دلائل و براہین کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جو ایک منصف اور طالب حق کو علم یقین عطا کرتے ہیں، اب مزید طمانیتِ قلب کے لیے ان چند حکمتوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو علماءِ حق نے اس سلسلہ میں بیان فرمایا ہے لیکن اس کے مطالعہ سے قبل یہ حقیقت بہرحال پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کی مشیت کی مصلحتوں کا احاطہ عقل انسانی کے لیے ناممکن ہے اور مخلوق، خالقِ کائنات کے اسرار و حِکَم پر عبور بھی کیسے کر سکتی ہے؟ تاہم

[1] صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے تین زمانوں کو "خیر القرون" کہا جاتا ہے چونکہ نبی معصوم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان تینوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے "خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونهم. ثم الذین یلونهم" سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا جو اس زمانہ سے قریب ہیں اور پھر ان کا جو اس دوسرے زمانہ سے متصل ہیں، اور اس کے بعد فرمایا "پھر جھوٹ کی کثرت ہو جائیگی یعنی ان ہر سہ ادوار کے بعد اکثریت کے اندر دینی انحطاط پیدا ہو جائیگا

علماءِ امت فراستِ مومن اور علمِ حق کی راہ سے دین اور احکامِ دین کے اسرار و مصالح پر قلم فرسائی کرتے اور اپنی محدود دسترس کے مطابق اس موضوع پر علمی حقائق کا اظہار کرتے آئے ہیں۔

اسلامی دور کی علمی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دورِ اول میں "علم الاسرار" کی امامت کا شرف عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب اور صدیقہ عائشہ (رضی اللہ عنہم) کو حاصل تھا اور اس کے بعد اگرچہ ہر ایک صدی میں دو چار علماءِ ربانی اس کے ماہر و محقق رہے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ خلیفۂ اموی عمر بن عبدالعزیز، امام ابوحنیفہ، علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصر، حافظ ابن تیمیہ، امام غزالی، رومی، سید مرتضیٰ زبیدی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کو اس علم سے خاص مناسبت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا تھا۔

بہر حال "حکمت" کی حیثیت لطائف و نکات کی ہوتی ہے اور اس کو دلیل و حجت کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا اس لیے زیرِ بحث مسئلہ میں بھی "حکمت و مصلحت" کا ذکر اسی نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب و بکل شئ عندہ فصل الخطاب"

(۱) یہود بنی اسرائیل اپنی مذہبی کتابوں کی پیشینگوئیوں اور بشارتوں میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ان کو دو شخصیتوں "مسیح ہدایت" اور "مسیح ضلالت" سے سابقہ پڑیگا اس لیے وہ منتظر تھے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد "مسیح ہدایت" کا ظہور کب ہوتا ہے لیکن شوخیٔ قسمت کہ جب مسیح ہدایت کا ظہور ہوا تو انہوں نے بغض و حسد کی راہ سے اس کو "مسیح ضلالت" کہہ کر رد کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ آمادۂ قتل ہو گئے، اور چونکہ قتلِ انبیاء ان کا دستور رہا تھا اس لیے وہ اس پر ہر وقت جری رہتے تھے، پس جبکہ وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ان کے قتل کے بھی قائل ہو گئے تو یہ تعجب خیز بات نہ ہوئی کہ جب مسیحِ ضلالت (دجال) کا خروج ہو تو یہود اس کو مسیحِ ہدایت کہہ کر قومی حیثیت سے اس کے

پیرو ہو جائیں کیونکہ مذہبی تعلیم کے پیشِ نظر اُن پر مسیح ہدایت کا اتباع ضروری تھا اور جب وہ مسیح ہدایت کو مسیح ضلالت کہہ کر قتل کر چکے تو اب مسیح ضلالت کو ہی اُس کے دعوے کے مطابق مسیح ہدایت تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائینگے مگر مشیت الٰہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مسیح ضلالت کی گمراہی کا فتنہ چونکہ عظیم الشان ہوگا اور وہ اوّل خدائی کا دعویٰ کریگا اور اُس کے بعد مسیح ہدایت بنیگا اس لیے اُس کا خروج قیامت کے قریب ہی ہونا چاہیے جو دورِ فتن یعنی فتنوں کی آماجگاہ ہوگا اس لیے حکمتِ الٰہی کا یہ بھی منشاء ہوا کہ "مسیح ہدایت" کو یہود کے فتنہ سے اس طرح بچا لیا جائے کہ وہ اُس کو ہاتھ بھی نہ لگا سکیں اور جب وہ وقت آپہنچے کہ مسیح ضلالت اپنی گمراہی کا علم بلند کرے تو مسیحِ ہدایت ملاءِ اعلیٰ سے کائناتِ ارضی پر اُترے اور یہودی بنی اسرائیل جو کہ بہ تعداد کثیر مسیح ضلالت کے پیرو ہو رہے ہونگے اپنی آنکھوں سے حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں اور جب مسیح ہدایت کے مقدس ہاتھوں سے مسیح ضلالت کا خاتمہ ہو جائے تو "جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا" حق الیقین بن کر ان کی نگاہوں کے سامنے آجائے اور اس طرح قبولِ حق کے ماسوا اُن کے لیے دوسرا چارۂ کار باقی ہی نہیں رہے اور یا پھر وہ بھی مسیح ضلالت کے ساتھ "فی النار" کر دیے جائیں

نیز یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ ادیان و ملل کی تاریخ میں صرف یہود ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے اپنے انبیاء (علیہم السلام) کو بھی قتل کرنے سے ہاتھ نہیں روکا لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد یہود نے جن انبیاء کے خونِ ناحق سے ہاتھ رنگے تھے وہ صرف نبی ہی تھے جو "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" کا مصداق تھے مگر کوئی صاحبِ شریعت رسول اُن کے اس قتلِ ناحق کا مظلوم نہیں بنا تھا اس لیے یہ پہلا موقعہ تھا کہ انھوں نے ایک جلیل القدر رسول (عیسیٰ بن مریم) کو قتل کرنے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے مکمل طیاری کر لی تھی تب مشیتِ حق نے یہ فیصلہ کیا کہ مسیح ہدایت کو اس طرح بچا لیا جائے کہ خود یہود کو بھی محسوس ہو جائے کہ وہ مسیح بن مریم پر دسترس

جا سکے، لہٰذا فیصلۂ مشیت بروئے کار آیا اور حضرت مسیح کو ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور تمام دیوی اسباب ہیچ ہو کر رہ گئے لیکن اس احساس کے باوجود چونکہ حقیقت حال تک نہ پہنچ سکے اور ظن وگمان ہی کے قعر میں پڑے رہے گو اپنی بات رکھنے کے لیے مشہور یہی کرتے رہے کہ ہم نے مسیح بن مریم کو قتل کر دیا، ادھر متبعین مسیح ہدایت (نصاریٰ) کی بدبختی دیکھیے کہ کچھ عرصے کے بعد پولوس رسول نے اُن میں عقیدۂ تثلیث وکفارہ کی بدعت پیدا کر کے یہود کے گڑھے ہوئے افسانۂ صلیب کو بھی داخلِ عقیدہ کر دیا، اور اب یہود و نصاریٰ دونوں جماعتیں اس گمراہی میں مبتلا ہو گئیں کہ عیسیٰ بن مریم صلیب پر چڑھا کر قتل کر دیے گئے۔ تب قرآنِ عزیز نے نازل ہو کر حق و باطل کے درمیان فیصلہ سنایا اور حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق دونوں جماعتوں نے جو الگ الگ رُخ اختیار کیے تھے اور پھر ایک مسئلہ میں دونوں کا اتفاق بھی ہو گیا تھا اُن سب کے متعلق علم یقین کے ذریعہ حقیقت حال کو واشگاف ، اور دونوں کی گمراہی کو واضح کر کے قبولِ حق کے لیے دعوت دی مگر جماعتی حیثیت سے دونوں نے انکار کر دیا اور حضرت مسیح سے متعلق اپنے اپنے گمراہ کُن عقیدہ پر قائم رہے، مگر عالم الغیب والشہادہ چونکہ ان حقائق کا اُن کے وقوع سے قبل عالم و دانا تھا اس لیے اُس کی حکمت کا یہ بھی تقاضا ہوا کہ مسیح ہدایت کو کائناتِ ارضی پر اُس وقت دوبارہ بھیجا جائے جب مسیح ضلالت کا بھی خروج ہو چکے تاکہ یہود و نصاریٰ کے سامنے حقیقتِ حال مشاہدہ کے درجہ میں روشن ہو جائے، یہود آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس کے قتل کے مدعی تھے قدرتِ الٰہی کے کرشمے کی بدولت وہ بقیدِ حیات موجود ہے اور نصاریٰ نادم ہوں کہ حضرت مسیح کی سچی پیروی چھوڑ کر جو گمراہ کُن عقیدہ اختیار کیا تھا وہ سرتاپا باطل اور ہیچ تھا اور اس طرح ہدایت و ضلالت کے معرکہ میں حق کی سربلندی اور باطل کی پستی کا دونوں مشاہدہ کر کے قرآنِ عزیز کی تصدیق پر مجبور ہو جائیں اور دونوں جماعتیں ایمانِ حق کو برضاء و رغبت اختیار کر لیں اور اپنے باطل

عقائد پر شرمسار و سرنگوں ہو جائیں ۔ اور چونکہ ان دونوں جماعتوں کے علاوہ ہدایت و ضلالت کا یہ مشاہدہ و مظاہرہ دوسرے اہل باطل بھی کرینگے اس لیے وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائینگے اور اس طرح احادیثِ صحیحہ کے مطابق اُس زمانہ میں کائناتِ ارضی کا صرف ایک ہی مذہب ہوگا اور وہ "اسلام" ہوگا "ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ۔ دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلّہ وکفیٰ باللہ شہیدا"

(۳) ادیان و ملل کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام اور معاندینِ حق کے درمیان "سنۃ اللہ" کے دو مستقل دور رہے ہیں۔ پہلا دور حضرت نوح (علیہ السلام) سے شروع ہو کر حضرت لوط (علیہ السلام) پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں سنۃ اللہ یہ رہی کہ جب قوموں نے اپنے پیغمبروں کی صدائے حق پر کان نہ دھرا بلکہ برابر اُس کا تمسخر کرتی اور اُس کے پیغامِ حق کے آڑے آتی رہیں، تب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے اُن کو ہلاک کر دیا اور دوسروں کے لیے اُن کو باعثِ عبرت و بصیرت بنا دیا۔ اور دوسرا دور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر خاتم الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اس دور میں سنت اللہ کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب اعدائِ حق اور دشمنانِ دین قوم نے کلمۂ حق کی مخالفت پر اصرار کیا، اپنے پیغمبروں کو ایذا دی اور اُن کے ساتھ تمسخر کو اپنا نصب العین بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن قوموں کو ہلاک کرنے کی بجائے اپنے پیغمبروں کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی راہ میں وطن چھوڑ دیں اور "ہجرت" کر جائیں چنانچہ حضرت ابراہیم پہلے پیغمبر ہیں جنھوں نے قوم[1] کے سامنے یہ اعلانِ حق کیا "انی مھاجر الی ربی انہ ھو العزیز الحکیم" اور عراق سے شام کی جانب ہجرت فرما گئے۔

پھر یہی صورت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو پیش آئی اور وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے شام کو ہجرت کر گئے مگر فرعون اور اُس کے لشکریوں نے چونکہ مزاحمت کی اور

[1] یہ حضرت ابراہیم کی اپنی قوم نہیں تھی اس لئے کہ یہ بنی سام (سامی) تھے اور غارۂ عراق اور انکی قوم بنی حام (حامی) تھے

ہجرت کے بھی آڑے آئے اس لیے وہ بحرِ قلزم میں غرق کر دیے گئے۔

اور یہی صورت نبی اکرم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیش آئی کہ جب قریش مکہ نے اذیت، تمسخر، دینِ حق کے تصادم، اعمال دین کی مزاحمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تب مشیتِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ آپ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر جائیں چنانچہ ہر قسم کی نگرانی اور مکان کے ہر طرف محاصرہ کے باوجود کرشمۂ قدرت سے آپ محفوظ و مامون مدینہ ہجرت کر گئے۔

"سنت اللہ" کے اسی دور میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت ہوئی اور اُن کی قوم بنی اسرائیل نے اُن کے ساتھ اور اُن کی دعوتِ حق کے ساتھ بھی وہ سب کچھ کیا جو معاندینِ حق اور دشمنان دین اپنے پیغمبروں کے ساتھ کرتے رہے تھے اور ان میں ایک یہ خصوصیت زیادہ بھی کہ وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) سے قبل چند انبیاء کو قتل تک کر چکے تھے اور اب حضرت مسیح کے قتل کے درپے تھے، اسی کے ساتھ یہ مسطورہ بالا حقیقت بھی فراموش نہیں رہنی چاہیے کہ یہود، مسیحِ ہدایت اور مسیح ضلالت دو مسیح کے منتظر تھے، اور حضرت عیسیٰ بن مریم کو مسیح ضلالت قرار دے کر آج بھی مسیح ہدایت کے منتظر ہیں۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ہجرت کائنات ارضی کی بجائے ملاءِ اعلیٰ کی جانب ہو تاکہ مقررہ وقت آنے پر وہ مسیح ہدایت اور مسیحِ ضلالت کے درمیان مشاہدہ سے امتیاز کر سکیں اور ایک جانب اگر مسیح ہدایت کو مسیح ہدایت سمجھیں تو دوسری جانب قرآن کے فیصلۂ حق کی صداقت و حقانیت کو دیکھ کر دینِ حق "اسلام" کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی اپنی جہالت اور یہود کی کورانہ تقلید پر ندامت ہو اور وہ بھی تعلیم قرآن کی صداقت پر یقین و اعتقاد کے ساتھ شہادت دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

کچھ عجیب صورتِ حال ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) اور خاتم الانبیاء محمد

(صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان دعوت و تبلیغِ حق، اور معاندین کی جانب سے حق کی معاندت و مخالفت، اور پھر اُس کے نتائج و ثمرات میں بہت ہی زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے، دونوں کی اپنی قوم نے دونوں کو جھٹلایا، دونوں کی قوتوں نے سازشِ قتل کے بعد مکانوں کا محاصرہ کیا، قدرتِ حق کے کرشمۂ اعجاز نے دونوں کو دشمنوں کی دسترس سے ہر طرح محفوظ رکھا، دونوں کے لیے ہجرت کا معاملہ پیش آیا، البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ بعثتِ عامہ تھی اور اُس کی دعوت و تبلیغ کے لیے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کرۂ ارضی پر قیامِ مسلسل ضروری تھا اس لیے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا حکم ہوا اور عیسیٰ بن مریم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) چونکہ قوم کو دعوتِ حق پہنچا چکے تھے اور ایک خاص مقصدِ عظیم کے پیشِ نظر اُن کا مدت مدید کے بعد کائناتِ پر موجود ہونا ضروری تھا اس لیے اُن کو ہجرتِ ارضی کی بجائے ہجرتِ سماوی پیش آئی پھر جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے قائدِ ضلالت "اُمیہ بن خلف" کو اپنے حربہ سے قتل کیا عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) بھی اپنی قوم کے مسیح ضلالت دجال کو قتل کرینگے اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد آپ کے وطن مکہ پر قدرتِ حق نے اقتدار عطا فرما دیا عیسیٰ بن مریم کا نزول بھی شام ہی کے اُس مشہور شہر میں ہوگا جس سے اپنی قوم کی معاندانہ سازشوں کی بنا پر ملاءِ اعلیٰ کی جانب ہجرت پیش آئی تھی اور بیت المقدس، دمشق اور شام کے پورے ملک پر یہود کے علی الرغم اُن کی حکومت ہوگی[1]

(۳) حضرت مسیح (علیہ السلام) سے پہلے قتلِ انبیاء (علیہم السلام) نے یہود کو اس درجہ گستاخ اور بے باک بنا دیا تھا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی ہستی کے متعلق فیصلہ کہ وہ نبیِ صادق ہے یا متنبیِ کاذب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس کو ہم اور ہمارے "فقیہ" "کاذب" قرار دیدیں

---

[1] خلاصہ از عقیدۃ الاسلام۔

وہ واجب القتل ہے چنانچہ اسی زعم باطل میں انہوں نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مسیح ضلالت کہا اور اُن کے فقیہوں نے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حالانکہ یہ وہ جلیل القدر ہستی تھی کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بنی اسرائیل میں اس پایہ کا کوئی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا تھا اور اس نے جدید پیغامِ حق (انجیل) کے ذریعہ روحانیت کی مردہ کھیتی میں دوبارہ جان ڈال دی تھی تب اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل کے اس زعم باطل کو پاش پاش کر دیا جائے اور دکھا دیا جائے کہ رب العلمین، خالقِ کائنات جس کی حفاظت کا وعدہ کرلے کائنات کی کوئی ہستی یا مجموعۂ کائنات بھی اُس پر دسترس نہیں پا سکتی چنانچہ یدِ قدرت نے اُس وقت اُس مقدس ہستی کو جسدِ عنصری کے ساتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لیا جب کہ مکان کے محاصرہ کے ساتھ دشمنوں نے اُس کی حفاظتِ جان کے تمام وسائلِ دنیوی مسدود کر دیئے تھے۔

پھر اس واقعہ نے ایک نئی صورت پیدا کر دی وہ یہ کہ مذاہب کی تاریخ میں صرف حضرت مسیح (علیہ السلام) ہی کی شخصیت ایسی ہے جن کے قتل و عدم قتل سے متعلق حق و باطل کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوا اور یہود و نصاریٰ کے باہم واقعۂ صلیب و قتل پر اتفاق کے باوجود دو باطل اور متضاد عقائد کی کشمکش نظر آنے لگی، یہود قتل و صلیب کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے نزدیک وہ "مسیح ضلالت" تھے اور نصاریٰ وجہ صلیب یہ بتلاتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے تھے جو کائنات کے گناہوں کا کفارہ بننے کے لیے بھیجے گئے تھے تاکہ پاپی دنیا پاپ سے پاک ہو جائے۔ اور صدیوں بعد جب قرآن نے "امرِ حق" کو واضح اور مسیح بن مریم سے متعلق حقیقتِ حال کو روشن کیا تب بھی دونوں جماعتوں نے جماعتی حیثیت سے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا قدرتِ حق کا فیصلہ ہوا کہ خود مسیح بن مریم (علیہما السلام) ہی وقتِ موعود پر نازل ہو کر قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کر دیں اور یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد کا خود بخود اس طرح

خاتمہ ہو جائے اور اس کے بعد مدعیانِ اہل کتاب کو شرک و باطل کی پیروری کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور خدا کی حجت اُن پر تمام ہو جائے۔

نیز جبکہ اللہ تعالیٰ نے کائناتِ ہست و بود کے لیے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خدا کی ہستی کو کے ماسوا ہر ایک وجود کو فنا اور موت ہے "کل نفسٍ ذائقۃ الموت" "کل شیءٍ ھالکٌ الا وجہہ" اور یہ ظاہر ہے کہ ملاءِ اعلیٰ اور عالم قدس مقامِ موت نہیں ہے بلکہ مقامِ حیات ہے اس لیے ازبس ضروری ہے کہ عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) بھی موت کا ذائقہ چکھیں اور اس کے لیے کائناتِ ارضی پر اُتریں تاکہ زمین کی امانت زمین ہی کے سپرد ہو اس لیے "حیات و رفع" کے بعد "نزول ارضی" مقدر ہوا۔

علماءِ حق نے حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق "اسرار و حکم" بیان فرمائے ہیں یہاں اُن کا احاطہ مقصود نہیں ہے اس لیے مختصر چند حکمتوں کا ذکر کر دیا گیا ورنہ محدث عصر علامہ سید محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ نے اس سلسلہ میں ایک طویل مقالہ عقیدۃ الاسلام میں سپردِ قلم فرمایا ہے جو لائقِ مطالعہ ہے، حضرت اُستاذ نے نہایت لطیف مگر دقیق پیرایۂ بیان میں کائناتِ عالم کو "انسانِ کبیر" اور انسان کو "عالم صغیر" قرار دے کر ان ہر دو عالم کی حیات و موت پر جو بحث فرمائی ہے اُس سے حضرت مسیح کے رفع اور قربِ قیامت میں کائناتِ ارضی کی جانب رجوع کی حکمت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے لیکن یہ کتاب چونکہ اس دقیق بحث کی متحمل نہیں ہے اس لیے اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔

آخر میں اب اپنی جانب سے چند جملے اس سلسلہ میں اضافہ کر کے اس مبحث کو ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۴) قرآنِ عزیز میں "میثاقِ انبیاء" سے متعلق یہ ارشادِ باری ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ — اور وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ اللہ نے نبیوں سے

؂ فتح الباری جلد ۶

لَمَآ اٰتَيْتُكُم مِّن كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ	(یہ) عہد لیا کہ جب تمہارے پاس (خدا کی جانب سے)
ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ	کتاب اور حکمت آئے پھر ایسا ہو کہ تمہاری موجودگی میں ایک
لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ	رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آئے جو تصدیق کرتا ہو اُن کتابوں
لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ	کی جو تمہارے پاس ہیں، ضرور تم اُس پر ایمان لانا اور ضرور
وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ	اُس کی مدد کرنا، اللہ نے کہا: کیا تم نے اقرار کیا، انہوں
قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا	نے جواب دیا ہاں ہم نے اقرار کیا، اللہ نے کہا: پس
وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ	تم اپنے اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ
(آل عمران)	ہوں۔

آلِ عمران کی اِن آیات میں حسبِ تفسیر حضرت ابن عباسؓ (رضی اللہ عنہما) اُس عہد و پیمان کا تذکرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیاء و رسل (علیہم السلام) سے لیا، قرآن کے اسلوبِ بیان کے مطابق اگرچہ یہ خطاب انبیاء و رسل کی معرفت اُن کی اُمتوں سے تھا کہ اُن میں سے جو اُمتیں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ مبارک پائیں تو اُن پر ایمان لائیں اور دعوتِ حق میں ان کی نصرت و یاری کریں، چنانچہ ہر ایک پیغمبر نے اپنے اپنے دور میں تعلیمِ حق کے ساتھ ساتھ خدا کے اس وعدہ کو بھی یاد دلایا اور اُن میں سے اہلِ حق نے وعدہ دیا اور اقرار کیا کہ ضرور اُن پر

لہ عن علی وابن عباس فی تفسیر آیۃ "مابعث اللہ نبیًا من الانبیاء الا اخذ علیہ المیثاق لئن بعث اللہ محمدًا وھو حی لیؤمنن بہ ولینصرنہ وامرہ ان یاخذ المیثاق علی امتہ لئن بعث محمد وھم احیاء لیؤمنن بہ ولینصرنہ. (تفسیر ابن کثیر جلد ۱)	اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے جس نبی کو بھی کسی قوم کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا تو اُس سے یہ عہد ضرور لیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اُس وقت زندہ ہو جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگی تو تم ضرور اُس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا اور ان سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی اپنی اُمتوں سے بھی یہی عہد و پیمان لیں کہ اُن میں سے جو اس وقت موجود ہوں وہ اُس پر ایمان لائیں اور اُس کی مدد کریں

ایمان لائینگے اور پیغام حق میں اُن کی مدد کرینگے۔

تو یہ "میثاق النبیین" اگرچہ اس طرح پورا ہوتا رہا تاہم ازل میں چونکہ اس عہد و میثاق کے اول مخاطب حضراتِ انبیاء و رسل تھے اس لیے اس میثاق کی عملی حیثیت کا تقاضا تھا کہ خود انبیاء و رسل میں سے بھی کوئی نبی یا رسول اس عہد و میثاق کا عملی مظاہرہ کر کے دکھلائے تاکہ یہ خطاب اولیں براہِ راست بھی موثر ثابت ہو کیونکہ "ثم جاءکم رسول" میں بقاعدۂ عربیت خطاب تھا اُن انبیاء و رسل سے جو ذاتِ اقدس سے پہلے اس کائناتِ ارضی میں مبعوث ہونے والے تھے کیونکہ ازل ہی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کے لیے یہ مقرر ہو چکا تھا" وَلٰکن رسول اللہ وخاتم النبیین" پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت" خاتم النبیین" اور ازل سے مقدر" میثاق النبیین" کا اجتماع صرف اسی ایک شکل میں ممکن تھا کہ انبیاء سابقین میں سے کوئی ایک پیغمبر بعثتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نزولِ فرمائیں اور وہ اور ان کی اُمت دنیاءِ انسانی کے سامنے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور دینِ حق کی مدد و نصرت کا مظاہرہ کریں تاکہ" لتؤمنن بہ ولتنصرنہ" کا وعدۂ حق پورا ہو۔

گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو چکی ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء و رسل اپنے اپنے زمانہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارات دیتے چلے آتے تھے لیکن یہ خصوصیت حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ہی کے حصہ میں آئی کہ وہ ذاتِ اقدس کی بعثت کے لیے تمہید اور براہِ راست منادی و مبشر بنے اور بنی اسرائیل کو تعلیم حق دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا" اِنی رسول اللہ الیکم مصدقاً لما بین یدیّ من التوراۃ ومبشراً برسولٍ یأتی من بعد اسمہ احمد" اور حقیقت یہ ہے کہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہی کا یہ حق تھا کہ وہ خاتم الانبیاء والرسل کی بعثت کا "منادی" اور "مبشر" ہو۔ اس لیے حکمتِ ربانی کا یہ فیصلہ ہوا کہ" میثاق النبیین" کی وفا کے لیے اُن ہی کو منتخب کیا جائے اور اس معاملہ میں وہی تمام انبیاء و رسل کی نمائندگی کریں تاکہ امتوں کی جانب سے ہی نہیں بلکہ براہِ راست انبیاء و رسل کی جانب سے وفاءِ عہد کا عملی مظاہرہ

ہوسکے اسی حقیقت کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا "انا اولی الناس بعیسیٰ بن مریم والانبیاء اولاد علات لیس بینی وبینہ نبی"

مگر قرآن چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے اور "انا لہ لحافظون" کے وعدۂ الٰہی نے رہتی دنیا تک اس کو تحریف سے محفوظ کر دیا ہے اس لیے قدرتی طور پر اس کی تعلیم کے ثمرات دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مقابلہ میں مدتِ طویل تک اپنا کام کرتے رہینگے اور اُس کی روشنی سے قلوب کو گرمانے اور طاعتِ ربانی کے لیے مشتعل کرنے کے لیے "علماءِ امت" انبیاء بنی اسرائیل کی طرح خدمتِ حق انجام دیتے رہینگے لیکن جب بعثت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گذرے ہوئے بہت ہی طویل عرصہ ہو جائیگا اور اُمتِ مرحومہ کے علمی قومی اور اجتماعی اعضاء میں انتہائی اضمحلال پیدا ہو کر یہ کیفیت ہو جائیگی کہ اُن کی بیداری اور تیز روی کے لیے صرف علماءِ حق کی روحانیت ہی کافی ثابت نہیں ہوگی وہ وقت اس کا متقاضی ہوگا کہ کوئی "قائم بالحجۃ" اُن کو سنبھالے اور اس لیے مشیتِ الٰہی نے مقدر کیا کہ جو ہستی (عیسیٰ بن مریم) انبیاء و رسل کے میثاقِ ازل کی نمائندگی کے لئے مامور ہے اُس کا ایسے ہی وقت نزول ہو اور وہ اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رہ کر ذاتِ اقدس کی نیابت اور اُمت کی امامت کا فرض انجام دے اور "لتومنن بہ ولتنصرنہ" کا عملی مظاہرہ کر کے دکھلائے۔

اب کرشمۂ قدرت دیکھیے کہ ازل کے اِن مقدرات نے جو کہ ملاءِ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے کائناتِ ارضی میں کس طرح اپنی بساط بچھائی؟ بنی اسرائیل اپنے جلیل القدر پیغمبر کے قتل کے لیے سازش مکمل کر چکے ہیں، شاہی دستہ چہار جانب سے مکان کو محصور کیے ہوئے ہے مگر قدرتِ حق اپنا کام اس طرح نہیں کرتی کہ معجزانہ کرشمہ کے ذریعہ اُن کو محفوظ وہاں سے نکال کر خدا کی وسیع زمین کے دوسرے حصہ میں "ہجرت" کرا دیتی، نہیں، بلکہ ہوا یہ کہ اُن کو ملاءِ اعلیٰ کی ہجرت کے لیے محفوظ و مامون زندہ اُٹھا لیا اور سازش و محصور کرنے والوں کو ظن و ریب

کی دلدل میں پھنسا کر آن کے لیے خسر الدنیا والآخرہ کا نشان عطا کر دیا اور پھر اصلی انسان کے اصلی احکام کے لیے وہ وقت مقرر کر دیا جو "میثاق النبیین" کی نمائندگی کے لیے موزوں تھا یہی ہے وہ حقیقت جس کو زبانِ وحی ترجمان نے اس طرح ظاہر فرمایا "والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکماً عدلاً" اور اسی کو نصِ قرآن نے یوں واضح کیا ہے۔ "وانہ لعلم للساعۃ"

پھر یہ ہستی میثاقِ انبیاء و رسل کی نمائندگی کا اس طرح حق ادا کریگی کہ جب اس کا نزول ہوگا تو اس کرشمۂ قدرت کو دیکھ کر مسلمانوں کے قلوب تصدیقِ قرآن اور تازگیِ ایمان سے روشن ہو جائینگے اور وہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کرینگے کہ بلاشبہ راہِ مستقیم صرف "اسلام" ہی ہے اور مخبرِ صادق کی جس طرح یہ خبر "صادق" نکلی عالم غیب سے متعلق اس کی تمام خبریں اسی طرح حق اور بلاشبہ حق ہیں، اور نصاریٰ بحیثیتِ قوم اپنے باطل عقیدے "تثلیث و کفارہ" پر نادم و شرمسار ہونگے اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو اپنے لیے راہِ نجات اور راہِ سعادت یقین کرینگے، اور یہود جب مسیحِ ہدایت اور مسیحِ ضلالت کے معرکۂ حق و باطل کا مشاہدہ کر لینگے اور مسیحِ ہدایت کے نزول سے اپنے دعوئے قتل و صلیب کے ملعون عقیدہ کو باطل پالینگے تو اب اُن کو بھی "ایمان بالحق" کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہیگا اور مسیحِ ضلالت کے رفقاء کے علاوہ وہ سب ہی "مسلم" بن جائینگے یہی ہے قرآن کی وہ خبرِ صادق "وان من اھل الکتٰب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ"

مسلمانوں میں ایمان کی تازگی و شگفتگی، نصاریٰ اور یہود میں تبدیلیِ عقائد کا حیرت انگیز انقلاب دیکھ کر اب مشرک جماعتوں پر بھی قدرتی اثر پڑیگا، اور ساتھ ہی خدا کے مقدس پیغمبر کے زبردست روحانی اثرات کارفرما ہونگے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائینگے اور اس طرح وحی ترجمان، حاملِ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کا یہ ارشاد اپنی صداقت کو نمایاں کریگا۔ "ویدعوا الناس الی الاسلام ویھلک اللہ فی زمانہ الملل کلھا الا الاسلام"

وجهلك الله فی زمانه الدجال"

اس تفصیل سے یہ بھی روشن ہو گیا کہ قرآن اور احادیث کی تصریحات ثابت کر رہی ہیں کہ اگر اس فرض کی انجام دہی کے لیے کوئی جدید نبی مبعوث ہوتا تو ایک جانب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی شرف "خاتم النبیین" باقی نہ رہتا اور دوسری جانب "میثاق النبیین" کے خطابِ اولین کا عملی مظاہرہ عالمِ وجود میں نہ آتا کیونکہ وہ ہستی بہرحال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہی میں سے ہوتی۔ البتہ سابق نبی کی آمد نقلاً اور عقلاً دونوں حیثیت سے شرفِ خصوصی "خاتم النبیین" کے لیے بھی قادح نہیں ہے اور "میثاق النبیین" کو بھی پورا کرتی ہے

واقعاتِ نزول صحیح احادیث کی روشنی میں

گذشتہ صفحات میں نزول عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق جو صحیح احادیث ذکر کی گئیں اور اُن سے اور بعض دوسری صحیح احادیث سے جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں اُن کو ترتیب کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے

قیامت کا دن اگرچہ معین ہے مگر ذاتِ باری کے ماسوا کسی کو اُس کا علم نہیں ہے اور اُس کا وقوع اچانک ہوگا "وعندہ علم الساعۃ۔ اور قیامت کا علم خدا ہی کو ہے" "حتیٰ اذا جاءتھم الساعۃ بغتۃ۔ حتیٰ کہ اُن پر اچانک قیامت کی گھڑی آ جائیگی" "لا تاتیکم الا بغتۃ قیامت اُن پر نہیں آئیگی مگر اچانک" اور حدیث جبرئیل میں ہے "ما المسئول عنھا باعلم من السائل (جبرئیل نے کہا) قیامت کے بارہ میں آپ سے زیادہ مجھے بھی علم نہیں جو اجمالی علم آپ کو ہے اسی قدر مجھ کو بھی ہے" اور ایک حدیث میں ہے "سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قبل ان یموت بشھر: تساءلون عن الساعۃ وانما علمھا عند اللہ تم مجھ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہو تو اُس کا علم تو اللہ ہی کو ہے" البتہ قرآن عزیز اور احادیثِ صحیحہ نے چند ایسی علامات بیان کی ہیں جو قیامت کے قریب پیش آئینگی اور اُن سے صرف اُس کے نزدیک ہو جانے کا پتہ چل سکتا ہے، ان "اشراطِ ساعت" میں سے ایک بڑی علامت حضرت مسیح (علیہ السلام) کا ملاءِ اعلیٰ سے نزول ہے جس کی تفصیلات یہ ہیں۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سخت معرکۂ جنگ بپا ہو رہا ہوگا اور مسلمانوں کی قیادت و امامت سُلالۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوگی جس کا لقب "مہدی" ہوگا اس معرکہ آرائی کے درمیان ہی میں مسیح ضلالت "دجّال" کا خروج ہوگا یہ نسلاً یہودی اور یک چشم ہوگا، کرشمۂ قدرت نے اُس کی پیشانی پر (ک ف ر) کافر لکھ دیا ہوگا جس کو اہل ایمان فراستِ ایمانی سے پڑھ سکینگے اور اُس کے دجل و فریب سے محفوظ رہینگے۔ یہ اول خدائی کا دعویٰ کریگا اور شعبدہ بازوں کی طرح شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنی جانب توجہ دلائیگا، مگر اس سلسلہ کو کامیاب نہ دیکھ کر کچھ عرصہ کے بعد "مسیح ہدایت" ہونے کا مدعی ہوگا۔ یہ دیکھ کر یہود بہ کثرت بلکہ قومی حیثیت سے اُس کے پیرو ہو جائینگے اور یہ اس لیے ہوگا کہ یہود "مسیح ہدایت" کا انکار کرکے اُن کے قتل کا ادعا کر چکے ہیں اور "مسیح ہدایت" کی آمد کے آج تک منتظر ہیں، اسی حالت میں ایک روز دمشق شام کی مسجد جامع میں مسلمان منہ اندھیرے نماز کے لیے جمع ہونگے، نماز کے لیے اقامت ہو رہی ہوگی اور مہدی موعود امامت کے لیے مصلے پر پہنچ چکے ہونگے کہ اچانک ایک آواز سب کو اپنی جانب متوجہ کریگی، مسلمان آنکھ اٹھا کر دیکھینگے تو سپید بادل چھایا ہوا نظر آئیگا اور تھوڑے سے عرصہ میں یہ مشاہدہ ہوگا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) دو زرد حسین چادروں میں لپٹے ہوئے اور فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا دیے ہوئے ملاء اعلیٰ سے اتر رہے ہیں، فرشتے اُن کو مسجد کے منارۂ شرقی پر اتار دینگے اور واپس چلے جائینگے، اب حضرت عیسیٰ کا تعلق کائناتِ ارضی کے ساتھ دوبارہ وابستہ ہو جائیگا اور وہ عام قانونِ فطرت کے مطابق صحنِ مسجد میں اترنے کے لیے سیڑھی کے طالب ہونگے۔ فوراً تعمیل ہوگی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں آ کھڑے ہونگے۔ مسلمانوں کا امام (مہدی موعود) از رہِ تعظیم پیچھے ہٹ کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے امامت کی درخواست کریگا۔ آپ فرمائینگے کہ یہ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے اس لیے تم ہی نماز پڑھاؤ، فراغت نماز کے بعد اب مسلمانوں کی امامت حضرت مسیح (علیہ السلام) کے

ہاتھوں میں آجائیگی لو وہ حربہ لے کر مسیح ضلالت (دجال) کے قتل کے لیے روانہ ہوجائینگے اور شہر پناہ کے باہر اُس کو بابِ لُد پر مقابل پائینگے، دجال سمجھ جائیگا کہ اُس کے دجل اور زندگی کے خاتمہ کا وقت آپہنچا اس لیے خوف کی وجہ سے رانگ کی طرح پگھلنے لگیگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ کر اُس کو قتل کر دینگے اور پھر جو یہود دجال کی رفاقت میں قتل سے بچ جائینگے وہ اور عیسائی سب اسلام قبول کر لینگے اور مسیحِ ہدایت کی سچی پیروی کے لیے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آئینگے، اس کا اثر مشرک جماعتوں پر بھی پڑیگا اور اس طرح اُس زمانہ میں اسلام کے ماسوا کوئی مذہب باقی نہیں رہیگا۔

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو اس فتنہ سے محفوظ رکھینگے، حضرت مسیح (علیہ السلام) کا دورِ حکومت چالیس[1] سال رہیگا اور اس درمیان میں وہ ازدواجی زندگی بسر کرینگے اور اُن کے دورِ حکومت میں عدل و انصاف اور خیر و برکت کا یہ عالم ہوگا کہ بکری اور شیر ایک گھاٹ پانی پئینگے اور بدی اور شرارت کے عناصر دب کر رہ جائینگے[2]

وفات مسیح علیہ السلام | چالیس سالہ دورِ حکومت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہوجائیگا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونگے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے:۔

فیمکث اربعین سنۃ ثم	پھر وہ کائنات ارضی پر آ کر چالیس سال قیام کرینگے اور اس کے
یتوفی ویصلی علیہ المسلمون	بعد وفات پا جائینگے اور مسلمان اُن کے جنازہ کی نماز پڑھینگے اور
ویدفنونہ[3]	اُن کو دفن کر دینگے۔

---

[1] اور مسلم میں ہے کہ دورِ حکومت سات سال رہیگا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب حضرت مسیح کا رفع سماوی ہوا اُس وقت اُن کی عمر تینتیس سال تھی اور نزول کے بعد سات سال مزید بقید حیات رہینگے اس طرح کائنات ارضی میں کل مدت حیات چالیس سال ہوجائیگی۔ [2] ماخوذ از صحیح احادیث عن ابن عساکر فی تاریخہ [3] اس سے قبل یہ حدیث مکمل نقل کی گئی ہے، اس کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں امام احمد نے (باقی بر صفحہ ۱۵۹)

اور ترمذی نے بسندِ حسن محمد بن یوسف بن عبداللہ بن سلام کے سلسلہ سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

قال مکتوب فی التوراۃ صفۃ محمد وعیسٰی بن مریم یدفن معہٗ

عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت (حلیہ وسیرت) مذکور ہے اور یہ بھی مسطور ہے کہ عیسٰی بن مریم (علیہما السلام) اُن کے ساتھ (پہلو میں) دفن ہونگے۔

ویوم القیٰمۃ یکون علیھم شھیدا

سورۂ مائدہ میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے مختلف حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر آخر سورت بھی اُن ہی کے تذکرہ پر ختم ہوتی ہے، اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اول قیامت کے اُس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے جب انبیاء علیہم السلام سے اُن کی اُمتوں کے متعلق سوال ہوگا اور وہ غایتِ ادب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرینگے اور عرض کرینگے خدایا! آج کا دن تو نے اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ ہر معاملہ میں حقائقِ امور کے پیشِ نظر فیصلہ شائع ہو اور ہم چونکہ صرف ظواہر ہی پر کوئی حکم لگا سکتے ہیں اور قلوب اور حقائق کا دیکھنے والا تیرے سوا کوئی نہیں اس لیے آج ہم کیا شہادت دے سکتے ہیں، صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں، تو علّام الغیوب ہے اس لیے تو ہی سب کچھ جانتا ہے۔

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (مائدہ)

وہ دن (قابلِ ذکر ہے) جب کہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو جمع کریگا، پھر کہیگا تم (اپنی اپنی امتوں کی جانب سے) کیا جواب دیے گئے! وہ (پیغمبر) کہینگے (تیرے علم کے سامنے) ہم کچھ نہیں جانتے بلاشبہ تو ہی غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا "لا علم لنا" فرمانا "علم حقیقی کی نفی" پر ہی مبنی ہوگا، یہ مطلب

(بقیہ صفحہ ۱۵۸) مسند میں ابوداؤد نے سُنن میں ابن جریر نے تفسیر میں اور ابنِ حبان نے صحیح میں حضرت ابوہریرہ سے اس کو نقل کیا ہے۔ [1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۵۸۴۔

نہیں ہوگا کہ وہ درحقیقت اپنی امتوں کے جواب سے لاعلم ہیں کہ کس نے ایمان کو قبول کیا اور کس نے انکار کیا کیونکہ جواب کا مقصد اگر یہ ہو تو یہ صریح جھوٹ اور کذب بیانی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جانب اس عملِ بد کی نسبت ناممکن ہے، اس لیے انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب مسطورۂ بالا حقیقت کے ہی پیشِ نظر ہوگا ظاہر حالات کے علم سے انکار پر مبنی نہیں ہوگا اس کے لیے خود قرآنِ عزیز ہی شاہد عدل ہے کیونکہ وہ متعدد جگہ یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں پر شہادت دینگے کہ ہم نے ان تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اور یہ کہ انہوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا یا رد کر دیا۔ تو ان ہر دو مقامات پر نظر رکھنے کے بعد یوں کہا جائیگا کہ پاسِ ادب کے طریقہ پر اول انبیاء علیہم السلام کا یہی جواب ہوگا جو مائدہ میں مذکور ہے لیکن جب ان کو خدائے برتر کا یہ حکم ہوگا کہ وہ صرف اپنے علم کے مطابق شہادت دیں تب وہ شہادت دینگے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا	پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (یعنی قیامت کے دن) جب
مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ	ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ طلب کرینگے (یعنی اس کے پیغمبر
وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ	کو طلب کرینگے جو اپنی امت کے اعمال واحوال پر گواہ ہوگا) اور ہم
شَهِيْدًا (نساء)	تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے طلب کرینگے۔
وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ	اور لائے جائینگے (قیامت کے دن) انبیاء اور شہداء اور فیصلہ کیا
وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ (زمر)	جائیگا ان لوگوں کے درمیان اچھائی اور برائی کا حق کے ساتھ

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نے بھی "لاعلم لنا" کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

عن ابن عباس یوم یجمع اللہ	حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) آیت یوم یجمع اللہ الرسل
الاٰیۃ یقولوا للرب عزّ وجلّ	الاٰیۃ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: انبیاء علیہم السلام رب عزوجل سے عرض
لاعلم لنا الا علم انت اعلم بہ منا[1]	کرینگے ہم کو کوئی علم نہیں ہے مگر ایسا علم کہ جس کے متعلق تو ہم سے بہتر

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ا۔

اور شیخ المحققین علامہ سید انور شاہ (رحمۃ اللہ) آیت کے جملہ "لا علم لنا" کو "علم حقیقی کے انکار" پر محمول کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"یہ بات مسلم ہے کہ ایک انسان کو ـــــ خواہ وہ کسی درجہ اور رتبہ کا ہو ۔۔۔ دوسرے انسان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوتا ہے وہ علم حقیقی کے لحاظ سے "ظن" کے درجہ سے آگے "علم" تک نہیں پہنچتا، اسی بنا پر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے "نحن نحکم بالظواھر و اللہ متولی السرائر۔ ہم ظاہر معاملات پر حکم لگاتے ہیں اور بھیدوں اور حقیقتوں پر تو صرف خدا کو ہی قابو حاصل ہے۔ نیز ایک دوسری حدیث میں ہے ذات اقدس نے ارشاد فرمایا: تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو اور بعض تم میں سے زیادہ چرب زبان ہوتے ہیں اور مجھ کو علم غیب نہیں ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہو جایا کروں اس لیے جو بھی فیصلہ دیتا ہوں ظاہر حالات پر ہی دیتا ہوں تو یاد رہے کہ جو شخص بھی اپنی چرب زبانی سے کسی بھائی کا ادنی سا ٹکڑا بھی ناحق حاصل کریگا وہ بلاشبہ جہنم کا ٹکڑا حاصل کریگا۔"[1]

بہرحال قرآن عزیز، احادیث رسول، آثار صحابہ، اور اقوال علما سب یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس موقعہ پر انبیاء علیہم السلام کا جواب "عدم علم" کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ازرہ پاس ادب "حقیقی علم پر انکار" کو واضح کرتا ہے

غرض، ذکر یہ تھا کہ اس مقام پر اصل تذکرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کا ہو رہا ہے جو قیامت میں پیش آئیگا جبکہ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنے انعامات شمار کرانے کے بعد اُن سے اُن کی اُمت کے متعلق سوال کریگا اور وہ حسب حال جوابات پیش کرینگے مگر سابق آیات میں چونکہ دوسرے مطالب ذکر ہوئے تھے اس لیے اُن سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے تمہیداً قیامت میں ہونے والے اُن سوال و جواب کا ذکر ضروری ہوا جو عام طور پر انبیاء علیہم السلام سے اُن کی اُمتوں کے متعلق کیے جائینگے اور اس لیے بھی یہ تذکرہ ضروری

---

[1] عقیدۃ الاسلام صفحہ ۱۲۵۔

تھا کہ اگلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا جو ذکر کیا گیا ہے اُس کا پیرایۂ بیان بھی انبیاء علیہم السلام کے جواب کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (مائدہ)

اور (وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم سے کہیگا: "کیا تو نے لوگوں (بنی اسرائیل) سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو دونوں کو اللہ کے ماسوا خدا بنا لیا" عیسیٰ کہینگے: "پاکی تجھ کو ہی زیبا ہے میرے لیے کیسے ممکن تھا کہ میں وہ بات کہتا جو کہنے کے لائق نہیں، اگر میں نے یہ بات اُن سے کہی ہوتی تو یقیناً تیرے علم میں ہوتی (اس لیے کہ) تو وہ سب کچھ جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں تیرا بھید نہیں پا سکتا، بلاشبہ تو غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے، میں نے اُس بات کے ماسوا جس کا تُو نے مجھ کو حکم دیا اُن سے اور کچھ نہیں کہا وہ یہ کہ صرف اللہ کی ہی پوجا کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے، اور میں اُن پر اس وقت تک کا گواہ ہوں جب تک میں اُن کے درمیان رہا پھر جب تو نے مجھ کو "قبض کر لیا" تب تو ہی اُن پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔ اگر تو ان سب کو عذاب چکھائے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے، پس تو ہی بلاشبہ غالب، حکمت والا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنا جواب دے چکینگے تب اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمائیگا

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ

اللہ تعالیٰ فرمائیگا: یہ ایسا دن ہے کہ جس میں راستبازوں کی راستبازی ہی کام آسکتی ہے اُن ہی کے لیے بہشت کہ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۚ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ
رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۚ رہینگے اور وہ خدا سے راضی اور خدا اُن سے راضی
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ (مائدہ) دکا مقام اعلیٰ پائینگے) یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب ایک جلیل القدر پیغمبر کی عظمتِ شان سے کے عین مطابق ہے، وہ پہلے بارگاہِ رب العزت میں عذرخواہ ہونگے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ایسی نامناسب بات کہتا جو قطعاً حق کے خلاف ہے" سبحٰنك ما یکون لی ان اقول ما لیس لی بحق" پھر پاسِ ادب کے طور پر خدا کے علم حقیقی کے سامنے اپنے علم کو ہیچ اور بے علمی کے مرادف ظاہر کرینگے "ان کنت قلتہ فقد علمتہ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك انك انت علام الغیوب" اور اس کے بعد اپنے فرض کی انجام دہی کا حال گذارش کرینگے "ما قلت لھم الا ما امرتنی ان اعبدوا اللّٰہ ربّی وربّکم" اور پھر اُمت نے اس دعوتِ حق کا جواب کیا دیا؟ اس کے متعلق ظاہر امور کی شہادت کا بھی اسی اسلوب کے ساتھ ذکر کرینگے جس میں اُن کی شہادت خدا کی شہادت کے مقابلہ میں بے وقعت نظر آئے "وکنت علیھم شھیدًا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علی کل شیءٍ شھیدًا" اور اس کے بعد یہ جانتے ہوئے کہ اُمت میں مومنین قانتین بھی ہیں اور منکرین جاحدین بھی وقوعِ عذاب اور طلبِ مغفرت کا اس انداز میں ذکر کرینگے جس سے ایک جانب خدا کے مقرر کردہ پاداشِ عمل کے قانون کی خلاف ورزی بھی مترشح نہ ہو اور دوسری جانب امت کے ساتھ رحمت و شفقت کے جذبہ کا جو تقاضا ہے وہ بھی پورا ہو جائے "ان تعذبھم فانھم عبادك وان تغفر لھم فانك انت العزیز الحکیم" جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) عرضداشت یا جواب کے مضمون کو ختم کر چکے تو رب العٰلمین نے اپنے قانونِ عدل کا یہ فیصلہ سُنا دیا تاکہ مستحق رحمت و مغفرت کو مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ مسرت و شادمانی سے اُن کے قلوب روشن ہو جائیں اور مستحق عذاب غلط توقعات قائم نہ کر سکیں "قال اللّٰہ ھذا یوم

ینفع الصّٰدقین صدقهم (الآیہ)

اِن تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ آیاتِ زیرِ بحث کا سباق وسباق صراحت کرتا ہے کہ یہ واقعہ قیامت کے روز پیش آئیگا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ملاءِ اعلیٰ پر اُٹھا لیے جانے کے وقت پیش نہیں آیا، اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی ابتداء "یوم یجمع اللہ الرسل" (الآیہ) سے کرنا اور انتہاءِ واقعہ "ھٰذا یوم ینفع الصّٰدقین صدقهم" (الآیہ) پر ہونا روزِ قیامت کے ماسوا اور کسی دن پر صادق نہیں آسکتا اور اس ایک قطعی بات کے علاوہ دوسرے کسی احتمال کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

نیز یہ تفصیلات واضح کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اپنی امت کے قبول و انکار کے حالات سے آگاہی کے باوجود آیاتِ مائدہ میں مذکور اسلوبِ بیان اس لیے اختیار فرمائینگے کہ دوسرے انبیاء و رسل (علیہم السلام) بھی مقام کی نزاکت حال اور رب العزت کے دربار میں غایت پاسِ ادب کے لیے یہی اسلوب بیان اختیار فرمائینگے۔

اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے اور انبیاء علیہم السلام کے جوابات میں اسلوب بیان کی یکسانیت کے باوجود اجمال و تفصیل کا فرق صرف اس لیے ہے کہ زیرِ بحث آیات میں اصل مقصود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کی اُمت کے قبول و انکار اور اُن کے نتائج و ثمرات کا تذکرہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر صرف واقعہ کی تمہید کے طور پر ہے۔

حقیقتِ حال کے اس انکشاف کے بعد اب جمہور اُمتِ مسلمہ کے خلاف خلیفہ قادیانی مسٹر محمد علی لاہوری کی تحریفِ معنوی بھی قابلِ مطالعہ ہے کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ میں مذکور حضرت عیسیٰ اور پروردگارِ عالم کا یہ سوال و جواب اُس وقت پیش آچکا جب حضرت عیسیٰ کی نعش ملنے پر شاگردوں نے اُن کا علاج کر کے چنگا کر لیا اور پھر وہ شام سے فرار ہو کر مصر اور مصر سے کشمیر پہنچے اور گمنامی کی حالت میں انتقال فرما گئے۔ مسٹر لاہوری نے اپنے دعوے میں دو دلائل پیش کیے ہیں ایک یہ کہ عربیت کے قاعدے سے لفظ "اذ" ماضی

کے لیے مستعمل ہو نہ کہ مستقبل کے لیے اور دوسری دلیل یہ کہ اگر جمہور کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح کا انتقال نہیں ہوا اور وہ قیامت کے قریب نازل ہونگے تو ضروری ہے کہ اُن کو اپنی اُمت (نصاریٰ) کے عقیدہ الوہیت مسیح اور تثلیث کا علم ہو چکا ہوگا کیونکہ نصاریٰ نے اُن کے رفع کے زمانہ تک تثلیث کو نہیں اپنایا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب ایسے اسلوب پر نہ ہوتا جس سے اُن کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔

مسٹر لاہوری نے قرآن کی تحریف معنوی پر یہ اقدام یا تو اس لیے کیا کہ اپنے مرشد متنبی قادیان (علیہ ما علیہ) کے دعوئے مسیحیت کو قوت پہنچائیں اور مغالطہ اور سفسطہ سے کام لے کر "خسران مبین" کا ساماں مہیا کریں اور یا پھر وہ قواعدِ عربیت سے اس درجہ ناواقف ہیں کہ نہ اُن کو نحو کے معمولی استعمالات ہی کا علم ہے اور نہ وہ آیات قرآنی کے سیاق و سباق کا ہی کچھ درک رکھتے ہیں، اور صرف جاہلانہ دعاوی پر دلیر نظر آتے ہیں۔

جن قوانینِ عربیت میں "اذ" اور "اذا" کے درمیان یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ "اذ" اگر فعل مستقبل پر بھی داخل ہو تب بھی "ماضی" کے معنی دیتا ہے اور "اذا" اگر چہ فعل ماضی پر بھی داخل ہو تب بھی مستقبل کے معنی دیا کرتا ہے اُن ہی قوانین میں علماءِ معانی و بلاغت یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ بسا ایسا ہوتا ہے کہ کسی گذرے ہوئے واقعہ کو اس طرح پیش کرنے کے لیے گویا وہ زمانۂ حال میں پیش آرہا ہے صیغہ مستقبل سے تعبیر کر لیا کرتے ہیں یعنی اس کے لیے "اذا" کا استعمال جائز رکھتے بلکہ مستحسن سمجھتے اور اس کو "استحضار" اور "حکایۃ الحال" کہتے ہیں۔ اور اسی طرح مستقبل میں ہونے والے ایسے واقعہ کو جس کے وقوع سے متعلق یقین دلانا ہو کہ وہ ضرور ہو کر رہیگا اور ناممکن ہے کہ اس کے خلاف ہو سکے اکثر ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرنا مستحسن سمجھتے بلکہ بلاغتِ تعبیر کے لحاظ سے ضروری اور مفید یقین کرتے ہیں، کیونکہ اس طرح مخاطب اور سامع کے سامنے ہونے والے واقعہ کا نقشہ اس طرح آجاتا ہے کہ گویا وہ ہو گذرا ہے اور یہ بھی "استحضار" ہی کی ایک صورت سمجھی جاتی ہے، دور کیوں جائیے لفظ "اذ"

کا استعمال مستقبل کے لیے خود قرآنِ عزیز میں متعدد مقامات پر ثابت ہے۔

سورۂ انعام میں قیامت کے دن مجرموں کی کیا کیفیت ہوگی اُس کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا گیا ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (الانعام)

اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ وہ کھڑے کیے جائینگے آگ (جہنم) کے اوپر پس کہینگے اے کاش کہ ہم لوٹا دیے جائیں دنیا میں اور نہ جھٹلائیں ہم اپنے رب کی نشانیوں کو اور ہو جائیں ہم ایمان والوں میں سے۔

اور اسی سورۂ انعام میں روزِ قیامت مجرموں کی حالت کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ قَالَ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ. (انعام)

اور کاش کہ تو دیکھے، جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کیے جائینگے تو (پروردگار) کہیگا کیا یہ حق نہیں ہے؟ وہ کہینگے قسم ہے پروردگار کی یہ (روز حشر) حق اور سچ ہے، بس (پروردگار) کہیگا تو چکھو اُس کے بدلہ میں عذاب جو تم کفر کیا کرتے تھے

اور ان ہی مجرمین کی روز قیامت حالت کا نقشہ سورۂ سبا میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَزِعُوا فَلَا فَوْتَ وَأُخِذُوا مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ (سبا)

اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ وہ (منکرین) گھبرائینگے پس نہیں بھاگ سکینگے اور پکڑے جائینگے قریب سے اور کہینگے ہم (اب) اس پر ایمان لے آئے۔

اور سورۂ سجدہ میں اس حقیقت کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ

اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ مجرم اپنا سر نیچے ڈالے ہوئے ہونگے اپنے رب کے سامنے۔

یہ اور اسی قسم کے متعدد مقامات ہیں جن میں مستقبل کے واقعات کو ماضی کے ساتھ

تعبیر کیا گیا اور اس لیے لفظ "اذ" کا استعمال مفید سمجھا گیا پس جس طرح ان مقامات میں "اذ وقفوا" "قال" "قالوا" "اذ فزعوا" "واخذوا" "اذ المجرمون ناکسوا" تمام افعال لفظ "اذ" کے باوجود مستقبل کے معنی دے رہے ہیں اسی طرح "اذ قال اللّٰہ یٰعیسیٰ" کے استعمال کو مستقبل کے لیے سمجھیے اور جس طرح ان تمام مقامات کے سباق و سیاق دلالت کر رہے ہیں کہ ان واقعات کا تعلق روز قیامت سے ہی ٹھیک آیاتِ مائدہ کی زیر بحث آیات کا سیاق و سباق صراحت کر رہا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق قیامت کے دن سے ہے۔

قاعدۂ عربیت کی اس حقیقت افروز تحقیق کے بعد مسٹر لاہوری کی دوسری دلیل پر نظر ڈال لیے تو وہ اس سے بھی زیادہ لچر نظر آئیگی اس لیے کہ گذشتہ تحقیق سے یہ واضح ہو چکا کہ سورۂ مائدہ کی آیات زیر بحث میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب ہرگز اس بات پر مبنی نہیں ہے کہ اُن کو اپنی اُمت کی گمراہی کا علم نہیں ہوگا اور وہ اپنی لاعلمی ظاہر کرینگے، ایک مرتبہ اُن آیات پر پھر غور کرو گے تو صاف نظر آئیگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل جواب صرف یہ ہے "مَاقلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللّٰہ ربی وربکم" اور اول و آخر باقی آیات میں یا جواب کے مناسب حال تمہید ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی جلالت و جبروت اور اپنی بیچارگی و درماندگی بلکہ عبودیت کا اظہار ہے جس میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان کے مناسب حضرۃ القدس کے سامنے شہادت پیش کی گئی ہے، علاوہ ازیں اگر مسٹر لاہوری کا یہ قول صحیح مان لیں کہ حضرت عیسیٰ کے رفع سماوی تک نصاریٰ نے چونکہ تثلیث کا عقیدہ نہیں اختیار کیا تھا اس لیے اُنھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ سوال کیا معنی رکھتا ہے "ءانت قلت للناس اتخذونی وامی الٰھین من دون اللّٰہ" کیا العیاذ باللہ اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ خدا نے عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت پر جھوٹا الزام لگایا؟ پھر یہ کیا کم حیرت کی بات ہے کہ کادیانی اور لاہوری ایک جانب تو یہ کہہ رہے ہیں مگر اس کے قطعاً متضاد آئینہ کمالات میں کادیانی نے یہ کہا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی روح کو یہ معلوم ہوا اور اس کو بتلایا گیا کہ

اُس کی اُمت کس طرح شرک میں مبتلا ہوگئی تب عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء کی۔ خدایا! تو میرا انجیل نازل فرما تاکہ میری اُمت اس شرک سے نجات پالے اور تیری سچی پرستار بنے ؎ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

حقیقت یہ ہے کہ قادیانی اور لاہوری کی تفسیر کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے مطالب قرآن کی زبان سے سُننا چاہتے ہیں بلکہ پہلے سے ایک باطل عقیدہ کو عقیدہ بتلاتے ہیں اور پھر اس کے سانچہ میں قرآن کو ڈھالنا چاہتے ہیں اور جب قرآن اُس سانچہ میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے تو تحریف کے حربہ سے زبردستی اُس پر مشق ستم کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ ایسا کرتے وقت میں حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ قرآن اُمت کی ہدایت کے لیے رہتی دنیا تک امام الہدیٰ ہے۔ اس لیے کوئی "ملحد و زندیق" خواہ کتنی ہی تحریف معنوی کی کوشش کرے ہمیشہ ناکام اور خاسر رہیگا اور خود قرآنی اطلاقات ہی اُس کے عقیدہ و فکر کی بطالت کے لیے ناطق ثبوت ہونگے بلکہ بمصداق دروغ گورا حافظہ نہ باشد وہ اکثر اپنے ہی متضاد اقوال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر اپنی کذب بیانی اور تفسیری افتراء پر مہر لگا لیتا ہے جس کی تازہ شہادت ابھی سطور بالا میں نقل ہو چکی ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ

حیات و رفع مسیح (علیہ السلام) سے متعلق گذشتہ مباحث میں "توفی" کی حقیقت پر کافی روشنی پڑ چکی ہے اور سورۂ مائدہ کی آیات مسطورہ بالا کی تفسیر کے بھی تمام پہلو واضح ہو چکے ہیں، تاہم قرآن کے اعجازِ بلاغت اور اسلوبِ بیان کی لطافت سے مستفید ہونے کے لیے چند سطور اس مسئلہ پر بھی سپرد قلم کر دینا مناسب ہے کہ اس مقام پر قرآن نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے قیام ارضی کو "ما دمت فیھم" سے اور کائنات ارضی سے انقطاعِ تعلقات کو "توفیتنی" سے کیوں تعبیر کیا؟

گذشتہ سطور میں لغت اور معانی کے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ "توفی" کے حقیقی معنی "اخذ و تناول" (لے لینے اور قبضہ میں کر لینے) کے ہیں اور موت کے معنی میں بطور

کنایہ اس کا استعمال ہوتا ہے اور یہ کہ کنایہ میں حقیقی معنی برابر ساتھ ساتھ رہتے ہیں مجاز کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ حقیقی معنی سے جدا ہو کر لفظ غیر موضوع لہٗ میں استعمال ہونے لگے۔ پس اگر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق قرآن کا عقیدہ یہ ہوتا کہ ان کو موت آچکی اور سوال و جواب کا یہ سلسلہ موت کے اسی وقت سے متعلق ہے نہ کہ قیامت کے دن سے تو پھر بلاغت و معانی کا تقاضا یہ تھا کہ اس موقعہ پر "حیات" اور "موت" ایک دوسرے کے متضاد الفاظ کو استعمال کیا جاتا تاکہ یہ حقیقت واضح ہو سکتی کہ سوال و جواب کا معاملہ "موت" کے ہم قریں ہے اور پھر لفظ "موت" کی صراحت اپنے مقابل لفظ "حیات" کی طالب ہوتی مگر قرآن نے ان دونوں الفاظ کی بجائے "ما دمت فیھم" کو "حیوٰۃ" کی اور "توفی" کو "موت" کی جگہ استعمال کیا ہے تو یہ کس لیے اور کس مقصد سے یا بغیر کسی حکمت و مصلحت کے یہ اسلوب اختیار کر لیا؟ جمہور امت تو اس کا ایک ہی جواب رکھتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے دوسرے مقامات کی طرح اس مقام پر بھی اعجاز و ایجاز سے کام لیا ہے اور ان دو لفظوں میں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی، رفع، نزول، اور موت، تمام مراحل کو سمو دینا چاہتا ہے، وہ اگر یہ کہتا "ما حییتُ۔ میں جب تک زندہ رہا" اور "فلما امتنی۔ پس جب تو نے مجھ کو موت دے دی" تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی عام حالات کے مطابق دو ہی مراحل پیش آئے ہیں "زندگی" اور "موت" اور ان دونوں مرحلوں کے درمیان کوئی خاص صورتِ حال پیش نہیں آئی، لیکن جبکہ یہ خلاف واقعہ تھا اور ان کی زندگی اور موت کے درمیان دو اہم مراحل پیش آچکے ہوں گے ایک "ملا اعلیٰ کی جانب بقیدِ حیات رفع" اور دوسرا "کائناتِ ارضی پر دوبارہ رجوع (نزول)" اس لیے از بس ضروری ہوا کہ حیوٰۃ اور موت کی جگہ دو ایسے الفاظ اختیار کیے جائیں جو ان چاروں مراحل پر صادق آسکیں اور جبکہ متعدد مقامات پر حسب حال ان مراحل کی تفصیل بیان ہو چکی ہے تو اعجاز بلاغت کا یہی تقاضا ہے کہ اب ان کو ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

صورتِ حال کا یہی نقشہ تھا جس کے لیے قرآنِ عزیز نے "مادمت" کی جگہ "مادمت فیہم" استعمال کیا تاکہ یہ جملہ اختصار کے ساتھ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی زندگی کے دونوں حصوں پر حاوی ہو جائے اُس حصہ پر بھی جو ابتدا، زندگی سے شروع ہوکر "رفع الی السماء" پر ختم ہوتا ہے اور اُس حصہ پر بھی جو "نزولِ ارضی" سے شروع ہو کر "موت" پر جاکر ختم ہو جاتا ہے اور اسی طرح قرآن نے "فلما امتنی" کی جگہ "فلما توفیتنی" کا اسلوب بیان اختیار کیا تاکہ یہ جملہ بھی پہلے جملہ کی طرح باقی دونوں مرحلوں کو اپنے اندر سمو لے اُس مرحلہ کو بھی جو "رفع الی السماء" کی صورت میں پیش آیا اور اس مرحلہ کو بھی جو نزول کے بعد "موت" کی صورت میں نمودار ہوا کیونکہ موت سے تو صرف ایک ہی حقیقت ظاہر ہوسکتی تھی مگر "توفی" میں بہ یک وقت دونوں حقیقتیں موجود تھیں حقیقی معنی کے لحاظ سے صرف "اخذ و تناول" اور کنایہ کے اعتبار سے اخذ و تناول کے ساتھ "موت" جیسا کہ سطور بالا میں "کنایہ" اور "مجاز" کے باہمی فرق سے معلوم ہو چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) عرض کریں گے، خدایا! جو وقت میں نے اُن کے درمیان گزارا اُس کے لیے تو بیشک میں شاہد ہوں لیکن "توفی" کے اوقات میں اُن پر فقط تو ہی نگہبان رہا، باقی تیری شہادت تو ہر حالت میں ہر وقت ہر شے پر حاوی ہے

مسئلہ متعلقہ کی یہ پوری بحث اس سے قطع نظر کہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات کی تفسیر میں کیا ارشاد فرمایا ہے، لغت، معانی، بلاغت کے پیشِ نظر تھی ورنہ ان آیات کی تفسیر میں ایک مومنِ صادق کے لیے وہ صحیح مرفوع احادیث کافی ہیں جن کو محدثین نے بسند صحیح روایت کیا ہے۔ مثلاً مشہور محدث حافظ ابن عساکرؒ نے بروایت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث نقل کی ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے۔

جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام انبیاء علیہم السلام کو اور اُن کی اُمتوں کو بلایا جائیگا اور عیسیٰ

علیہ السلام بھی بلائے جائینگے، اللہ تعالیٰ اول اُن کے سامنے اپنی اُن نعمتوں کو شمار کرائے گا جو دنیا میں اُن پر نازل ہوتی رہیں اور عیسیٰ (علیہ السلام) ان سب کا اعتراف کرینگے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیگا "ءانت قلت للناس اتخذونی وأمی الٰهین من دون الله" تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) انکار فرمائینگے، پھر نصاریٰ بلائے جائینگے اور اُن سے سوال کیا جائیگا تو وہ دروغ بیانی کرتے ہوئے کہینگے کہ ہاں، عیسیٰ نے ہم کو یہی تعلیم دی تھی، یہ سُن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سخت خوف طاری ہو جائیگا، بدن کے بال کھڑے ہو جائینگے اور خشیتِ الٰہی سے اُن کا رواں رواں بارگاہِ صمد میں سجدہ ریز ہو جائیگا اور یہ مدت ایک ہزار سال معلوم ہوگی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصاریٰ کے خلاف حجت قائم کردی جائیگی اور اُن کی خود ساختہ صلیب پرستی کا راز فاش کر دیا جائیگا اور پھر اُن کو جہنم میں جھونک دیے جانے کا حکم ہو جائیگا۔[1]

اور محدث ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے بسند صحیح یہ روایت نقل کی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں: "کہ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن عیسیٰ (علیہ السلام) سے ان کی اُمت کے متعلق سوال کریگا تو اپنی جانب سے عیسیٰ علیہ السلام پر جواب بھی القاء کردیگا" اور اس القاء کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ پر القاء ہوگا کہ وہ یہ جواب دیں "سبحانك ما يكون لي ان اقول ما ليس لي بحق"[2]

اور صحیحین (بخاری و مسلم) اور سُنن میں جو حدیث شفاعت منقول و مشہور ہے اُس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح قیامت میں تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہونگے اور معاملہ کے پیش آنے سے قبل خائف و ہراساں ہونگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اُن میں سے ایک ہونگے اور اُن پر یہ خوف طاری ہو رہا ہوگا

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ سورۂ مائدہ [2] ایضاً

کہ جب اُن سے اُمت کی مشرکانہ بدعت پر سوال ہوگا تو وہ درگاہِ صمدی میں کس طرح اُس سے عہدہ برآ ہو سکینگے؟

الحاصل سورۂ مائدہ کی ان آیات کی تفسیر وہی صحیح ہے جو جمہور اُمت کی جانب سے منقول ہے اور کادیانی اور لاہوری کی تفسیر بالرائے الحاد و زندقہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

حضرت مسیح کی دعوتِ اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے

گذشتہ مباحث میں پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطا کی تھی اور یہ الہامی کتاب دراصل توراۃ کا تکملہ تھی یعنی حضرت مسیح کی تعلیمی اساس اگرچہ توراۃ ہی پر قائم تھی مگر یہود کی گمراہیوں، مذہبی بغاوتوں اور سرکشیوں کی وجہ سے جن اصلاحات کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی معرفت انجیل کی شکل میں اُن کے سامنے پیش کر دیا تھا حضرت مسیح (علیہ السلام) کی بعثت سے پہلے یہود کی اعتقادی اور عملی گمراہیاں اگرچہ بے شمار حد تک پہنچ چکی تھیں اور حضرت مسیح نے مبعوث ہو کر اُن سب کی اصلاح کے لیے قدم اُٹھایا تاہم چند اہم بنیادی باتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ اصلاح تھیں جن کی اصلاح کے لیے حضرت مسیح (علیہ السلام) بہت زیادہ سرگرم عمل رہے

(۱) یہود کی ایک جماعت کہتی تھی کہ انسان کے اعمالِ نیک و بد کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے باقی قیامت، آخرت، آخرت میں جزا و سزا، حشر و نشر، یہ سب باتیں غلط ہیں، یہ "صدوقی" تھے۔

(۲) دوسری جماعت اگرچہ ان تمام چیزوں کو حق سمجھتی تھی مگر ساتھ ہی یہ یقین رکھتی تھی کہ وصول الی اللہ کے لیے ازبس ضروری ہے کہ لذاتِ دنیا اور اہلِ دنیا سے کنارہ کش ہو کر "رہبانیت" کی زندگی اختیار کی جائے چنانچہ وہ بستیوں سے الگ خانقاہوں اور جھونپڑیوں میں رہنا پسند کرتے تھے مگر یہ جماعت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی بعثت سے کچھ پہلے اپنی

کھو چکی تھی اور اب ترک دنیا کے پردہ میں دنیا کی ہر قسم کی گندگی میں آلودہ نظر آتی تھی، ظاہر رسم و طریق زاہدوں کا سا ہوتا مگر خلوتکدوں میں وہ سب کچھ نظر آتا جن سے رندانِ بادہ خوار بھی ایک مرتبہ حیا سے آنکھیں بند کر لیں، یہ "فریسی" کہلاتے تھے۔

(۳) تیسری جماعت مذہبی رسوم اور خدمتِ ہیکل سے متعلق تھی لیکن ان کا بھی یہ حال تھا کہ جن رسوم اور خدمات کو لوجہ اللہ کرنا چاہیے تھا اور جن اعمال کے نیک نتائج خلوص پر مبنی تھے اُن کو تجارتی کاروبار بنا لیا تھا اور جب تک ہر ایک رسم اور خدمتِ ہیکل پر بھینٹ اور نذر نہ لے لیں قدم نہ اُٹھائیں حتیٰ کہ اس مقدس کاروبار کے لیے اُنھوں نے توراۃ کے احکام تک میں تحریف کر دی تھی یہ "کاہن" تھے۔

(۴) چوتھی جماعت ان سب پر حاوی اور مذہب کی اجارہ دار تھی، اس جماعت نے عوام میں آہستہ آہستہ یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ مذہب اور دین کے اصول و اعتقادات کچھ نہیں ہیں مگر وہ جن پر وہ صاد کر دیں، اُن کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں، احکام دین میں اضافہ یا کمی کر دیں جس کو چاہیں جنت کا پروانہ لکھ دیں اور جس کو چاہیں جہنم کی سند تحریر کر دیں، خدا کے یہاں اُن کا فیصلہ اٹل اور ان مٹ ہے، غرض بنی اسرائیل کے "ارباباً من دون اللہ" بنے ہوئے تھے اور توراۃ کی لفظی اور معنوی ہر قسم کی تحریف میں اس درجہ جری تھے کہ اس کو دنیا طلبی کا مستقل سرمایہ بنا لیا تھا اور عوام و خواص کی خوشنودی کے لیے ٹھہرائی ہوئی قیمت پر احکام دین کو بدل ڈالنا اُن کا مشغلۂ دینی تھا۔ یہ "احبار" یا "فقیہ" تھے۔

یہ تھیں وہ جماعتیں اور یہ تھے اُن کے عقائد و اعمال جن کے درمیان حضرت مسیح (علیہ السلام) مبعوث ہوئے اور جن کی اصلاح حال کے لیے اُن کی بعثت ہوئی اُنھوں نے ہر ایک جماعت کے فاسد عقائد و اعمال کا جائزہ لیا، رحم و شفقت کے ساتھ اُن کے عیوب و نقائص پر نکتہ چینی کی، اُن کو اصلاحِ حال کے لیے ترغیب

دی اور اُن کے عقائد و افکار اور اُن کے اعمال و کردار کی نجاستوں کو دور کرکے اُن کا رشتہ خالقِ کائنات اور ذاتِ واحد کے ساتھ دوبارہ قائم کرنے کی سعی کی۔ مگر ان بدنصیبوں نے اپنے اعمالِ سیاہ کی اصلاح سے یکسر انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ اُن کو مسیح ضلالت کہہ کر اُن کی دعوتِ حق و ارشاد کے دشمن اور اُن کے خلاف سازشیں کرکے اُن کی جان کے درپے ہو گئے۔

اناجیلِ اربعہ حضرت مسیح (علیہ السلام) پر جو انجیل نازل ہوئی تھی کیا موجودہ چاروں انجیلیں وہی ہیں یا یہ حضرت مسیح کے بعد کی تصانیف ہیں؟ اس کے متعلق تمام اہلِ علم کا جن میں نصاریٰ بھی شامل ہیں، اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کی انجیل نہیں ہے اور نہ اُس کا ترجمہ ہے لیکن پھر ان موجودہ انجیلوں کے متعلق عیسائی کیا کہتے ہیں اور ناقدین کی رائے کیا ہے یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔

یہ بات بہرحال تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ چاروں انجیلوں کے متعلق نصاریٰ کے پاس کوئی ایسی سند موجود نہیں جس کی بنا پر وہ یہ کہہ سکیں کہ ان کی روایات کا سلسلہ یا ان کی ترتیب و تالیف کا زمانہ حضرت مسیح یا اُن کے شاگردوں (حواریوں) تک پہنچتا ہے نہ اس کے لیے کوئی مذہبی سند ہے اور نہ تاریخی بلکہ اس کے خلاف خود عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں اکیس سے زیادہ انجیلیں الہامی یقین کی جاتی اور رائج و معمول بہا تھیں لیکن ۳۲۵ء میں نائسیا کی کونسل نے ان میں سے صرف چار کو منتخب کرکے باقی کو متروک قرار دے دیا اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ کونسل کا یہ انتخاب کسی تاریخی اور علمی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اُسی کو الہامی ارشاد تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ اُن اکیس سے زائد انجیلوں میں سے بعض یورپ کے قدیم کتب خانوں میں پائی گئی ہیں، مثلاً انیسویں صدی میں ویٹیکان کے مشہور کتب خانہ سے متروک اناجیل کا ایک نسخہ برآمد ہوا تھا جس میں موجود

چاروں انجیلوں سے بہت کچھ زائد موجود ہے، موجودہ نسخوں میں سے سینٹ لوقا کی انجیل میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مسیح کی پیدائش کا واقعہ تفصیل سے درج ہے لیکن سورۂ مریم میں قرآن عزیز نے اس واقعہ کو جس طرح حضرت مریم کی پیدائش اور ہیکل میں تربیت کے ذکر سے شروع کیا ہے نہ لوقا کی انجیل میں اُس کا ذکر ہے اور نہ باقی تینوں انجیلوں میں مگر ویٹیکان کے اس نسخہ میں یہ واقعہ ٹھیک سورۂ مریم میں مذکور واقعہ کی طرح درج ہے۔ اسی طرح سولہویں صدی میں روما کے مشہور پوپ سِکٹس (Skits) کے قدیم کتب خانہ میں ایک اور متروک انجیل کا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل برناباؔ ہے، یہ نسخہ پوپ کے مقرب لاٹ پادری فرامرنیو نے پڑھا اور پوپ کی اجازت کے بغیر کتب خانہ سے چرا لایا، چونکہ اُس میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کثرت سے واضح اور صاف بشارتیں موجود تھیں حتیٰ کہ "احمد" نام تک مذکور تھا نیز الوہیتِ مسیح کے خلاف عقیدہ کی تعلیم پائی جاتی تھی اس لیے وہ لاٹ پادری مسلمان ہوگیا، حال ہی میں اُس کا عربی ترجمہ مصر میں علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار پریس سے شائع کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے، ڈاکٹر سعادہ نے اُس کے مقدمہ میں جو قابلِ قدر علمی تحقیق پیش کی ہے اُس میں ہے کہ اس انجیل کا پتہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اُس تاریخی منشور (حکم نامہ) سے چلتا ہے جو خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عیسائیوں کے پوپ گلیسیوس .... کی جانب سے کلیساؤں کے نام بھیجا گیا تھا اور جس میں اُن کتابوں کے نام درج تھے جن کا پڑھنا پڑھانا عیسائیوں پر حرام کیا گیا تھا اُن ہی میں انجیل برناباؔ کا نام بھی شامل تھا۔

علاوہ ازیں محققین یورپ بھی آج اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مسیح کے بعد ابتدائی تین صدیوں میں ایک سو سے زائد انجیلیں پائی جاتی تھیں جو بعد میں چار کو چھوڑ کر باقی متروک کر دی گئیں اور کلیسہ کے فیصلہ کے مطابق اُن کا پڑھنا حرام کر دیا گیا اس لیے آہستہ آہستہ وہ سب مفقود ہوتی چلی گئیں اور کہتے ہیں کہ ان مفقود نسخوں میں ایک مشہور انجیل، انجیل اگنٹس (انجیل اعظمی) بھی تھی جو اب ناپید ہے۔

لہ ترجمان القرآن جلد دوم

نیز یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ سینٹ پال (پولوس سول) کے جو خطوط ہیں اور جن پر موجودہ عیسائیت کی بنیادیں قائم ہیں اُن کے مطالعہ سے جگہ جگہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کرتا اور ڈراتا ہے کہ وہ ان انجیلوں کی جانب توجہ نہ دیں جو مسیح کے نام کی بجائے دوسرے ناموں سے منسوب ہیں کیونکہ مجھ کو روح القدس نے اسی کے لیے مامور کیا ہے کہ میں انجیل مسیح کی حمایت کروں، اُسی کو اسوہ بناؤں اور اُس کی تعلیم کو تمام عیسائی دنیا میں پھیلاؤں، چنانچہ حسب ذیل جملے اس کی صراحت کرتے ہیں کہ اس کے نزدیک مسیح کی انجیل عیسائیوں میں متروک ہو چکی تھی اور بعد کی بے سند انجیلوں کا عام رواج ہو گیا تھا اور اُن ہی میں سے یہ چار ہیں جو نایسیا کی کونسل نے بغیر کسی سند کے قال کے ذریعہ صحیح تسلیم کرلیں۔

اب ان چار کا حال بھی سُنیے۔ ان میں سے سب سے قدیم متّی کی انجیل تسلیم کی جاتی ہے باایں ہمہ اُس کے متعلق نصاریٰ میں سے علماء متقدمین تو بالاتفاق اور علماء موجودہ میں سے اکثر اس کے قائل ہیں کہ موجودہ انجیل متی اصل نہیں ہے بلکہ اُس کا ترجمہ ہے اس لیے کہ اصل کتاب عبرانی زبان میں تھی جو اب ناپید ہے اور ضائع ہو گئی لیکن یہ اصل کا ترجمہ ہے یا اس میں بھی تحریف ہوئی ہے اس کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں حتیٰ کہ مترجم کا نام تک معلوم نہیں اور نہ یہ پتہ کہ کس زمانہ میں یہ ترجمہ ہوا[1]۔ اور مشہور عیسائی عالم جرجیس زوین الفتوحی اللبنانی نے اپنی کتاب میں تصریح کی ہے کہ متی نے اپنی انجیل بیت المقدس میں بیٹھ کر سنہ ۳۹ء میں عبرانی میں تصنیف کی تھی جیسا کہ مقدس ایرونیموس نے کہا ہے کہ اوسیبیوس نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ متی کی انجیل کا یونانی ترجمہ اصل نہیں ہے اور جب باتینوس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان جاکر عیسائیت کی تبلیغ کرے تو اس نے متی کی انجیل کو عبرانی میں مکتوب اسکندریہ کے کتب خانۂ قیصر میں محفوظ دیکھا تھا مگر وہ نسخہ مفقود ہو گیا اور

---

[1] اظہار الحق مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی (نور اللہ مرقدہ) جلد اول ص ۱۲۱۔

نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانہ میں کس شخص نے یونانی زبان میں موجودہ ترجمہ کو روشناس کرایا۔

دوسری انجیل مرقس کی ہے اس کے متعلق مشہور عیسائی عالم پطرس گوامگ اپنی کتاب مروج الاخبار فی تراجم الابرار میں مرقس کی سوانح حیات پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ نسلاً یہودی لاوی اور پطرس حواری عیسیٰ (علیہ السلام) کا شاگرد تھا رومیوں نے جب عیسائیت اختیار کرلی تو اُن کے مطالبہ پر یہ انجیل تصنیف کی، یہ الوہیتِ مسیح کا منکر تھا اور اُس نے اپنی انجیل میں اُس حصہ کو بھی نہیں لیا جس میں حضرت مسیح (علیہ السلام) پطرس کی مدح کرتے ہیں، یہ ۶۸ء میں اسکندریہ کے قید خانہ میں قتل ہوا بت پرستوں نے اس کو قتل کر دیا[1]۔ اور عیسائی دنیا کو اس بارہ میں اختلاف ہے کہ مرقس کی انجیل کب تصنیف ہوئی، چنانچہ الفارق کے مصنف مرشد الطالبین ص ۱۷۰ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ علماءِ نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ یہ پطرس کی نگرانی میں ۶۱ء میں تصنیف ہوئی[2]

تیسری انجیل سینٹ لوقا کی انجیل ہے جس قدر اختلاف علماءِ نصاریٰ میں متی کی انجیل سے متعلق ہے اُس سے بھی زیادہ لوقا کی انجیل کی صحت و عدم صحت کے متعلق اختلاف ہے، چنانچہ الفارق کے مصنف نے اس سلسلہ میں خود علماءِ نصاریٰ کے ہی اقوال نقل کیے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کتاب نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مسٹر گڈل ...... اپنے رسالہ الہام میں دعویٰ کرتا ہے کہ لوقا کی انجیل الہامی نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ لوقا نے خود اپنی انجیل کی ابتداء میں یہ لکھا ہے کہ یہ (انجیل) اُس نے تاوفیلس کے ساتھ خط و کتابت کی بنا پر لکھی ہے وہ اُس کو مخاطب کر کے لکھتا ہے کہ مسیح کی باتیں جن لوگوں نے آنکھوں سے دیکھی تھیں اُنھوں نے ہم تک جس طرح پہنچائی ہیں اُن کو بہت سے لوگ ہم سے نقل کر رہے

---

[1] الفارق بین المخلوق والخالق جلد ا ص ۲۰ ماخوذ از کتاب جرجیس زرین لبنانی مطبوعہ بیروت
[2] قصص الانبیاء للنجار
[3] الفارق ص ۳۱۶۔

ہیں اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اُن کو خود ہی صحیح طریقہ پر جمع کر دوں تاکہ تم کو صحیح حقیقت معلوم ہو جائے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے حضرت مسیح کا زمانہ نہیں پایا، اور محققین نصاریٰ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل مرقس کی انجیل کے بعد وجود میں آئی ہے اور پطرس اور پولوس کے مرنے کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔[1]

اصل بات یہ ہے کہ لوقا انطاکیہ میں طبابت کرتا تھا، اُس نے مسیح کو نہیں دیکھا، اور مسیحیت کو سینٹ پال (پولوس) سے سیکھا ہے اور پولوس کے متعلق یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ دراصل متعصب یہودی اور عیسائیت کا بدترین دشمن تھا اور نصاریٰ کے خلاف علی الاعلان اپنی جدوجہد جاری رکھتا تھا مگر جب اُس نے یہ دیکھا کہ اُس کی ہمہ قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود مسیحیت کی ترقی ہوتی جا رہی ہے اور روکے نہیں رُکتی تب اُس نے یہودیانہ مکروفریب سے کام لیا اور اعلان کیا کہ عجیب معجزہ ہوا، میں بحالتِ صحت تھا کہ ایک دم اس طرح زمین پر گرا جیسا کہ کوئی کُشتی میں پچھاڑ دیتا ہے اور اس حالت میں حضرت مسیح نے مجھ کو چھوا اور پھر سخت زجروتوبیخ کی کہ آئندہ تو ہرگز میرے پیرووں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا پس میں اُسی وقت حضرت مسیح پر ایمان لے آیا اور پھر حضرت مسیح کے حکم سے میں مسیحی دنیا کی خدمت کے لیے مامور ہو گیا، اُنھوں نے مجھ کو فرمایا کہ میں لوگوں کو مسیح کی انجیل کی بشارت سُنادوں اور اُس کے اتباع کی ترغیب دوں، چنانچہ اُس نے آہستہ آہستہ "کلیسہ" پر ایسا قبضہ کیا کہ دینِ عیسوی کی اصل صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں اور برائیوں کا مجموعہ بنا دیا، الوہیتِ مسیح، تثلیث و ابنیت اور کفارہ کی بدعت ایجاد کر کے مسیحیت کو ثمنیت میں تبدیل کر دیا اور شراب، مردار اور خنزیر سب کو حلال بنا دیا، یہی وہ مسیحیت ہے پولوس کے صدقہ میں جس سے آج دنیا روشناس ہے، اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ پولوس کے شاگرد لوقا کی انجیل الہامی انجیل ہے، اور جیروم کہتا ہے کہ بعض قدیم علماءِ

[1] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۷۷-۴۷۸۔

نصاریٰ اس کے قائل ہیں کہ لوقا کی انجیل کے ابتدائی دو باب الہامی نہیں الحاقی ہیں کیونکہ یہ اُس نسخہ میں موجود نہیں ہیں جو مارسیون فرقہ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور مشہور نصرانی عالم اکہارن لکھتا ہے کہ لوقا کی انجیل کے باب ۲۲ آیات ۴۳-۴۴ الحاقی ہیں، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ معجزات سے متعلق جو بیان ہے اُس میں کذب بیانی اور شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے جو غالباً کاتب کی جانب سے اضافہ ہیں لیکن اب صدق کا کذب سے امتیاز حد درجہ دشوار ہے، اور کلی میشس........ لکھتا ہے کہ متی اور مرقس کی انجیلیں بہت جگہ آپس میں مخالف اور متضاد واقعات کی حامل ہیں لیکن جس معاملہ میں دونوں کا اتفاق ہو اُس کو لوقا کی انجیل کے بیان پر ترجیح حاصل ہے[۲]۔ اور یہ واضح رہے کہ لوقا کی انجیل میں بیس سے زیادہ مواقع پر متی کی انجیل سے اضافہ ہے اور مرقس کی انجیل سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ[۳]۔ پس ان تمام دلائل سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لوقا کی انجیل ہرگز الہامی نہیں ہے اور نہ کسی حواری کی تصنیف ہے۔

چوتھی انجیل، یوحنا کی ہے۔ اس کے متعلق نصاریٰ کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے محبوب شاگرد یوحنا زبدی کی ہے، زبدی صیاد، یوحنا کے والد کا نام تھا جلیل کے بیتِ صیدا میں ولادت ہوئی اور حواری عیسیٰ (علیہ السلام) کا شرف حاصل ہوا اور نصاریٰ میں مشہور بارہ حواریوں میں سے سب سے زیادہ ان ہی کو تقدیس حاصل ہے۔ جرجیس زویں اللبنانی لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں شیرنطوس اور ابیون اور ان کی جماعت اپنے عقیدہ کی تشہیر کر رہی تھی کہ الوہیتِ مسیح کا عقیدہ باطل ہے وہ بشر تھے اور حضرت مریم کے بطن سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم سے قبل وہ عالمِ وجود میں نہیں تھے اُس زمانہ میں سنہ ۹۶ء میں پادریوں، لاٹ پادریوں کی مجلس مشاورت ہوئی اور انہوں نے یوحنا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کی کہ وہ حضرت مسیح کی باتیں تحریر کریں اور جو باتیں دوسری

---

[۱] الفارق بین المخلوق والخالق [۲] قصص الانبیاء، ص ۴۷۷ [۳] ایضاً ص ۴۷۷

انجیلوں میں پائی جاتی ہیں اُن کے ماسوا جو کچھ معلوم ہو وہ لکھیں خصوصیت سے الوہیت مسیح کا مسئلہ ضرور لکھیں تاکہ شیرنیطوس وغیرہ کی جماعت کے خلاف ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں، تب یوحنا اُن کی بات نہ ٹال سکے اور یہ انجیل لکھنے پر مجبور ہوئے[1]۔ مگر اس کے باوجود مسیحی علماء زمانۂ تصنیف کی تعیین میں مختلف نظر آتے ہیں، بعض کہتے ہیں ۶۵ء میں تالیف ہوئی اور بعض ۹۶ء اور بعض ۹۸ء میں تصنیف ہونا بیان کرتے ہیں۔

مگر ان کے مقابلہ میں اُن مسیحی علماء کی بھی تعداد کم نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یوحنا کی انجیل، حواری یوحنا کی تصنیف ہرگز نہیں ہے چنانچہ کیتھولک ہیرالڈ جلد ۷[2] میں پروفیسر لن سے منقول ہے کہ انجیل یوحنا از ابتداء تا انتہاء مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تصنیف ہے اور برٹش نیمدر لکھتا ہے کہ انجیل یوحنا اور رسائل یوحنا ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح کے شاگرد یوحنا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شخص نے دوسری صدی کے اوائل میں اس کو تصنیف کر کے اس لیے یوحنا کی جانب منسوب کر دیا تاکہ وہ لوگوں میں مقبول و مشہور بن جائے اور صاحب الفارق کہتے ہیں کہ مشہور مسیحی عالم کرڈیس .... کا بیان ہے کہ یہ انجیل شروع میں بیس ابواب پر مشتمل تھی بعد میں افاس کے کنیسہ نے اس میں اکیسویں باب کا اضافہ کر دیا جبکہ یوحنا کا انتقال ہو چکا تھا[3]۔ ان حوالجات سے یہ بخوبی آشکارا ہوتا ہے کہ بلاشبہ یہ یوحنا حواری کی انجیل نہیں ہے اور صرف اس مقصد سے تصنیف کر کے یوحنا کی جانب منسوب کی گئی کہ الوہیت مسیح کے عقیدۂ کنیسہ کو قوت پہنچائی جائے، اور اصلاحِ عقیدہ کی جو آواز کبھی کبھی مسیحی دنیا میں اٹھتی تھی اُس کو دبایا جائے۔

چہارگانہ اناجیل کے متعلق مسطورۂ بالا مختصر تنقیدات کے علاوہ ان کے الہامی نہ ہونے کی دو واضح دلائل یہ بھی ہیں کہ ان چاروں انجیلوں میں حضرت مسیح (علیہ

۱؎ قصص الانبیاء ص ۴۷۷ ۲؎ مطبوعہ ۱۸۴۴ء ۳؎ الفارق۔ ص ۳۴۲۔ ۳۴۱۔

السلام) کی زندگی کے وقائع درج ہیں حتیٰ کہ نصاریٰ کے زعم کے مطابق اُن کی گرفتاری، صلیب، قتل، مرکر جی اُٹھنے، اور حواریوں پر ظاہر ہونے وغیرہ تک کے حالات بھی موجود ہیں۔ پس اگر یہ اناجیل انجیلِ مسیح یا اُس کا کوئی حصہ ہوتیں تو اُن میں ان باتوں کا قطعاً تذکرہ نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ واقعات تو مسیح کے بعد اُن کے شاگرد علیحدہ جمع کرتے اور اُن کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوتی نہ کہ وہ کتاب اللہ کہلانے کے مستحق ہوتے، اور یہ کہ جس طرح ان انجیلوں کے مصنفین کے بارہ میں اختلاف ہے اسی طرح ان تصنیفات کے باہم روایات واقعات میں بھی تناقص اور سخت اختلاف پایا جاتا ہے یعنی بعض معجزات و عجیب واقعات ایسے ہیں جو ایک انجیل میں پائے جاتے ہیں اور دوسری انجیل میں اُن کا اشارہ تک نہیں ہے یا بعض میں ایک واقعہ جس طرح مذکور ہے دوسری میں کچھ زیادتی یا کمی کے ساتھ ایسے طریقہ پر بیان ہوا ہے کہ پہلی انجیل کے بیان میں اور اس میں صریح تضاد اور خلاف نظر آتا ہے۔ مثلاً صلیبِ مسیح علیہ السلام کا واقعہ اناجیل میں تضادِ بیان کے ساتھ منقول ہے

یہ بات بھی کم حیرت کے لائق نہیں ہے کہ یہ اناجیلِ اربعہ جن جن زبانوں میں منقول ہے ہوئی ہیں اُن کی عبارات و کلمات کے بقاء و تحفظ کی کبھی پرواہ نہیں کی گئی بلکہ ایک ہی زبان کے مختلف ایڈیشنوں اور اشاعتوں میں بہ کثرت الفاظ اور جملوں کی تبدیلی، کمی اور بیشی موجود ہے خصوصاً جن مقامات پر علماءِ اسلام اور علماءِ نصاریٰ کے درمیان بشارات کے سلسلہ میں یہ بحث آگئی ہے کہ ان کا مصداق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا حضرتِ مسیح یا کوئی اور نبی ہے جن مقامات پر الوہیتِ مسیح کی صراحت میں فرق پڑتا نظر آتا ہو اُن کو کافی تختۂ مشق بنایا جاتا رہا ہے۔

اگر تحریفاتِ لفظی و معنوی اور تضادِ بیان کی تفصیلات و تصریحات کو بہ نظرِ وسیع مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی اظہار الحق، حافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاریٰ باجہ جی زادہ کی الفارق بین المخلوق والخالق اور مولانا آل نبی امروہی کی اظہارِ حق

لائقِ دید کتابیں ہیں

غرض موجودہ چاروں انجیلیں الہامی انجیلیں نہیں ہیں، نہ ان کے الہامی ہونے کی روایتی سند ہے اور نہ تاریخی، نہ ان کے مصنفین کے متعلق قطعی اور یقینی علم حاصل ہے اور نہ زمانہ ہائے تصانیف ہی متعین ہیں بلکہ اس کے خلاف پولوس کے بیانات ان کتابوں کی تاریخی حیثیت، مضامین و مطالب کا باہمی تضاد و تغیر اسی پر شاہد ہیں کہ یہ ہرگز انجیلِ مسیح یا اُس کا حصّہ نہیں ہیں اور یہ کہ انجیل مسیح "نصاریٰ" کے ہی ہاتھوں اوّل تحریف لفظی و معنوی کا شکار ہوئی اور اُس کے بعد مفقود ہوگئی بلکہ ان چہارگانہ انجیلوں میں سے بھی کوئی اصل نہیں ہے بلکہ یونانی اور اس سے منقول دوسری زبانوں کے تراجم ہیں جو تبدیلی و تغیر اور نقص و ازدیاد کا برابر شکار ہوتے رہے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ یہ اناجیلِ اربعہ انجیلِ مسیح نہیں ہیں بلکہ کسی علمی، تاریخی اور مذہبی سند سے ان کا شاگردانِ مسیح کی تصنیف ہونا بھی ثابت نہیں ہے بلکہ بعد کے مصنفین کی تصانیف ہیں البتہ ان تراجم میں مواعظ و نصائح اور مقالاتِ حکمت کے سلسلہ میں ایک حصّہ ایسا ضرور ہے جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ارشاداتِ عالیہ سے ماخوذ ہے اور اس لیے نقل میں کہیں کہیں اصل کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

قرآن اور انجیل قرآنِ عزیز کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ جس طرح خدا ایک ہے اُسی طرح اُس کی صداقت بھی ایک ہی ہے اور وہ کبھی کسی خاص قوم، خاص جماعت، اور خاص گروہ کی وراثت نہیں رہی بلکہ ہر قوم اور ہر ملک میں خدا کی ہدایت و رشد کا پیغام ایک ہی اساس و بنیاد پر قائم رہتے ہوئے اُس کے سچے پیغمبروں یا اُن کے نائبوں کے ذریعہ ہمیشہ دنیا کے لیے راہِ مستقیم کا داعی اور منادی رہا ہے اور اسی کا نام "صراطِ مستقیم" اور "اسلام" ہے اور قرآن اُسی بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے آیا ہے اور یہی وہ آخری پیغام ہے جس نے تمام مذاہبِ ماضیہ کی صداقتوں کو اپنے اندر سمو کر کائناتِ ارضی کی ہدایت کا بیڑا اُٹھایا ہے اور اس لیے اب اس کا انکار گویا

خدا کی تمام صداقتوں کا انکار ہے، اسی بنیادی تعلیم کے پیش نظر اُس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عظمتِ شان کو سراہا اور یہ اعتراف کیا کہ بلاشبہ انجیل الہامی کتاب اور خدا کی کتاب ہے لیکن ساتھ ہی جگہ جگہ یہ بھی بہ دلائل تبلایا کہ علماءِ اہل کتاب نے اس کی سچی تعلیم کو مٹا ڈالا، بدل ڈالا اور ہر قسم کی تحریف کر کے اُس کی تعلیم کو شرک و کفر کی تعلیم بنا دیا۔ مگر بعض بعض مقامات پر اہل کتاب کو تورات و انجیل کے خلاف عمل پر ملزم بناتے ہوئے موجودہ تورات و انجیل کے حوالے بھی دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت اصل نسخے بھی اگرچہ محرف شکل ہی میں کیوں نہ ہوں پائے جاتے تھے، بہرحال اُس وقت بھی یہ دونوں کتابیں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفات سے اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں کہ وہ توراتِ موسیٰ اور انجیلِ مسیح کہلانے کی مستحق نہیں رہی تھیں چنانچہ قرآن نے اصل کتابوں کی عظمت، اور اہل کتاب کے ہاتھوں اُن کی تحریف اور اُن کا مسخ دونوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ نے تجھ پر کتاب کو اُتارا
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ	حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے اُن کتابوں کی جو
اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ	اُس کے سامنے ہیں اور اُتارا اُس نے تورات اور
قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ	انجیل کو (قرآن سے) پہلے جو ہدایت ہیں لوگوں کے لیے
الْفُرْقَانَ ۝ (آل عمران)	اور اُتارا فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی)
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ	اور سکھاتا ہے وہ کتاب کو، حکمت کو، تورات کو، انجیل کو
يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ	اے اہلِ کتاب! تم کس لیے ابراہیم کے بارہ
وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا	میں جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ تورات اور انجیل کا
مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (آل عمران)	نزول نہیں ہوا مگر ابراہیم کے بعد پس کیا تم اتنا
	بھی نہیں سمجھتے۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ	اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ بن مریم کو جو تصدیق
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ	کرنے والا ہے اُس کتاب کی جو سامنے ہے تورات۔
وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ	اور دی ہم نے اس کو انجیل جس میں ہدایت اور
وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ	نور ہے اور جو اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق
وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ وَلْيَحْكُمْ	کرتی ہے اور سر تا سر ہدایت اور نصیحت ہے پرہیزگاروں
اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ	کے لیے، اور چاہیے کہ اہل انجیل اُس کے مطابق
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	فیصلہ دیں جو ہم نے انجیل میں اُتار دیا ہے اور
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝	جو اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کے موافق
(المائدہ)	فیصلہ نہیں دیتا پس یہی لوگ فاسق ہیں۔
وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ	اور اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھتے (تحریف
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا	کر کے اُن کو مسخ نہ کر ڈالتے) اور اُس کو قائم رکھتے
مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ	جو اُن کی جانب اُن کے پروردگار کی جانب
مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ	سے نازل ہوا ہے تو البتہ وہ (فارغ البالی سے
مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝	ساتھ) کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے نیچے سے
(المائدہ)	بعض اُن میں سے میانہ رو صلاح کار ہیں اور
	اکثر ان کے بد عمل ہیں۔
قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ	(اے محمد) کہہ (تنبیہ:) اے اہل کتاب! تمہارے
حَتّٰي تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ	لیے ٹکنے کی کوئی جگہ نہیں ہے جب تک تورات اور انجیل
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ	اور اُس شئی کو جس کو تمہارے پروردگار نے تم پر
(المائدہ)	نازل کیا قائم نہ کرو (تاکہ اس کا نتیجہ قرآن کی تصدیق ہو)
وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	اور جب میں نے تجھ کو اے عیسیٰ سکھائی

وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (المائدہ)	کتاب، حکمت، تورات، اور انجیل
اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ	(نکوکار) وہ لوگ ہیں جو پیروی کرتے ہیں الرسول کی
الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا	جو نبی امی ہے اور جس کا ذکر اپنے پاس تورات اور
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (الاعراف)	انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔
اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	بلاشبہ اللہ نے خرید لیا ہے مومنوں سے اُن کی جانوں
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ	اور اُن کے مالوں کو اس بات پر کہ اُن کے لیے
الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	جنت ہے وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں
فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ	پس قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں اُن کے لیے
حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (توبہ)	اللہ کا وعدہ سچا ہے جو تورات اور انجیل میں کیا گیا ہے۔

غرض یہ مدح و منقبت ہے اُس تورات اور انجیل کی جو تورات موسیٰ اور انجیل مسیح کہلانے کی مستحق اور درحقیقت کتاب اللہ تھیں۔ لیکن یہود و نصاریٰ نے ان الہامی کتابوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا اس کا حال بھی قرآن ہی کی زبان سے سنیے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ	کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لینگے حالانکہ
قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ	اُن میں ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا پھر
كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ	اُس کو بدل ڈالتا تھا باوجود اس بات کے کہ وہ اس کے
مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (بقرہ)	مطالب کو سمجھتا تھا اور وہ دیدہ و دانستہ تحریف کرتے تھے
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ	پس افسوس اُن (مدعیان علم) پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود
بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ	اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں
عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا	یہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کرتے
فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ	ہیں تاکہ اُس کے معاوضہ میں ایک حقیر سی قیمت
وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (بقرہ)	دنیوی فائدہ کی حاصل کریں پس افسوس اُس پر

جو کچھ اُن کے ہاتھ لکھتے ہیں اور افسوس ان پر جو کچھ وہ اس ذریعہ سے کماتے ہیں۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (المائدہ)
وہ (اہل کتاب) کتاب اللہ (توراۃ و انجیل) کے کلمات کو ان کے محل و مقام سے بدل ڈالتے ہیں (یعنی تحریف لفظی اور معنوی دونوں کرتے ہیں)

ان کے علاوہ ثمنِ قلیل (معمولی پونجی) کے عوض آیات اللہ کی فروخت کرنے کے متعلق توبقرہ، آل عمران، نساء، توبہ میں متعدد آیات موجود ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ، تورات و انجیل کی بیع دونوں طرح کیا کرتے تھے تحریف لفظی کے ذریعہ بھی اور تحریف معنوی کے سلسلہ سے بھی گویا سیم و زر کے لالچ سے عوام و خواص کی خواہشات کے مطابق کتاب اللہ کی آیات میں لفظی و معنوی تحریف اُن کے فروخت کرنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بڑھ کر شقاوت و بدبختی کا دوسرا کوئی عمل نہیں اور جو ہر حالت میں موجب "لعنت" ہے۔

انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام

مفسرین عام طور پر حواری کو حور سے ماخوذ کہتے ہیں جس کے معنی کپڑے کی سپیدی کے ہیں، جب کپڑا دُھل جانے کے بعد سپید ہو جاتا ہے تو اہلِ عرب کہا کرتے ہیں "حار الثوب" اس لیے دھوبی کو "حواری" کہتے ہیں اور "حواریون" اُس کی جمع آتی ہے، اس معنی کے پیشِ نظر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے شاگردوں کو یا اس لیے حواری کہتے ہیں کہ اُن میں سے اکثر دھوبی اور مچھیرے کا پیشہ کرتے تھے اور یا اس لیے کہ جس طرح دھوبی کپڑا صاف کر دیتا ہے یہ بھی حضرت مسیح کی تعلیم سے لوگوں کے قلوب کو روشن کر دیا کرتے تھے، حواری کے معنی ناصر و مددگار اور ناصح کے بھی آتے ہیں اور عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں کو "شاگرد" کہتے ہیں، یہ تعبیر بے اصل نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے "حبور" عبرانی لفظ

ہو جس کے معنی "شاگرد" کے ہیں اور اس کی جمع "حبوریم" آتی ہے، یہی حبوریم ہے جو عربی میں جاکر حواری اور حواریین کہلایا۔

حواریینِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے لیکن قرآن عزیز نے صرف "حواریون" کہہ کر مجمل تذکرہ کیا ہے کسی کا نام مذکور نہیں ہے، انجیل نے البتہ اُن کے نام بھی بتلائے ہیں اور تعداد بھی، چنانچہ متّی کی انجیل کے باب۱۰ میں بارہ نام شمار کرائے ہیں، اور چار انجیلوں سے خارج برنابا کی متروک انجیل کے باب۱۴ میں بھی یہی تعداد مسطور ہے، البتہ چند ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ نقشہ حسب ذیل ہے۔

انجیل متّی		انجیل برنابا	
شمار	نام	شمار	نام
(۱)	پطرس (سمعان)	(۱)	بطرس الصیاد (سمعان)
(۲)	اندراوس (پطرس کا بھائی)	(۲)	اندراوس
(۳)	یعقوب بن زبدی	(۳)	برنابا
(۴)	یوحنا (یعقوب کا بھائی)	(۴)	یعقوب بن زبدی
(۵)	فیلپس	(۵)	یوحنا بن زبدی
(۶)	برثولماوس	(۶)	فیلپس
(۷)	توما	(۷)	برثولماوس
(۸)	متی العشار	(۸)	تداوس
(۹)	یعقوب بن حلفی	(۹)	یعقوب بن حلفی
(۱۰)	لباوس (ملقب بہ تداوس)	(۱۰)	یہودا
(۱۱)	سمعان القانونی	(۱۱)	متّی العشار
(۱۲)	یہوذا اسخریوطی	(۱۲)	یہودا اسخریوطی [۱]

[۱] قصص الانبیاء للنجار ص۴۸۲

دونوں انجیلوں کے درمیان صرف دو ناموں میں اختلاف ہے۔ متّی میں توما اور شمعان قانوی ہیں اور برنابا میں اُن کی جگہ خود برنابا اور تداوس ہیں۔ ان میں کون صحیح کہتا ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن دلیل کی روشنی میں یہ کہنا بہت آسان ہے کہ کلیسا کی کونسل نے بے دلیل اور بے سند صرف اس بنا پر برنابا اور اُس کے رفیق تداوس کے نام نامنظور کر دیے کہ ان دونوں کی روایات الوہیتِ مسیح اور کفارہ کے خلاف سچی عیسائیت پر مبنی تھیں اور یہ کلیسہ کے اُس عقیدہ کے قطعاً خلاف تھیں جو سینٹ پال کی محرف عیسائیت کا مقبول عقیدہ تھا اور ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ برنابا کا نام موجودہ عیسائیت میں حواریوں سے خارج سمجھا جاتا ہے تاہم اُن رسولوں کی فہرست میں آج بھی موجود ہے جنہوں نے ملکوں میں خدائی بادشاہت کا اعلان کیا اور دینِ مسیحی کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا ہے۔

حضرت مسیح (علیہ السلام) اور موجودہ مسیحیت

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تعلیمِ حق کا خلاصہ گزشتہ بیانات میں سپردِ قلم ہو چکا ہے، وہ خدا کے سچے پیغمبر، حق و صداقت کے داعی، دینِ مُبین کے ہادی و مُبلغ تھے اور خدا کے تمام سچے پیغمبروں کی طرح اُن کی تعلیم بھی پہلی صداقتوں کی موئد، اور وقت کی انفرادی و اجتماعی ضروریات کے انقلاباتِ حوادث کے مناسب حال انجیل کی شکل میں اصلاح و انقلاب کے لیے مستند تھی، توحید خالص، معرفتِ کردگار کے لیے کردگار سے ہی بلا وسیلہ تقرب، محبت و شفقت، رحمت و عفو کی اخلاقی برتری اُن کی پاک تعلیم کا نچوڑ تھا، لیکن انسانی انقلابات کی ذہنی تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت اور تعجب کی غالباً دوسری کوئی بات نہ ہو کہ حضرت مسیح کی مقدس تعلیم ہی کے نام پر موجودہ مسیحیت، توحید کی جگہ تثلیث، معرفتِ حق کے لیے ابنیت کا عقیدہ، نجات کے لیے علم و عمل کی درستکاری کی جگہ کفارہ پر ایمان جیسی مشرکانہ اور جاہلانہ بدعات کی تبلیغ اور نشر و اشاعت میں سرگرمِ عمل ہے۔

تثلیث ؟ بُستانی نے دائرۃ المعارف (Encyclopaedia) میں اس مسئلہ پر مسیحی نقطۂ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عیسائی مذہب نے سب سے پہلے تثلیث کا نام "رسولوں کے عہد" میں سُنا، اس سے قبل مسیحیت اس عقیدہ سے قطعًا نا آشنا تھی، اور رسولوں کا عہد سینٹ پال (پولوس رسول) سے شروع ہوتا ہے، یہ وہی حضرت ہیں جن کی بدولت دینِ مسیحی نے نیا جنم لیا اور جن کی یہودیت نے از رہِ تعصب مسیحی صداقت و توحید کے عقیدہ کو وثنیت اور شرک سے آلودہ کر کے کامیابی کا سانس لیا، یہ عقیدہ دراصل وثنی (بت پرستانہ) فلسفہ کی موشگافیوں کی پیداوار اور صنم پرستانہ عقیدۂ "اوتار" کی صدائے بازگشت ہے اور اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ذات یا صفتِ خداوندی بشکلِ انسانی کائناتِ ارضی میں وجود پذیر ہو سکتی ہے۔ گویا یہ عقیدہ فلاسفۂ ہیلائیین اور غنوسطینین کے عقائدِ فلسفیانہ کا ایک معجونِ مرکب ہے چنانچہ تاریخ قدیم سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں انطاکیہ کے بشپ (Bishop) تھیوفیلوس نے سب سے پہلے اس سلسلہ میں ایک یونانی کلمہ "ترِیاس" کا استعمال کیا، اس کے بعد ایک دوسرے بشپ ترتلیانوس نے اس کے قریب قریب ایک لفظ "ترینتاس" ایجاد کیا، یہی وہ یونانی لفظ ہے جو موجودہ مسیحی عقیدہ "ثالوث" (تثلیث) کے مرادف اور ہم معنی ہے، اگر اس مسئلہ کی حقیقت کو ذرا اور گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کیجائے تو تاریخی حقائق سے یہ بات نمایاں نظر آئیگی کہ ثالوث کا عقیدہ دراصل مسیحیت اور وثنیت کی اُس آمیزش کا نتیجہ ہے جو مسیحیت کے غلبہ اور وثنیت (بت پرستی) کی مغلوبیت کی وجہ سے پیش آیا، خصوصًا جب مصری بت پرستوں نے اس مذہب کو قبول کیا تو اُنہوں نے اس عقیدہ کو بہت ترقی دی اور فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں کے ساتھ اس کو علمی بحث بنا دیا، مسیحیت قبول کر لینے کے بعد بت پرستوں پر جو ردِ عمل ہوا اس کے نتائج میں سے ایک اہم بات

یہ تھی کہ اُن کی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ وہ کس طرح گذشتہ وثنیت کی موجودہ مسیحیت کے ساتھ مطابقت پیدا کریں؟ تاکہ اس طرح قدیم وجدید دونوں ادیان کے ساتھ ربط قائم رہ سکے چنانچہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تخیل سیراپیز (Serapis) سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی، اور ایزیز (Isis) کی جگہ حضرت مریم (علیہا السلام) کو اور ہورس (Horus) کی حضرت مسیح کو دی گئی" اور اس یونانی اور مصری فلسفیانہ وثنیت کی بدولت موجودہ مسیحیت میں الوہیتِ مسیح اور تثلیث "کلیسہ کا مقبول عقیدہ بن گیا۔

یہ عقیدۂ تثلیث ابھی سن طفولیت ہی میں تھا کہ علماء نصاریٰ میں اس کے ردّ وقبول پر معرکۃ الآرا بحثیں شروع ہوگئیں، "نیقاو" کی کونسل میں مشرقی گرجاؤں میں اور خصوصی وعمومی مجالس میں جب بحث نے طول کھینچا تو "کلیسہ" نے فیصلہ دیا کہ مسئلہ ثالوث (تثلیث) حق اور اس کے خلاف "الحاد" ہے۔ ان ملحد جماعتوں اور فرقوں میں نمایاں فرقہ "ابیونیین" ہے جو کہتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) انسانِ محض تھے، دوسرا سابلیین ہے جس کا خیال ہے کہ خدا، ذات واحد ہے اور اب، ابن، روح القدس، یہ مختلف صورتیں ہیں جن کا اطلاق مختلف حیثیتوں سے ذاتِ واحد ہی پر ہوتا ہے تیسرا فرقہ "آریوسین" ہے اس کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح اگرچہ "ابن اللہ" ہیں مگر "اب" کی طرح ازلی نہیں ہیں بلکہ کائنات بلند وپست سے قبل "اب" کی تخلیق سے مخلوق ہوا ہے اور اس لیے وہ "اب" سے نیچے اور اُس کی قدرت کے سامنے مغلوب وخاضع ہے اور چوتھا فرقہ "مقدونیین" ہے ان کا کہنا ہے کہ صرف "اب" اور "ابن" دو ہی اقنوم ہیں "روح القدس" اقنوم نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے۔

کلیسہ نے ان کو اور اسی قسم کے دوسرے فرقوں کو "ملحد" قرار دے کر نیقادی کی کونسل منعقدہ ۳۲۵ء اور قسطنطنیہ کی کونسل منعقدہ ۳۸۱ء کے مطابق ثالوث (تثلیث) کو مسیحی عقیدہ کی بنیاد تسلیم کیا اور فیصلہ دیا کہ "اب" اور "ابن" اور "روح القدس"

تینوں جُدا جُدا مستقل اقنوم (اصل) ہیں اور عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ہی خدا ہی گویا اس طرح ریاضی اور علم ہندسہ کے اٹل اور ناقابلِ انکار بدیہی مسئلہ کے خلاف یا یوں کہیے کہ بداہۃً عقل کے خلاف یہ تسلیم کرلیا کہ "ایک تین ہی اور تین ایک" اور یہ بھی کہا کہ "ابن" ازل ہی میں "اب" سے پیدا ہوا اور "روح القدس" کا صدور بھی ازل ہی میں "اب" سے ہوا ہی، اور پھر ۵۸۹ء میں طلیطلہ کونسل نے یہ ترمیم منظور کرلی کہ "روح القدس" کا صدور "اب" سے ہی نہیں بلکہ "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا ہی۔ اس ترمیم کو "لاطینی کلیسہ" نے تو بغیر چون و چرا تسلیم کرلیا اور اس کو کلیسہ کا عقیدہ بنا لیا لیکن "یونانی کلیسہ" اول تو خاموش رہا مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس ترمیم کو "بدعت" قرار دے کر تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور اس باہمی اختلاف نے اس قدر شدید صورت اختیار کرلی کہ "یونانی کلیسہ" اور "کیتھولک لاطینی کلیسہ" کے درمیان کبھی اتفاق و اتحاد پیدا نہ ہوسکا۔

ثالوث یا تثلیث کا یہ عقیدہ دینِ مسیحی کے رگ و پے میں خون کی طرح ایسا سرایت کرگیا کہ مسیحی بڑے فرقوں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کے درمیان سخت بنیادی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس میں اتفاق ہی رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ حیرت ہی یہ بات کہ لوتھر کی جماعت اور اصلاح پسند کلیساؤں نے بھی ایک عرصۂ دراز تک اس کیتھولک عقیدہ کو بغیر کسی اصلاح و ترمیم کے عقیدہ تسلیم کیا۔ البتہ تیرہویں صدی عیسوی میں فرقۂ لاہوتی کی اکثریت نے اور جدید فرقوں سوسینیائی ——— جرمانی ——— موحدین ——— اور عموميين ——— وغیرہم نے اس عقیدہ کو نقل و عقل کے خلاف کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کردیا[1]۔

یہ ہی مسیحیت میں عقیدۂ تثلیث کی وہ مختصر تاریخ جس سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہی کہ دینِ مسیحی کی حقیقی صداقت کی تباہی کا راز اسی الحاد اور مشرکانہ بدعت کے

[1] دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۶ صفحہ ۳۰۵ کلمۂ ثالوث)

اندر پوشیدہ ہے جو صنم پرستانہ تخیل کا رہینِ منت ہے

عقیدۂ ثالوث کیا شئے ہے اور "اب" "ابن" "روح القدس" کی تعبیرات کی حقیقت کیا ہے، یہ مسئلہ بھی مسیحیت کے اُن مباحث میں سے ہے جن کا فیصلہ کن جواب کبھی نہ مل سکا اور جس قدر اُس کو صاف اور واضح کرنے کی سعی کی گئی اُس میں الجھاؤ اور پیچیدگی کا اضافہ ہی ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جس عقیدہ کو مسیحیت میں اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل تھی وہی "معمہ" بن کر رہ گیا اور قدیم و جدید علماء نصاریٰ کو یہ کہنا پڑا کہ تثلیث میں توحید ہے اور توحید میں تثلیث، یہ مذہب کا ایسا مسئلہ ہے جو دنیا میں حل نہیں ہو سکتا اور دوسرے عالم میں پہنچ کر ہی یہ عقدہ حل ہو گا اس لیے یہاں اس کو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرنا فضول ہے بلکہ خوش عقیدگی کے ساتھ قبول کر لینا ہی نجات کی راہ ہے، چنانچہ اواخر اُنیسویں صدی کے مشہور عیسائی عالم پادری فنڈر نے "میزان الحق" میں یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاہم اس صنم پرستانہ فلسفہ کی جو تشریحات کی گئی ہیں اُن کو مختصر طور پر یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کائناتِ ہست و بود کو جس میں ہم بس رہے ہیں "عالم ناسوت" کہا جاتا ہے اور ملاءِ اعلیٰ کہ جس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے وہ اور اُس سے ماوراء جہاں نہ زمین و زماں کا گذر اور نہ مکین و مکاں کا، جہاں سب کچھ ہے لیکن مادیت سے بالاتر اور وراء الوراء ہے اُس کا نام "عالمِ لاہوت" ہے، تو جب زیر و بالا اور بلند و پست کچھ بھی نہ تھا اور ازل کی غیر محدود وسعت میں "وقت" ایک بے معنی لفظ تھا اُس وقت تین اقنوم[1] تھے، "باپ" "بیٹا" "روح القدس" اور ان ہی تین اقانیم کی مجموعی حقیقت کا نام "خدا" ہے۔ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور ان دونوں سے جُدا کلیسۂ شرقی تینوں ہی اس پر متفق ہیں اور اسی کو دینِ مسیحیت کی روح یقین کرتے ہیں اور بڑی

---

[1] اقنوم کے معنی ہیں "اصل"

جسارت کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ کتاب مقدس کی تصریحات اسی کا اعلان کرتی ہیں۔

اس عجوبۂ روزگار عقیدہ نے اس حد پر پہنچ کر جو نئے نئے مباحث و افکار پیدا کیے اُن کا مطالعہ کرنے سے دیدۂ حیرت اور چشم عبرت کے لیے بہت کچھ سامان مہیا ہو جاتا ہے، بڑی بڑی مذہبی کونسلوں، بڑے بڑے کلیساؤں کے بشپوں اور پاپاؤں نے اس عقیدہ کی تشریح میں یہ عجیب و غریب مباحث پیدا کیے کہ "اقنوم اول" باپ سے کس طرح اقنوم ثانی "بیٹے" کی ولادت ہوئی اور پھر باپ سے یا باپ اور بیٹے دونوں سے کس طرح اقنوم ثالث "روح القدس" پھوٹ کر نکلی یا کس طرح اس کا صدور ہوا اور یہ کہ ان کے باہم نسبت کیا ہے اور ان کے جُدا جُدا کیا القاب و صفات ہیں جو ایک دوسرے کو آپس میں متاثر کرتے ہیں اور پھر جب یہ تثلیث، توحید بن جاتی ہے تو اُس کی صفات و القاب کی کیا صورت ہو جاتی ہے، نیز یہ کہ جس کو ہم خدا کہتے ہیں اُس میں تینوں اقانیم برابر کے شریک ہیں یا کوئی ایک پورا اور دوسرے دو جزوی حصہ دار ہیں اور جزوی شرکت ہے تو کس نسبت اور تعلق سے ہے؟ غرض خدائے برتر کی مقدس اور پاک ہستی کو معاذ اللہ کمہار کے چاک پر رکھا ہوا برتن فرض کر کے جس طرح اُس کو بنایا اور طیار کیا ہے اور توحید خالص کو تباہ و برباد کر کے جس طرح شرک و ترکیب کا نیا سانچہ ڈھالا ہے دنیائے مذاہب و ادیان کی تاریخ میں ایسا مذہبی تغیر و انقلاب بہ چشم فلک نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ "ان ھذا لشیء عجاب" بہرحال "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کی جدا جدا تفصیلات و تشریحات اور پھر وحدت سے ترکیب اور ترکیب سے وحدت کی عجوبۂ زا تعبیرات کی ایک بھول بھلیاں ہے جس کا کہیں اور چھور نظر ہی نہیں آتا اور جب کہنے والا ہی لفظی تعبیرات کے علاوہ "حقیقت" سمجھنے سے عاری ہے تو سننے والا کیا خاک سمجھ سکتا ہے۔

باپ اقانیم ثلاثہ میں "اب" پہلا اقنوم ہے، اسی سے اقنوم ثانی کی ولادت ہوئی اور عالم لاہوت میں یہ کبھی بھی دوسرے اور تیسرے اقانیم سے جدا نہیں ہوتا مگر مسیحی فرقوں میں کنیسہ کی

عام تعلیم کے مطابق اکثر فرقے یہ کہتے ہیں کہ وحدتِ لاہوت میں تینوں کا درجہ مساوی ہے اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہے اور آریوسی ——— کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرا اقنوم "بیٹا" اقنوم اول کی طرح ازلی نہیں ہے البتہ عالم بالا و پست سے غیر معلوم مدت پہلے اقنوم اول سے پیدا ہوا ہے اس لیے اُس کا درجہ "باپ" کے بعد اور اُس سے کم ہے اور مقدونی فرقہ کہتا ہے کہ صرف دو ہی اقنوم ہیں "باپ" اور "بیٹا" اور "روح القدس" مخلوق ہے اور فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس کا پایہ تمام ملائکۃ اللہ سے بلند ہے اور طلیطلہ کی کونسل کا فیصلہ یہ ہے کہ روح القدس "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے پھوٹ کر نکلی ہے یا دونوں سے ہی اس کا صدور ہوا ہے مگر قسطنطینہ کی کونسل روح القدس کو صرف "باپ" ہی سے صادر ہونا بتلاتی ہے، اور قدیم و جدید فرقوں میں سے ایک بڑی جماعت اقنوم ثالث مریم (علیہا السلام) کو تسلیم کرتی اور روح القدس کے اقنوم ہونے کا انکار کرتی ہے۔

بیٹا عربی میں "ابن" فرنچ میں "فی" ——— اور انگریزی میں "سن" (SON) اور اردو میں "بیٹا" کہتے ہیں، یہ اُس شکلِ انسانی پر بولا جاتا ہے جو عام قانونِ قدرت کے مطابق مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے مگر عقیدۂ ثالوث کے مطابق وہ عالم لاہوت میں "باپ" سے جُدا بھی نہیں ہے اور پیدا بھی ہے اور پھر بعض کے نزدیک اُس کی پیدائش ازلی ہے اور بعض کے نزدیک غیر ازلی آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب "باپ" کی مشیت کا فیصلہ ہوا تو اقنوم ثانی "بیٹا" عالمِ ناسوت (کائناتِ ہست و بود) میں مریم کے بطن سے پیدا ہو کر "مسیح" کہلایا اور بعض کا تو یہ دعویٰ ہے کہ خود باپ ہی عالمِ ناسوت میں بیٹا بن کر مریم کے بطن سے تولد ہوا اور مسیح کی شکل میں روشناس ہوا اور طرفہ تماشا یہ کہ بعض کے نزدیک تو اقنوم ثانی "ابن" کو اقنومِ اوّل "اب" پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

روح القدس | اسی طرح "روح القدس" کے متعلق بھی سخت اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ وہ اقنوم ہی نہیں ہے اس لیے عالمِ لاہوت میں اس کو الوہیت حاصل نہیں ہے چنانچہ مقدونی اور

آریوسی کہتے ہیں کہ وہ ملائکۃ اللہ میں سے ہے اور اُن میں سب سے برتر و بلند ہے اور ماردتونیوس کہتا ہے کہ روح القدس کی تعبیر مجازی ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال پر مجازاً اس کا اطلاق کیا جاتا ہے ورنہ الگ سے کوئی حقیقت نہیں ہے اسی بنا پر اس قول کے قائلین کو "مجازئین" کہا جاتا ہے اور علماءِ جدید میں کلارک کہتا ہے کہ الہامی کتابوں (عہدنامۂ قدیم و جدید) میں کسی ایک جگہ بھی "الوہیت" کا درجہ نہیں دیا گیا۔ فرقۂ مکدونی نے الوہیتِ روح القدس کا انکار کرتے ہوئے شد و مد سے یہ کہا کہ اگر جوہرِ الوہیت میں روح القدس کو بھی دخل ہوتا تو یا وہ مولود ہوتی یا غیر مولود، اگر مولود ہے تو اُس کے اور "ابن" کے درمیان کیا فرق رہا اور اگر غیر مولود ہے تو اس کے اور "اب" کے درمیان کیا امتیاز ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری جماعتیں کہتی ہیں کہ "روح القدس" کو بھی الوہیت حاصل ہے، بوسیو رومانی کہتا ہے کہ روح القدس کا صدور "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا اور وہ ان کے جوہرِ نفس سے ہے اور دونوں کے ساتھ وحدتِ لاہوت میں "الٰہ" ہے۔ اور اثناسیوس کہتا ہے کہ روح القدس کی الوہیت ناقابل انکار ہے اور کتب سماویہ میں روح پر "الٰہ" کا اور "الٰہ" پر "روح" کا اطلاق ثابت و مسلّم ہے۔ اور اُس کی جانب اُن ہی امور کی نسبت کی گئی ہے جن کا تعلق ذاتِ خدا کے ماسوا اور کسی سے نہیں ہے۔ مثلاً تقدیسِ ذات، معرفتِ جمیع حقائق وغیرہ، اور یہ عقیدہ قدیم سے چلا آتا ہے جیسا کہ نظمِ وسو لجیا سے ثابت ہے جس کی قدامتِ تالیف سب کے نزدیک مسلّم ہے، اس میں الوہیتِ روح القدس کا اعتراف موجود ہے، اور مولٹ لفیلو پیٹرس نے انکارِ الوہیتِ روح پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نصاریٰ کے نزدیک خدائے حقیقی کی توحید کا تثلیث میں مضمر ہونا ایک مسلّم حقیقت ہے پھر روح کو الوہیت سے خارج کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور مکدونیوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مار اثناسیوس کہتا ہے کہ کتب سماوی میں روح کو ابن نہیں کہا گیا بلکہ روح الاب اور روح الابن کے اطلاقات پائے جاتے ہیں لہٰذا اُس کو "ابن" یا "اب" کہنا صحیح نہیں اور

نہ اُس کو الوہیت سے نکال کر مخلوق کہنا درست ہو سکتا ہے، اور ادراکِ بشری عاجز ہے کہ ان فلسفیانہ بحثوں سے "روح القدس" کی حقیقت تک پہنچ سکے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقط تولید (پیدا ہونا) ہی تنہا ایسا واسطہ نہیں ہے جو "اب" کے ساتھ قائم ہو بلکہ انبثاق (صدور یا پھوٹ نکلنا) بھی ایک شکل ہو سکتی ہے مگر ہم اس دنیا میں تولید اور انبثاق کے درمیان فرق ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہیں، البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تولید و انبثاق دونوں کا "اب" کے ساتھ ازلی و ابدی اور تلازم کا تعلق ہے پس ہمارے لیے ہرگز یہ مناسب نہیں ہے کہ فلاسفۂ قدیم (فلاسفۂ یونان) کی طرح "روح القدس" اور "اب" کے درمیان فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ وہ اعتقادات قبول کرلیں جو اُنہوں نے خدا سے صدور یا ارواح کے متعلق پیدا کر لیے ہیں۔

اِسی کے ساتھ ساتھ وہ اختلافات بھی پیش نظر رہنے چاہئیں جو گذشتہ سطور میں بیان ہو چکے ہیں کہ بعض کلیسے "روح القدس" کا فقط اقنوم اوّل (باپ) سے صادر ہونا مانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے اس کا صدور ہوا ہے، یہ اختلاف بھی عیسائی فرقوں کے مابین سخت کشاکش کا باعث رہا ہے کیونکہ ۳۸۱ء میں منعقدہ کونسل قسطنطینیہ نے "منشورِ ایمانی" میں یہ واضح کر دیا تھا کہ "روح القدس" کا صدور "باپ" ہی سے ہوا ہے اور عرصہ تک یہی عقیدہ مسیحی دنیا میں نافذ رہا لیکن ۴۴۷ء میں اوّل ہسپانیہ کے کلیسہ نے پھر فرانس کے کلیسہ نے اور اُس کے بعد تمام لاطینی رومن کلیساؤں نے اس ترمیم کو جزءِ عقیدہ بنایا کہ "روح القدس" کا صدور اقنوم اوّل (باپ) اور اقنومِ ثانی "بیٹا" دونوں سے ہوا ہے۔ عیسائی علماء کہتے ہیں کہ دراصل یہ بحث ۸۶۶ء میں سب سے پہلے شرق کے بطریق فوتیوس نے اس لیے پیدا کی کہ اُس کی اور اُس کی جماعت کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح شرق (یونان) کے کلیسہ کو غرب (روم) کے کلیسہ سے جُدا کر دیا جائے اور مشرق و مغرب کے کلیساؤں کا اتحاد باقی نہ رہنے

دیا جائے، اسی خیال کی تائیدُ تقویت کے لیے ۱۰۴۳ء میں بطریق میخائیل کردلاریوس نے اس عقیدہ کو بہت شائع کیا اور آخر کار صدیوں تک ان اختلافات نے کلیسہ ہائے شرق و غرب کے درمیان مخالفانہ کشا کش کو قائم رکھا اور دونوں کلیسہ ایک دوسرے پر یہ الزام قائم کرتے رہے کہ مخالف کلیسہ نے مسیحیت میں الحاد و بدعت کی آمیزش کر کے حقیقی مذہب کو مٹا ڈالا ہے اور رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی بالعموم اور کلیساؤں کے مختلف فرقوں کی بالخصوص کشمکش کا یہ سلسلہ اس وقت تو انتہائی شدت اختیار کر چکا تھا اور باہم ہولناک خونریزیوں اور بہیمانہ مظالم کا جنم بن چکا تھا جبکہ اسلام، اعتقادات کی سادگی، اعمالِ صالحہ کی پاکیزگی اور اپنی علمی و عملی روحانیت کی شگفتگی کی بدولت "امنِ عام" اور "رحمت" کا نیرِ درخشاں بنا ہوا تھا

ازمنۂ مظلمہ اور اصلاح کنیسہ کی آواز

یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں کے مذہبی کلیسہ معمولی معمولی اختلافات کی بنا پر پوپ کی حکومت اور پیروان پوپ کی حکومتوں کے ذریعہ ایک دوسری جماعت کو گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتی اور ہزاروں لاکھوں انسانوں کو وحشتناک عذابوں میں مبتلا کر کے قتل کر دیا کرتی تھیں، اسی بنا پر مورخین تاریخ کے اس دور کو ازمنۂ مظلمہ (زمانہائے تاریک) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن نے حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق جس حقیقت اور صداقت کا اظہار کیا تھا، پوپ اور کلیسائے روم کی عصبیت نے اگرچہ ایک مدتِ مدید تک عیسائیوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا مگر پھر بھی یہ صدائے حق اثر کیے بغیر نہ رہ سکی، اس کی تفاصیل اگرچہ خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مذکور ہونگی لیکن یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا مقصود ہے کہ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ، اور دوسرے فرقوں نے بغیر کسی جھجک کے سینٹ پال کی تحریف (تثلیث) مسیحیت کا بنیادی عقیدہ تسلیم کر لیا تھا اور اگرچہ بعض چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا افراد نے کبھی کبھی اس کے خلاف

آواز اُٹھائی مگر وہ آواز دب کر رہ گئی اور نقار خانہ میں طوطی کی صدا سے زیادہ اس کی حیثیت نہ بن سکی مثلاً ۳۲۵ئہ اور ۳۸۱ئہ میں جب نیقاوی کونسل اور قسطنطینہ کونسل نے تثلیث کو دینِ مسیحی کی بنیاد قرار دیا اُس وقت ابوئیین نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرت مسیح صرف انسان ہیں اور الوہیت کا اُن سے کوئی علاقہ نہیں اور سابلئین کہتے تھے کہ اقانیم ثلاثہ، تین مختلف جوہر نہیں ہیں بلکہ وحدتِ لاہوتی کی مختلف صورتیں اور تعبیریں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صرف اپنی ذاتِ واحد کے لیے اطلاق کرتا ہے، تاہم اُس وقت تک چونکہ پوپ اور کلیسہ کے فیصلے خدائی فیصلے سمجھے جاتے تھے اور بشپ اور پاپا "ارباباً من دون اللہ" یقین کیے جاتے تھے اس لیے اِن اصلاحی آوازوں کو "الحاد" کہہ کر دبا دیا گیا مگر جب صلیبی جنگوں نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے اتنا قریب کر دیا کہ اُنھوں نے اسلام کے اعتقادی اور عملی نظام کا بہت کچھ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسلام سے متعلق بطارقہ **Batariqa** اساقفہ (Bishops) کی غلط بیانی اور بہتان اُن پر ظاہر ہونے لگی تب اُن میں بھی آزادیٔ فکر نے کروٹ لی اور کورانہ تقلید کو شکست و ریخت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا چنانچہ لوتھر کی آواز پہلی صدائے حق تھی جس نے جرأت کے ساتھ "ارباباً من دون اللہ" کے بتوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور پوپ کے مقابلہ میں کتابِ مقدس کی پیروی کی دعوت دی، مگر آپ کو تعجب ہوگا یہ سن کر کہ پوپ کی جانب سے لوتھر کے خلاف جو الحاد اور بددینی کے الزامات لگائے گئے تھے اُن میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یہ دربردہ "مسلمان" ہو گیا ہے اور پاپا کے خلاف اس کی صدا قرآن کی صدائے بازگشت ہے۔

بہرحال یہی وہ صدائے اصلاح تھی جو بلاشبہ اسلام کی دعوتِ تفکر و تعقل سے متأثر ہو کر آہستہ آہستہ "اصلاحِ کنیسہ" کے نام سے مسیحی دنیا میں گونج اُٹھی اور آگ کی طرح ہر طرف اُس کے شعلے بلند نظر آنے لگے، ان ہی اصلاحات میں سے ایک اہم اصلاحی تخیل یہ بھی تھا کہ عقیدۂ ثالوث کتابِ مقدس (عہد نامۂ جدید) کے قطعاً خلاف ہے چنانچہ تیرہویں

صدی عیسوی میں قدیم لاہوتی فرقہ کے جمہور نے نسطوری فرقہ کے جماعتی فیصلہ نے اور جدید جماعتوں میں سے سوسینیانیں ——— جرمانیین ——— موحدین ——— اور عموميين ——— اور دوسری جماعتوں نے تعلیم کلیسا کے خلاف مذہبی بغاوت کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ تثلیث کا عقیدہ نقل و عقل دونوں کے خلاف اور ناقابل تسلیم ہے، اور اگرچہ قومی ومذہبی عصبیت نے اُن کو اسلامی عقیدہ کا پیرو ہونے سے باز رکھا تاہم انہوں نے عقیدہ تثلیث کی مختلف شکلوں کے ساتھ ایسی تعبیرات کرنی شروع کردیں جس سے عقیدہ ثالوث باطل ہو کر توحیدِ الٰہی کے پاک اور مقدس جراثیم پیدا ہونے لگے مثلاً سویڈنبرگ نے کہا: "اقانیم ثلاثہ باپ" "بیٹا" "روح القدس کا تعلق حضرت مسیح کی ذات کے ماسوا ذاتِ احدیت سے نہیں ہے، یعنی مسیح کی ذات اپنی طبع لاہوتی کے پیشِ نظر "باپ" ہے اور عالم ناسوت میں انسانی شکل کے تقید کی وجہ سے "بیٹا" اور اقنومِ ثانی ہے اور اس حیثیت سے کہ "روح القدس" کا صدور اُس سے ہوا ہے وہ اقنوم ثالث "روح" ہے، غرض ثالوث کا تعلق صرف حضرت مسیح سے ہے" اور کانٹ (Cant) کہتا ہے کہ عقیدہ ثالوث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "باپ" "بیٹا" "روح القدس" بلکہ یہ عالمِ لاہوت میں خدائے برتر کی تین بنیادی صفات کی جانب اشارہ ہے جو باقی تمام صفات کے لیے مصدر اور منبع کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ "قدرت" (اب)، حکمت (ابن) اور "محبت" (روح) ہیں یا اللہ تعالیٰ کے اُن تین افعال کی جانب اشارہ ہے جو "خلق" "حفظ" اور "ضبط" کے نام سے بھی تعبیر کیے جاتے ہیں اور ہیگن اور شیلنگ نے اس خیال کی کافی اشاعت کی کہ عقیدہ ثالوث حقائق کی طرح کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ ایک تخیلی نظریہ ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خدائے برتر کی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور مسیح (علیہ السلام) مخلوقِ خدا لیکن عالم خیال وتصور میں جب ہم لاہوتی عالم کی جانب پرواز کرتے ہیں تو ہمارا خیال اُس عالم میں

خدا، مسیح، اور روح القدس کو "اب" "ابن" اور "روح" کی تعبیرات دیتا اور اُن کے باہم تعلق کو اقانیم ثلاثہ کی حیثیت میں دیکھتا ہے۔

"عقلیین" "لوتھرین" اور "موحدین" اور "جرمانیین" کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جو سابلیین کے عقیدہ کو اختیار کرکے ایک بڑی جماعت کی شکل اختیار کرچکے ہیں

ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ کی نشاۃ جدید میں بھی عام طور پر تمام کلیساؤں کا ثالوث (تثلیث) پر یہی عقیدہ ہے اور اُن کے نزدیک اس کلمہ کی تعبیر وہی ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں متعدد مذہبی کونسلوں نے کی اور جو بلاشبہ شرک جلی اور توحید کے یکسر منافی ہے۔

قرآن اور عقیدۂ تثلیث نزولِ قرآن کے وقت جمہور مسیحی جن بڑے فرقوں میں تقسیم تھے ثالوث کے متعلق اُن کا عقیدہ تین جُدا جُدا اصولوں پر مبنی تھا، ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح عینِ خدا ہے اور خدا ہی بشکلِ مسیح دنیا میں اُتر آیا ہے اور دوسرا فرقہ کہتا تھا کہ مسیح ابن اللہ (خدا کا بیٹا) ہے اور تیسرا کہتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے، باپ، بیٹا، مریم اور اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے اور دوسرا گروہ حضرت مریم کی جگہ "روح القدس" کو اقنوم ثالث کہتا تھا غرض وہ حضرت مسیح کو ثالث ثلاثہ (تین میں کا تیسرا) تسلیم کرتے تھے، اس لیے قرآن کی صدائے حق نے تینوں جماعتوں کو جُدا جُدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی اور دلائل و براہین کی روشنی میں مسیحی دنیا پر یہ واضح کیا ہے کہ اس بارہ میں راہِ حق ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسیح، مریم کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور خدا کا سچا پیغمبر اور رسول ہے باقی جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ باطلِ محض ہے — خواہ اُس میں تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ العیاذ باللہ وہ شعبدہ باز اور مفتری تھے یا افراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا ہیں یا خدا کے بیٹے ہیں یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآن عزیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ نصاریٰ کے تردیدی پہلو کو ہی اس سلسلہ

میں واضح کیا ہو بلکہ اس کے علاوہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی شانِ رفیع کی اصل حقیقت کیا ہو اور عند اللہ اُن کو کیا قربت حاصل ہو اس پر بھی نمایاں روشنی ڈالی ہو تاکہ اس طرح یہود کے عقیدۂ باطل کی بھی تردید ہو جائے اور افراط و تفریط سے جُدا "راہِ حق" آشکارا نظر آنے لگے۔

حضرت مسیح خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ۝ (مریم)

مسیح نے کہا: "بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھ کو نبی بنایا ہو اور مجھ کو مبارک ٹھہرایا جہاں بھی میں رہوں، اور اس نے مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی جب تک بھی میں زندہ رہوں اور اس نے مجھ کو میری والدہ کے لیے نکوکار بنایا اور مجھ کو سخت گیر اور بدبخت نہیں بنایا، مجھ پر سلامتی ہو جب میں پیدا ہوا، جب میں مرجاؤں اور جب حشر کے لیے زندہ اٹھایا جاؤں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ ۝ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (زخرف)

وہ (مسیح) نہیں ہو مگر ایسا بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور ہم نے اس کو مثال بنایا ہو بنی اسرائیل کے لیے اور اگر ہم چاہتے تو کر دیتے ہم تم میں سے فرشتے زمین میں چلنے پھرنے والے اور بلاشبہ وہ (مسیح) نشان ہو قیامت کے لیے پس اس بات پر تم شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا: "اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے

مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ (الصف)

تورات، اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیگا، اُس کا نام احمد ہے۔

حضرت مسیح نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۰ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (المائدہ)

بلاشبہ اُن لوگوں نے کفر اختیار کرلیا جنھوں نے یہ کہا: "بیشک اللہ وہی مسیح بن مریم ہے" کہہ دیجیے اگر اللہ یہ ارادہ کرلے کہ مسیح بن مریم، مریم اور کائنات زمین پر جو کچھ بھی ہے سب کو ہلاک کر ڈالے تو کون شخص ہے جو اللہ سے (اس کے خلاف) کسی شی کے مالک ہونے کا دعویٰ کر سکے اور اللہ کے لیے ہی بادشاہت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، وہ جو چاہتا ہے اُس کو پیدا کر دیتا ہے اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰٮهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (المائدہ)

بلاشبہ اُن لوگوں نے کفر اختیار کیا جنھوں نے کہا: "بلاشبہ اللہ وہی مسیح بن مریم ہے" حالانکہ مسیح نے یہ کہا: "اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے، بیشک جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے پس یقیناً اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اُس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد نہیں ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۰ (بقرہ)

اور اُنھوں نے کہا اللہ نے "بیٹا" بنا لیا ہے، وہ ذات تو ان باتوں سے پاک ہے بلکہ (اس کے خلاف) اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں، ہر شے اُس کے لیے تابعدار ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ (آل عمران)

بلا شبہ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے کہ اس کو مٹی سے پیدا کیا پھر اس کو کہا ہو جا تو وہ ہو گیا۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ انتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (نساء)

اے اہل کتاب اپنے دینی معاملہ میں حد سے نہ گذرو اور اللہ کے بارہ میں حق کے ماسوا کچھ نہ کہو، بلا شبہ مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم پر ڈالا (یعنی بغیر باپ کے اس کے حکم سے مریم کے بطن میں وجود پذیر ہوئے) اور اس کی روح ہیں پس اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تین (اقانیم) نہ کہو اس سے باز آجاؤ تمہارے لیے بہتر ہوگا، بلا شبہ اللہ خدائے واحد ہے، پاک ہے اس سے کہ اس کا بیٹا ہو، اسی کے لیے ہے (بلا شرکت غیرے) جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں اور کافی ہے اللہ "وکیل" ہو کر۔

بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (انعام)

وہ (خدا) موجد ہے آسمانوں اور زمین کا، اس کے لیے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بیوی ہے اور اس نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے اور وہی ہر شے کا جاننے والا ہے۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ

مسیح بن مریم نہیں ہیں مگر خدا کے رسول بلا شبہ ان سے پہلے رسول گذر چکے اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں، یہ دونوں کھانا کھاتے تھے یعنی دوسرے انسانوں کی

طرح کھانے پینے وغیرہ امور میں وہ بھی محتاج تھے۔ (المائدہ)

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ (النساء)

ہرگز مسیح اس سے ناگواری نہیں اختیار کریگا کہ وہ اللہ کا بندہ کہلائے اور نہ مقرب فرشتے (حتیٰ کہ روح القدس "جبرئیل") ناک بھویں چڑھائینگے، اور جو شخص بھی اُس کی عبادت سے ناگواری کا اظہار کرے اور غرور اختیار کرے تو قریب ہے کہ اللہ تعالےٰ اُن سب کو اپنی جانب اکٹھا کریگا (یعنی جزا و سزا کے دن سب حقیقت حال کھل جائیگی)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (توبہ)

اور یہود کہتے ہیں عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں مسیح خدا کا بیٹا ہے یہ اُن کے منہ کی باتیں ہیں ریس کرنے لگے اگلے کافروں کی بات کی، اللہ اُن کو ہلاک کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (اخلاص)

(اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)) کہہ دیجیے، اللہ یکتا ہے۔ اللہ بے نیاز ہستی ہے، نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کائنات میں کوئی اُس کا ہمسر نہیں ہے۔

قرآن نے اس سلسلہ میں اپنی صداقتِ تبلیغ اور اصلاحِ عقائد و اعمال کا جو مدلل اور واضح اعلان کیا اُس کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ کتاب مقدس کے محرف اور مسخ کردیے جانے کے باوجود جس شکل و صورت میں آج موجود ہے وہ کسی ایک مقام پر بھی "ثالوث" کے اُس عقیدہ کا پتہ نہیں دیتی جس کی تفصیلات و تشریحات ابھی سطور بالا میں علماءِ نصاریٰ، مذہبی کونسلوں، اور کلیساؤں سے نقل ہو چکی ہیں، اور نہ

تعبیر کے کہ جگہ جگہ حضرت مسیح کی زبان سے خدا کو "باپ" اور خود کو "بیٹا" ظاہر کیا گیا ہے اس کے لیے اور کوئی ثبوت واضح اور مصرح طور پر مہیا نہیں ہے۔ پس اگر ہم اس سے قطع نظر بھی کر لیں کہ یہ تعبیرات "تحریفی" اور صنم پرستی کے تخیل کی رہینِ منت ہیں او بالفرض یہ تسلیم کر لیں کہ خدائے برتر کی جانب سے سچی الہامی انجیل میں بھی یہ تعبیرات موجود تھیں تب بھی ان سے نصاریٰ کا عقیدہ "تثلیث" کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ "ابن" کا لفظ اگرچہ حقیقی معنی کے لحاظ سے اُس انسان پر بولا جاتا ہے جو کسی کی صلب یا کسی کے بطن سے مادۂ منویہ کے ذریعہ پیدا ہوا ہو تاہم محاوراتِ زبان اور اہل زبان کے استعمالات و اطلاقات شاہد ہیں کہ یہ لفظ کبھی مجاز کے طور پر اور کبھی تشبیہ یا کنایہ کے طریق سے اور بھی مختلف معانی پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً ایک بڑی عمر کا شخص اپنے سے چھوٹے کو مجازاً "ابن" (بیٹا) کہہ دیا کرتا ہے، یا بادشاہ اپنی رعایا کو اولاد کہہ کر خطاب کرتا ہے یا اُستاذ اپنے شاگردوں کو "بیٹا" کہہ کر پکارتا ہے یا جو شخص کسی علم و ہنر کا ماہر یا اُس کی خدمت میں سرشار ہوتا ہے تو اُس کو کنایۃً اُس علم و ہنر کا بیٹا کہہ کر یاد کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں "ابن القانون" "ابن الفلسفہ" "ابن الفلاحۃ" "ابن الحدادہ" یا دنیا طلبی کی حرص و آز میں اگر حد سے گذر چکا ہے تو اُس کو "ابن الدراہم" "ابن الدنانیر" کہہ دیا کرتے ہیں، اسی طرح مسافر کو "ابن السبیل" مشہور شخصیت کو "ابن جلا" بڑے ذمہ دار انسان "ابن لیلہا" آنے والے دن سے بے پرواہ شخص کو "ابن یومہ" دنیا ساز ہستی کو "ابن الوقت" کہتے ہیں یا جس کے اندر کوئی وصف نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے تو اُس وصف کی جانب لفظ ابن کو منسوب کر کے ذاتِ موصوف کو یاد کرتے ہیں مثلاً صبح کو "ابن ذکا" کہتے ہیں اور ان تمام مثالوں سے زیادہ یہ کہ انبیاء بنی اسرائیل اپنی امتوں کو ابناء اور اولاد کے ساتھ ہی خطاب کرتے اور نصائح و مواعظ میں یہ ظاہر فرماتے ہیں کہ امم و اقوام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی روحانی اولاد ہوتی ہیں۔

اور یہی حال "اب" اور "باپ" کے اطلاقات و استعمالات کا ہے، ایک چھوٹا اپنے بڑے کو، ایک ضرورتمند اپنے مربی کو، ایک شاگرد اپنے استاذ کو، ایک اُمتی اپنے نبی و رسول کو "اب" اور "باپ" کہنا فخر سمجھتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تمام اطلاقات مجاز، کنایہ اور تشبیہ کے طور پر کیے جاتے ہیں، اس طرح بے نظیر مقرر اور خطیب کو "ابوالکلام" بہترین انشا پرداز کو "ابو القلم" ماہر نقاد کو "ابوالنظر" ڈراونی اور ہیبتناک شے کو "ابوالہول" سخی کو "ابو النجاد" فن کاشتکاری کے ماہر کو "ابوالفلاحہ" صنعت و حرفت کے حاذق کو "ابوالصنع" شب و روز بولتے رہتے ہیں۔

تو ان اطلاقات کے پیش نظر بآسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ کتاب مقدس میں ذاتِ احدیث پر اب (باپ) کا اطلاق ربِّ حقیقی کی حیثیت میں اور حضرتِ مسیح پر ابن (بیٹا) کا اطلاق محبوب و مقبولِ الٰہی کی حیثیت میں ہوا ہے یعنی جس طرح باپ اور بیٹے کے درمیان محبت و شفقت کا رشتہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے اُس سے کہیں زیادہ محبت و شفقت کا وہ رشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اور اُس کے مقدس پیغمبر مسیح (علیہ السلام) کے درمیان قائم ہے۔ ایک صحیح حدیث میں بھی نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس استعارہ اور تشبیہ کو استعمال فرماتے ہوئے کہا ہے "الخلق عیال اللہ" (تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے)

پس روزمرہ کے محاورات و اطلاقات کو نظرانداز کر کے کتاب مقدس کے لفظ "اب" اور "ابن" کے ایسے معانی و مطالب مراد لینا "جو صریح شرک کے مرادف ہوں بلکہ اُس سے بھی زیادہ قباحت و شناعت کے ساتھ خدا کی ہستی کو تین اقانیم سے مرکب ظاہر کرتے اور خدا کے حصے بخرے بناتے ہوں" کسی طرح بھی جائز نہیں ہوسکتا اور صریح ظلم اور اقدامِ شرک ہے۔ "تعالی اللہ علواً کبیراً" بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ان ہی اناجیل میں بصراحت حضرت مسیح کے انسان اور مخلوق خدا ہونے پر نصوص موجود ہوں مثلاً یوحنا کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ ارشاد مذکور ہے۔[1]

---

[1] باب ۱ آیت ۱۵۔

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم آسمان کو کھلا ہوا، اور خدا کے فرشتوں کو اوپر جاتے اور ابن آدم (مسیح) پر اُترتے دیکھو گے۔"

اور باب ۱۳ میں بصراحت خود کو "رسول" کہا ہے۔

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے مالک سے بڑا نہیں ہوتا، اور نہ "رسول" اپنے بھیجنے والے سے۔

اور باب ۴ میں ہے

"کیونکہ یسوع نے خود گواہی دی کہ "نبی" اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا"

اور باب ۳ میں ہے۔

"اور آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوائے اُس کے جو آسمان سے اُترا یعنی ابن آدم جو آسمان میں ہے"۔

اور باب ۶ میں ہے۔

پس جو معجزہ اُس نے دکھایا وہ لوگ اُسے دیکھ کر کہنے لگے جو "نبی" دنیا میں آنے والا تھا فی الحقیقت یہی ہے۔

اور انجیل متی میں ہے:[۵]

"لیکن اس لیے کہ تم جان لو کہ ابن آدم (مسیح) کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے"

علاوہ ازیں اگر عہد نامۂ جدید میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے لیے "ابن" کا اطلاق موجود ہے تو نکوکار انسانوں پر بھی "ابناء اللہ" اور بدکاروں کے لیے "ابناء ابلیس" کا اطلاق پایا جاتا ہے چنانچہ انجیل متی میں ہے[۶]

---

[۱] باب ۱۳۔ آیت ۱۶ [۲] باب ۴ آیت ۴۴، باب ۳۔ آیت ۱۴، باب ۶ آیت ۱۴

[۵] باب ۹۔ آیت ۶ [۶] باب ۵ آیت ۹

"مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ "خدا کے بیٹے" کہلائینگے"

اور انجیل یوحنا میں ہے۔

"یسوع نے اُن سے کہا۔ اگر تم ابراہیم کے فرزند ہوتے تو ابراہیم کے سے کام کرتے ..... انہوں نے اس سے کہا ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔

لہٰذا عقیدۂ تثلیث میں نصاریٰ کے لیے موجودہ کتاب مقدس سے بھی کوئی حجت و دلیل نہیں ملتی اور اس لیے بغیر کسی شک و ریب کے یہ کہنا حق ہے کہ یہ عقیدۂ تثلیث صنم پرستانہ عقائد کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔

لائق توجہ بات | یہ بات کبھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ ادیان و ملل سابقہ کے مسخ و تحریف میں تحریف کرنے والوں کو اس سے بہت زیادہ مدد ملی کہ بنیادی عقائد میں صراحت اور وضاحت کی جگہ وقت کے معبروں، مفسروں اور ترجمانوں نے کنایات، استعارات اور تشبیہات سے بہت زیادہ کام کیا۔ ان تعبیرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان مذاہبِ حق کا صنم پرستوں اور فلسفیوں سے واسطہ پڑا اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح اُس دینِ حق کو قبول کر لیا تو اپنے فلسفیانہ اور مشرکانہ افکار و خیالات کے لیے ان ہی استعارات و تشبیہات کو پشت و پناہ بنایا اور آہستہ آہستہ ملتِ حقیقی کی شکل و صورت بدل کر اس کو معجونِ مرکب بنا ڈالا، اسی حقیقت کے پیشِ نظر قرآنِ عزیز نے وجود باری، توحید، رسالت، الہامی کتب، ملائکۃ اللہ، غرض بنیادی عقائد میں ذو معنی الفاظ، پرپیچ تشبیہات، اور توحید میں خلل انداز استعارات و کنایات کی بجائے واضح، صریح اور غیر مبہم اطلاقات کو اختیار کیا ہے تاکہ کسی ملحد، زندیق اور مشرک فلسفی کو توحید خالص میں شرک اور اوہام و ظنون کی نکتہ آفرینیوں کا موقعہ ہاتھ نہ آنے پائے اور اگر کوئی شخص اس کے باوجود بھی بے جا جسارت کرے تو خود قرآنِ عزیز

ے باب ۸ آیت ۳۹۔۴۰۔۴۱۔

کی نصوصِ صریحہ ہی اُس کے الحاد کو پاش پاش کردیں۔

کفارہ؛ | موجودہ مسیحیت کا دوسرا عقیدہ جس نے دینِ مسیحی کی حقیقت کو برباد کرڈالا "کفارہ" کا عقیدہ ہے، اس کی بنیاد اس تخیل پر قائم ہے کہ تمام کائنات "جس میں نکوکار اور انبیاء و رسل سب ہی شامل ہیں" ابتداءِ آفرینش سے ہی گنہگار ہے، آخر رحمتِ الٰہی کو جوش آیا اور اُس کی مشیت نے ارادہ کیا کہ "بیٹے" کو کائناتِ ارضی میں بھیجے اور وہ مصلوب ہو کر اول و آخر تمام کائنات کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے اور اس طرح دنیا کو نجات اور مکتی حاصل ہوسکے لیکن اس عقیدہ کے قوام بنانے کے لیے چند ضروری اجزاء کی ضرورت تھی جن کے بغیر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی تھی اس لیے "عہدِ رسول" میں سب سے پہلے مسیحیت نے یہودیت کے اس عقیدہ کو تسلیم کرلیا کہ اُن کو صلیب پر بھی چڑھایا گیا اور مار بھی ڈالا گیا اور اس کو شرفِ قبولیت دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اُٹھایا کہ "الوہیت" کے باوجود مسیح کا صلیب پانا اور قتل ہونا اپنے لیے نہیں بلکہ کائنات کی نجات کے لیے تھا، چنانچہ جب اُس پر یہ حادثہ گذر لیا تو اُس نے پھر الوہیت کی چادر اوڑھ لی اور عالمِ لاہوت میں باپ اور بیٹے کے درمیان دوبارہ لاہوتی رشتہ قائم ہوگیا۔

پس جس مذہب میں خدائے برتر کے ساتھ صحتِ عقیدہ اور نیک عملی مفقود ہو کر نجات کا دار و مدار عمل و کردار کی بجائے "کفارہ" پر قائم ہوجائے اُس کا حشر معلوم؛

قرآن نے اسی لیے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ نجات کے لیے عقیدہ کی صحت یعنی صحیح خدا پرستی اور نیک عملی کے ماسوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے اور جو شخص بھی اس "راہِ مستقیم" کو ترک کرکے خوش عقیدگی اور اوہام و ظنون کو اسوہ بنائیگا اور نیک عملی اور صحیح خدا پرستی پر گامزن نہ ہوگا وہ بلاشبہ گمراہ ہے اور راہ مستقیم سے یکسر محروم

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا جو لوگ اپنے کو مؤمن کہتے ہیں اور جو یہودی ہیں اور جو

النصاریٰ والصّابئین من اٰمن	نصاریٰ ہیں اور جو صابی ہیں اُن میں سے جو بھی
باللہ والیوم الاٰخر وعمل صالحاً	اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آیا اور اس نے
فلھم اجرھم عند ربھم ولا	نیک عمل کیے تو یہی وہ لوگ ہیں جن کا اجر اُن کے
خوف علیھم ولا ھم یحزنون	پروردگار کے پاس ہے، نہ اُن پر خوف طاری ہوگا
(بقرہ)	اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

یعنی قرآن کی دعوت اصلاح ادیان وملل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہودی نصرانی صابی گروہوں کی طرح ایک نیا گروہ مومنوں کے نام سے اس طرح اضافہ کر دے کہ گویا وہ بھی ایک قومی نسلی یا ملکی گروہ بندی ہے کہ خواہ اُس کی خدا پرستانہ زندگی اور عملی زندگی کتنی ہی غلط اور برباد ہو یا سرے سے مفقود ہو مگر اس گروہ بندی کا فرد ہونے کی وجہ سے ضرور کامیاب اور خدا کی جنت و رضا کا مستحق ہے، قرآن کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ اعلان کرنے آیا ہے کہ اُس کی دعوتِ حق سے پہلے کوئی شخص کسی بھی گروہ اور مذہبی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اگر اُس نے (قرآن کی تعلیمِ حق) کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی کو اختیار کر لیا ہے تو بلا شبہ وہ نجات یافتہ اور کامیاب ہے ورنہ تو وہ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوا، پلا اور بڑھا اور اسی سوسائٹی میں زندگی گذار کر مر گیا مگر قرآن کی دعوتِ حق کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی دونوں سے محروم رہا یا مخالف تو اس کے لیے نہ کامیابی ہے اور نہ فوز و فلاح باقی رہا مسیحیت کے کفارہ کا خصوصی مسئلہ تو قرآن نے اُس کے ابطال اور اس کی تردید کے لیے یہ راہ اختیار کی کہ جن بنیادوں پر اُس کو قائم کیا گیا تھا اُن کی ہی جڑ کاٹ دی۔ چنانچہ گذشتہ سطور میں صلیب اور قتل مسیح کے انکار اور رفع الی السماء کے اثبات کے مبحث میں اس پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن - بشارات النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) - صبح سعادت - تاریخ ولادت کی تحقیق - نسب مبارک - یتیمی - بت پرستی سے نفرت - خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق - حقیقت وحی؟ صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل - بعثت - حدیث بخاری - بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق - نبی اور مصلح - کیفیت وحی - کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی - نزولِ وحی کا پہلا دور - نزولِ وحی کا دوسرا دور - دعوت وارشاد کی پہلی منزل - دعوت وارشاد کی دوسری منزل - دعوت وارشاد کی تیسری منزل - (بعثتِ عامہ) دعوت اسلام کا مجمل خاکہ - قرآن اور تجدید دعوت - توحید - رسالت - یوم آخرت - اسریٰ (معراج) ہجرت - غزوات - غزوہ بدر - غزوۂ احد - غزوۂ خندق یا احزاب - واقعہ حدیبیہ - معاہدۂ صلح - فتح مکہ (الفتح الاعظم) حاطب بن بلتعہ کا واقعہ - بت شکنی - خطبہ - غزوۂ حنین - غزوۂ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ غزوات اور نتائج و بصائر - تنبیہ - خرافی داستان - بصائر - بنو نضیر - بصیرت - واقعۂ افک - موعظت - نبارقا موعظت - مسجد ضرار - وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ - عبرت و موعظت -

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن

قرآن کلام الٰہی ہے اور خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس کے مہبط ہیں، وہ اُن پر نازل ہوا ہے، قرآن علم و یقین کی روشنی ہے اور ذاتِ اقدس اُس کا عملی نمونہ اسوہ اور نقشہ ہیں "لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ" قرآن، رشد و ہدایت ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم، راشد و ہادی، قرآن حق و صداقت کے لیے دعوت و پیغام ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے داعی اور پیغامبر، اس لیے قرآن کا ہر ایک جملہ اور اُس کی ہر ایک آیت کسی نہ کسی حیثیت میں ذاتِ قدسی صفات سے تعلق رکھتی ہے تو اب کس طرح یہ کہا جائے کہ قرآن میں اتنی جگہ اُس مقدس ہستی کا ذکر ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے چند صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا

کہ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حالات زندگی ہم کو سنائیں، صدیقہ عائشہ نے نگاہ تعجب سے دریافت کیا۔ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے جو مجھ سے خُلقِ نبی کے متعلق سوال کرتے ہو، فانّ خلقہ کان القرآن آپ کی تمام اخلاقی زندگی قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی قرآن جو کچھ کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی کو کر دکھایا پس قرآن کے کسی حصہ کو سامنے لانا گویا حیاتِ طیبہ کا پیش نظر لے آنا ہے۔

البتہ قرآنِ عزیز نے جن آیات میں آپ کے اسماء گرامی یا اوصافِ عالی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا یا "ایہا النبی" اور "ایہا الرسول" کہہ کر مخاطب کیا اُس کی تفصیل مسطورہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نقشہ میں "نبی" اور "رسول" کے علاوہ جن اسماء اور اوصاف کی تفصیل مسطور ہے وہ یہ ہیں۔

محمد[1]، احمد[2]، عبداللہ[3]، شاہد[4]، بشیر[5]، نذیر[6]، مبشر[7]، مذکر[8]، عزیز[9]، رؤف[10]، رحیم[11]، امین[12]، مزمل[13]، مدثر[14]، منذر[15]، ہادی[16]، یٰسین[17]، رحمۃ[18]، نعمۃ[19]، طٰہٰ[20]، نور[21]، حق[22]، سراجِ منیر[23]، شہید[24]، داعی الی اللہ[25]، خاتم النبیین[26]، نبی[27]۔ رسول[28]، عبدہ[29]

نقشہ

نام یا صفت	سورۃ	آیات	نام یا صفت	سورۃ	آیات
محمد (۱)	آل عمران	۱۴۴	عبداللہ (۳)	حدید	۹
	احزاب	۴۰		جن	۱۹
	محمد	۱		کہف	۱
	الفتح	۲۹			
احمد (۲)	صف	۶	شاہد (۴)	الفتح	۹
				احزاب	۴۵
				مزمل	۱۵

نام یا صفت	سورة	آیات	نام یا صفت	سورة	آیات
(۵) مبشر	احزاب	۴۶		بقره	۱۱۹
	الفتح	۹		سبا	۲۸۔۴۶
	فرقان	۵۶		ص	۷
(۶) بشیر	نساء	۱۹		احقاف	۵
	اعراف	۱۸۸	(۸) مذکر	الغاشیہ	۲۱
	ہود	۲	(۹) سراج منیر	فاطر	۴۶
	سبا	۲۸	(۱۰) داعی الی اللہ	فاطر	۴۶
	فاطر	۲۴	(۱۱) حق	یونس	۱۰۸
	بقره	۱۱۹	(۱۲) عزیز	توبہ	۱۲۸
(۷) نذیر	عنکبوت	۵۰	(۱۳) رؤف	توبہ	۱۲۸
	نساء	۱۹	(۱۴) رحیم	توبہ	۱۲۸
	اعراف	۱۸۸	(۱۵) امین	دخان	۱۹
	ہود	۲	(۱۶) نور	مائدہ	۱۵
	حجر	۸۹	(۱۷) نعمۃ	بقره	۲۳۱
	فاطر	۲۳۔۲۴۔۳۷۔۴۲۔۴۶	(۱۸) ہادی	نمل	۸۱
	الفتح	۹		روم	۵۳
	الذاریات	۵۰۔۵۱	(۱۹) رحمۃ	انبیاء	۱۱۷
	ملک	۸۔۹۔۱۷۔۲۶	(۲۰) طٰہٰ	طٰہٰ	۱
	فرقان	۵۶	(۲۱) یٰسٓ	یٰسٓ	۱
	بقره	۱۱۹	(۲۲) مزمل	مزمل	۱

	نام یا صفت	سورة	آیات
	(۲۳) مُدّثّر	مدثر	۱
	(۲۴) مُنزّل	نحل	۹۲
	(۲۵) خاتم النبیین	احزاب	۴۰
(۲۶) نبی		آل عمران	۱۶۱
		اعراف	۱۵۷-۱۵۸
		مائده	۸۱
		انفال	۶۴-۶۵-۶۷-۷۰
		براۃ	۶۱-۷۳-۱۱۳
		حجرات	۲
		احزاب	۱-۲۸-۳۲-۳۸-۴۶
		فاطر	۵۰-۵۲
		تحریم	۱-۳-۸-۹
		طلاق	۱
		ممتحنه	۱۲
(۲۷) رسول		بقره	۱۴۳-۲۰۵
		آل عمران	۲۳-۸۱-۸۶-۱۰۱ ۱۳۲-۱۵۳-۱۷۲ ۱۷۹-۱۸۳
		نساء	۱۴-۵۲-۶۱-۶۴-۶۹ ۷۹-۸۰-۱۰۰-۱۱۵- ۱۳۶-۱۷۰
		مائده	۱۵-۳۲-۴۱-۵۵-۵۶- ۶۷-۸۳-۹۲-۹۹-۱۴۰

	نام یا صفت	سورة	آیات
(۲۷) رسول		اعراف	۱۵۷-۱۵۸
		انفال	۱-۱۲-۲۴
		توبه	۱-۲-۷-۱۶-۲۴-۲۶- ۲۹-۳۳-۵۴-۵۹-۶۳ ۶۵-۸۰-۸۱-۸۴-۸۶ ۸۸-۹۱-۹۴-۹۷-۹۹ ۱۰۵-۱۰۷-۱۲۸-
		نحل	۱۱۳
		اسراء	۹۳
		حج	۷۸
		مومن	۷۸
		زخرف	۲۹
		عنکبوت	۱۸
		حجرات	۱-۳-۸-۱۴-۱۵-
		الفتح	۹-۱۲-۱۳-۱۷-۲۶- ۲۷-۲۸-۲۹-
		احزاب	۶-۲۱-۲۹-۳۱- ۳۳-۳۶-۴۰
		فاطر	۵۲-۵۷-۶۱
		دخان	۱۴-۱۹
		حدید	۷-۸-۲۹
		مجادله	۵-۸-۹-۱۲-۱۳ ۲۰-۲۲
		محمد	۳۲-۳۳
		منافقون	۱-۷-۸

نام یا صفت	سورۃ	آیات	نام صفت	سورۃ	آیات
	تغابن	۸-۱۲		بقرہ	۱۴۳
	فرقان	۷-۲۷-۳۰-۴۱		نساء	۴۱
	طلاق	۱۱		نحل	۸۹
	جمعہ	۲		حج	۷۸
	صف	۹-۱۱-۶۶		الفرقان	۱
	حشر	۴-۶-۷-۸		اسراء	۱
	ممتحنہ	۱			
	جن	۲۲-۲۸			
	الحاقہ	۴۲			
	نور	۴۷-۴۸-۵۱-۵۲-۵۴-۵۶-۶۲-۶۳			

قرآنِ عزیز اور صحیح احادیث میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جن اسماء و صفات کا ذکر ہے علماءِ اسلام نے اُس پر مستقل تصانیف کی ہیں اور ابنِ وحیہؒ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس پر قلم اُٹھایا ان کے علاوہ ابن کثیر، بیہقی، ابن عساکر (رحمہم اللہ) جیسے محدثین نے اُن تمام احادیث و آثار کو یکجا کر دیا ہے جن میں آپ کے اسماء، صفات اور القاب مذکور ہیں مشہور محدث ابوبکر بن عربیؒ نے شرح ترمذی میں ان کی شمار چونسٹھ[۶۴] کرائی ہے، بعض نے ننانوے[۹۹]، بعض نے تین سو اور بعض اہل علم نے اس شمار کو ایک ہزار تک پہنچایا ہے[۱] مگر یہ کثرت تعداد اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس شمار میں اُن تمام انتسابات کو بھی شامل کر لیا گیا جو کسی مناسبت حال سے آپ کی جانب منسوب ہیں اگرچہ بحیثیت اسماء، صفات یا القاب کے اُن کا اطلاق ذاتِ اقدس پر صحیح نہیں ہو سکتا مثلاً آپ نے انبیاء علیہ السلام اور اپنے درمیان صفتِ نبوت کے تعلق کو ظاہر اور ختم نبوت کو واضح کرنے

[۱] فتح الباری جلد ۶ ص ۴۳۵۔

کے لیے خود کو قصرِ نبوت کی آخری لَبِنَہ (اینٹ) فرمایا ہے تو جن بزرگوں کو آپ کے اسماء و صفات کی کثرت سے شغف تھا اُنھوں نے صفات النبی میں "اللبنہ" کو بھی شمار کر لیا۔[1]

بخاری کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: میرے پانچ نام ہیں، محمد ہوں، احمد ہوں، ماحی ہوں یعنی کفر و شرک کو مٹانے والا ہوں، حاشر ہوں، اس لیے کہ قیامت کے دن تمام کائنات سے پہلے میں حضرتِ حق کی درگاہ میں حاضر ہونگا، اور عاقب ہوں (بقول زہری آخری پیغمبر ہوں) حافظ ابن حجر عسقلانی رح فرماتے ہیں پانچ کا یہ عدد حصر کے لیے نہیں ہے بلکہ اس جگہ اُن اسماء و صفات کا ذکر ہے جو کتبِ سابقہ اور اُمم و اقوامِ ماضیہ میں آپ سے متعلق مشہور و معروف اور بشارات و پیشین گوئیوں میں مسطور تھے۔ ابن حجرؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ باتفاق علماء اسلام قرآن میں آپ کے جو اسماء و صفات مذکور ہیں وہ یہ ہیں۔

الشاہد، المبشر، النذیر المبین، الداعی الی اللہ، السراج المنیر، المذکر، الرحمۃ النعمۃ، الہادی، الشہید، الامین، المزمل، المدثر۔ لیکن ہماری فہرست کے مقابلہ میں یہ فہرست ناقص ہے، جن اسماء و صفات کا ذکر نقشہ میں ہے وہ بھی جمہور کے نزدیک مُسلّم ہیں۔ حافظ ابن حجر (رحمہ اللہ) یہ بھی لکھتے ہیں کہ احادیث میں مذکور اسماء و صفات میں سے حسب ذیل صفات بہت مشہور و معروف ہیں۔

المتوکل، المختار، المصطفیٰ، الشفیع المشفع، الصادق المصدوق۔

بہرحال محمد اور احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دو اسماء اعلام (نام) ہیں اور باقی اسماءِ صفات والقاب ہیں۔ اور قرآن میں آپ کے نام پاک کے انتساب سے ایک سورۃ کا نام سورۂ محمد ہے جس کے شروع ہی میں آپ کا اسم گرامی مذکور ہے "وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ" اور صرف ایک جگہ سورۂ صف میں احمد منقول ہے یعنی حضرت مسیح (علیہ السلام) کی اُس بشارت کے تذکرہ میں یہ نام آیا ہے جو آپ کی آمد سے متعلق اُنھوں نے

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۴۔

بنی اسرائیل کو سنائی تھی" ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد"

یہ حقیقت بھی قابل فراموش نہیں ہے کہ آپ کے اسماء وصفات محض رسمی نہیں ہیں کہ والدین نے جو چاہا نام رکھ دیا اور احباب واصحاب نے جس صفت ولقب سے جی چاہا پکار لیا بلکہ ان تمام اسماء وصفات کا آپ کی زندگی اور آپ کے اخلاق واعمال کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے جیسا کہ ابھی ماحی، حاشر، اور عاقب کے متعلق خود زبان وحی ترجمان سے سن چکے ہو یا مثلاً محمد اس ہستی کو کہتے ہیں جس کے تذکرے ہمیشہ خوبی اور نیک گوئی کے ساتھ ہوتے ہوں، یا انبیاء سابقین (علیہم السلام) کی بشارات اور مستقبل میں تذکرہائے حیات کی جانب اشارہ ہے، اور احمد اس ذات پر اطلاق ہوتا ہے جو سب سے زیادہ حمدِ الٰہی کے لیے نغمہ سنج ہو، یہ ذاتِ اقدس کی عبدیتِ کاملہ اور انسانِ کامل ہونے کو ظاہر کرتا ہے، بلاشبہ آپ خدا پرست انسانوں کے لیے مبشر و بشیر اور فتنہ جو مفسدوں، کافروں اور مشرکوں کے لیے منذر و نذیر ہیں، روزِ قیامت صادق و کاذب دونوں پر شاہد و شہید ہیں چشمِ حق بیں اور گوشِ حق نیوش کے لیے مذکر (ناصح) ہیں، راہِ حق سے بھٹکے ہوؤں کے لیے ہادی اور خدا سے بھاگے ہوؤں کے لیے داعی ہیں، اُن کا وجود رحمت ہے کائناتِ عالم کے لیے اور اُن کی ہستی نظامِ کائنات کے لیے نعمۃ ہے جہل و شرک کے لیے نور ہیں اور پیغامِ الٰہی کے لیے نبی و رسول، مصائب و آلام میں عزیز ہیں اور نوعِ انسان کے ہر ایک گوشۂ حیات کے لیے رؤف و رحیم، اُن کی صدا، صدائے حق ہے اور اُن کی ذات الصادق الامین، قرآن خدا کا آخری پیغام ہے اس لیے وہ خاتم النبیین ہیں، ان کی بعثت عالمگیر ہے اس لیے طٰہٰ و یٰسٓ ہیں، اور آسمانِ نبوت کے سراجِ منیر ہیں، اور کائنات رسالت کے بشیر و نذیر، عالم ادیان و ملل کی سلطانی کے باوجود گدائے کملی پوش ہیں اس لیے مزمل ہیں اور مدثر اور پھر با اینہمہ حسنِ کمال "انما انا بشر" اور "لما قام عبد اللہ" کے مصداق ہیں۔ اللّٰھم صل وسلم وبارک علیہ۔

خدا پر توکل اس کا شعار ہو اس لیے متوکل اس کا وصفِ عالی و قاہر ہے، اور وہ خدائے برحق کا برگزیدہ و مختار ہے، بارگاہِ الٰہی میں ابرار و مقربین سے بھی زیادہ مصطفیٰ مجتبیٰ، نکو کاروں صالحین کے لیے الشفیع المشفع اور ہر ایک شعبہائے حیات میں الصادق المصدق ہو، صلی اللہ علیہ وسلم

ہم جانتے ہیں کہ اظہارِ مقصد کے لیے یہ اشارات کافی نہیں ہیں بلکہ اپنے معنوی مناسبات کے لحاظ سے ہر ایک وصف و نام قرآن سے شہادت کا طالب ہے اور قرآن کی شہادت بلاشبہ ہر ایک گوشہ کی تفصیل کے لیے شاہدِ عدل، لیکن افسوس کہ کتاب کا موجودہ ترتیبی نقشہ اس کا متحمل نہیں ہے۔ اس لیے صرف آیات کے حوالجات اور اشارات پر ہی اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے

بشارات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ۝ (آل عمران)	اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ میں تم کو جو کچھ کتاب اور حکمت عطا کروں اور پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہیں تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا (پھر) اللہ نے فرمایا: کیا تم اس عہد کا اقرار کرتے ہو اور اس کو میرا اہم عہد سمجھ کر قبول کرتے ہو" تو انہوں نے کہا: "بیشک ہم اقرار کرتے ہیں"۔ اللہ نے فرمایا: "اب تم اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ بنتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی (رضی اللہ عنہم) فرماتے ہیں کہ اس آیت "میثاق" میں اس عہد و میثاق کا تذکرہ ہے جو ازل میں تمام انبیاء و رسل (علیہم السلام) سے خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لیا گیا خطاب اگرچہ براہِ راست انبیاء علیہم السلام سے ہے مگر مقصود و مراد میں ان کی امتیں بھی شامل ہیں کیونکہ عمومی طور پر ان ہی کے ذریعہ

دفاءِ عہد کا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

اس عہد و میثاق کو اس درجہ اہمیت کیوں حاصل ہے؟ یہ بات کچھ تمہید کی محتاج ہے مادیات و روحانیات پر فاعلِ مختار ایک ہی ہستی ہے اور وہ خدا ہے مگر مادیات میں خدائے برتر کے جاری قانونِ فطرت کا ہم شب و روز مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور وہ ہم کو محسوس نظر آتا ہے اس کے برعکس عالمِ روحانیات حواسِ خمسہ سے بلند احساساتِ تعقل و تفکر کا محتاج ہے، یہاں وجدان و شعور جب عقل و فکر کو رہنما بناتے اور دونوں راہنما ریب و شک اور اوہام و ظنون سے محفوظ "سلیم" بن کر رہنمائی کا حق ادا کرتے ہیں تو انسان کے سامنے روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت چمک اٹھتی ہے کہ خدائے واحد کی احدیت و یکتائی عالمِ مادیات و روحانیات میں ایک ہی قسم کے قانونِ فطرت کو نافذ رکھتی ہے۔

اب ذرا دیدۂ عبرت کو وا کیجیے اور کائناتِ ہست و بود پر نظر ڈالیے تو یہ حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی ملیگی کہ ذاتِ واحد کے ماسوا یہاں کائنات کی ہر ایک شَے کے لیے دو ہی سرحدیں مقرر ہیں، آغاز و انجام اور درمیان کی تمام کڑیاں نشو و ارتقاء کے لیے وقف ہیں، ایک چیز شروع ہوتی، اور درمیانی دور میں ترقی پذیر رہتی اور پھر حدِ کمال کو پہنچ کر اپنی ضرورت کو پورا کر دیتی ہے اُس کو انجام اور شروع کو آغاز کہتے ہیں۔

روحانیات میں بھی یہی سلسلہ جاری ہے نسلِ انسانی کا جب آدمؑ سے آغاز ہوا تو مادی وجود کے ساتھ خدا کی معرفت یعنی خدا پرستی کی امانت کو بھی ساتھ لایا، وہ اگر ایک جانب نسلِ انسانی کے مادی باپ تھے تو دوسری جانب خدا کی بخشی ہوئی ہدایت و صداقت کے لیے "نبی" اور "ایلچی" بھی تھے اور جبکہ خدا کی ہستی ایک ہے اور اُس کی بنیادی صداقت و ہدایت کا پیغام بھی ایک ہی تو ضروری ہوا کہ نوعِ انسانی کی رشد و ہدایت اور خدا پرستی کی بنیادی تعلیم کا سلسلہ بھی ایک ہی لڑی میں پرو دیا جائے اور آغاز سے انجام تک اس سلسلہ کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوں کہ ان میں سے کسی ایک

کی بھی تکذیب گویا پورے سلسلۂ روحانیت کی تکذیب کے مرادف ہو چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح ظاہر کیا ہے "لانفرق بین احد من رسلہ" ہم ایمان و تصدیق میں خدا کے کسی ایک پیغمبر کے درمیان بھی تفریق جائز نہیں رکھتے" اور اسی کو زبانِ وحی ترجمان نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے "نحن بنو علات دیننا واحد" ہم تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات اصل دینیات میں اسی طرح ایک ہیں جیسے کہ علاتی بھائی کہ اُن سب کا باپ ایک ہی ہے۔

پھر اس سلسلۂ روحانیات کی اگرچہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں مگر آغاز، دورِ نشو و نما اور دورِ کمال و انجام کے پیشِ نظر اسی طرح باہم فرق مراتب رکھتی ہیں جس کا مظاہرہ ہم کو عالمِ مادیات کے مختلف سلسلوں میں نظر آتا ہے اور جس کو ہم فطری (Natural) کہتے ہیں اور ان درجات و مراتب میں بھی درجۂ کمال کو جس سے کہ انجام کی سرحد ملتی ہے سب سے زیادہ رفعت و بلندی حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہی اُس سلسلہ کا محور و مرکز (Centre) اور قطب رحیٰ (چکی کی کیلی) ہوتا اور رشتۂ وابستہ و پیوستہ کی منزلِ مقصود سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ کائنات کی ہر شئی کی طرح خود عالمِ انسانی نے بھی اس ربع مسکوں پر عہدِ طفولیت گزارا ہے اُس وقت دنیائے انسانی ایک چھوٹے سے کنبے کی طرح آباد تھی اور نسلِ انسانی کا باپ ہی روحانی طبیب بھی تھا لیکن جب سلسلۂ بود و ماند آہستہ آہستہ خاندانوں، برادریوں قبیلوں سے آگے بڑھ کر قوموں اور جغرافیائی نسلوں میں تقسیم ہونے لگا اور وحدت نے کثرت کی ہی شکل نہیں اختیار کر لی بلکہ کثرت میں بھی تنوع پیدا ہونے لگا تو ان مادی نشو و نما اور ترقیوں کے ساتھ ساتھ روحانی رشد و ہدایت نے بھی نقطۂ وحدت پر قائم رہتے ہوئے تنوع اور کثرت کی شکل اختیار کر لی یعنی ہر ایک قوم و ملک میں جُدا جُدا ہادی و رہنما اور پیغمبر مبعوث ہونے لگے بلکہ بعض حالات میں ایک قوم میں بیک وقت متعدد نبیوں نے

دعوتِ حق میں ایک دوسرے کی اعانت کا فرض انجام دیا اگرچہ اُن کی دعوتوں کی بنیاد سرتاسر ایک ہی "[illegible] بنیاد" پر قائم تھی۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (البقرہ)

ابتدا میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے، ایک ہی قوم و جماعت تھے (پھر ایسا ہوا کہ باہم دگر مختلف ہو گئے اور الگ الگ ٹولیاں بن گئیں) پس اللہ نے (یکے بعد دیگرے) نبیوں کو مبعوث کیا وہ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) بشارت دیتے، اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈراتے تھے، نیز اُن کے ساتھ کتاب الہٰی نازل کی گئی، تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے، اُن میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو (اور تمام لوگوں کو راہِ حق پر متحد کر دے) جو لوگ باہم دگر مختلف ہوئے تو اس لیے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم (اور حقیقت سے بے خبر تھے نہیں، وحی الہٰی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے، بالآخر اللہ نے ایمان والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھا دی جس میں لوگ مختلف ہو رہے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○ (یونس)

اور (ابتدا میں) انسانوں کی ایک ہی اُمت تھی پھر الگ الگ ہو گئے، اور اگر تمہارے پروردگار کی جانب سے پہلے ایک بات نہ ٹھہرا دی گئی ہوتی تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں اُن کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔

لیکن خدائے واحد کی جانب سے رشد وہدایت کا یہ سلسلہ اگرچہ وقتی تقاضا کے پیش نظر ہزاروں برس تک قوموں اور ملکوں میں تنوع اختیار کیے رہا تاہم وہ اپنے مقصدِ وحدت کو فراموش نہ کر سکا اور بنیادی وحدت کے ساتھ اس عارضی کثرت کو بھی ایک ہی نقطۂ وحدت پر لانے کے لیے اُس وقت تک برابر حرکت کرتا رہا جب تک کہ اپنے مرکزِ وحدت اور مقصد کمال کو نہ پا سکا۔

یعنی خدا کی صداقت کا پیغام اگرچہ جُدا جُدا قوموں اور ملکوں میں نبیوں اور پیغمبروں کی زبانی پہنچایا جاتا رہا اور گو اُن تمام پیغامات میں فروعی اور وقتی تنوع سے قطع نظر اساسی اور بنیادی وحدت قائم رہی مگر خدا کی وحدانیت اور اس کے پیغام کی اساسی وحدت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ مختلف دعوتیں اور پیغامات سمٹ کر ایک ایسے نقطہ اور مرکز پر آجائیں کہ وہ تمام کائنات کے لیے بیک وقت اور رہتی دنیا تک ایک ہی پیغام بن کر اپنی نمود دکھلائے اور ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہو جس کی بعثت، بعثتِ عام ہو اور جس کی دعوت، عالمگیر دعوت ہو، تاکہ پھر اس تنوع اور کثرت کی ضرورت باقی نہ رہے۔

عالمِ روحانیات کی اپنی "مثلِ اعلیٰ" یا اپنے رومرکز کی جانب یہ حرکت جبکہ عالمِ مادیات کے نشو و ارتقاء کے متناسب حالات سے وابستہ تھی اور خالق کائنات کا قانونِ فطرت جبکہ دونوں سمتوں میں ایک ہی اصل پر کار فرما ہے تو یہ بھی ازبس ضروری ہوا کہ روحانیت کے کمال و ارتقاء کا یہ دور مادی عالم کے ایسے دور کے ساتھ رونما ہو کہ کائنات انسانی کے ارتقاءِ دماغی و عقلی کی استعدادات اپنے رشد و کمال کے ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں کہ حجابِ مستقبل میں مستور تمام ترقیاں اسی ارتقاء کا نتیجہ کہلائیں اور گو اس سلسلہ میں ایک مدت کیوں نہ صرف ہو جائے مگر کائناتِ ارضی کا یہ پورا مادی کارخانہ اسباب مادی کی بنا پر ایک کنبہ اور ایک خاندان بن کر رہ جائے اور ملکوں اور قوموں کی بہتات و کثرت کے باوجود کسی ایک گوشہ کے حرکت و سکون کے اثر سے تمام کائنات متاثر ہونے پر مجبور

ہوجائے۔ تاکہ اس وقت عالمِ روحانیات کا آخری نقطۂ ارتقاء کائناتِ انسانی کے عقل و دماغ کو اپنی دعوت کی یکتائی و وحدت سے متاثر کرسکے اور دنیا دانستہ یا نادانستہ اُسی کے بتلائے ہوئے سوسائٹی کے نظام کو آہستہ آہستہ اپنا کر عملاً خدا کا ایک کبنہ بن جائے اور مساواتِ عالم اور اخوتِ ہمہ گیر کا مظاہرہ کردکھائے۔ اور نتیجہ یہ نکلے کہ دینِ حق صرف تعلیمِ قرآن ہی میں منحصر ہوکر رہ جائے۔

تاریخِ اقوام و ملل شاہد ہے کہ قرآن کی دعوت و اصلاح کی صدائے حق نے جب چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو پکارا ہے اُس وقت دنیا کے تمام مذاہب و ادیان خود اصحابِ مذاہب کے تاریخی اقوال کے مطابق اپنی حقیقی روشنی کو یکسر فراموش کرچکے تھے۔ اور دنیا کے ہر گوشے اور ہر سمت میں مذہب و دھرم اور نظامِ سوسائٹی تنگی و تاریکی اختیار کرچکا تھا۔ اُس وقت قرآن کی آواز پہلی آواز تھی جس نے دنیا کے مذاہب اور اُن کی سوسائٹی کے ابتر نظام میں نیا انقلاب پیدا کردیا اور اقوام و امم نے بہ عجلت یا بہ دیر، اعتراف و اقرار کے ساتھ یا حاسدانہ انکار کے ساتھ مذہب اور سوسائٹی دونوں میں اُسی کی اصلاحات کو اپنایا اور قبولِ اصلاحات کے بغیر آنے والی دنیا میں اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

توحیدِ کامل اور خالص خدا پرستی، نسل و خاندان یا کفارہ کی بجائے خدا پرستی اور نیک عملی پر مدارِ نجات، نسلی غرور و تفاخر کا انہدام، کاسٹ سسٹم کا خاتمہ، حقوقِ انسانیت میں تمام افرادِ انسانی کی مساوات، اخوتِ عام کی داغ بیل، رواجی غلامی کے خلاف اصلاح و انقلاب کی تشکیل ، عورتوں کے لیے حقوقِ انسانیت میں مساوات کا اعلان، اور حقوقِ صنفی میں امتیازی احکامات، انقلاب و اصلاح، وراثت، ازدواجی زندگی میں ظالمانہ رواج کا خاتمہ اور جدید مفید اصلاحات (خلع و طلاق وغیرہ) زکوٰۃ کے وجوب، سود و قمار کی حرمت اور دوسری اصلاحات کے ذریعہ اقتصادی نظام میں بنیادی انقلاب، انفرادی اور اجتماعی ملکیت[1] کی تسلیم اور دونوں کے مابین تحدیدی اعتدال کا اعلان سیاسی

---

[1] اس سلسلہ کے حوالجات آئندہ تعلیم الاسلام اور مسئلہ خاتم النبیین کے بحث میں ذکر ہونگے۔

اور ملکی نظام میں پادشاہت، شخصی اور پارٹی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ شوروی نظام کی تشکیل، ایسے مسلم امور ہیں کہ آج کی دنیا میں ہر ایک انصاف پسند عاقل کے نزدیک اُن کی صداقت وافادیت تسلیم ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو بلاشبہ یورپ و ایشیا میں، آفریقہ و امریکہ میں سوسائٹی کے نظام اور مذہب و دھرم کی اصلاح کے نام سے جو صدائیں بھی اس تعلیم اور اعلانِ حق کے بعد اٹھیں اگر بغیر کسی تعصب کے تاریخی انقلابات پر غور کیجیے گا تو اُن میں بالوسطہ یا بلا واسطہ اُسی صدا کی بازگشت پائیگا جو چھٹی صدی عیسوی میں فاران کی خشک چوٹی سے بلند ہوئی اور جس نے " وما ارسلناك الا رحمة للعالمين " کو تاریخ عالم میں سچ کر دکھایا۔

تاریخی حقائق کی اس روشنی میں اب پھر ہم کو گذشتہ مضمون کی جانب واپس جانا چاہیے کہ جبکہ مادی استعدادات نشوونما پا رہے تھے اور چند صدیوں بعد جو قوموں کے انقلابات واصلاحات کے لیے چند برسوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں " ۔ مادی اسباب کی بدولت یہ سارا کارخانۂ عالم ایک کنبہ بن جانے والا تھا اُس وقت از بس ضروری ہوا کہ " وحدت مذہب " کی روحانی صدا بلند ہو اور اُس کی صدائے حق کسی خاص قوم اور ملک کی بجائے کائنات کے ہر گوشہ کے لیے یکساں حیثیت رکھے۔

پس منشائے تقدیرِ الٰہی یہ ہوا کہ ایسے پیغام اور پیغامبر کی نصرت وحمایت کے لیے ازل ہی میں انبیاء ورسل سے عہد ومیثاق لیا جائے اور اُن کو مطلع کیا جائے کہ جب وہ " پیغامِ کامل " اور " آخری صدائے حق " بلند ہو جس کا تعلق رہتی دنیا تک تمام کائناتِ ارضی کے ساتھ یکساں طور پر وابستہ ہے تو وہ اور اُن کی اُمتیں اُس کو قبول کریں اور اُس کی مدد فرض سمجھیں کیونکہ کائناتِ روحانی کا یہی مرکز وحدت اور نقطۂ اعلیٰ ہے چنانچہ یہی وہ عہد ومیثاق ہے جس کو تمام امتوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے پیغمبروں اور نبیوں کی معرفت " بشارات " کی شکل میں سُنا اور آج بھی دنیا کے تمام مذاہب وادیان میں ۔ خواہ وہ امتدادِ زمانہ کی بنا پر شرک کی آلودگیوں سے قطعاً محرف ہو چکے ہوں یا اُن میں تحریف وصداقت کا امتزاج

قومی دور سے وابستہ ہو۔ اوتار یا نبی مرسل کی معرفت کے ساتھ ایک "منتظر ہستی" کا مشترک عقیدہ پایا جاتا ہے، یہود "مسیح" کے علاوہ بھی "ایلیا" یا "وہ نبی" کہہ کر اس کی آمد کے منتظر ہیں نصاریٰ بھی ہر قسم کی تحریف کے باوجود مسیح کے بعد فارقلیط (پیراکلیوطاس بمعنی (احمد) یا "روح حق" یا "ناصر" وغیرہ صفات کے تعارف سے اُسی کے انتظار میں ہیں، مجوس آج تک ایک "نجات دہندہ" کا انتظار کر رہے ہیں اور ویدک دھرم (سناتن دھرم) ہندوؤں میں بھی ایک "اوتار" کا انتظار ہو رہا ہے۔

اور آج عقلیت کے نام پر اس "ہستی منتظر" کے عقیدہ کو کتنا ہی مضحکہ خیز سمجھا جائے اور خود مذہبی افراد اپنے اپنے مذہب کے اس عقیدہ کو کیسا ہی غیر معقول کیوں نہ ٹھہرائیں لیکن ان کے پاس اس کا جواب کچھ نہیں ہے کہ مذاہب و ادیان کے موجودہ اختلافات و افتراقات کے باوجود چھوٹے سے ناستک گروہ کو چھوڑ کر ہزارہا برس کائناتِ انسانی میں اس عقیدہ کا کسی نہ کسی شکل میں مشترک عقیدہ بنا رہنا اس کے "حقیقت" ہونے کی ناقابل انکار دلیل ہے۔

البتہ یہ بات جدا ہے کہ جس طرح یہود نے از رہ حسد مسیح ہدایت کے انتظار کے باوجود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قبول نہ کیا اُسی طرح مذاہب عالم کی اقلیت کو چھوڑ کر جو کہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئی اُن کی اکثریت نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خود ملکی عصبیت اور گروہ بندی کی بندشوں کی وجہ سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یا اُن کی دعوتِ حق کو عرب کے لیے محدود قرار دے کر خود کو اُس سے علیحدہ کر لیا

بہرحال ہندستان کا قدیم مذہب چونکہ حقیقتِ مذہب کو فراموش کر چکا اور اُس کی موجودہ شکل نے کسی طرح قدیم شکل و صورت کو بدل کر یا رخ اختیار کر لیا اور اس کی تاریخ خود اُس کے اپنے پاس بھی موجود نہیں ہے اور اب اُس کی تمام بنیاد صرف آبائی رسوم پر یا چند مخصوص فلسفیانہ عقائد پر قائم ہے اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ "منتظر ہستی" کے متعلق جو روایات رکھتے ہیں اُن کی اصل حقیقت کیا تھی، اور یہی حال بدھسٹ کا بھی ہے اس لیے

ہم ابوریحان بیرونی اور بعض دیگر مفسروں اور مورخوں کے ان بیانات سے قطع نظر کرتے ہیں جو انہوں نے ہندوؤں کے عقیدۂ "کلنکی اوتار" کے "شنبل" میں نزول کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر منطبق کرنے کی سعی کی ہے۔

اور یہاں صرف یہود و نصاریٰ پر نازل کتبِ سماویہ تورات، زبور اور انجیل سے ہی اُن بشارات کو پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جن میں تحریف کے باوجود اب بھی اصل حقیقت کی چمک باقی ہے اور علماء یہود و نصاریٰ کے پاس اس انطباق کے انکار کی موجہ دلیل موجود نہیں ہے، چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ (نور اللہ مرقدہ) کی میزان الحق اور حافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاریٰ اور باجرجی زادہ کی الفارق وغیرہ کتب سے اور اُن مناظرات مطبوعہ سے ظاہر ہوتا ہے جو علماء نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان ان بشارات سے متعلق پیش آئے ہیں اور جن کے متعلق بعض علماء نصاریٰ کو اقرار و اعتراف کے ماسوا کوئی چارۂ کار نہیں نظر آیا۔

تورات کتاب استثناء میں ہے۔ | تورات اور بشارات

خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کریگا، تم اُس کی طرف کان دھریو، اُس سب کی مانند جو تو نے خداوند اپنے خدا سے حورب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ پھر دیکھوں تاکہ میں مر نہ جاؤں ۔ اور خداوند نے مجھے کہا کہ اُنہوں نے (بنی اسرائیل نے) جو کچھ کہا سو اچھا کیا ۔ میں اُنکے لیے اُنکے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالونگا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤنگا وہ سب اُن سے کہیگا ۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو کہ جنہیں وہ میرا نام لے کے کہیگا نہ سُنے گا تو میں اُس کا حساب اُس سے لونگا ۔ لیکن وہ نبی اگر ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔[1]

[1] باب ۱۸ آیت ۲۱-۱۵۔

نشان زدہ جملوں کو غور سے پڑھیے اور پھر ہر ایک جملہ کی حقیقت کو تاریخی روشنی میں دیکھیے تو تاریخ کا بے لاگ فیصلہ ایک اور صرف ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ اس بشارت کا مصداق ذاتِ اقدس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ماسوا دوسری کوئی ہستی نہیں ہے۔

بشارت کا پہلا جملہ یہ ہے "میں اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا" تاریخ کہتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں بنی اسمٰعیل کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں جو اس کا مصداق بن سکے اور بنی اسمٰعیل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی نبی ہی نہیں ہوا جو موسیٰ کی مانند کہلایا جاسکے اور دوسرا جملہ ہے "میں اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالونگا اور جو کچھ میں اُس سے فرماؤنگا وہ سب اُن سے کہیگا" اس جملہ کو ایک بار پھر غور سے پڑھیے اور اس کے بعد قرآن کی ان آیات کا مطالعہ کیجیے جن میں بعینہٖ یہی صفات نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے مذکور ہیں۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم)	وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں خدا کی وحی سے کہتے ہیں جو اُن پر دی کیجاتی ہے
فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ۝ (مریم)	پس بے شبہ ہم نے اس (قرآن) کو تیری زبان پر آسان کردیا تاکہ تو اس کے ذریعہ متقیوں کو بشارت دے اور کج راہوں کو (عذاب الٰہی سے) ڈرائے۔
وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ	اور یقیناً یہ جہانوں کے پروردگار کا اُتارا ہوا ہے، اس کو روح الامین (جبرئیل) نے تیرے قلب پر اُتارا تاکہ تو گمراہوں کو (اعمال بد کے نتائج سے) ڈرانے والوں میں سے ہو یہ صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر پہلی کتابوں میں موجود ہے

بشارات کے جملوں اور قرآن کی ان آیات کے اسلوب بیان کا مطالعہ کرنے کے بعد کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ دونوں کسی ایک ہی ہستی کی صفات کا ذکر ہے۔ اب تیسرے جملہ

کو پہنچے جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے گا تو میں اُس کا حساب اُس سے لونگا" اور ساتھ ہی ان آیاتِ قرآن کا مطالعہ کیجیے

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ	اور پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اُس دن (قیامت کے
بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ	دن) جب کہ ہم ہر ایک امت میں سے اُن پر ایک گواہ
شَهِيدًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ	طلب کرینگے اور ہم تم کو ان سب پر گواہ بنائینگے، سو جن
كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ	لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور الرسول (محمد صلی اللہ
بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ	علیہ وسلم) کی نافرمانی کی وہ اُس دن یہ پسند کرینگے کاش کہ
حَدِيثًا ۝ (النساء)	(وہ دھنس جائیں) اور زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اُس
	دن یہ اللہ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہ رکھ سکینگے۔

غور کیجیے کہ دونوں عبارتوں میں کس درجہ مطابقت ہے، اور سب کے بعد اس فقرہ کو بامعانِ نظر دیکھئے "لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے" اور پھر قرآن کی اس آیت کو بھی پڑھیے اور فرمائیے کہ کیا یہ دونوں مضامین ایک ہی حقیقت کے دو نقش نہیں ہیں؟۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ	اور یہ پیغمبر بعض باتوں کو اپنی جانب سے گڑھ کر ہماری جانب
لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا	منسوب کر دے تو بے شبہ ہم اُس کا داہنا ہاتھ پکڑلیں اور پھر
مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ	اس کی گردن کی رگ کاٹ ڈالیں (قتل کردیں) اور اُس
عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝ وَإِنَّهُ لَتَذْكِرَةٌ	وقت تم میں سے کوئی بھی اُس کو ہماری گرفت سے باز
لِلْمُتَّقِينَ ۝ (الحاقہ)	نہیں رکھ سکتا۔

تورات کی پیشگوئی اور آیاتِ قرآنی کے مسطورۂ بالا انطباق کے بعد تحدی (چیلنج) کے ساتھ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ بشارات میں ذکر کردہ مجموعۂ صفات کا مصداق ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کے ماسوا دوسری کوئی ہستی تاریخی دنیا میں نہیں پائی جاتی، یہ مجموعۂ صفات نہ حضرت مسیح (علیہ السلام) پر صادق آتے ہیں، نہ حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) پر اور نہ حضرت زکریا و یحییٰ (علیہما السلام) پر اور نہ دوسرے انبیاءِ بنی اسرائیل پر صادق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب علماءِ یہود سے اس کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے تو وہ ایک "منتظر ہستی" کے مزید انتظار کے ماسوا دوسرا کوئی جواب نہیں رکھتے، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا مصداق نہ سمجھنے میں بے دلیل انکار اور خموشی کے علاوہ اُن کے پاس اور کچھ نہیں ہے، اسی طرح نصاریٰ بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کو اس بشارت کا مصداق ثابت کرنے میں مجموعۂ صفات کے پیشِ نظر عاجز و درماندہ نظر آتے اور صاف اور واضح باتوں کو دور از کار تاویلات کا جامہ پہنا کر اعترافِ حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔

اور تورات استثنا ہی میں حضرت موسیٰ کا ایک نغمہ باب ۳۱ میں مذکور ہے جو اُنہوں نے موت کے چند لمحات سے قبل بحکمِ الٰہی بنی اسرائیل کو سُنایا، اُس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ میدانِ تیہ میں اپنی قوم کو جمع کرو اور خدا کا یہ پیغام سُناؤ کہ جب بنی اسرائیل خدا کے وعدہ کے مطابق شہروں میں جا بسینگے تو حکومت، تمول اور رفاہیت میں بدمست ہو کر خدا کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جائینگے حتیٰ کہ بت پرستی سے بھی باز نہیں رہینگے، پس جب اُن کی حالت اس درجہ ابتر ہو جائیگی تو میں اُن سے خفا ہو جاؤنگا اور اُن سے اپنا مُنہ چھپا لونگا اور اس کے بعد میری غیرتِ حق حرکت میں آئیگی اور میں بھی ان (بنی اسرائیل) کو ایک ایسی قوم کے ذریعہ خفا کرونگا اور اُن سے اپنی نعمت (نبوت) چھین کر اس قوم کو بخش دونگا جو ان پڑھ[1]

[1] کتاب مقدس کے قدیم نسخوں میں "ان پڑھ" کا لفظ تمام زبانوں میں موجود ہے مگر بعد کے ایڈیشنوں میں اس کی جگہ کہیں "بے عقل" اور کہیں اسی کے مرادف الفاظ پائے جاتے ہیں، حاصل اگرچہ پھر بھی وہی رہتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اُمّی اور آپ کی قوم کی "اُمیین" مذکور ہے جس کا لفظی ترجمہ "ان پڑھ قوم" ہوتا ہے اس لیے محض اس لیے کہ پیشینگوئی کا یہ صاف تطابق باقی نہ رہے۔ قدیم لفظ کو بدل کر اس قسم کے الفاظ رکھے گئے، مختلف ایڈیشنوں کی اس قسم کی لفظی تحریفات کیلیے میزان الحق کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

اور تمدن سے دور بے عقل خانہ بدوش ہو گی، جس کو تم اور دنیا کی قومیں "متمدن جماعت" نہ سمجھیں گی۔ اس کے بعد باب ۳۲ میں اس نغمہ کی تکمیل ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے۔

اور اس خدا کو جس نے تجھے صورت بخشی بھول گیا۔ اور جب خداوند نے یہ دیکھا تو اس سے (بنی اسرائیل سے) نفرت کی اس لیے کہ اس کے بیٹوں اور بیٹیوں نے اُسے غصہ دلایا۔ اور اس نے یہ فرمایا کہ میں اُن سے اپنا منہ چھپاؤنگا تاکہ میں دیکھوں کہ اُن کا انجام کیا ہوگا اس لیے کہ وہ کج نسل ہیں، ایسے لڑکے کہ جن میں امانت نہیں۔ انہوں نے اس کے سبب سے جو کہ خدا نہیں ہے مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا، سو میں بھی انہیں اُس سے جو گروہ نہیں غیرت میں ڈالونگا اور ایک ان پڑھ قوم سے اُن کو خفا کرونگا۔[1]

تم اس بشارت یا پیغمبرانہ پیشین گوئی کے لیے تاریخ ماضی پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ بنی اسرائیل کی متمردانہ سرگرمیاں، باغیانہ اور سرکشانہ شرانگیزیاں جب حد سے زیادہ متجاوز ہوگئیں اور انہوں نے مسیح ہدایت جیسی جلیل القدر ہستی کو بھی رد کر دیا اور حضرت یحییٰ جیسے مقدس پیغمبر کو قتل کر ڈالا تو اُن کی جگہ خدا نے کس قوم کو پسند کیا، کس کو شرف رسالت سے نوازا اور کس نے ساری کائنات میں حیرت زا انقلاب بپا کر کے سچی خدا پرستی اور نیک عملی کا غلغلہ بلند کر دیا، اور بنی اسرائیل نے کس کے عظمت و جلال کو دیکھ کر حاسدانہ اس کی روکنے کی سعی کی، کیا یہ عرب قوم نہیں تھی اور کیا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ہستی اور اُن کی قوم نہ تھی، جس پیغمبر نے دنیوی وسائل و اسباب کی نظر میں "اُمّی" "ان پڑھ" ہونے کے باوجود متمدن قوموں کے ظالمانہ و جابرانہ تمدن کو فنا کے گھاٹ اتار کر اس عظیم الشان عادلانہ تمدن کی بنیاد ڈالی کہ ہر قسم کے اسباب و وسائل کے فقدان اور موانع کے باوجود جس کی عظمت و سرعت رفتار نے ماہرین فلسفۂ تاریخ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام کی دعوت و اصلاح اور انقلاب دنیا، تاریخ کی مستثنیات میں سے ہے، یہی وہ اُمّی اور گلہ بان قوم تھی جو ایک اُمی کی خدا پرستانہ تعلیمات سے تربیت پا کر چند ہی برسوں میں دنیا کی قوموں

[1] آیت ۱۸-۲۱۔

کی تربیت و اصلاح کے لیے "بہترین معلم" ثابت ہوئی اور اونٹوں اور بکریوں کے چرانے والے دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کے "چرواہے" بن گئے اور بنی اسرائیل کی ہمہ قسم کی حاسدانہ اور معاندانہ جدوجہد اس کی راہ ترقی میں پرکاہ کی برابر بھی سنگ راہ نہ بن سکی۔ تو کیا تاریخ کے ان ابھرے ہوئے نقوش کے بعد بھی اس انکار کے لیے کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ تورات کی اس پیشینگوئی کا مصداق محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بنی اسمٰعیل (علیہ السلام) کے ماسوا کوئی اور ہستی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہی وہ صاف اور واضح حقیقت ہے جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ	(پس میں اُن کے لیے رحمت لکھ دونگا) جو الرسول (محمد صلی
الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا	اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرینگے کہ وہ نبی امی ہوگا (یعنی دنیا
عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ	کے سلسلۂ تعلیم و تعلم کے لحاظ سے ان پڑھ ہوگا) اور اس
یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ	کے ظہور کی خبر وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی
الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ	پائینگے، وہ اُنہیں نیکی کا حکم دیگا، بُرائی سے روکیگا،
عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ	پسندیدہ چیزیں حلال کریگا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائیگا
اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ	اُس بوجھ سے نجات دیگا جس کے تلے وہ دبے ہونگے
عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ	اُن پھندوں سے نکالیگا جن میں گرفتار ہونگے تو جو لوگ
وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ	اُس پر ایمان لائے، اُس کے مخالفوں کے لیے روک
اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ	ہوئے (راہِ حق میں) اُس کی مدد کی، اور اُس روشنی کے
قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ	پیچھے ہوئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) سو وہی
اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ	ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں (اے پیغمبر! تم لوگوں سے) کہو
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ	"اے افراد نسلِ انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا
یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ	ہوں وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمینوں کی بادشاہت اُسی کیلیے

النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۞ (اعراف)

ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی ایک (ذات) وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے، اس کی پیروی کرو تاکہ (کامیابی کی) راہ تم پر کھل جائے۔

اور توراتِ استثناء میں ہے۔

اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا۔ کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔[۲]

موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ بشارت بھی بنی اسرائیل کو اپنی موت سے قبل ایسی حالت میں سنائی تھی کہ وہ موسیٰ (علیہ السلام) کی وداعی حالت کو دیکھ کر دل تنگ اور دلگیر ہو رہے تھے اور یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب خداوند خدا موسیٰ جیسا کوئی پیغمبر مبعوث نہ کریگا۔

سینا جو طور کے نام سے مشہور اور وادی سینا میں واقع ہے اور زبانِ حال سے شہادت دے رہا ہے کہ آگ کی جستجو کے بہانہ موسیٰ کو یہیں خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا اور "کلم اللہ موسیٰ تکلیماً" کا مظاہرہ میرے ہی سینہ پر ہوتا رہا ہے اور شعیر (ساعیر یا سراة) اس پہاڑی سلسلہ کا نام ہے جو عرب میں سب سے زیادہ طویل اور شام سے یمن تک شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے اور القدس (یروشلم) کے سامنے ہو کر گذرتا ہے یہیں وہ جگہ ہے جو بیت اللحم کے نام سے آج بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ولادتِ مبارک کی گواہ اور بعثتِ مسیح

---

[۱] "امّی" لفظ "اُم" کی جانب منسوب ہے جس کے معنی (ماں) کے ہیں، اہل عرب یہ لفظ اس شخص کے لیے بولتے ہیں جس نے پڑھا لکھا نہ ہو گویا وہ ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے، اہل عرب چونکہ عام طور سے ان پڑھ تھے اس لیے "اُمیین" کہلائے اور پیغمبر اسلام نے بھی چونکہ "وحی الٰہی" کے ذریعہ تعلیم و تربیت کے ماسوا دنیا کے اسبابِ تعلیم و تعلّم کے لحاظ سے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا اس لیے آپ کی صفت بھی "اُمّی" رہی آپ نے بھی یہ ارشاد فرمایا ہے "نحن امة امية لا نكتب ولا نحسب"

[۲] باب ۳۳ آیت ۲۔

کا مقام ہی اور فاران عبرانی (حبرو) میں عرب کے اُس حصہ کو کہتے ہیں جو حجاز کے نام سے مشہور ہی یہی مقام اُس وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین) کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہی جس کو مکہ کہتے ہیں اور جو بہت مشہور و معروف ہی اور مقامِ ولادت و بعثت ہی خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا۔

اس تفصیل کے بعد پیشینگوئی کا مطلب واضح ہی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا خدائے برتر کی صداقت و ہدایت کا پیغام نورِ ہدایت بن کر سینا سے حضرت موسیٰ کی شکل میں نمودار ہوا، اور سراۃ (شعیر) پر حضرت مسیح (علیہ السلام) کی صورت میں طلعت افروز ہوا اور فاران پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رُخِ انور بن کر جلوہ گر ہوا۔

فراعنۂ مصر کی طویل و مدید غلامی نے اس خانوادۂ نبوت (بنی اسرائیل) کے قلوب میں یاس و حرمان نے ایسی جگہ کر لی تھی کہ اب اُن کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس بنجر زمین پر خدا کی رحمت کی بارش ہوگی اور تو بر تو حجابہائے تاریک سے "نورِ ہدایت" اپنی نمود دکھلائیگا اس لیے حضرت موسیٰ کی صدائے حق گویا نورِ ہدایت کی وہ نمود تھی جس نے صدیوں بعد پھر اُن کے گھرانے پر رونمائی کی اور موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد اگرچہ بہت انبیاء علیہم السلام احیاءِ حق کے لیے مبعوث ہوئے مگر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے وجودِ گرامی نے جس شان و عظمت کے ساتھ اس درمیان کی پیدا شدہ اندھیاریوں کا پردہ چاک کرکے ہدایت و رشد کی روشنی چمکائی گویا وہ طلوع تھا اُس نورِ ہدایت کا جو حضرت موسیٰ کی حیاتِ طیبہ میں اپنی نمود دکھا چکا تھا اور جس کے ذریعہ آسمانِ ہدایت کے اُفق میں صبحِ سعادت نے شبِ ظلمت سے جھانکنا شروع کر دیا تھا، اور تاریخ شاہد ہی کہ یہی نورِ ہدایت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر جب بنی اسمٰعیل تک پہنچا تو خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس طرح جلوہ گر ہوا کہ فاران کی چوٹیوں سے جب اُس کی کرنیں کائنات کے چہار جانب پھیلیں تو تمام عالمِ انسانی کو روشن و منور بنا دیا اور ظلمتِ شرک و کفر کو مٹا کر نورِ توحید سے

ہر گوشۂ عالم کو تابان و درخشاں کر دیا، چنانچہ تورات میں مذکورہ اس حقیقت کو قرآنِ عزیز نے اس سے زیادہ بہتر اور معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ادا کیا ہے

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ	شاہد ہے وہ مقام جو مرکز ہے انجیر و زیتون کے باغوں کا (یعنی
وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ لَقَدْ	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام ولادت "بیت اللحم" اور شاہد
خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ	ہے طور سینا اور شاہد ہے یہ بلد امین مکہ، یقیناً ہم نے انسان
تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ	کو بہترین مخلوق بنایا۔ پھر اُس کو انتہائی پستی میں پھینک
سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	دیا ماسوا اُن انسانوں کے جو ایمان لائے اور کام کیے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ	نیک، پس اُن کے لیے اجر ہے بے منت (یعنی خدا کا فضل
غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ (التین)	اور رضا اور جنت۔

"الواو للشهادة۔ واو کا استعمال شہادت کے لیے بھی ہوتا ہے" عربیت کا مشہور قاعدہ ہے اور اس قسم کی شہادت اکثر ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہے کہ متکلم جس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے مختلف وجوہ کی بنا پر مخاطب کو اس کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے تب متکلم بعض بدیہی اور محسوس مثالیں دے کر مخاطب کے لیے اُس حقیقت کا سمجھنا آسان بنا دیتا ہے، سورۂ والتین کی آیات میں بھی صورتِ حال ایسی ہی ہے، اس لیے کہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا ہے اس کے باوجود وہ اگر سچا خدا پرست اور نیک کردار نہیں ہے تو انجام کار وہ انتہائی پستی میں پھینک دیا جائیگا اور اُس کی حقیقت چوپاؤں سے بھی بدتر رہ جائیگی۔ اولئك كالانعام بل هم اضل، مگر یہ کہ سچا خدا پرست اور نیک اعمال ثابت ہو تو پھر انسانیت کے بلند سے بلند درجہ کا مستحق اور بے حساب و بے منت خدا کی نعمتوں کا مستوجب ہے" ظاہر ہے کہ یہ بات کافی تفکر و تدبر کی محتاج ہے کہ ایک ہستی تمام مخلوقات سے اپنی تخلیق و تکوین میں "احسن" بھی ہو اور پھر قعرِ مذلت کی گہرائیوں میں بھی پھینک دی جائے اس لیے بطور شہادت نہایت لطیف پیرایہ میں تین مشہور اور نمایاں دورِ ہدایت کا ذکر کر کے اس جانب توجہ دلائی کہ اگر تاریخ کا مقصد

یہ ہے کہ ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھی جا سکے تو ان ہر سہ ادوارِ تاریخ کا مطالعہ کرو اور دیکھو کہ خدا کے برترنے کائنات کی رشد و ہدایت کا شرف "انسان" ہی کو بخشا اور پھر غور کرو کہ وہ بھی انسان ہی تھے جنہوں نے خدا کے پیغمبروں کی پیروی میں سچی خدا پرستی اور نیک عملی اختیار کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ روزِ قیامت کے فیصلہ سے قبل بھی اسی دنیا میں انہوں نے عزت، شرافت، حکومت سب کچھ پایا اور آخرت کا اجر تو بے منت و بے حساب الگ رہا اور وہ بھی انسان ہی تھے جو سرکشی، بغاوت اور پیغمبرانہ تعلیم کے خلاف فساد انگیزی کی بدولت آخرت سے پہلے ہی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کے قعر ہلاکت مذلت سے دوچار ہوئے اور جہنم کے اسفل سافلین سے جو واسطہ آئندہ پڑنے والا ہے وہ جدا ہے، پس اگر ان حقائق کو پیشِ نظر رکھو گے اور تاریخ ماضی کے ان اوراق کو دیدۂ عبرت سے دیکھو گے تو پھر تمہاری یہ حیرت، اعترافِ حقیقت سے بدل جائیگی اور آئینہ عقل و فکر میں یہ سب کچھ روشن ہو جائیگا۔

توراۃ کی بشارت کے یہ الفاظ بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں "وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت اُن کے لیے تھی" قابلِ توجہ اس لیے ہے کہ جب ہم تاریخ کے اس واقعہ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ "رمضان ۸ھ ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء میں فتح مکہ کی غرض سے جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) روانہ ہوئے ہیں تو دس ہزار صحابہ (رضی اللہ عنہم) جلو میں تھے اور آتشی شریعت یعنی "جہاد بالسیف کا حکمِ الٰہی" اُن کے ہاتھ میں تھی" تو قدرت الٰہی کے اس اعجاز کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جس ذاتِ برتر نے موسیٰ (علیہ السلام) کی لسانِ حق سے ان جملوں کو ادا کرایا اُسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس کو کر دکھایا "واللہ علیٰ کل شیٔ قدیر" تو کیا کسی حق پرست و حق آگاہ کو ذرا سا بھی تامل ہو سکتا ہے کہ بلاشبہ موسیٰ (علیہ السلام) کی بشارت کا مصداق خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔

توراۃ کی یہ اور اسی قسم کی دوسری بشارات ہیں جن کے پیشِ نظر بعثتِ محمد (صلی اللہ

علیہ وسلم سے صدیوں پہلے یہود کو نبی آخر الزماں کا انتظار تھا اور وہ یقین رکھتے تھے کہ اب وہ وقت دور نہیں ہے کہ "نورِ ہدایت" "آفتابِ عالمتاب" بن کر جلوہ گر ہونے والا ہے۔ اسی لیے جب کبھی اُن کے اور مشرکین کے درمیان جنگ پیش آجاتی تو کہا کرتے تھے کہ وہ وقت قریب آرہا ہے کہ نبی آخر الزماں مبعوث ہونگے اور ہم اُن پر ایمان لاکر اُن کی قیادت میں تم سے حق و باطل کی جنگ کرینگے اور کامیاب ہونگے۔ چنانچہ جب قومی و نسلی تعصب اور بغض و حسد کی بنا پر اُنہوں نے آفتابِ ہدایت کی روشنی سے مُنہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کرلیں تو قرآن عزیز نے اُن کو "یادِ ایام" کے ساتھ مجرم و ملزم بناتے ہوئے یہ کہا۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝
(بقرہ)

چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے اُن کی ہدایت کے لیے ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو پہلے سے اُن کے پاس موجود ہے تو باوجودیکہ وہ (تورات کی پیشینگوئیوں کی بنا پر اس ظہور کے منتظر تھے، اور) کافروں کے مقابلہ میں اُس کا نام لے کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے، لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آگئی تو صاف انکار کر گئے (اور مخالفت پر کمر باندھ لی) پس ان لوگوں کے لیے جو (دیدہ و دانستہ) کفر کی راہ اختیار

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ایک مرتبہ قبیلہ غطفان اور یہود کے درمیان جنگ ہوئی تو خیبر کے یہود اُن کے مقابلہ میں فتح و نصرت کے لیے یہ دعا مانگتے تھے[1]

اللّٰھم انا نسئلک بحق محمد النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجہ فی آخر الزمان ان تنصرنا علیھم۔

خدایا! ہم تجھ سے اُس نبی امی کا واسطہ دے کر دعا مانگتے ہیں جس کے متعلق تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ نبی آخر الزماں ہونگے، کہ تو ہم کو ان پر فتح و نصرت عطا فرما۔

اور علی ازدی سے منقول ہے کہ "یثرب" (مدینہ) کے یہود ہمارے مقابلہ کے وقت اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے۔

اللّٰھم ابعث ھذا النبی یحکم	خدایا! اس نبی موعود کو مبعوث فرما جو ہمارے اور لوگوں
بیننا وبین الناس.	(مشرکوں) کے درمیان حق کا فیصلہ کر دے[1]۔

اور عقبہ ثانیہ میں جب مدینہ کے ستر اشخاص آپ سے دعوت اسلام کی حقیقت معلوم کرنے آئے اور آپ نے اُن پر حقیقتِ حال ظاہر فرمائی تو اُنھوں نے اُسی وقت ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، بلا شبہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بعثت سے متعلق ہم اکثر یہودی علماء سے سُنا کرتے ہیں[2]، اور کیا اس تاریخی پہلو سے ان نقول کی صداقت پر روشنی نہیں پڑتی کہ جب رومیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی آخری اور فیصلہ کن تباہی عمل میں آئی تو آخر شام فلسطین، شرق اردن، یمن جیسے شاداب وزرخیز علاقوں کو چھوڑ کر وہ کونسی اہم وجہ تھی جس نے یہود کے نمایاں اور مشہور قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر (وغیرہ) کو یثرب اور نواح یثرب میں آباد ہونے کی ترغیب دی، یقیناً صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ کہ اُنھوں نے حضرت موسیٰ اور اُن کے بعد اپنے انبیاء کی بشارات میں یہ بھی سُنا تھا کہ اس "منتظر ہستی" کا ظہور یثرب اور نواح یثرب میں ہوگا۔ مگر وائے بدبختی کہ قبولِ حق کا سب سے بڑا مانع اُن کو یہ پیش آیا کہ قومی، جماعتی اور نسلی حسد نے اُن کو اُس کی اطاعت سے باز رکھا حتیٰ کہ جب انصار (رضی اللہ عنہم) میں سے بعض حضرات علماء یہود کے سامنے یہ کہہ گذرتے کہ ہم نے تو اس نبیِ اُمّی پر ایمان لانے کی بات سب سے پہلے تمہاری ہی زبانی سُنی تھی اور اُس کے ظہور سے قبل تم ہی اُس کے چرچے کیا کرتے اور اُن کتابوں سے اُس سے متعلق بشارات سُنایا کرتے تھے، پھر اب کیا ہوا کہ جب اُس کا ظہور ہوا تو تم انکار کر بیٹھے تو وہ علانیہ جھوٹ بول دیتے اور کہتے کہ ہم کو یاد نہیں کہ کب ہم نے تم سے ایسی باتیں کہی تھیں[3]۔

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۲ عن البیہقی بسند [2] بدائع الفوائد جلد ۲ از مسند بزاز [3] تفسیر ابن کثیر جلد ۱

تورات کی طرح عہدنامۂ جدید (اناجیل) میں بھی تحریف لفظی و معنوی کے باوجود نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت سے متعلق یہ بشارات ملتی ہیں۔ متّی کی انجیل میں ہے۔

لیکن بہت سے اوّل آخر ہو جائینگے اور آخر اوّل ٥ کیونکہ آسمان کی بادشاہت اُس گھر کے مالک کی مانند ہے جو سویرے نکلا تاکہ اپنے انگوری باغ میں مزدور لگائے اور اُس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر اُنہیں اپنے باغ میں بھیج دیا ٥ پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکل کر اُس نے اوروں کو بازار میں بیکار کھڑے دیکھا ٥ اور اُن سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ جو واجب ہے تمہیں دونگا پس وہ چلے گئے ٥ پھر اُس نے دوپہر اور تیسرے پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑا پایا اور اُن سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے ٥ اُنہوں نے اُس سے کہا، اس لیے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا، اُس نے اُن سے کہا: تم بھی باغ میں چلے جاؤ ٥ جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلاؤ اور پچھلوں سے لے کر پہلوں تک اُنہیں مزدوری دیدو ٥ جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے گئے تھے تو انہیں ایک ایک دینار ملا جب پہلے مزدور آئے تو اُنہوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں زیادہ ملیگا اور اُن کو بھی ایک ہی دینار ملا ٥ جب ملا تو گھر کے مالک سے یہ شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے اُنہیں ہمارے برابر کر دیا جنہوں نے (ہم نے) دن بھر کا بوجھ اُٹھایا اور سخت دھوپ سہی ٥ اُس نے جواب دے کر اُن میں سے ایک سے کہا "میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا، کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا، جو تیرا ہے اُٹھا لے اور چلا جا، میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں اُس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں ٥ کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں؟ یا تو اس لیے کہ میں نیک ہوں بُری نظر سے دیکھتا ہے ٥ اس طرح آخر اوّل ہو جائینگے اور اوّل آخر ٥[1]

اس بشارت میں حضرت مسیح (علیہ السلام) نے مثالی رنگ میں اقوام و امم عالم کی عملی زندگی اور خدا کی جانب سے اُن پر اجر و ثواب کا مرقع پیش فرمایا ہے پہلے مزدور حضرت موسیٰ (علیہ

[1] باب ۲۰، آیات ۱۶-۱

السلام) سے قبل کی دنیا کے لوگ ہیں اور دوسری جماعت سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی اُمت بنی اسرائیل مراد ہیں، تیسرا گروہ نصاریٰ ہیں اور چوتھی جماعت خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے، کائناتِ ارضی کی عمر کے لحاظ سے پہلی، دوسری اور تیسری جماعت کے مقابلہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا زمانہ حیات یوں سمجھیے گویا دن کا آخری حصہ ہے اور اجر و ثواب میں اس آخری اُمت کو پہلی امتوں کے مقابلہ میں برابر کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے یہاں ان کو دوسری تمام اُمتوں پر برتری حاصل ہے اس لیے کہ اگرچہ ان کا وجود حیات اُمتوں کے آخر میں ہوا ہے لیکن چونکہ یہ خدا کے آخری پیغام "قرآن" کی حامل اور سرخیلِ انبیاء و رسل" کی اُمت ہیں اور تمام اُمتوں سے ان ہی کے رسول پر ایمان لانے کا وعدہ میثاق لیا گیا ہے لہذا حیاتِ دنیا کے لحاظ سے گو ان کا زمانہ آخر ہے مگر مرتبہ اور عظمت کے اعتبار سے وہ سب سے "اول" ہیں، یہی ہے مراد بشارت کے پہلے اور آخری جملہ کی یعنی "بہت سے اول آخر ہو جائینگے اور آخر اول اور "اس طرح آخر اول ہو جائینگے اور اول آخر"

نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی ٹھیک اسی طرح ایک مثال بیان فرمائی ہے جو بخاری میں منقول ہے:۔

دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں دنیا کے اندر تمہاری مثال ایسی ہے جیسا کہ دن کے طویل عرصہ میں عصر (شام) سے غروب آفتاب کے وقت کی اہل تورات (یہود) کو تورات عطا کی گئی اور اُنہوں نے اُس پر عمل کیا حتیٰ کہ وہ دوپہر ڈھلے عاجز رہ گئے (یعنی خدا کی تعلیم حق کو فراموش کر بیٹھے) تب اُن کو مالک نے ایک قیراط مزدوری دے دی اور پھر اہل انجیل (نصاریٰ) کو کام پر لگایا اور اُنہوں نے دوپہر ڈھلے سے عصر (شام) تک کام کیا اور پھر وہ بھی عاجز رہ گئے، تب اُن کو بھی مالک نے ایک ایک قیراط مزدوری دے دی، آخر میں ہم کو قرآن ملا اور ہم نے دنیا کی زندگی کے دن غروب ہونے تک کام کیا تب مالک نے ہم کو دو دو قیراط عطا کیے اس پر پہلوں نے شکایت کی کہ ہم نے زیادہ محنت کی مگر تو نے ان کو اور ہم کو برابر

کردیا، مالک نے کہا: میں نے تمہاری مزدوری میں سے تو کم نہیں کیا، تب مالک نے فرمایا: تو پھر یہ میری مرضی ہے کہ میں اپنے پاس سے جس کو چاہوں (مزدوری کی کیفیت و نوعیت کے فرق اور کام کی صلاحیت و استعداد کے پیشِ نظر) زیادہ دوں " فھو فضل اوتیہ من اشاء "

اور امم ماضیہ و اقوام سالفہ کے مقابلہ میں اُمت محمدیہ کی یہی فضیلت ہے جس کو قرآن نے بصراحت اس معجزانہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران)

تم (تمام امم و اقوام میں) بہترین امت ہو جو کائنات انسانی (کی خدمت) کے لیے وجود میں لائی گئی ہے، تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے باز رکھتے ہو۔

بہرحال آخری جماعت کا اول ہو جانا اگر اس کا مصداق اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں تو اور کون ہے جس کا ذکر توراۃ کی اس بشارت میں ہو رہا ہے اور جس کی تصدیق " نبی امی " اور " قرآن " دونوں کر رہے ہیں، عقلاً بھی یہ فرقِ مراتب واضح ہے اس لیے کہ جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل کے بعد مبعوث ہوئے اور آپ کے قبول کرنے والوں میں آپ کی قوم سے بھی زیادہ دنیا کی دوسری اقوام و امم کے افراد شامل ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی فرد یا جماعت پہلے سے کسی مذہبی جماعت میں شامل ہے تو اس کے لیے جدید دعوتِ حق کو قبول کرنے میں قومی، جماعتی اور نسلی عصبیت و غرور سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آجاتا ہے پس جو شخص اس رکاوٹ کو پاؤں تلے روند کر دعوتِ حق پر " لبیک " کہتا ہے وہ بلاشبہ اس کا مستحق ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں پہلی صداقتوں پر ایمان لانے والوں کے مقابلہ میں اُس کو دو چند بلکہ چند در چند اجر و ثواب عطا ہو۔

اور انجیل یوحنا میں ایک بشارت اس طرح مسطور ہے:۔

اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے " کاہن " اور " لیوی " یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں اُنھوں نے اُس

سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں، پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو کون ہے تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟[1]

اس پیشینگوئی کا تاریخی زمانہ وہ ہے جب حضرت یحییٰ (یوحنا)[2] علیہ السلام اپنی صدائے حق سے بنی اسرائیل کو مسحور کر رہے تھے اور حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ظہور کی بشارت دیتے تھے، اس وقت یہود کے مقدسین کی ایک جماعت اُن کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے یہ سوالات کیے:۔

سوالات میں تین پیغمبروں کے متعلق اُن سے دریافت کیا گیا کہ وہ اُن میں سے کون ہیں مگر اُنہوں نے انکار کیا کہ وہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں ہیں، تو یہ سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ یہود تین یا دو پیغمبروں کے ظہور کے منتظر تھے حضرت مسیح کے حضرت ایلیا[3] کے اور ایک ایسے پیغمبر کے جس کا ذکر اُن کے درمیان اس درجہ مشہور تھا کہ اُنہوں نے سوالات کے وقت دو ناموں کی طرح نام لینا ضروری نہیں سمجھا، اور صرف "وہ نبی" کہنا ہی کافی خیال کیا۔

یہ بشارت اس درجہ واضح اور صاف ہے کہ نصاریٰ بجز بے دلیل انکار کے تاریخ کے اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم "وہ نبی" کا مصداق نہیں ہیں تو پھر کون ہے، کیا معاملہ کی صورت یہ نہیں ہے کہ جس طرح یہود، ظہورِ مسیح (علیہ السلام) کے منتظر تھے مگر اُن کی آمد پر ازرہ حسد اُن کو رد کر دیا، اسی طرح یہود و نصاریٰ دونوں "وہ نبی" کی شہرتِ عام کے پیش نظر اُس کے ظہور کے سخت منتظر ہونے کے باوجود اُس کی بعثت وظہور

---

[1] باب ۱، آیات ۱۹-۲۲ [2] یوحنا عبرانی میں حضرت یحییٰ کا نام ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری کا نام بھی ہے جن کی جانب انجیل یوحنا منسوب ہے۔

[3] کہا جاتا ہے کہ کتب قدیمہ میں ایلیا بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت منقول تھی، اور اس لیے خواص علماء یہود ایلیا اور فارقلیط کو ایک ہی تسلیم کرتے تھے مگر بعد کو تحریفات کی بدولت ایک اور منتظر ہستی کا اضافہ ہوگیا اور وہ الیاس علیہ السلام ہیں، یہود نے اب یہ گڑھ لیا کہ حضرت الیاس کا دوبارہ ظہور ہوگا اور اس لیے اب اناجیل میں بھی متو کی جگہ تین کے ظہور کا ذکر نظر آتا ہے۔

کے نسلی و قومی عصبیت کی بدولت منکر ہو گئے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝	وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ تم کو اس طرح "پیغمبر حق" پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلا شبہ اُن میں سے ایک فریق حق کو چھپاتا ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ حق کو چھپا رہے ہیں۔
	(بقرہ)

یوحنا کی انجیل میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کی وصیت بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے لیے شاہدِ عدل ہے، فرماتے ہیں۔

تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے؟ بلکہ اس لیے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کہیں، تمہارا دل غم سے بھر گیا لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ "مددگار" تمہارے پاس نہ آئیگا لیکن اگر جاؤنگا تو اُسے تمہارے پاس بھیجدونگا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی سے اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائیگا۔[۱]

یہ بشارت حضرتِ مسیح کی وصیت ہے اور تمثیلی استعاروں اور تشبیہوں کی بجائے واضح الفاظ میں ایک "موعود پیغمبر" کی خبر دیتی ہے اور موعود ہستی کی جن صفات کا اس میں ذکر ہے وہ حرف بحرف خاتم الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں۔

حضرت مسیح حواریوں اور شاگردوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ اُن کی جدائی سے کس درجہ متاثر ہیں، دل غم سے بھرے ہوئے ہیں، آنکھیں پُرنم ہیں، حسرت و یاس چہرہ سے ٹپک رہی ہے، کیوں؟ کیا اس لیے کہ ایک انسان اُن سے جدا ہو رہا ہے، نہیں نہیں، بلکہ اس لیے کہ خدا کا ایک ہادی، نبی و رسول، پیغمبرِ صداقت کی وداعی گھڑیاں قریب ہیں اور اب نہیں کہا جاسکتا کہ دنیا ایسی مقدس ہستیوں سے بہرہ ور ہوگی یا نہیں کیونکہ منکروں اور

[۱] باب ۱۶۔

باطل پرستوں نے خدا کی اس نعمت کی کوئی قدر نہ کی اور اُس کو رد کر دیا، اس غم آگیں منظر میں حضرت مسیح (علیہ السلام) اُن کو تسلّی و تشفّی دیتے اور یقین دلاتے ہیں کہ "میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے" اور پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئیگا" یعنی میرا کائناتِ ارضی پر یہ قیام اُس "مددگار" کی آمد کے لیے تاخیر کا باعث ہو رہا ہے جس کا آنا تمہارے لیے اس درجہ مفید ہے کہ باایں محبت و خلوص میرا جانا ہی تمہارے لیے فائدہ مند ہے، پھر اُس کی معرفت کے لیے مزید باتیں بیان فرمائیں کہ وہ دنیا کو گناہوں (برائیوں) سے باز رکھیگا، راست بازی کا حکم کریگا اور افراط و تفریط کی اُن روشوں کے خلاف جو انسانی دنیا کے ہر معاملہ میں رگ و ریشہ کی طرح پھیلی ہوئی ہونگی "عدل" سے گریز پر مجرم اور قصوروار ٹھہرائیگا۔

قدرتی طور پر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ہستی کون ہے جو ان مجموعۂ صفات کا مصداق بن سکے، علماءِ نصاریٰ کہتے ہیں کہ اس سے مُراد "روح القدس" ہے اور وہ حضرت مسیح کے قبر میں سے جی اُٹھنے اور آسمان پر باپ کے پاس چلے جانے کے بعد شاگردوں پر نمودار ہوئی، لیکن جب اس باطل تاویل پر اُن سے یہ کہا گیا کہ ماضی یا مستقبل میں کونسا زمانہ آچکا ہے یا آئیگا جس پر بشارت کا یہ جملہ صادق آسکے جو دراصل پوری وصیت کی روح ہے "وہ آکر دنیا کو گناہ سے اور راستبازی سے اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائیگا" اور کس طرح یہ عبارت صرف اُس نور پر صادق آسکتی ہے جو شاگردوں پر (روح القدس) ایک کبوتر کی شکل میں نازل ہو کر دکھلا گئی

یہ وصیت تو اس تاویل کے برعکس صاف یہ ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت مسیح ایک ایسے عظیم المرتبہ جلیل القدر پیغمبر کے ظہور کی بشارت سنا رہے ہیں جس کی آمد کائناتِ انسانی کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کی موجودگی سے بھی زیادہ سودمند ثابت ہوگی اور جو ایک مرتبہ پھر کائنات کو اُس کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیگی اور اُس کی تعلیم حق کا معیار

سرتاسر "عدل" پر مبنی ہوگا کہ یہی تمام اخلاقِ کریمانہ اور شعبہ حیات کے لیے اساس اور بنیاد کا ہے۔ اور اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے جب ہم تاریخ مذاہب سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کا مصداق کون ہے تو اس کے ماسوا اور کوئی جواب نہیں ملتا کہ حضرت مسیح کے بعد وصیت میں مذکورہ اوصاف کی مصداق ہستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی ظہور میں نہیں آئی، یہی وہ مقدس ہستی ہے جس نے ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کی قوموں اور اُن کی سوسائٹیوں میں "عدل" ایک بے معنی شے رہ گئی تھی اور جبکہ سچی نیک عملی اور خدا پرستی قومی اور جماعتی زندگی سے خارج ہو چکی تھی دنیا انسانی کو یہ پیغام سُنایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے "عدل" کا "احسان" کا، قرابت
وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ	داروں کے ساتھ سلوک کا اور یقیناً منع کرتا ہے فحش کاموں
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ	اور باتوں سے، بُرے کاموں سے اور بغاوت و سرکشی
لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۝ (النحل)	سے، وہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔

اور یہی وہ مقدس ہستی ہے جس کے ظہور کی بدولت اُس کی اُمت کا مقصدِ حیات یہ ظاہر کیا گیا۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ	(اے اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں (کی
لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	خدمت) کے لیے عالمِ وجود میں لائی گئی ہے، تم لوگوں کو بھلائی اور
وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (آل عمران)	نیکیوں کا حکم کرتے اور اُن کو برائیوں سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہو۔

مضمونِ وصیت کے اس نمایاں پہلو کے ماسوا ایک اور روشن اور واضح بات اس وصیت یا بشارت میں وہ جملہ ہے جس میں موعود ہستی کو ایک خاص وصف کے ساتھ یاد کیا گیا ہے یہ وصف اگرچہ جدید ایڈیشنوں میں "مددگار" "وکیل" "معزی" اور "شفیع" ہے لیکن قدیم یونان، فرنچ، لیٹن اور انگریزی تراجم میں "پیراکلیتاس" اور عبرانی (حبرو) اور عربی تراجم میں "فارقلیط" پایا جاتا ہے جو عربی لفظ احمد کے ہم معنی اور مرادف ہے۔

یہ بات تو علمار نصاریٰ اور ہر ایک تاریخ داں کے نزدیک متفق علیہ اور مسلم ہی کہ موجودہ اناجیل میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کی اصل انجیل نہیں ہی بلکہ جن ناموں سے یہ منسوب ہیں اُن کے بھی اصل نسخے نہیں بلکہ تراجم ہیں اور یہ کہ مسیح کی انجیل کا اوریجنل (اصل) نسخہ قدیم حبرو (عبرانی) زبان میں تھا اس لیے یہ دعویٰ بسہولت کیا جا سکتا ہی کہ اوریجنل نسخہ میں یہ لفظ بلا شبہ "احمد" ہی ہوگا جیسا کہ سورۂ صف میں قرآنِ عزیز نے حضرتِ مسیح کا یہ قول نقل کیا ہی " ومبشرًا برسول یاتی من بعد اسمہ احمد" اور دلیل یہ ہی کہ موجودہ انجیل کے قدیم تراجم میں فارقلیط اسی لفظ احمد کا ہم معنی اور مرادف لفظ اختیار کیا گیا مگر جب علمار نصاریٰ نے یہ دیکھا کہ صداقتِ خاتم الانبیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتابِ مقدس سے بصراحتِ تام بہت بڑی دلیل ہاتھ آتی اور علما راسلام کی جانب سے ہم پر قوی حجت قائم ہوئی جاتی ہی تو بعد کے ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط یا پیراکلیوتاس نکال دیا گیا اور اب اُس کی جگہ کبھی ناصر (مددگار) کبھی وکیل، کبھی شفیع اور کبھی معزی (تسلی دینے والا) لکھا جانے لگا تاکہ واضح نام کی بجائے ایک ایسی صفت آجائے جس کا اطلاق بغیر کسی تعین کے ہر ایک ذاتِ حق پر ہو سکے۔ اناجیل کے قدیم وجدید نسخوں اور پھر قدیم وجدید کے مختلف ایڈیشنوں میں لفظِ فارقلیط اور اسی قسم کی دوسری گوناگوں تحریفات کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے میزانِ الحق اور الفارق کا مطالعہ ازبس مفید ہی۔ یہاں اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ اناجیل کے عربی تراجم میں مسطورہ بالا الفاظ کی بجائے فارقلیط تھا صرف یہ ایک ثبوت کافی ہی کہ ایک صدی قبل کے عربی نسخہ میں جو لندن سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا یہ لفظ یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶ میں موجود تھا " واطلب من الاب فیعطیکم فارقلیطا اٰخر"

تاہم علمار نصاریٰ کی اس واضح تحریف کے بعد بھی اُن کا مقصد حل نہیں ہو سکتا اور ایک مرتبہ اُن سے پھر یہ سوال کیا جا سکتا ہی کہ اس بشارت میں لفظ فارقلیط (احمد) کی جگہ

مسطورۂ بالا الفاظ میں سے ہی کوئی لفظ سہی مگر جبکہ اس بشارت کا مصداق "روح القدس" کا کبوتر کی شکل میں شاگردوں پر نمودار ہو جانا" کسی طرح نہیں بنتا تو پھر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے بعد تاریخِ ادیان میں وہ کونسی ہستی ہے جس کو اس کا مصداق سمجھا جائے کیا علماء نصاریٰ اس بے دلیل انکار کے ساتھ کہ اس کا مصداق ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں جرأت کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ہستی اس مجموعۂ صفات کا مصداق تھی یا آج ہے یا آئندہ آئیگی، نہیں وہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کے پاس اس انکار کے لیے صرف یہی ایک مثبت دلیل ہے کہ "روح القدس" اس کا مصداق ہے، کاش کہ وہ یہ قدرت بھی رکھتے کہ "روح القدس" کو انسانی شکل میں کائنات کی ہدایت کے لیے لا سکتے کہ وہ پیغمبرانہ صداقت کے ساتھ لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتی، برائیوں سے روکتی اور عدل ترک کر کے افراط و تفریط کی راہ اختیار کرنے پر لوگوں کو قصوروار ٹھہراتی، تب شاید ان کا یہ قول الفاظِ بشارت کی مطابقت کر سکتا، ورنہ تو یہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس بشارت کو ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تسلیم نہ کرنا صرف نسلی، قومی اور جماعتی گروہ بندی سے پیدا شدہ عصبیت و حسد کا نتیجہ ہے۔

اس سے قطع نظر ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ مسیح کی انجیل میں احمد (فارقلیط) کی بجائے مسطورۂ بالا الفاظ ہی میں سے کوئی لفظ تھا تب بھی اس کا مصداق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ قرآنِ عزیز نے مختلف مقامات پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصافِ حمیدہ بیان کیے ہیں وہ ان ہی مسطورہ بالا الفاظ کے ہم معنی ہیں مثلاً سورۂ توبہ میں آپ کو عزیز، رؤف، رحیم کہا گیا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	(ایمان والو!) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آگیا
عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ	ہے جو تم ہی میں سے ہے تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس کو
عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ	بہت شاق گذرتا ہے، وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (توبہ)

وہ ایمان والوں کے لیے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے۔ (اے پیغمبر!) اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے، کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اُس کی ذات، میں نے اس پر بھروسہ کیا وہ تمام عالمِ ہستی کی جہانداری کے عرش عظیم کا خداوند ہے۔

اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء) اور ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا مگر جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔

اور اگر صحیح احادیث کی تصریحات کو بھی ان آیات کی تفسیر کے طور پر شامل کر لیا جائے تب تو اناجیل کے تراجم میں مذکور صفات بعینہٖ آپ کو مل جائینگے مثلاً الشافع المشفع، الشفیع، الناصر (مددگار) وغیرہ

پھر اسی باب کی آیت ۱۳ کو اس مضمون کے ساتھ اگر ملائیے تو معاملہ اور زیادہ واضح اور صاف ہو جائیگا، حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

لیکن جب وہ سچائی کی رُوح آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائیگا، اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہیگا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دیگا۔

غور فرمائیے کیا یہ مضمون "رُوح القدس" پر صادق آسکتا ہے جس نے چند شاگردوں پر ظاہر ہو کر اپنی نمود دکھلائی یا ایسی ہستی پر کہ جو لوازم بشریت سے متصف ہونے کے باوجود کائنات انسانی میں رہ کر سچائی کی راہ دکھلائے اور امور غیب سے متعلق خدا نے جو کچھ بتلایا ہے (علامات قیامت، جنت و جہنم، حشر و نشر وغیرہ کی تفصیلات) اُس کو مخلوق خدا تک پہنچائے اور پھر معلوم کرو تاریخ ماضی سے کہ حضرت مسیح کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کون آیا جس نے خدا سے بھٹکے ہوئے انسانوں کا رشتہ دوبارہ خدا سے ملایا اور ادیان و ملل کی گم شدہ

صداقتوں کو قرآن کے ذریعہ روشن و نمایاں کیا، کیا موافق و مخالف دونوں شہادتیں اس پر متفق نہیں ہیں کہ اُس کی قوم، دوست و دشمن سب ہی اُس کو "الصادق الامین" کہہ کر پکارتے تھے اور کیا انجیل کا یہ فقرہ "اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہیگا" اور قرآن کی یہ آیت "وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ"۔ وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، جو کچھ کہتا ہے اُس وحی سے کہتا ہے جو خدا کی جانب سے اُس پر اتاری جاتی ہے" ایک ہی مقدس ہستی کی تقدیسِ حیات اور صداقتِ قول و عمل کے دو عکس نہیں ہیں۔ پس "سچائی کی روح" میں لفظ "روح" سے فائدہ اُٹھا کر اور بقیہ تمام مضمونِ بشارت سے آنکھ بند کر کے اُس کو "روح القدس" کہہ دینا علمی دیانت ہے؟ ہرگز نہیں۔

غرض، وصیت یا بشارت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی جانب سے واضح اوصاف اعلان ہے۔ ظہور قدسی صفات صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس کا انکار بداہت کا انکار ہے اور تعصبِ بے جا کی دلیل[1]۔

بشارات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ باب بہت وسیع ہے اور چھٹی صدی ہجری میں ایک مسیحی عالم سعید بن حسن اسکندرانی نے جب کتاب مقدس میں ان بشارات کو دیکھ کر اسلام قبول کیا تو محیط النظر ایک مستقل کتاب اسی موضوع پر تصنیف کی اور ہمیشہ سے علماء اسلام بھی اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھتے رہے ہیں حتیٰ کہ بعض علماء نے ہندوؤں کی قدیم کتابوں اور مجوس کے قدیم نوشتوں میں بھی "منتظر ہستی" سے متعلق جو کچھ مذکور ہے اُس کو بشارات النبی میں شامل کیا ہے مگر ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہوئے قرآن عزیز کی اُن آیات پر اس مضمون کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو نزول قرآن کے وقت سے یہود و نصاریٰ کے سامنے برابر اعلان کرتی رہی ہیں کہ قدیم سماوی کتابوں میں اس مقدس پیغمبر کا تذکرہ برابر رہا ہے اور چونکہ خدا کی

[1] اس پیشنگوئی میں فارقلیط سے متعلق مفصل محققانہ بحث کے لیے میزان الحق از مولانا رحمۃ اللہ (نور اللہ مرقدہ) الفارق، ہدایۃ الحیاریٰ اور رسالہ تہذیب الاخلاق مضمون فارقلیط قابلِ مراجعت ہیں۔

کی تقدیر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اُس کا آخری اور کامل و مکمل قانون اسی ذاتِ اقدس کے ہاتھوں کائناتِ ہست و بود تک پہنچیگا اس لیے از بس ضروری تھا کہ اُس کا ذکر پہلے نوشتوں میں ہوتا کہ جب اُس کے ظہور کا وقت آپہنچے تو تمام صادق ادیان و ملل سے متعلق اُمتیں میثاقِ الٰہی کے مطابق اُس پر ایمان لائیں اور اُس کی پیش کردہ صداقت اور قانونِ ہدایت "قرآن" کو اپنے لیے راہِ عمل بنائیں چنانچہ سورہ الفتح میں ارشاد ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ	محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ (صحابہ) اُن کے
اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ	ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں، آپس میں نرم خو
تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا	ہیں، (اے مخاطب!) تو اُن کو دیکھیگا (خدا کے سامنے
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ	جھکنے والے، سجدہ کرنے والے اور اس طریقہ سے خدا
وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ	کے فضل اور اس کی رضا کے خواہشمند ہیں اُن کی
مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي	نشانی یہ ہے کہ اُن کے چہروں (پیشانیوں) پر سجدے کے
الْاِنْجِيْلِ (الفتح)	نشانات ہیں، توراۃ اور انجیل میں اُن کا ذکر اسی طرح ہے۔

یہ ذکر انجیل برنابا میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور آپ کی صفات بہت نمایاں الفاظ میں مذکور ہیں لیکن وہ نصاریٰ کے نزدیک متروک ہے مگر جیسا کہ سابق میں کہا جا چکا اُس کا ترک کسی دلیل پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ اور بعض دوسری اناجیل کا ترک محض ایک فال کی بنا پر ہوا جو اسی غرض سے نکالی گئی تھی۔

اور سورہ شعراء میں ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ	اور یقیناً یہ (قرآن) جہانوں کے پروردگار کا اُتارا ہوا ہے،
بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ	اُس کو روح الامین (جبرئیل) نے (خدا کی جانب سے)
مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ	تیرے قلب پر نازل کیا تاکہ تو (خدا کے نافرمانوں) کو
وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (الشعراء)	ڈرانے والوں میں سے ہو یہ صاف عربی زبان میں ہے

اور اس کا ذکر پہلوں (گذشتہ پیغمبروں) کی کتابوں میں ہے۔

اور ایک مرتبہ خود نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان ہی بشارات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

دعوۃ ابی ابراھیم وبشری عیسیٰ — میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں اور عیسیٰ مسیح کی بشارت ہوں

(یعنی) دعاءِ خلیل اور نویدِ مسیحا

قرآنِ عزیز نے دعاءِ ابراہیم (علیہ السلام) کا ذکر اس طرح کیا ہے

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرہ)	اے ہمارے پروردگار! ان (اہلِ عرب) ہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیات پڑھے اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھلائے اور اُن کو (ہر قسم کی برائیوں سے) پاک کرے، بے شبہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اور بشارتِ مسیح کا ذکر سورۂ صف میں اس طرح منقول ہے۔

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ	اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا "اے بنی اسرائیل! میں تمہاری جانب اللہ کا رسول (الٰہی) ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیگا اور اس کا نام احمد (فارقلیط) ہوگا، پس جب ان کے پاس وہ (خدا کا پیغمبر) دلائل لے کر آیا تو یہ کہنے لگے، یہ تو کھلا جادو ہے۔

صبحِ سعادت | تاریخ ادیان و ملل شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ظہور پر تقریباً

چھٹی صدیاں گذر چکی ہیں کہ معمورۂ عالم خدا کے پیغمبروں کی معرفت حاصل کی ہوئی صداقتِ حق کو فراموش کر چکا ہے، تمام کائناتِ انسانی خدا پرستی کی بجائے مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور ہر قوم اور ہر ملک میں نوعِ انسانی سے لے کر نوعِ جمادات تک کی پرستش سرمایۂ نازش بنی ہوئی ہے۔ کوئی انسان کو اوتار (خدا) کہہ رہا ہے تو کوئی خدا کا بیٹا، ایک اگر مادہ پرست ہے تو دوسرا خود اپنی آتما (روح) کو ہی خدا سمجھ رہا ہے، سورج کی پوجا ہے، چاند اور ستاروں کی پرستش ہے، حیوانو درختوں اور پتھروں کی عبادت ہے، آگ پانی، ہوا مٹی کے سامنے ناصیہ فرسائی ہے، غرض کائنات کی ہر شی پرستش اور پوجا کے لائق ہے اور نہیں ہے تو صرف ذاتِ واحد قابلِ پرستش نہیں ہے، نہ اُس کی احدیت کا تصورِ خالص ہے اور نہ صمدیت کا، اُس کو اگر مانا بھی جاتا ہے تو دوسروں کی پرستش اور عبادت کے ذریعہ، وہ اگر خالقِ موجودات ہے تو دوسروں کے واسطہ اور احتیاج کے ساتھ، مادہ، روح اور ترکیب، سب ہی باتوں کا محتاج ہے، وہ اگر مالکِ موجودات ہے بھی تو انسان، حیوان، درخت، پتھر کے بل بوتہ پر، غرض ساری دنیا میں اصل کارفرمائی مظاہر کی تھی اور "ذاتِ حق" صرف نام کے لیے، حقیقت سے چشم پوشی تھی مگر مجاز کے ساتھ ذوقِ عشق، ذاتِ حق سے بُعد تھا مگر مظاہر سے قربت سرمایۂ سعادت، خالق سے بیگانگی تھی مگر مخلوقات کی عبادت گذاری شعارِ عام تھا، اور ہر طرف "ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔ ہم اُن کو نہیں پوجتے مگر اس لیے تاکہ وہ خدا کی جانب ہماری قربت کا ذریعہ بن جائیں" کا مظاہرہ نظر آتا تھا۔

یہی وہ تاریک دور تھا جس میں "سنۃ اللہ" یعنی خدا کے قانون ہدایت وضلالت نے ماضی کی تاریخ کو پھر دہرایا اور غیرتِ حق نے فطرت کے قانون ردِ عمل (Reaction) کو حرکت دی یعنی آفتابِ ہدایت برجِ سعادت سے نمودار ہوا اور چہار جانب چھائی ہوئی شرک وجہالت اور رسم ورواج کی تاریکیوں کو فنا کر کے عالمِ ہست وبود کو علم ویقین کی روشنی سے منور کر دیا۔

۹- ربیع الاول مطابق ۲۰- اپریل ۵۷۱ء کی صبح، وہ صبح سعادت تھی جب مدنیت و حضارت سے محروم، بن کھیتی کی سرزمین مکہ کے ایک معزز قبیلہ قریش (بنی ہاشم) میں عبداللہ بن عبدالمطلب کے یہاں آمنہ بنتِ وہب کے مشکوٰ معلّٰی سے آفتابِ رسالت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ظہور کیا۔

خدایا! وہ صبح کیسی سعادت افروز تھی جس نے کائناتِ ارضی کو رشد و ہدایت کے طلوع کا مژدۂ جانفزا سُنایا، اور وہ ساعت کیسی مبارک و محمود تھی جو معمورۂ عالم کے لیے پیامِ بشارت بنی، عالم کا ذرہ ذرہ زبانِ حال سے نغمے گا رہا تھا کہ وقت آپہنچا کہ اب دنیاءِ ہست و بود کی شقاوت دور اور سعادتِ مجسم سے عالم معمور ہو، ظلمتِ شرک و کفر کا پردہ چاک ہو، اور آفتابِ ہدایت روشن و تابناک ہو، مظاہر پرستی باطل ٹھہرے اور خدائے واحد کی توحید مقصدِ حیات قرار پائے۔

دنیا تو کیا، ملک، قبیلہ اور خاندان کو بھی یہ علم نہ تھا کہ مذاہبِ عالم جس آفتابِ رسالت کے طلوع ہونے کے منتظر ہیں وہ اس غیر متمدن سرزمین اور عبدالمطلب کے گھرانے سے جلوہ گر ہوگا کہ اُس کی ولادت باسعادت کو خاص اہمیت دیتے اور تاریخ ولادت کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے مگر جس خالقِ کائنات کے نوشتۂ تقدیر نے اُس کو مقدس ہستی بنانے کا فیصلہ کیا، اُسی کے یدِ قدرت نے ولادت باسعادت کے لیے ایک معجزانہ تاریخی نشان بھی ظاہر کر دیا۔ اور وہ "اصحاب الفیل" کا واقعہ تھا۔

معتبر اور مستند روایات شاہد ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اس واقعہ سے چند ماہ بعد ہوئی [1]

یہ واقعہ جن خصوصیات کا حامل ہے اُن کے پیشِ نظر یہ عرب کے لیے عموماً اور اہلِ حجاز کے لیے خصوصاً نہایت عجیب اور حیرت زا تھا اور اس لیے وہ کبھی اس کو فراموش

---

[1] واقعہ کی تفصیلات قصص القرآن جلد ۳ میں گذر چکیں۔

نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے اس کا نام ہی عام الفیل (یعنی ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا، مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ دراصل یہ واقعہ ایک "نشان" ہے اس جلیل القدر ہستی کے ظہور کا جو ایک روز تمام معمورۂ انسانی کو مرکزِ توحید اور قبلۂ ابراہیمی پر جمع کردیگی اور اس کو غیر اللہ (بتوں) کی آلودگیوں سے پاک کرکے توحید الٰہی کے نغموں کے لیے مخصوص کرائیگی۔ کیونکہ یہی وہ پہلا مقام ہے جو صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا گیا، یہ مندر نہیں تھا کہ مورتی کی پوجا کی جائے، یہ گرجا اور کلیسا بھی نہ تھا کہ یسوع مسیح اور کنواری مریم کے مجسموں کے سامنے سر جھکایا جائے، نہ یہ آتشکدہ تھا کہ آگ کو نور کا مظہر قرار دے کر اس کی پرستش کی جائے اور نہ یہ صلواتِ یہود تھا کہ حضرت عُزیر کو خدا کا بیٹا بنا کر اس کی تقدیس کے نغمے گائے جائیں بلکہ یہ تو خدا اور صرف ایک خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا "اِنَّ اَوَّلَ بیتٍ وُضع للناس لَلَّذِی بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ"

غرض بعثت کے بعد جب قدرت کے اعجاز نما ہاتھوں نے عام الفیل میں آپ کی ولادت کا راز سربستہ آشکارا کردیا تب دنیا نے یہ سمجھا کہ ابرہۃ الاشرم اور اس کے لشکر سے کعبۃ اللہ کی یہ حفاظت اس لیے تھی کہ وہ وقت قریب آپہنچا جب دوبارہ یہ مقدس مقام خدائے واحد کی عبادت اور توحیدِ خالص کی مرکزیت کا شرف حاصل کرنے والا ہے پس جو طاقت بھی اس مقصد عظمیٰ سے متصادم ہوگی خود ہی پاش پاش ہوکر رہ جائے گی۔

ابرہہ عیسائی تھا اور اہل عرب (قریش) مشرک، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کی بربادی قریش کی نصرت و حمایت کے لیے تھی، نہیں، بلکہ اس لیے یہ سب کچھ ہوا کہ مشیت الٰہی کے خلاف ابرہہ کی خواہش تھی کہ یمن (صنعاء) میں جو خوبصورت گرجا (القلیس) باپ، بیٹا، روح القدس (تثلیث) کے فروغ دینے کو بنایا گیا تھا مرکزِ توحید "کعبۃ اللہ" کی جگہ وہ مرجع خلائق بنے اور اس مقصد کی خاطر اُس نے انہدام کعبہ کے لیے لشکر کشی کی" ادھر قریش بلکہ سارا عرب اُس کی مقاومت سے عاجز و درماندہ تھا، ابرہہ تیرے

تمام جنگی اسلحہ اور سروسامان کا مالک اور قریش اُن سب سے یکسر محروم، تب غیرتِ حق حرکت میں آئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر مشیت الٰہی سے ٹکرانے والا خود ہی فنا کے گھاٹ اتر گیا اور محورِ توحید "کعبہ" خدائی حفاظت کے سایہ میں اُسی طرح قائم رہا "ان فی ذلك لعبرۃ لمن یخشیٰ۔ بلاشبہ اس بات میں بڑی ہی عبرت ہے اُس شخص کے لیے جو خوفِ خدا رکھتا ہے"۔ قرآنِ عزیز نے سورۂ الفیل میں اسی حقیقت کو معجزانہ اسلوب کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ	(اے پیغمبر!) کیا تجھے نہیں معلوم کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں
الْفِيْلِ ○ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ	والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا اُن کے فریب کو ناکام
تَضْلِيْلٍ ○ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا	نہیں بنا دیا؟ اور اُن پر فوج در فوج پرند بھیج دیے، وہ
اَبَابِيْلَ ○ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ	پرند اُن پر کنکریاں پھینکتے تھے، پھر (خدا نے) اُن ہاتھیوں
سِجِّيْلٍ ○ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ○	والوں کو کھائے ہوئے بھس کی مانند کر دیا۔

بہرحال عام الفیل، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا سال ہے اور یہ مشہور واقعہ آپ کے ظہور قدسی کا سب سے بڑا قریبی "نشان" ہے اور یہ حقیقت اُس شخص پر بخوبی عیاں ہے۔ لمن کان لہ قلبٌ او القی السمع وھو شھید جس کے پاس (قبول حق کے لیے) دل ہے یا وہ حاضر دماغی کے ساتھ امر حق کی جانب کان لگائے ہوئے ہے"۔

تاریخ ولادت کی تحقیق تمام اربابِ تاریخ و سیر کا تین باتوں پر کلی اتفاق ہے، ایک یہ کہ ولادت کا سال "عام الفیل" تھا چنانچہ سیرت و مغازی کا مشہور امام محمد بن اسحٰقؒ اور جلیل القدر محدث و مورخ حافظ ابن کثیرؒ جمہور کی یہی رائے نقل کرتے ہیں۔

وکان مولدہ علیہ الصلوٰۃ والسلام	جمہور کے نزدیک یہی قول مشہور ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ
عام الفیل وھذا ھو المشھور عن	والسلام کی ولادت عام الفیل میں ہوئی، اور
الجمھور وقال ابراھیم بن منذر	ابراہیم بن منذر کہتے ہیں کہ اس بات میں کسی
الحزامی وھو الذی لا یشك فیہ	عالم کو بھی شک و شبہ نہیں کہ نبی علیہ السلام

احد علمائنا انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام وُلِد عام الفیل[1] عام الفیل میں پیدا ہوئے۔

والمجتمع علیہ انہ علیہ السلام وُلِدَ عام الفیل[2] اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عام الفیل میں پیدا ہوئے۔

اور دوسری اور تیسری بات یہ کہ آپ کی ولادت ربیع الاوّل کے مہینہ میں دوشنبہ (پیر) کے دن صبح صادق کے وقت ہوئی۔

وھذا مالا اختلاف فیہ انہ وُلِدَ صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاثنین .... ثم الجمھور علی ان ذٰلک کان فی شھر ربیع الاوّل[3]	اور اس پر کلی اتفاق ہے کہ آپ دوشنبہ (پیر) کے دن پیدا ہوئے ...... پھر جمہور کا یہی فیصلہ ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔
قال ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) ان اعرابیا قال یا رسول اللہ ما تقول فی صوم یوم الاثنین فقال ذٰلک یوم وُلِدتُ فیہ و اُنزل علیّ فیہ[4]	ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: گاؤں کے ایک آدمی نے کہا، اے اللہ کے رسول! آپ پیر کے دن کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا "یہ وہ دن ہے جس میں میری ولادت ہوئی اور جس میں مجھ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی"

لیکن اہل سیر و تاریخ اس بات میں مختلف الرائے ہیں کہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی؟ عوام میں تو مشہور قول یہ ہے کہ ۱۲۔ ربیع الاوّل تھی اور بعض کمزور روایات اس کی پشت پر ہیں اور اکثر علماء ۸ ربیع الاول کہتے ہیں لیکن صحیح اور مستند قول یہ ہے کہ ۹۔ ربیع الاول تاریخ ولادت ہے۔ اور مشاہیر علماء تاریخ و حدیث اور جلیل المرتبہ ائمۂ دین اسی تاریخ کو "صحیح" اور "اثبت" کہتے ہیں۔ چنانچہ حُمیدی، عقیل، یونس بن یزید، ابن عبداللہ، ابن حزم، محمد بن موسیٰ خوارزمی، ابو الخطاب ابن دحیہ، ابن تیمیہ

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۱ [2] ایضاً جلد ۲ ص ۲۶۱ [3] ایضاً جلد ۲ ص ۲۶۱ [4] مسلم

ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، شیخ بدرالدین عینی جیسے معتمد علماء کی یہی رائے ہے۔

محمود پاشا فلکی نے جو قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجم گذرا ہے ہیئت کے مطابق جو زائچہ اس غرض سے مرتب کیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ سے اپنے زمانہ تک کے کسوف و خسوف (سورج گرہن و چاند گرہن) کا صحیح حساب معلوم کرے پوری تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سن ولادت باسعادت میں کسی حساب سے بھی دوشنبہ (پیر) کا دن ۱۲۔ ربیع الاول کو نہیں آتا بلکہ ۹۔ ربیع الاول ہی کو آتا ہے اس لیے بلحاظ قوت و صحتِ روایات اور باعتبار حسابِ ہیئت و نجوم ولادتِ مبارک کی مستند تاریخ ۹۔ ربیع الاول ہے نہ کہ ۱۲۔ ربیع الاول[1]۔

اصحاب فیل کے واقعہ سے کس قدر عرصہ بعد ولادت ہوئی؟ متعدد اقوال میں سے مشہور قول یہ ہے کہ پچاس دن بعد ظہورِ قدسی ہوا ہے

وقیل بخمسین یوماً	ایک قول یہ ہے کہ اصحاب فیل کے واقعہ سے پچاس دن بعد
وھو اشھر[2]	ولادت باسعادت ہوئی اور یہی قول زیادہ مشہور ہے۔

نسب مبارک نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) عربی النسل ہیں اور عرب کے معزز قبیلہ قریش کی سب سے زیادہ مقتدر شاخ بنی ہاشم سے ہیں، قرآن عزیز نے اہلِ عرب کو خطاب کرتے ہوئے متعدد مقامات پر آپ کے عربی نژاد ہونے کا ذکر کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ)	(خدا) وہ ذات ہے جس نے اُمیین (ان پڑھ لوگوں) میں سے ہی ایک رسول بھیجا جو اُن پر اُس کی آیات پڑھتا اور اُن کا تزکیہ کرتا اور اُن کو الکتاب (قرآن) اور حکمت سکھاتا ہے۔
لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ (توبہ)	بلاشبہ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول (محمد) آیا
إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ	جبکہ بھیجا اللہ نے اُن میں ایک رسول جو (بلحاظ نسب)

[1] ۸، اور ۹، کا اختلاف حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ مہینے کے ۲۹، اور ۳۰، کے اختلاف پر مبنی ہے اور جبکہ حساب سے ثابت ہو گیا کہ صحیح تاریخ ۲۰۔ اپریل ہی تو ۸، کے متعلق تمام اقوال دراصل ۹، کی تائید میں پیش ہو سکتے ہیں۔ [2] فتح الباری جلد ۹ و تاریخ...

اَنْفُسِہِمْ (آل عمران) ان ہی میں سے ہے۔

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ اسی طرح ہم نے آپکو قرآن بزبان عربی اتارا ہے تاکہ (اے محمد صلی
أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا اللہ علیہ وسلم) تم مکہ والوں اور ان کے گرد وپیش کے بسنے والوں
(شوریٰ) کو (برائیوں سے) ڈراؤ۔

ءَأَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ کیا (اس قرآن کو سکھا دیتا ہے کوئی عجمی اور حالت یہ ہے
عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ۔ (النحل) کہ یہ واضح عربی زبان ہے۔

ماہرینِ انسابِ عرب کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کی نسل سے ہیں اس لیے کہ قریش بغیر کسی اختلاف رائے کے عدنانی ہیں اور عدنان کے اسمٰعیلی ہونے میں دو رائے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

عرب کے علم الانساب کے مشہور عالم محدث ابن عبد البر تحریر فرماتے ہیں۔

واجمعوا ان محمدًا رسول اللہ صلی اور علماءِ انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ محمد رسول اللہ
اللہ علیہ وسلم من ولد عدنان صلی اللہ علیہ وسلم عدنان کی نسل سے ہیں اور عدنان
وان عدنان من ولد اسمٰعیل وان اسمٰعیل (علیہ السلام) کی نسل سے ہے اور ربیعہ اور
ربیعۃ ومضر من ولد اسمٰعیل[1] مضر بھی اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد ہیں۔

علماءِ انساب نے نسب نامہ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے۔

محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

اور والدہ کی جانب سے آپ کا نسب نامہ کلاب پر جا کر پدری سلسلۂ نسب کے ساتھ ملتا ہے یعنی آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب، کلاب کو حکیم بھی

[1] القصد والامم ص ۲۲ والانباہ علی قبائل الرواۃ ص ۴۶۔

بھی کہتے ہیں۔

البتہ عدنان اور حضرت اسمٰعیل کے درمیان سلسلہ کے ناموں سے متعلق ماہرین انساب کی آرار مختلف ہیں[1]، اس لیے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے متعلق ارشاد فرماکر "کذب النسابون۔ نسب بیان کرنے والوں نے غلط بیانی کی ہے" کسی رائے کی توثیق نہیں فرمائی اور اپنے سلسلۂ نسب کے متعلق صرف اس قدر ارشاد فرمایا ہے۔

ان اللہ اصطفیٰ کنانۃ من ولد اسمٰعیل واصطفیٰ قریشا من کنانۃ واصطفیٰ من قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم[2]	اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل (علیہ السلام) کی نسل میں سے کنانہ کو ممتاز بنایا اور کنانہ میں سے قریش کو عزت و عظمت بخشی اور قریش میں سے بنی ہاشم کو امتیاز عطا فرمایا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔

گویا اس طرح سلسلۂ نسب کے صرف اُن حصوں کی تصدیق فرمائی جو ماہرین انساب کے درمیان بلا خلاف مسلّم تھے۔

اسلام نے نسبی تفاخر اور اُس پر مبنی سماجی رسم و رواج کو بہت بڑا گناہ اور حرام قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے یہاں فضیلت کا معیار "ایمان اور عمل صالح" ہے اور وہاں حسب و نسب کی کوئی پرسش نہیں ہے نیز نسبی تفاخر اسلام کے بنیادی قانون "اخوت اسلامی" کے قطعاً منافی ہے اس لیے اسلام کے اجتماعی دستور میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

تاہم واقعاتی طور پر تاریخ یہ پتہ دیتی ہے کہ ہمیشہ انبیاء و رسل (علیہم السلام) اپنی قوم اور اپنے ملک کے معزز خاندان میں سے ہوتے رہے ہیں، حکمتِ خداوندی کا یہ فیصلہ غالباً اس لیے ہوا کہ قوموں اور ملکوں کے رسم و رواج اور نسبی تفاخر کے خلاف اُن کی دعوتِ حق اور اُن کا پیغامِ صداقت کہیں ذاتی مفاد کے لیے نہ سمجھ لیا جائے اور اس طرح اس کا

---

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ [2] مسلم

اخلاقی پہلو کمزور نہ ہوجائے مثلاً کسی سماجی زندگی میں ذات پات کی تقسیم اور کاسٹ سسٹم اس طرح موجود ہو کہ اُس کی وجہ سے بعض انسان بعض کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے ہیں تو اگر اُس قوم یا ملک میں کوئی پیغمبر اُس خاندان سے تعلق رکھتا ہوتا جس کو ملکی اور قومی رواج نے نیچ اور پست اقوام کا لقب دے رکھا ہے، ایسی حالت میں اس ظلم صریح اور باطل کوشی کے خلاف اُس پیغمبر کی صدائے حق اتنی سرعت کے ساتھ کامیاب نہ ہوتی جس قدر اُس حالت میں ہوسکتی ہے جبکہ وہ خود اُس ملک و قوم کے اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہو، اور صرف ایک اسی خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اُس کے پیغامِ حق کی تمام اصلاحات میں یہ فرق ضرور نظر آئیگا۔

بہرحال یہ حکمت ہر مقام اور ہر موقعہ پر مفید ہو یا نہ ہو عرب کے حالات و واقعات کے لیے از بس مناسب اور مفید ثابت ہوئی چنانچہ صدائے اسلام نے جب اپنی انقلابی اور اصلاحی گرج سے روحانیت کی خفتہ کائنات میں تہلکہ ڈال دیا تو ایک جانب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اہل عرب کو یہ سُنایا کہ جہاں تک خاندانی امتیاز کا تعلق ہے تو میں قریشی بھی ہوں اور ہاشمی بھی اور یہ امتیاز تمہارے نقطۂ نظر سے بہت بلند ہے مگر میری نگاہ میں اس کی حیثیت صرف یہ ہے " ولا فخر۔ یہ کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں ہے" اور دوسری جانب نسبی تفاخر کی بنیادوں کے انہدام اور مساواتِ انسانی کی دعوتِ عام کے لیے اس خدائی فرمان کا اعلان کر کے کائناتِ انسانی کی تمام تاریک ذہنیت کے خلاف انقلابِ عظیم برپا کردیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ	لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے (یعنی
مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ	تخلیق انسانی کی ابتدا آدم اور اُس کی بیوی حوا علیہما السلام
شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا	سے ہوئی ہے) اور تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں صرف اس لیے
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ	بانٹ دیا ہے کہ آپس میں (صلۂ رحمی کے لیے) پہچان اور معرفت

اَتْقٰکُمْ (الحجرات) کا طریقہ قائم کرلو (اور اصل یہ ہے کہ) بلاشبہ اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو تم میں سے پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے والا ہے۔

اور حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب آپ ہزارہا صحابہ کی موجودگی میں وداعی پیغام سُنا رہے اور اسلام کے بنیادی اصول کے استحکام کے لیے اہم وصایا پیش فرما رہے تھے اس حکم خداوندی کی تائید میں یہ انقلاب آفرین پیغام بھی ارشاد فرمایا۔

ان اللہ یقول یا یھا الناس	اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "اے افرادِ نسل انسانی!
انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ و	بلاشبہ ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور
جعلنکم شعوبا و قبائل	ہم نے تمھارے درمیان خاندان اور قبائل بنا دیے
لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ	ہیں تاکہ (صلۂ رحمی کے لیے) تعارف پیدا کرو، بلاشبہ
اتقکم فلیس لعربی علی	تم میں اللہ کے نزدیک وہی برگزیدہ ہے جو زیادہ متقی
عجمی فضل ولا لعجمی علی	(نیک کردار) ہے پس خوب یاد رکھو کہ نہ عربی کو عجمی پر
عربی فضل ولا لاسود علی	کوئی فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی برتری حاصل
ابیض فضل ولا لابیض علی	ہے، نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے اور نہ گورے
اسود فضل الا بالتقوی یا	کو کالے پر کوئی بزرگی، بلکہ ان سب کے لیے فضیلت
معشر قریش لا تجیئوا بالدنیا	کا معیار صرف تقویٰ (نیک عملی) ہے۔ اے گروہ قریش!
تحملونھا علی رقابکم و تجئ	ایسا نہ ہو کہ تم (خاندانی فخر کے زعم باطل کی وجہ سے
الناس بالآخرۃ فانی لا اغنی	قیامت میں) دنیا کو کاندھے پر لاد کر لاؤ اور دوسرے
عنکم من اللہ شیئا [1]	لوگ (نیک عملی کی بدولت) آخرت کا سامان لیے

آئیں، واضح رہے کہ تمھارے محض قریشی ہونے کی وجہ سے میں تم کو خدا کے فیصلہ سے قطعاً بے پرواہ نہیں بنا سکتا (خدا کے یہاں تو صرف عمل ہی کام

[1] جمع الفوائد جلد ۱ از معجم طبرانی کبیر

اور ایک مرتبہ نسبی فخر کے خلاف تبلیغ حق کرتے ہوئے اس کو "جاہلی تعصب" فرمایا اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کے لیے سخت تاکید فرمائی۔ ارشاد فرمایا۔

انّ اللہ تعالیٰ قد اذھب عنکم	اللہ تعالیٰ نے دعوت اسلام کے ذریعہ تمہارے درمیان
عبیۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالاٰباء	سے جاہلیت کے تعصب اور نسبی فخر کو مٹا دیا ہے اور اب انسان
وانما ھو مؤمن تقیّ اوفاجر شقیّ	یا نکوکار مومن ہے اور یا بدکار پاپی، سب انسان آدم کی
الناس کلھم بنو آدم وآدم	اولاد ہیں اور آدم کی پیدایش مٹی سے ہوئی ہے پھر فخر
خُلق من تراب[1]	کا کیا موقعہ ہے؟

اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے دورِ اولیں میں نہ ذات پات کا کوئی سوال باقی رہ گیا تھا اور نہ خاندانی تفاخر کی کوئی حیثیت سمجھی جاتی تھی اور اس صدائے حق نے غلاموں تک کو سروری بخشدی تھی، چنانچہ اسامہ بن زید کی سالاریِ لشکر اور امامتِ جہاد، بلال حبشیؓ کے لیے صدیق اکبر کا یہ ارشاد "سید ہذہ الامۃ۔ اس امت کا سردار" قریش اور ہاشمی صحابہ کے درمیان ایک عجمی انسان ابو ہریرہ کی جلالت وعظمت، صہیب رومی اور سلمان فارسی کی رفعت وبلندیِ مرتبت اور اسی قسم کے ہزاروں واقعات تھے جو چشم فلک نے آنکھوں سے دیکھے اور تاریخ نے آغوشِ صفحات میں محفوظ رکھے ہیں مگر وائے بدبختی کہ بیرونی اثرات اور عرب سے باہر عجمی ماحول نے ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کو پھر اُسی لعنت سے دوچار کر دیا جس کا مرثیہ اقبال مرحوم کو اس طرح کرنا پڑا۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں — کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ فرما کر "انما ھو مومن تقی اوفاجر شقی" اس مسئلہ کو اس درجہ صاف کر دیا تھا کہ مسلمان کی زندگی میں کبھی اس کے برعکس زندگی کا کوئی اثر پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا، ذات پات نو صرف اس لیے تھیں کہ چھوٹے چھوٹے

---

[1] ابوداؤد، ترمذی۔

حلقوں میں باہمی تعارف، صلہ رحمی اور حسن سلوک کا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ بآسانی ہوسکے ورنہ کیسی ذات؟ کہاں کا خاندان؟ کون برادری؟ یہاں تو صرف دو ہی فطری اور نیچرل تقسیمیں ہیں یا "نکوکار" یا "بدکار" کسی قوم، کسی خاندان اور کسی ملک کا انسان ہو اگر "سچی خداپرستی اور نکوکاری" رکھتا ہے تو وہ سب ایک برادری اور ایک قوم ہیں اور اگر "مشرک و کافر اور بدکار و پاپی" تو یہ سب ایک گروہ اور ایک ٹولی ہیں۔

یتیمی | خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے والد ماجد کا نام عبداللہ اور والدہ ماجدہ کا آمنہ تھا، ابھی آفتابِ ہدایت نے کائناتِ ہست و بود میں طلوع نہیں کیا تھا اور حضرت آمنہ کی مشکوٰۓ معلّی اس ودیعت کی امین ہی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا ارباب سیرت کہتے ہیں کہ حضرتِ عبداللہ ایک قافلۂ تجارت کے ساتھ شام تشریف لے گئے تھے، واپسی میں جب قافلہ مدینہ (یثرب) پہنچا تو وہ بیمار ہوگئے اور اس لیے اپنے ننہال بنی نجار میں قیام پذیر رہے، قافلہ جب مکہ پہنچا تو عبدالمطلب نے بیٹے کے متعلق دریافت کیا، قافلہ نے اُن کی بیماری اور مدینہ میں قیام کا واقعہ کہہ سنایا، تب عبدالمطلب نے اپنے بڑے لڑکے حارث کو دریافت حال کے لیے مدینہ بھیجا، حارث جب مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ نے ایک ماہ چند روز بیمار رہ کر داعیِ اجل کو لبیک کہہ دیا، واپس آکر جب حارث نے باپ کو حادثہ سے اطلاع دی تو عبدالمطلب اور تمام خاندان کو اس صدمۂ جانکاہ نے بے حال کر دیا کیونکہ عبداللہ اپنے باپ اور بھائیوں کے بہت چہیتے تھے۔

غرض جب ولادتِ باسعادت ہوئی تو اس سے قبل ہی آپ کو یتیمی کا شرف حاصل ہوچکا تھا، چنانچہ قرآن نے آپ کی یتیمی، دنیوی وسائل سے محرومی کے باوجود آغوشِ رحمتِ پروردگار میں نشو ونما پاکر ہادیِ عالم بننے کا معجزانہ اختصار کے ساتھ سورہ والضحیٰ میں تذکرہ کیا ہے۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ (اے پیغمبر!) کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا پھر (اپنی آغوشِ رحمت
وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ میں) جگہ دی اور کیا تجھ کو ناواقف نہیں پایا پھر تجھ کو کائنات
وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝ کی ہدایت کے لیے ہدایت مآب بنایا اور کیا تجھ کو (ہر قسم کے
وسائل سے محروم و) محتاج نہیں پایا پھر تجھ کو (ہر قسم کی سروری
دے کر) غنی بنا دیا۔

بقول حضرت ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) ان آیات میں عجیب و غریب اعجاز اور اسلوب بیان کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے تمام ارتقائی مدارج کا تذکرہ ہے، تم سمجھتے ہو کہ "فآوی" کے معنی یہ ہیں کہ پروردگارِ عالم نے آپ کو رہنے سہنے کی صورت پیدا کر دی یا آپ کو بے یار و مددگار نہیں رہنے دیا، یہ بھی صحیح ہے مگر اس کلام ربانی کی اصل روح یہ ہے کہ اُس نے ذاتِ اقدس کو ہر قسم کے مادی اسباب و وسائل سے بے پرواہ رکھ کر اپنی آغوشِ رحمت میں لے لیا اور آپ کے نشو و ارتقاء کو خاص اپنی تربیت میں کامل و مکمل کیا[۱]، اور "وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ" کی تفسیر کو خود قرآن ہی نے دوسری جگہ روشن کر دیا ہے مثلاً سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے "امر" کی روح کا القاء
رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ کیا (حالانکہ اس سے پہلے) نہ تو کتاب (قرآن) سے واقف
تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ تھا اور نہ ایمان (کی حقیقت) سے لیکن ہم نے اس کو "نور"
وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي (روشنی) بنا دیا، ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں
بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ (اُس کی صلاحیت و استعداد کے پیشِ نظر) اس کے ذریعہ ہدایت دیتے ہیں

اور آیت "عَائِلًا فَأَغْنَىٰ" میں دنیوی احتیاج و غنیٰ کا ذکر روحِ کلام نہیں ہے بلکہ اس جانب اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قربت و کمال کا وہ مرتبۂ عظمیٰ عطا فرمایا ہے کہ مادی اور روحانی ہر قسم کی احتیاج سے بالاتر بنا کر صفاتِ حمیدہ اور اخلاقِ کریمانہ کی مثلِ اعلیٰ "غنی" سے بہرہ ور

[۱] تفسیر ابن کثیر

بنا دیا یہی وہ غنیٰ ہے جس کا خود ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس طرح ذکر فرمایا ہے۔

لیس الغنیٰ عن کثرۃ العرض — غنیٰ مال داری کی بہتات کا نام نہیں حقیقی غنیٰ نفس کا ماسوی اللہ

ولکن الغنیٰ غنَی النفس۔ — سے مستغنی ہو جانا ہے

عمر مبارک ابھی چھ سال ہی کی تھی کہ آپ کی والدہ ماجدہ آمنہ کا بھی انتقال ہوگیا، بی بی آمنہ آپ کو آپ کے ننہال (مدینہ) میں لے کر گئی تھیں، واپسی میں مقام ابوا میں بیمار ہوگئیں اور چند روز علیل رہ کر وہیں انتقال فرمایا، اور سن مبارک ابھی آٹھ منزلیں ہی طے کر پایا تھا کہ دادا عبد المطلب نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا، اور اس طرح عہد طفلی ہی میں وسائلِ تربیت اور دنیوی اسباب کفالت سے محرومی نے گویا مشیت الٰہی کی جانب سے یہ اعلان کردیا کہ جس ذات قدسی صفات کو خدائے واحد نے خالص اپنی تربیت کے لیے منتخب کرلیا ہے کیسے ممکن ہے کہ اس کو دنیوی اسباب و وسائلِ تربیت کا محتاج بنائے؟

اللہ تعالیٰ نے ایک یتیم و یسیر اور مادی وسائل سے محروم ہستی کو اپنے لیے چن کر کس طرح اپنی ربوبیتِ کاملہ کا مظہر بنایا سورۂ انشراح میں اس حقیقت کو اچھوتے انداز میں بیان فرمایا ہے:۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝	کیا ہم نے (قبول حق و صداقت کے لیے) تیرا سینہ نہیں کھول دیا، اور
وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝	معرفت الٰہی کی حقیقی طلب اور قوم اور کائنات انسانی کی بے راہ روی
الَّذِیْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝	پر ان کی ہدایت کی تڑپ کا) وہ بوجھ ہم نے تجھ سے دور کردیا جس نے
وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝	تیری کمر توڑ رکھی تھی، اور ہم نے تیرے ذکر کو کائناتِ ہست و بود میں بلند کردیا۔

"شرح صدر" یہ کہ اب وسائلِ تعلیم و تعلم کے ذریعہ حاصل ہونے والے تمام علوم و معارف اس عطاءِ الٰہی اور وہبی معرفت و علم کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئے ہیں جس کی سمائی کے لیے ہم نے تیرے سینہ کو کھول دیا ہے، اب علوم و معارف کے بحر ناپیدا کنار بھی ہوں تو تیرے سینہ کا دامن وسیع ان کے لیے کافی و وافی ہے، اور اسی "شرح صدر" نے معرفتِ الٰہی کے تمام

پوشیدہ گنجینے تجھ پر وا کر دیے اور وہ سارا بوجھ تیرے سینہ پر سے ہٹ گیا جس نے تیری کمر کو اس لیے شکستہ کر رکھا تھا کہ قلبی جستجو اور دلی تڑپ کے باوجود تو اس سے قبل نہیں جانتا تھا کہ معرفتِ الٰہی کی راہِ مستقیم کون سی ہے اور گم کردہ راہوں کی راہنمائی کی سبیل کیا ہے؟ مگر اب یہ سب کچھ روشن ہو جانے کے بعد ہم نے عالمِ بالا و پست میں تیرے ذکر کو وہ بلندی اور رفعت عطا فرمائی کہ تیرا مقام "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" قرار پایا، چنانچہ نام احمد و محمد ہے اور مقام، مقام محمود، سورۂ الحمد وظیفۂ حیات ہے اور لواء حمد قیامت میں طغرائے امتیاز

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ ید بیضا داری   آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہی نہیں بلکہ "قرآن کی تجدیدِ دعوت" کے ذریعہ تیری صدائے حق نے اعتقاد و عمل اور ایمان و کردار کی راہ سے تمام دنیا کے نظامہائے اجتماعی و سماجی میں جو عظیم الشان انقلاب بپا کر دیا اور سوسائٹی کے ہر شعبہ کی پرانی اور فرسودہ بساط کو الٹ کر جو نئی بساط بچھا دی اس نے تیرے ذکر کو وہ رفعت و برتری عطا کی کہ کوئی قوم، کوئی مذہب اور کوئی جماعت کسی نہ کسی شکل میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادتِ الٰہی کا ذوق

عہد طفولیت سے ازدواجی زندگی کے ابتدائی مراحل تک کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ کتب سیرت و حدیث میں منقول ہیں، اس لیے وہیں لائق مراجعت ہیں، مختصر یہ کہ دادا عبدالمطلب کے انتقال کے بعد آپ کے چچا ابو طالب آپ کے ساتھ بہت اُنس رکھتے تھے اور زندگی بھر آپ کی رفاقت کا حق ادا کرتے رہے، انبیاء و رسل کی سنت کے مطابق آپ نے اپنی روزی کا بار کسی پر نہیں ڈالا اور دنیوی مشاغل میں آپ نے بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی، شام کے مشہور تجارتی شہر بصریٰ میں بھی اس غرض سے تشریف لے گئے اور پچیس سال کی عمر میں یہی سفر حضرت خدیجۃ الکبریٰ (رضی اللہ عنہا) سے عقد کا باعث ہوا، آپ خدیجہؓ کا

مال تجارت مضاربت پر بصریٰ کی منڈی میں لے گئے، خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی رفیق سفر تھا، اس درمیان میں آپ کی صداقت و امانت ایک یہودی راہب کی بشارت اور بیش بہا منافع تجارت کا جو تجربہ اور مشاہدہ کیا تھا میسرہ نے وہ سب حضرت خدیجہؓ سے کہہ سنایا۔ چنانچہ یہی تاثر ازدواجی رشتہ کا باعث بن گیا۔

اب زندگی میں ایک اور انقلاب ہوا کہ آپ کو خلوت گزینی کی رغبت ہوئی اور غارِ حرا میں روز و شب بسر ہونے لگے، بت پرستی سے شروع ہی میں نفرت تھی اس لیے کبھی نہ کسی صنم کے آگے سر جھکایا اور نہ کسی ایسی مجلس میں شرکت فرمائی جو صنم پرستی کے میلے کہلاتے تھے، اب خلوت میں فطرتِ سلیم جس طرح راہنمائی کرتی خدائے واحد کی عبادت کرتے مگر ایک خلش سینہ میں ایسی تھی جو اس حالت میں بھی بے چین ہی رکھتی، اکثر یہ سوچ کر تڑپ جاتے تھے کہ میری قوم خصوصاً اور دنیا انسانی عموماً کس طرح خدائے واحد کو چھوڑ کر صنم پرستی اور مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور یہ کہ اخلاق کی دنیا کس طرح اُلٹ گئی ہے آخر وہ کونسا نسخہ کیمیا ہے جو اس حالت میں انقلاب پیدا کر دے اور سچی خدا پرستی اور نیک عملی پھر ایک مرتبہ اپنی نمود دکھلائے۔

یہی جذبات و تاثرات تھے جو قلبِ مضطرب میں موجزن تھے اور خلوتکدہ حرا میں انہی کیفیات کے ساتھ ذاتِ اقدس مصروفِ یادِ الٰہی رہتی اور جب کئی کئی دن اس طرح گذر جاتے تو کبھی حضرت خدیجہ حاضر ہو کر آذوقہ حیات دے جاتیں اور کبھی خود بنفس نفیس جا کر چند روز کا سامانِ خورونوش لے آتے اور حرا میں پھر مشغولِ عبادت ہو جاتے، چنانچہ چودہ صدیاں گذرنے کے بعد بھی آج حرا زبان سے اس کیف آگیں منظر کا شاہد ہے جس کا لطف اُس نے برسوں اُٹھایا ہے، مشہور محدث و مورخ حافظ عمادالدین بن کثیر نے اس واقعہ کو ان مختصر الفاظ میں حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

وانما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم　　اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روز و شب میں خلوت نشیں

یحب الخلاء والانفراد عن قومہ لما	ہو گئے تھے اور قوم سے الگ تنہائی میں وقت گذارتے
یراھم علیہ من الضلال المبین	تھے کیونکہ وہ قوم کی اس کھلی گمراہی کو دیکھ کر کہ وہ بت
من عبادۃ الاوثان والسجود	پرستی میں مبتلا اور بتوں کے سامنے سجدہ گذار ہو گئے
للاصنام وقویت محبتہ للخلوۃ	تھے اور جوں جوں آپ پر وحی الٰہی کے نزول کا زمانہ
عند مقاربۃ ایحاء اللہ الیہ	قریب ہوتا جاتا تھا (مشیت الٰہی سے) اسی قدر آپ کی
صلوات اللہ وسلامہ علیہ[1]	خلوت پسندی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا" صلوات اللہ

وسلامہ علیہ۔ اُس ذات اقدس پر خدا کی رحمتیں اور سلامتی نازل ہو"

بہر حال یہی وہ خلوتکدۂ عبادت تھا جہاں ذات اقدس پر سب سے پہلے "وحی الٰہی" کا نزول ہوا اور بالترتیب سورۂ "اقرأ" اور سورۂ "مدثر" کی چند آیات سنانے کے لیے بشیر و نذیر بنا دیا۔

حقیقت وحی؟ یہ "وحی" و "تنزیل" کیا ہے جس کو "نبوت و رسالت" کے خصائص میں سے کہا جاتا ہے اور یہ "منصب نبوت و رسالت" کیا شئی ہے جس کا "وحی و تنزیل" کے ساتھ اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ منطقی اصطلاح میں "لازم و ملزوم" کہا جا سکتا ہے، اور ان اصطلاحی گفتگو سے قطع نظر سادہ الفاظ میں اس سوال کو کیوں نہ اس طرح پیش کر دیا جائے کہ کائنات انسانی کے ہر معاملہ میں جبکہ حسن و قبح کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے فطرت نے ہم کو "جوہرِ عقل" عطا کر دیا ہے اور انسان کے اندر کی یہ سرچ لائٹ (Search Light) ہر ایک مادی شعبۂ حیات میں راہنمائی کرتی ہے تو پھر "رسول و نبی کے ذریعہ پیغام الٰہی" کی حاجت کیا ہے! اور عالمِ روحانیات کے مسائل اور معرفت الٰہی کے حصول میں "تنہا عقل" ہی کیوں کافی نہیں سمجھی جاتی؟ یہی وہ سوال ہے جس کے حل ہو جانے پر "وحی" اور "نبوت" دونوں کی حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جا سکتی ہے۔

اس سوال کو حل کرنے کے لیے پہلے ایک تمہید قابلِ توجہ ہے اور دراصل وہی

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۳ ص ۵

اس مسئلہ کی کلید ہے۔

تم جب کائنات کے وجود و خلق کو عمیق فکر و نظر سے مشاہدہ کرتے ہو تو حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنی ربوبیتِ کاملہ کے فیض و عطا، ہر شئے کو جس طرح وجود بخشا اور خلق کیا اُس کو "ہدایت" (راہنمائی) سے بھی سرفراز کیا ہے اور اگر یہ نہ ہوتی تو کائنات کا وجود و خلق مہمل اور بیکار ہو جاتا، کیونکہ یہی "ہدایت" ہر ایک جاندار پر زندگی اور معیشت کی راہ کھولتی اُن کی حیات کو مفید بناتی اور ضروریاتِ حیات کی طلب و حصول میں راہنمائی کرتی ہے، اور یہی ناموسِ فطرت کا وہ فیضِ عام ہے جس کے بغیر کوئی مخلوق بھی سامانِ حیات اور وسائل تربیت سے استفادہ نہیں کر سکتی اور نہ وجود و حیات کی یہ گرمجوشیاں ہی ظہور پذیر ہو سکتیں۔

"مچھلی کے جائے کو کن تیرائے" اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے، وہ جب اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں تو خود بخود پانی میں تیرنے لگتے اور اپنی غذا کی جستجو میں مصروف ہو جاتے ہیں، پرندوں کے بچے انڈے سے باہر آتے ہی ہوا میں اُڑنے کی کیوں کوشش کرتے نظر آتے ہیں، حیوان اور انسان کا بچہ جب اس کارگاہِ ہستی میں قدم رکھتا ہے تو بھوک و پیاس دور کرنے کے لیے ماں باپ سے تعلیم حاصل نہیں کرتا بلکہ خود بخود ماں کے سینہ پر مُنہ رکھ کر غذا کے خزانہ سے دودھ کیوں چوسنے لگتا ہے، آخر یہ سب کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ تم کہتے ہو کہ یہ فطرت کا قانون ہے جو ان سب کو "فیضِ ہدایت" سے فیضیاب کر کے مخلوق کی نشو و نما کا سامان مہیا کرتا ہے، یہ "ہدایت" ہے جو ہر حرکتِ حیات میں اپنا کام کر رہی ہے اور یہ "فیضِ ہدایت" ہے جو خالق کائنات کی جانب سے مخلوقات کی نشو و نما کے لیے "فیضِ عام" ہوا ہے۔

لیکن ابھی وسعتِ نظر کے قدم کو آگے بڑھنے دیجیے اور قدرتِ حق کے مشاہدہ کے لیے تیز گام ہو جیے تو کارگہِ قدرت اور نوامیسِ فطرت کی کرم فرمائیاں اور زیادہ جلوہ آرا نظر

بخشی اور تم دیکھو گے کہ یہ "ہدایت" بھی دوسری موجودات کی طرح ارتقائی درجات رکھتی ہے اور ہر ایک درجہ اپنی افادیت کی نمود جدا رکھتا ہے۔ چنانچہ اس راہ میں سب سے پہلے "وجدان کی ہدایت" سامنے آتی ہے اور یہ "طبیعت حیوانی کے فطری اور باطنی الہام" کا نام ہے، یہی وہ ابتدائی مدد ہے جو بچہ کو قید ہستی میں آنے کے فوراً بعد ہی کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر اس کی غذا کا پتہ دیتا اور اسباب حیات کے لیے معلم بنتا ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو انسان کی ارتقائی منزل پر پہنچ کر "ضمیر کی آواز" "اندر کی صدا" بن کر حقائق کی معرفت کے لیے خارجی دلائل و براہین سے زیادہ قوی حجت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد "ہدایت حواس" کا درجہ ہے یہ پہلے درجہ سے بلند ہے اور اس کی عطا و بخشش سے ہر ایک ذی روح دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے، چھونے کی قوتیں حاصل کرتا اور ان کے ذریعہ کائنات عالم میں اپنی افادیت اور استفادہ دونوں کو ترقی دیتا ہے۔

قدرتِ حق کی جانب سے یہ دونوں درجے انسان اور حیوان دونوں کو عطا ہوئے ہیں اور دونوں کی یکساں طور پر راہنمائی کرتے ہیں، مگر ان دونوں سے بلند ایک درجہ اور ہے جو "ہدایت عقل" کہلاتا اور صرف "انسان" ہی کے لیے مخصوص ہے اور یہ بھی پہلے دو درجوں کی طرح بدیہی اور فطرت کے قوانین و نوامیس میں نمایاں جگہ رکھتا ہے۔ یہی وہ "ہدایت" ہے جو انسان کو بقیہ تمام حیوانات سے امتیاز بخشتی، اس کے سامنے فکر و نظر اور ترقیوں کی راہیں کھولتی ہے اور اسی کی بدولت وہ "اشرف المخلوقات" کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

عطیۂ الٰہی "ہدایت" کے یہ تینوں درجے اپنے حلقۂ اثر میں حضرت انسان کی راہنمائی کا حق ادا کرتے رہتے ہیں چنانچہ "وجدان" اس میں سعیِ پیہم کا جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے "حواس" اس کے لیے معلومات فراہم کرتے ہیں، اور "عقل" اس کو جزئیات و کلیات کا علم بخشتی اور ان سے متعلق احکام و نتائج ترتیب دیتی ہے۔

غرض یہی وہ ہدایت ہے، قرآن عزیز نے جس کا ذکر انسانی تخلیق و تربیت کے سلسلہ میں کیا ہے، مثلاً حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے باہمی مکالمہ میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے خدائے برحق کی ربوبیتِ کاملہ کا جس طرح اظہار فرمایا ہے اُس کا ذکر یوں کیا ہے۔ سورہ طٰہٰ میں ہے۔

ربنا الذی اعطیٰ کل شی خلقه	ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی بناوٹ
ثم ھدیٰ	دی پھر اُس پر راہ عمل کھول دی

اور سورہ اعلیٰ میں ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ	وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی، پھر اُس کو درست کیا
قَدَّرَ فَھَدٰی ۖ	پھر ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اُس پر راہ عمل

اور سورہ بلد میں ہے

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ وَلِسَانًا وَّ	کیا ہم نے اُس کو دیکھنے کے لیے، دو آنکھیں نہیں دیں اور کیا بولنے
شَفَتَیْنِ وَھَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ	کے لیے، زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، اور ہم نے اس کو اچھی
	اور بری دونوں راہیں دکھا دیں۔

اور سورہ دہر میں ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ	ہم نے انسان کو (مرد و عورت کے) ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا،
اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا	جس کو ہم، مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں پھر اُسے سُننے والا
بَصِیْرًا ۝ اِنَّا ھَدَیْنٰهُ	اور دیکھنے والا بنا دیا، ہم نے اس پر راہ عمل کھول دی۔
السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا	اب یہ اُس کا کام ہے کہ شکر گذار رہے یا ناشکر گذار۔

ﻪ اس آیت میں وجود کائنات کے چار مراتب بیان کر کے قرآن نے ایک عظیم الشان "حقائق علمیہ" کا باب کھول دیا ہے، یہ چار مراتب بالترتیب "خلق، تسویہ، تقدیر، ہدایت" ہیں اور یہی چار مراتب خلاصۂ حقائق ہیں، خلق یہ کہ وجود بخشا، تسویہ یہ کہ اُس کی استعداد کے مطابق اُس کی درست کاری کی، تقدیر یہ کہ ہر شے سے متعلق اُس کے بدء خلق سے اس کے نتیجۂ حیات تک کے لیے پہلے سے ایک مقررہ اندازہ طے کر دیا۔ اور ہدایت یہ کہ اس پر ہر قسم کی راہ عمل کھول دی تفصیلات

مگر یہ بات بھی بہت صاف ہے کہ ہدایت کے ان ہر سہ مراتب "وجدان" "حواس" "عقل" کی راہ عمل اپنے اپنے دائرۂ عمل ہی تک محدود ہے یعنی "وجدان" ایک جاندار کے اندر زندگی کے لیے جوش عمل اور سعیِ مسلسل کا ولولہ تو پیدا کر سکتی ہے مگر حیوان یا انسان سے باہر محسوساتِ خارجیہ کا ادراک اور علم اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہے۔ اسی طرح "ہدایت حواس" محسوسات کا ادراک ضرور پیدا کر دیتی ہے لیکن یہ اس کے احاطۂ عمل سے باہر ہے کہ وہ محسوسات کے نتائج و احکام اور جزئیات سے کلیات کا اور کلیات سے جزئیات کا استنباط کر سکے کیونکہ یہ کارفرمائی "ہدایتِ عقل" سے متعلق ہے جو عام حیوانات کے لیے نہیں بلکہ صرف انسان کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔

تو "ہدایتِ عقل" اگرچہ پہلی دونوں ہدایات کے مقابلہ میں بلند مرتبہ رکھتی اور کائنات کی بلند ترین ہستی (حضرت انسان) کی راہنمائی کرتی ہے تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ "عقل کا دائرہ" وسیع تر ہونے کے باوجود پھر محدود ہے کیونکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ عقل جو کچھ اور جس قدر بھی نتائج و احکام کا استنباط و استخراج کرتی ہے اس کا دائرہ محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حواسِ خمسہ (قوتِ باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ) نے اپنی اپنی خدمات انجام دے کر جو کچھ ہمارے لیے فراہم کیا ہے "عقل" اسی پر اپنا تصرف کرتی اور کر سکتی ہے لیکن یہ بات کہ محسوسات کی سرحد سے پرے کیا کچھ ہے اور اس پردہ کے پیچھے کیا ہے؟ اس مقام پر پہنچ کر "عقل" بھی عاجز درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ "درجۂ ہدایت" بھی اس سلسلہ میں ہم کو کسی قسم کی روشنی پہنچانے سے معذور نظر آتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر وجدان کی تکمیل کے لیے حواس، اور حواس کی تکمیل کے لیے عقل کی ہدایت موجود نہ ہوتی تو انسان ہرگز ان مدارج ارتقاء اور مراتب رفیع پر نہ پہنچ پاتا جن تک آج پہنچا ہوا ہے اور آئندہ جن تک پہنچنے کے لیے میدانِ عمل میں گامزن ہے۔ اگر انسان میں وجدان کی قوت نہ ہوتی تو کس طرح حواس کی دنیا تک اپنی حیات کو پہنچا سکتا

اور اگر محسوسات کے ادراک کے لیے حواس کی قوتیں نہ ہوتیں تو انسان کس طرح اپنی ذات سے خارج اشیاء کا ادراک کر سکتا اور ترقی کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا، اور جبکہ حواس کے وسائلِ ادراک محدود ہیں اور نہ صرف محدود بلکہ بسا اوقات گمراہی اور غلطی میں مبتلا کر دیتے ہیں مثلاً ہم کو طویل فاصلہ کی بڑی سے بڑی چیز چھوٹی نظر آتی ہے یا خلطِ صفرا کے بڑھ جانے سے شیریں سے شیریں چیز ذائقہ میں تلخ معلوم ہوتی ہے یا فاصلہ ہونے کی وجہ سے ہم رنگوں کے امتیاز میں اکثر غلطی کر جاتے ہیں تو ان تمام حالتوں میں "عقل کی ہدایت" کام آتی اور صحیح راہنمائی کرتی ہے اور اصل حقیقت کو پیشِ نظر لاتی ہے، وہ کہتی ہے کہ اگر طویل فاصلہ کی بنا پر تم کو "جہاز" ایک چھوٹی سی چیز نظر آتا ہے تو یہ نگاہ اور قوتِ باصرہ کا قصور ہے ورنہ جہاز ایک لمبی چوڑی اور بڑی شی کا نام ہے۔ اسی طرح شیریں اور تلخ کا فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ حقائق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی شیریں ہر حالت میں شیریں ہے، اس لیے ذائقہ کی یہ تلخی مرض کی وجہ سے ہے، غرض حواس کی غلطیوں سے محفوظ رکھ کر اصل حقیقت کو واضح کرنا "عقل کی ہدایت" کا فریضہ ہے اس لیے ہم ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے قطع نظر ——— کہ عقل محسوسات کی حدود سے آگے کچھ نہیں جانتی ——— انسان کی عملی زندگی کے تمام حالات میں عقل کی ہدایت بھی کافی اور مؤثر ثابت نہیں ہوتی اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفسِ انسانی جذبات، رجحانات اور قسم قسم کی خواہشات سے متاثر و مغلوب ہے بلکہ اکثر یہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ جب "عقل" اور "جذبات" کے درمیان کشمکش ہوتی ہے تو فتح "جذبات" ہی کی ہوتی ہے اور "عقل" درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

تو ان حالات میں "عقل" ہی تقاضا کرتی ہے کہ یہاں "عقل سے بھی بلند" اور کوئی درجہ ہونا چاہیے جو عقل سے زیادہ موثر رہنما اور ہر قسم کی کوتاہیوں سے پاک اور بے لوث ثابت ہو۔

اس تمہید کا حاصل یہ نکلا کہ انسان محسوسات کے دائرہ میں محدود رہ کر بھی اور ما ورائے محسوسات کے ادراک کے لیے بھی "ہدایتِ عقل" سے بلند (ایک چوتھے) درجۂ ہدایت کا محتاج

ہے تو اب لائقِ غور و فکر ہے یہ بات کہ جس "رب العلمین" نے اپنی ربوبیتِ کاملہ سے انسان کے ارتقائی کمالات کی حاجات و ضروریات کے پیش نظر ہدایت وجدان سے بلند ہدایتِ حواس اور ہدایتِ حواس سے رفیع ہدایتِ عقل عطا فرمائی تو جبکہ عقل کی ہدایت بھی خاص حدود سے آگے نہیں جا سکتی اور حصولِ کمالات اور اعمال کے صحیح ضبط و نظم کے لیے ہی کافی نہیں ہے نیز ماوراءِ محسوسات کے عدم علم کے باوجود اس کے انکار پر کوئی مثبت علمی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وجدانی جذبات و احساسات اور شعورِ نفس اس کے "حقیقت" ہونے کا پتہ دیتے ہیں تو کیا اُس خدائے برحق کی ربوبیت اور فیضِ رحمت کے لیے یہ منافی نہ تھا کہ وہ انسان کو "ہدایتِ عقل" سے بلند کوئی "مرتبۂ ہدایت" عطا نہ کرے؟ ضرور منافی تھا اور اس لیے ایسا نہیں ہوا بلکہ اُس نے اُس کو ایک اور بلند تر مرتبہ "ہدایتِ وحی" بخشا یہ مرتبۂ ہدایت اپنی راہنمائی میں ہر قسم کی کوتاہیوں اور خطا و قصور سے مامون و محفوظ ہے کیونکہ یہ خدا کی جانب سے ہر شئے کی حقیقت کا علم و یقین عطا کرتا ہے اور "ہدایتِ وحی" کے افاضہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی مقدس ہستی کو جو ہر قسم کے گناہوں اور عیوب سے "معصوم" ہوتی ہے اس مقصد کے لیے چن لیتا ہے کہ وہ اُس کی جانب سے کائناتِ انسانی تک "ہدایت وحی" کو پہنچا دے، اس لیے یہ مقدس ہستی ایک جانب لوازمِ بشریت کے ساتھ مقیدہ کر دوسرے انسانوں کی طرح "انسان" اور "بشر" کہلاتی ہے اور دوسری جانب عیوب و آثم سے "معصوم" رہ کر خدا کے ساتھ وہ تعلق رکھتی ہے جو دوسرے مقدس سے مقدس انسانوں کو بھی حاصل نہیں ہوتا اور اس طرح خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان افاضۂ "ہدایتِ وحی" کے لیے ایلچی اور واسطہ بنتی ہے، ایسی حقیقت کا نام مذہب کی اصطلاح میں "نبوت و رسالت" ہے

قرآنِ حکیم نے ہدایت کے اس "مرتبۂ عالی" کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے حسب ذیل چند شواہد ملاحظہ ہوں۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا ۔ لیکن قوم ثمود تو اُسے بھی ہم نے راہِ حق (ہدایت)

العمیٰ علی الھدیٰ (حم سجدہ) دکھلائی تھی لیکن اُس نے اندھے پن کو پسند کیا اور "ہدایت" کی راہ نہ چلی۔

قل ان ھدی اللّٰہ ھو الھدیٰ وامرنا لنسلم لرب العلمین (انعام) (اے پیغمبر!) کہہ دیجیے، یقیناً اللہ کی ہدایت ہی "حقیقی ہدایت" ہے اور ہم سب کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تمام کائناتِ عالم کے پروردگار کے آگے سرِ عبودیت جھکا دیں۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا و ان اللّٰہ لمع المحسنین اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں سعی و جانفشانی کی تو ضرور ہے کہ ہم بھی اُن پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ اُن لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو نیک کردار ہیں۔

ان علینا للھدیٰ وان لنا للاخرۃ والاولیٰ۔ بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم راہنمائی کریں (ہدایت وحی عطا کریں) اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہیں

ارتقائی نقطۂ نظر سے "ہدایتِ وحی" اور مسئلہ نبوت و رسالت کی وضاحت کے لیے اشہبِ فکر کو یوں بھی مہمیز کیا جا سکتا ہے کہ جبکہ یہ عقلی اور علمی نظریہ مسلمات میں سے ہے کہ "بقاء انفع" یا "بقاءِ اصلح" کے فطری قانون کے مطابق کائنات کی گوناگوں موجودات میں ہر ایک شی اپنے موجود رہنے کے لیے کوئی "حکمت و مصلحت" ضرور رکھتی ہے اور حکیم مطلق کا قانونِ فطرت کسی شی کو اسی وقت تک باقی رکھتا ہے جب تک اُس کا وجود "نافع" اور "مفید" ہونے کی صلاحیت رکھتا اور جس غرض و غایت کے لیے اُس کو پیدا کیا گیا ہے اُس کو پورا کرتا ہے اور اسی قانون "بقاءِ انفع و اصلح" سے یہ بات بھی بہت واضح اور نمایاں طور پر ثابت ہوتی ہے کہ "نفع" اور "افادیت" کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ ہر شی اپنے سے بلند مخلوق اور سلسلۂ مخلوقات میں سے ہر نوع اپنے سے بلند نوع کی بقاء کے لیے مفید و معاون ثابت ہو، پس جبکہ حضرت انسان کو عقل بھی موجوداتِ عالم کی سب سے بلند مخلوق اور مدارجِ ارتقاء کی بلند ترین کڑی تسلیم کرتی ہے اور اسی قانون

کی رو سے موجوداتِ عالم کی ہر شئے اس کی خدمت، اُس کے نفع، اور اُس کی افادیت میں مصروفِ عمل نظر آتی ہے تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس اشرف المخلوقات (انسان) کا وجدان اس کے جذباتِ عالیہ، اور اس کے افکار و خیالات کی پرواز جبکہ عالمِ مادیات سے کہیں زیادہ بلند اور رفیع ہیں اور اس کی عقل یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ماوراءِ مادہ سے ناواقف ہے پھر بھی اس پردہ کے پیچھے کچھ ہونے کا احساس رکھتی اور اُس کی معرفت کے لیے چبک محسوس کرتی ہے، فطرتِ الٰہی کا فیضان اور بقاءِ انفع کا ناموس اُس کو عالمِ مادیات و محسوسات ہی کے اندر محصور رکھتا، اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ فطرت "بخیل" ٹھہرتی بلکہ یہ فطرت کا بہت بڑا ظلم ہوتا، اور یہ ظاہر ہے کہ تنہا عقل اُس کو اس منزل تک پہنچانے کے لیے قاصر و ناکام ہے، لہٰذا ازبس ضروری تھا کہ "فطرتِ الٰہی" اس کی رہنمائی کے لیے مزید کوئی سامان مہیا کرتی اور انسان کی ذہنی و فکری ترقیوں کو درجۂ تکمیل تک پہنچاتی، پس ماوراءِ مادہ علوم و معارف اور کائناتِ انسانی کی فلاح و نجات کے مقصدِ عظمیٰ کے لیے عقل کی رہنمائی کا یہی وہ فیضانِ الٰہی ہے جس کو قرآن کی اصطلاح اور مذہبی بول چال میں "وحی و نبوت" کہا جاتا ہے اور آیاتِ ذیل اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں۔

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ (انعام)	اس نے (خدا نے) مجھ پر اس قرآن کی وحی کی تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں (اہلِ عرب کو) اور انہیں جن تک اس کی تعلیم پہنچ جائے (ربع مسکون کو) "انکار اور بدعملی کے نتیجہ سے" ڈراؤں۔
اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ	(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری جانب اُسی طرح "وحی" بھیجی جس طرح نوح پر اور اُن نبیوں پر جو نوح کے بعد ہوئے بھیجی تھی اور جس طرح ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون، سلیمان پر بھیجی اور داؤد کو زبور

وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَ
يُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ وَاٰتَيْنَا
دَاوٗدَ زَبُوْرًا وَرُسُلًا قَدْ
قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ
وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ
وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا رُسُلًا
مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ
لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝
(النساء)

عطا فرمائی، نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے۔ یہ تمام رسول (خدا پرستی اور نیک عملی پر) خوش خبری دینے والے اور (انکار حق پر) ڈرانے والے تھے اور اس لیے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ ہمیں راہِ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ
قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ
لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ اِنَّ اللّٰهَ
رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝
(طہ)

اور جب عیسیٰ (خدا کی) نشانیاں لے کر آیا، کہا: میں تمہارے پاس حکمت و دانائی لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ بعض اُن باتوں کو جن کے متعلق تمہارے درمیان اختلاف ہے صاف صاف بیان کر دوں، پس اللہ کے متقی بندے بن جاؤ اور میری پیروی کرو (اس بات میں کہ) بیشک اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اُسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا
مُّبِيْنًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ

اے افرادِ نسلِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان (دلیل و حجت) آ گئی اور ہم نے تمہاری طرف واضح اور آشکارا روشنی بھیج دی پس جو لوگ اللہ

وَاعْتَصَمُوا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ — ایمان لائے اور اُنھوں نے اُس کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو
فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّ — وہ اُنھیں عنقریب اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کردیگا
يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا — اور اُن پر اپنا فضل کریگا اور اُنھیں اپنے تک پہنچنے کی راہ
مُّسْتَقِيْمًا (النساء) — دکھائیگا ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہو۔

قرآن نے ان آیات میں "ہدایتِ وحی" کو "حکمت" "برہان" (حجت و دلیل) اور نورِ مبین (آشکار روشنی) کہا ہو تاکہ یہ بخوبی واضح ہو جائے کہ جس طرح محسوسات و مادیات کے لیے "عقل" کو "روشنی" اور "دلیل راہ" کہا جاتا ہو اُسی طرح عقل کے دائرۂ حدود سے آگے کے لیے "ہدایت وحی" یہی حیثیت رکھتی اور یہی خدمات انجام دیتی ہو۔

"ہدایتِ وحی" کی ضرورت پر اب تک جو کچھ کہا گیا اگر اس کے علاوہ مزید اضافہ مطلوب ہو تو مبدءِ فیاض کے اس لطیف و حسین فیضان کے متعلق اس روشن پہلو سے بھی نظر کی جا سکتی ہو کہ جب ہم حواس کی قوتوں کا فکرِ عمیق سے مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت صاف نمایاں نظر آتی ہو کہ ناموسِ فطرت نے یہاں ہر ایک قوت کے عملی نظام کو اس طرح سانچہ میں ڈھالا ہو کہ انسان کے اندر ودیعت کی ہوئی قوت حواس اُس وقت تک اپنا صحیح عمل نہیں کر پاتی جب تک خارج سے اُس کی مدد نہ کی جائے مثلاً قوتِ باصرہ دیکھنے کی قوت کا نام ہو اور تم اس سے اپنی زندگی میں برابر کام لیتے رہتے ہو اور اس بحث سے قطع نظر، کہ جو شئے باہر موجود ہو وہ آنکھ کے باریک پردوں پر اپنا عکس ڈال رہی ہو یا آنکھ کے پردوں میں جو روشنی ہو وہ اندر سے بشکلِ شعاع نکل کر موجودِ خارجی کو متاثر کر رہی ہو اور اس کو ہم "دیکھنا کہتے ہیں" تم نے کبھی اس پر ضرور غور کیا ہوگا کہ جب تم کسی قسم کی بھی روشنی میں ہوتے ہو تو اپنی قوتِ باصرہ کی استعداد کے مطابق جس شئے کو دیکھنا چاہتے ہو دیکھتے ہو لیکن جوں ہی تاریکی کا شکار ہو جاتے ہو اور شب دیجور کے ساتھ ابرِ سیاہ کے پردے روشنی پر چھا جاتے ہیں اُس وقت حلقۂ چشم میں قوتِ باصرہ کی موجودگی کے باوجود تم یہ کہا کرتے ہو

کہ "ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا" تو آخر بینا ہوتے ہوئے ایسا کیوں کہتے ہو؟ تمہارا جواب اُس وقت یہ ہوتا ہے کہ قانونِ قدرت نے یہی مقرر کر دیا ہے کہ باطنی قوائے عمل اُس وقت تک اپنا صحیح کام نہیں کرتے جب تک خارج سے اسی سلسلہ کی مدد نہ پہنچے اس لیے قوتِ باصرہ کی باطنی قوت بھی محتاج ہے کہ دیے (چراغ) کی روشنی سے لے کر ماہتاب و آفتاب تک جس حیثیت کی بھی روشنی اُس کی مدد کریگی اُسی طاقت و وسعت کے ساتھ باصرہ کی باطنی روشنی اپنا عملی مظاہرہ کر سکیگی اور یہی حال دوسرے حواس کا بھی ہے۔

پس اگر یہ صحیح ہے اور بلاشبہ صحیح ہے کہ خدائے واحد کا قانونِ قدرت اور ناموسِ فطرت اپنی وحدت کی جلوہ نمائی کا مظاہرہ کائناتِ مادی اور عالمِ روحانی میں یکساں طور پر کرتا رہتا ہے تو بے تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ "عقل" حضرتِ انسان کے اندر کی وہ روشنی ہے جس کو ید قدرت نے انسانیت کے ارتقائی منازل پر گامزن ہو کر انسانیت کی "مثلِ اعلیٰ" اور "مقصدِ عظمیٰ" کو پا لینے کے لیے ودیعت کیا ہے مگر مسطورۂ بالا قانون یہاں بھی اُسی طرح کارفرما ہے جیسا کہ قوائے حواس میں کارفرما نظر آتا ہے یعنی اگر "عقل" عالمِ محسوسات و مادیات کے دائرے میں اپنا عملی مظاہرہ کرنا چاہتی ہے تو وہ محسوسات خارجی کی مدد کی ضرور محتاج رہتی ہے مثلاً اُس کا یہ فریضہ ہے کہ جزئیات کے ذریعہ "کلی" کا استخراج کرے لیکن وہ ایسا جب ہی کر سکیگی کہ خارج میں اُس سلسلہ کی جزئیات کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے حقائق اصلیہ کو اُس کے سامنے پیش کرے پس اگر عقل کی روشنی اور ان حقائق کے درمیان وہم، خیال اور ظن کے تاریک پردے حائل ہو جائیں تو عقل کی روشنی ہرگز اپنا صحیح کام نہیں کر سکتی، تو اسی طرح جب وہ ماوراءِ محسوسات (روحانیات) کی جانب اپنی روشنی کو متوجہ کرتی ہے تو یہی اوہام، ظنون خیالات جذباتِ فاسدہ کے تاریک پردے اُس کے اور عالمِ روحانیات کے درمیان عموماً حائل ہو جاتے ہیں اور وہ اکثر و بیشتر اُن سے مغلوب ہو کر گم کردہ راہ ہو جاتی اور معرفتِ حق اور معرفتِ باطل

کے درمیان فرق و امتیاز سے عاجز نظر آتی ہے ایسی حالت میں خالقِ کائنات کی رحمت کاملہ اور ربوبیتِ تامہ اُس کو خاسر و ناکام نہیں چھوڑتی اور خارج سے اُس کی پوری مدد کرتی ہے اور یہی وہ خارج کی روشنی ہے جو نبی اور پیغمبر کے ذریعہ کائناتِ انسانی تک پہنچی اور دین و مذہب کی زبان میں " وحی کی روشنی" کہی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ عزیز نے اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے جگہ جگہ وحی کو " نور" (روشنی) سے تعبیر کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا (النساء)	اے افرادِ نسلِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے بُرہان (دلیل و حجت) آگئی اور ہم نے تمہاری جانب واضح اور آشکارا "روشنی" (وحی الٰہی بشکل قرآن) بھیج دی
قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ (مائدہ)	اللہ کی جانب سے تمہارے پاس (حق کی) "روشنی" آچکی اور ایسی کتاب آگئی (جو اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے۔
يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا (توبہ) أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ	یہ لوگ (مشرکین، یہود، نصاریٰ) چاہتے ہیں "اللہ کی روشنی" کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں حالانکہ اللہ یہ "روشنی" پوری کیے بغیر رہنے والا نہیں اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے۔
وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (ابراہیم)	اور دیکھو، واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ موسیٰ کو بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور "روشنی" میں لائے۔
وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَنْ	اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے "امر" میں سے "روحِ امر" کی وحی بھیجی حالانکہ اس سے قبل تو نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب؟ اور نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے ایمان؟ لیکن ہم نے اس کو (قرآن کو) نور (روشنی) بنایا ہے، ہم اپنے بندوں میں سے

نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا	جس کو چاہتے ہیں اُن کو اس کے ذریعہ راہ دکھلاتے ہیں اور
وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْ اِلٰی	اے پیغمبر! بلاشبہ تو (لوگوں کو) سیدھی راہ کی جانب راہنمائی
صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝	کرتا ہے۔

پھر اس مسئلہ کی اہمیت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی فکر و نظر کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ہم اس عالم ہست و بود میں روز و شب کے مشاہدات و تجربات سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ یہاں ہر شی کی کیفیت و کمیت یا اُس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک ترازو یا "پیمانہ" ضروری ہے اور یہ کہ ہر ایک "پیمانہ" اور ہر ایک "ترازو" اپنے اندر ایک خاص صلاحیت رکھتا اور اپنی صلاحیت کے مطابق ہی اشیاء کے ماپ تول میں کام دے سکتا ہے مثلاً موتی اور جواہرات کے تولنے کے لیے ایک خاص ترازو (کانٹا) ہے اب اگر ہم یہ چاہیں کہ اُس میں شکر، روئی، غلہ جیسی چیزوں کو تولیں تو ظاہر ہے کہ اُس کے لیے یہ نہیں کہ دوسری قسم کا ترازو کام دیگا یا مثلاً کپڑا، زمین وغیرہ جیسی اشیا کی پیمائش کے لیے ہم ایک خاص قسم کا پیمانہ (گز) استعمال کرتے ہیں۔ پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اُس سے حرارت و برودت کی بھی پیمائش کرلیں تو اس کے لیے یہ نہیں بلکہ دوسرا پیمانہ تھرمامیٹر[1] کام میں لانا ہوگا اور اسی طرح ہوا کے دباؤ اور سطح کی اونچائی معلوم کرنے کے لیے بیرومیٹر[2] اور زلزلوں اور بھونچالوں کی حالت دریافت کرنے کے لیے سیسمومیٹر[3] اور آواز کی مقدار و قوت کی پیمائش کے لیے فونومیٹر[4] جُدا جُدا قسم کے پیمانے استعمال کرنے ہونگے کیونکہ اُن کی اپنی صلاحیت و استعداد کار کا یہی فطری تقاضا ہے کہ اگر اس کے خلاف ان کا استعمال کیا جائیگا تو یا قطعاً بیکار ثابت ہونگے اور یا صحیح حقیقت نہ بتلا سکینگے حالانکہ ان سب کا ایک ہی کام ہے یعنی "ماپ تول" اور ایک ہی نام ہے "ترازو اور پیمانہ" مگر ہر شی کی حقیقت اور اُس کی کیفیت و کمیت کے پیش نظر چونکہ ان سب کی صلاحیت کار کی حدود متعین ہیں لہٰذا اُن میں سے کوئی ایک بھی اپنی حدود

---

[1] Thermometer [2] Barometer [3] Seismometer [4] Phonometer

متجاوز ہو کر کارآمد ثابت نہیں۔

قانونِ قدرت کی کارفرمائی کو رہنما بنا کر اگر ہم اسی نقطۂ نظر سے آگے قدم بڑھائیں اور خالص مادیات سے گذر کر معنویات کی حدود پر جا پہنچیں تو یہاں بھی وہی کرشمۂ قدرت نظر آتا ہے یعنی انسان کی انفرادی و اجتماعی حیات کے لیے رحمتِ کردگار نے جو پیمانے مقرر کیے ہیں اور جن کو وجدان، حواس اور عقل کہا جاتا ہے، اُن میں بھی جدا جدا صلاحیتوں کے اعتبار سے حدود منقسم ہیں، مثلاً پیمانہ "وجدان" انسان کی صرف اُسی کیفیت و حالت سے متعلق ہے جو قدرت کے ہاتھوں نے اُس کے وجود کے ساتھ ساتھ اُس میں ودیعت کر دی ہے اور حواس کا پیمانہ اُن ہی اشیاء سے تعلق رکھتا ہے جو دیکھنے، سُننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے میں آسکتی ہیں اور پیمانہ "عقل" ان دونوں سے آگے عالم مشاہدات و محسوسات کے حقائق اور اُن کی کیفیات کے جانچنے، اُن کے درمیان امتیاز پیدا کرنے، اُن سے نتائج اخذ کرنے، اور اُن پر احکام صادر کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے۔

پس اگر ہم چاہیں کہ "وجدان" سے "حواس" اور "حواس" سے "عقل" کا کام لیں تو خود عقل ہی کے نزدیک ایسا کرنا غلط ہوگا کیونکہ یہ قانونِ فطرت کی مقررہ حدود کی خلاف ورزی کے مرادف ہے جس کے اقدام پر ناکامی کے ماسوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

لیکن عقلِ انسانی اس کے آگے نہ جاننے کے باوجود پھر جاننے کی جو جستجو رکھتی ہے اور اپنی ترقی کو اس کے اندر محدود نہیں سمجھتی نیز تمام خارجی دلائل سے بڑھ کر انسان کے اندر کی قوی تر حجت و برہان "وجدان" ان ہر دو عالم سے بھی بلند تر عالم کے وجود کا جو پتہ دیتی ہے اُس کے پیشِ نظر ہم وسعتِ نظر کا قدم اور آگے بڑھانے اور مسطورہ بالا عالم معنویات سے لطیف تر معنوی عالم کا کھوج لگانا چاہتے، اور اُس کائنات سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں، جہاں حسن، صداقت، اور محبت[1] (ذاتِ حق کی صفاتِ ربوبیت، عدالت اور

---

[1] آج کل علماءِ جدید میں یہ بحث جاری ہے کہ سائنس نے اپنی حدود کو اس طرح محدود رکھا کہ اُس کے (بقیہ بر صفحہ ۲۸۲)

رحمت، اپنی جلوہ آرائیوں سے اس کائنات کو بھی منور کر رہی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر پیمانۂ عقل بھی کوتاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور اُس کی رفعتِ پرواز وہاں تک رسائی نہیں کر پاتی خصوصاً ایسی حالت میں کہ انسانوں کے درمیان "عقل" کا اس درجہ تفاوت موجود ہے کہ ایک شخص کی عقل اُس کو نہ صرف ممکن الوقوع سمجھتی ہے بلکہ اُس کو وجود پذیر کر دکھاتی ہے بلکہ تفاوتِ عقلی کی بوالعجبیوں کا تو یہ حال ہے کہ ایک ہی شخص کی عقل ایک وقت جس بات پر ناممکن کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے دوسرے وقت میں اُسی بات کو ممکن سمجھنے لگتی ہے تو جب پیمانۂ عقل کا عالم محسوسات میں یہ حال ہے تو عالمِ غیب تک اُس کی رسائی معلوم؟ اور پھر جس پیمانہ کے توازن کو غیر متوازن بنانے کے لیے وہم و خیال اور جذبات کا سیلِ رواں موجیں مارتا رہتا ہو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خارج سے مدد و یاری کے بغیر "عقل" معرفتِ الٰہی اور علومِ غیب تک رسائی حاصل کر سکتی ہے؟

پس انسان کی بیچارگی و درماندگی کے اس مقام پر بھی رحمتِ کردگار اپنے فیضان سے اُس کو محروم نہیں رکھتی اور معنوی و روحانی حقائق کی معرفت کے لیے ایک مقدس ہستی (پیغمبر) کے ذریعہ اُس کو عقل سے بھی رفیع و لطیف پیمانہ "ہدایتِ وحی" عطا کرتی ہے۔ تاکہ انسان "سعادت و شقاوت" میں امتیاز کرنے کے بعد حیاتِ سرمدی اور "نجاتِ ابدی" کو پا سکے۔

قرآنِ عزیز نے "وحیِ الٰہی" کو یہی حیثیت دیتے ہوئے سورۂ شوریٰ میں ارشاد فرمایا ہے

اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ۔ اللہ وہ ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن) کو نازل کیا اور اُتارا "میزان" (ترازو) کو یعنی دینِ حق کو جو حق و باطل کے لیے ترازو اور پیمانہ ہے۔

چنانچہ شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) موضح القرآن میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۸۱) دائرہ میں حُسن، صداقت او محبت کی کوئی قدر و قیمت نظر نہیں آتی اور اس لیے وہ خدا کی ہستی کی معرفت ضروری نہیں سمجھتی مگر یہ سائنس کا کمال نہیں بلکہ نقص ہے جو آج نہیں تو کل ضرور پورا ہو کر رہیگا۔

تحریر فرماتے ہیں :-

"ترازو فرمایا دینِ حق کو جس میں بات پوری ہو نہ کم نہ زیادہ"

صاحبِ وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل

"ہدایتِ وحی" یا "نبوت و رسالت" کی حقیقت و اہمیت پر گذشتہ سطور میں کوتاہ قلمی کے باوجود جو کچھ سپردِ قرطاس کیا گیا اُس کی تکمیل کے لیے اس سوال کو بھی حل کرنا ازبس ضروری ہو کہ جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ "حاملِ وحی" ہو اور "خدا کا پیغمبر اور نبی" تو اُس کے دعوے صدق و کذب کی معرفت کا کونسا طریقہ ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہو کہ اگرچہ "علم الکلام" کے ماہرین (متکلمین) نے اس معرفت کے لیے بہت سے دلائل و براہین پیش کیے ہیں اور اس مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر معرکۃ الآراء بحثیں کی ہیں تاہم وہ اپنے طرزِ استدلال میں اصطلاحی فلسفیانہ اسلوب رکھتی ہیں جس کو ہم "مذہبیات" و "روحانیات" میں خاص اہمیت دینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ اس راہ میں وہی اسلوبِ بیان مفید، دلنشین اور جاذبِ قلوب ہو سکتا ہو جس کی بنیاد و نہاد وجدانی طرزِ استدلال پر رکھی گئی ہو اور عقلیت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اصطلاحی فلسفہ و منطق کی قیود میں اُس کو پابہ زنجیر نہ کر دیا گیا ہو اور یہ اس لیے کہ معرفتِ الٰہی اور معرفتِ علومِ غیبیہ کے لیے دلیلِ "وجدان" سے زیادہ دوسری کوئی دلیل و برہان مؤثر نہیں ہو، اسی حکمتِ بالغہ کے پیشِ نظر قرآن عزیز کے تمام عقلی استدلالات —— جن پر غور کرنے کے لیے "قرآن" عقل و فکر اور تدبر کو مخاطب بناتا ہو —— کی بنیاد بھی "وجدان" پر قائم کی گئی ہو البتہ یہ قرآنِ حکیم کا اعجازِ بلاغت ہو کہ ان وجدانی دلائل کو اگر کوئی فلسفی دقیق فلسفیانہ طریقِ استدلال کے سانچہ میں ڈھال کر زیرِ بحث لانا چاہے تو یہ وجدان پر مبنی استدلالات اسی اہمیت و قوت کے ساتھ اپنی صداقت اور ثمرۂ و نتیجہ کو اُس رنگ میں بھی تسلیم کرا لیتے ہیں غرض "وجدان" اس سوال کا جواب یہ دیتا ہو کہ تم مدعیِ نبوت کی زندگی کو "صداقت کی کسوٹی" پر خوب کسو اور اگر آج وہ ہستی تمہارے سامنے نہیں ہو تو تعصب اور نسلی و جماعتی حسد

سے پاک اور بے لوث ہو کر بے لاگ تاریخی حقائق سے دریافت کرو پس اگر تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ اُس کی قبل از دعوئ نبوت زندگی کا ہر شعبۂ حیات صداقت و حقانیت کا مظہر ہے اور ہر ایک شعبۂ زندگی بے داغ صداقت کا پیکر اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اُس کا وجود ہر قسم کی بداخلاقیوں، گناہوں اور آلودگیوں سے پاک اور معصوم ہے اور اخلاقی بلندیوں کا مخزن اور ان ہی کیفیات و حالات کے ساتھ اُس نے جانے بوجھے لوگوں میں زندگی کا بڑا حصہ گذرا ہے تو پھر اُس کے دعوے صداقت میں شک و شبہ کرنا عقلِ سلیم کے خلاف ہوگا، کیونکہ عقل بآسانی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس ہستی نے اپنی مدتِ حیات کے طویل عرصہ میں نازک سے نازک موقعوں پر بھی کبھی ایک لمحہ کے لیے انسانی دنیا پر جھوٹ نہ بولا ہو آخر دماغی و قلبی انقلابات کی وہ کونسی تاریخ ہے جس کی بنا پر ایسی باہوش و حواس ہستی کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ خالقِ کائنات، خدائے برحق پر کذب بیانی اور افترا پردازی کے لیے یک بیک آمادہ ہو جائے چنانچہ قرآنِ عزیز نے اسی حقیقت کو سورۂ یونس میں اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ	اور تم کہو "اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمھیں سُناتا ہی نہیں
وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ	اور تمھیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا مگر اس کا چاہنا
عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ	یہی ہوا کہ تم میں اُس کا کلام نازل ہو اور تمھیں اقوامِ عالم
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ	کی ہدایت کا ذریعہ بنائے، پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس
كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ	معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر
الْمُجْرِمُوْنَ ۔ (یونس ۲)	کر چکا ہوں کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟

"صاحبِ وحی" کی صداقت کی یہ ایسی بہترین کسوٹی اور دلیل ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ میں پادشاہانِ دنیا کے نام اسلام کی دعوت و پیغام کے سلسلہ میں والا نامے بھیجے تو وقت کی سب سے بڑی طاقت رومن امپائر کے پادشاہ ہرکلیوس (ہرقل) کے اس حضرت دِحیہ کلبی نامۂ مبارک لے کر پہنچے تب اُس نے بھی جب آپ کی صداقت

کو پرکھنا چاہا تو سب سے پہلے اسی وجدانی دلیل کو "معیارِ صداقت" ٹھیرایا اور صورتِ حال یہ پیش آئی کہ اُس نے سرکاری حکام سے دریافت کیا، یہاں کوئی حجازی قافلہ موجود ہے جس سے اس ہستی کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں ؟ اتفاق سے ابو سفیانؓ (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک تجارتی قافلہ مقیم تھا، چنانچہ اُن لوگوں کو شاہی دربار میں طلب کیا گیا اور ہرکلیوس نے رئیس التجارۃ (ابو سفیانؓ) سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند سوالات کیے جن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ "وہ تمہارے اندر ہی پلا بڑھا، رہا سہا ہے تو کیا تم نے اُس کی زندگی کے اس طویل دور میں کبھی جھوٹ کا شائبہ پایا ہے ؟" ابو سفیان نے جواب دیا: کبھی نہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی قوم میں "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے" یہ سُن کر ہرکلیوس نے یہ کہا۔

وسالتك هل كنتم تتهمونه بالكذب	میں نے تجھ سے یہ بھی دریافت کیا: کیا کبھی اس کے
قبل ان يقول ما قال فذكرت	اس دعوے سے قبل تم نے اُس کو جھوٹا پایا ہے" تو نے
ان لا، فقد اعرف انه لم يكن ليذر	کہا "کبھی نہیں" تب میں نے یقین کر لیا کہ جو ہستی انسانوں
الكذب على الناس ويكذب على	پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں
الله۔ ؎	بول سکتی۔

"جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی" دیکھیے یہ جملہ اس سلسلہ میں وجدانِ انسانی کا کس درجہ صحیح ترجمان ہے کہ ہرکلیوس نے بھی تمام عقلی و نقلی دلائل سے الگ ہو کر وجدان کے تقاضے سے پہلی دلیل جو پیش کی وہ وہی تھی جس کو وجدان کے خالق (خدائے برتر) نے اپنے پیغمبر سے "صداقت دعویٰ کے لیے" پیش کرائی۔ چنانچہ مولانا ابو الکلام آزاد نے ان آیات کی تفسیر اسی حقیقت کی روشنی میں اس طرح کی ہے۔

"پھر آیت (۱۶) میں صداقتِ نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے...

.... فرمایا، ساری باتیں چھوڑ دو، صرف اس بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں

جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر دہو، تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں، یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمر انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی، بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے طیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پا سکتے؟

تمام علماءِ اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے، جو سانچہ اس عرصہ میں بن گیا، پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک "صادق" و "امین" رہا ہے، تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ فاطر السموات والارض (آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا) پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ اس کے بعد فرمایا۔ دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے۔ جو شخص اللہ پر افترا کرے اُس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں، اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے۔ اور شریر و مفتری انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اب صورتِ حال نے یہاں دونوں فریق پیدا کر دیے، اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑیگا، اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے، فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے، اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا یہ فیصلہ صادر ہو گیا، جو مکذب تھے اُن کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا، جو صادق تھا، اُس کا کلمۂ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہیگا۔[1]

[1] ترجمان القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۵۰۔

بہرحال "صاحبِ وحی" کے دعوے صداقت کی یہ وجدانی دلیل عقلِ سلیم اور فکرِ مستقیم کی نگاہ میں "علم الیقین" پیدا کرنے کے لیے کافی ووافی ہے، تاہم بقیہ شرائط یعنی صداقتِ تعلیم، نزولِ وحی کا ادعاء اور مخالفین کے مقابلہ میں تحدی (چیلنج) اور تحدی کا ایفاء "مدعی نبوت و رسالت" کے لیے یہ تمام امور بھی ازبس ضروری ہیں اور اپنی جگہ تفصیل طلب اور قابلِ لحاظ ہیں اس لیے کہ ان شرائط کے پیشِ نظر ہی نبی اور مصلح کے درمیان امتیاز، نبی اور ساحر وشعبدہ باز کے مابین فرقِ بیّن اور نبی اور متنبی میں تضاد قائم کیا جاسکتا ہے۔[1]

بعثت

غرض خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کا یہ حال تھا کہ ایک جانب خلوتہائے راز میں معرفتِ الٰہی کے لیے استغراق، صراطِ مستقیم کی جستجو، نوعِ انسانی کے اصلاحِ حال کی تڑپ اور طلب تھی اور دوسری جانب افرادِ قوم وملک کے ساتھ راست گفتاری، صداقت شعاری، حُسنِ معاملت اور اصابتِ فکر جیسے اخلاقِ کریمانہ وصفاتِ حمیدہ سے متصف معاشرتی زندگی کا مظاہرہ تھا اور اُن امتیازات کی وجہ سے ہر فرد کی نگاہ میں آپ کی وہ قدر ومنزلت تھی کہ باتفاق رائے "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے اور کل جو دشمنی اُن کو "محمد رسول اللہ" سے دعوےٰ نبوت کی بناء پر ہوئی وہ آج محمد بن عبداللہ کے ساتھ قطعاً نہیں تھی اور سب ہی اُن کی تقدیس وتطہیر کے قائل تھے۔

یہی حالات وواقعات تھے جبکہ عمر مبارک چالیس منزلیں طے کر چکی تھی، رمضان کا مہینہ تھا اور آپ غارِ حراء میں مشغولِ عبادت تھے کہ اچانک آپ کے سامنے جبرئیل فرشتہ نمودار ہوا اور اُس نے بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثقلین کی رشد وہدایت کے لیے چُن لیا اور رسالت وپیغمبری کے منصب کبریٰ پر فائز کیا۔

یہ واقعہ چونکہ نوعِ انسانی کی تاریخ میں حیرت زا انقلاب کا باعث ثابت ہوا

[1] یہ مباحث علمِ کلام میں قابلِ مراجعت ہیں لیکن قصص القرآن کی تمام جلدوں کے مطالعہ سے یہ کل بحث

اور اُس نے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو معراجِ رفعت کی اُس حد پر پہنچا دیا جہاں عالم ادیان وملل کے تمام اصلاحات وانقلابات اسی ہستی کا فیضِ رحمت نظر آتے ہیں اس لیے تاریخ وحدیث کے روشن صفحات نے اس واقعہ کی تمام تفصیلات کو بسند صحیح اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے چنانچہ فنِ حدیث وتاریخِ اسلام کے امام "بخاری" (رحمہ اللہ) نے اپنی مشہور ومقبول کتاب الجامع الصحیح میں صدیقہ عائشہ کی سند سے اس واقعہ کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے اُس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر شروع میں سچے خوابوں کا سلسلہ جاری رہا، کوئی خواب آپ نہیں دیکھتے تھے مگر وہ اپنی تعبیر میں اس درجہ روشن اور صحیح ثابت ہوتا تھا جیسا کہ طلوعِ صبح کے لیے سپیدۂ صبح کا ظہور ہوتا ہے، پھر آپ کو خلوت محبوب ہوگئی اور حرا میں مشغولِ عبادت رہنے لگے۔ گاہے گاہے آپ اہل وعیال کے پاس بھی تشریف لے آتے تھے، حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) آپ کے لیے کچھ توشہ طیار کرتیں اور آپ اُس کو لے کر پھر غار میں واپس تشریف لیجاتے، اسی طرح حرا میں مشغولِ استغراق وعبادت تھے کہ اچانک ایک روز آپ پر خدا کا فرشتہ نمودار ہوا اور کہنے لگا: "اقرأ۔ پڑھیے" نبیِ امی نے کہا "ما انا بقاری"۔ میں پڑھنا نہیں جانتا" پیغمبر ارشاد فرماتے تھے "کہ جب میں نے فرشتہ سے یہ کہا تو اس نے مجھ کو گرفت میں لے لیا جس کی شدت سے مجھ کو تکلیف محسوس ہونے لگی اور پھر چھوڑ کر مجھ سے دوبارہ کہا "پڑھیے" اور میں نے وہی جواب پھر دیا "میں پڑھنا نہیں جانتا" تب اُس نے پھر وہی عمل کیا اور گرفت چھوڑ کر تیسری مرتبہ پھر پہلا جملہ دُہرایا اور میں نے بھی وہی سابق جواب دیا، غرض تین مرتبہ یہی گفتگو اور یہی عمل ہوتے رہنے کے بعد چوتھی مرتبہ فرشتہ نے (سورۂ اقرأ کی) یہ چند آیتیں تلاوت کیں۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ۔ "اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا، اس نے انسان کو خونِ بستہ سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا پروردگار بہت کرم کرنے والا ہے جس نے قلم (تحریر) کے ذریعہ (انسان کو) علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جس سے وہ ناواقف تھا[1]" غرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کو دہرایا اور یہ آپ کے ذہن نشین ہوگئیں، اس کے بعد جب حرا سے فارغ ہوئے تو یہ حالت کہ قلب (شدتِ وحی سے) کانپ رہا تھا آپ نے مکان میں داخل ہوتے ہی فرمایا: "مجھ کو کپڑا اُڑھاؤ، مجھ کو کپڑا اُڑھاؤ" (حضرت) خدیجہ نے فوراً کپڑا اُڑھا دیا، جب آپ کو سکون ہوا تو خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کو تمام واقعہ کہہ سُنایا اور پھر فرمایا: "خشیتُ علیٰ نفسی مجھے جان کا خوف ہے[2]" (حضرت) خدیجہ نے سُن کر عرض کیا: "قسم بخدا، خدا آپ کو ہرگز رسوا نہیں کریگا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمان داری، بیچاروں کی چارہ گری فرماتے اور مفلس کے لیے ذریعہ معاش مہیا کرتے ہیں، اور حق رسی کی کرٹھی سے کڑی مصیبت میں مددگار بنتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ زمانۂ جاہلیت کے ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سچی عیسائیت کو قبول کرلیا تھا، عبرانی زبان سے واقف، اور انجیل کی کتابت کیا کرتے تھے اور بہت ضعیف العمر اور نابینا تھے، (حضرت) خدیجہ نے ورقہ سے کہا: برادرِ من! آپ اپنے بھتیجے کا واقعہ

[1] حضرت شاہ عبدالقادر (رحمۃ اللہ) اس آیت کی تفسیر میں بہت ہی لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں، موضح القرآن میں لکھتے ہیں۔ "اوّل جبرئیل وحی لائے تو یہی پانچ آیتیں، حضرت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی لکھا پڑھا نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ قلم سے بھی علم وہی دیتا ہے یوں بھی دیتا ہے (یعنی بغیر رسائل بھی وہی طور پیدا) دیگا

[2] یعنی مجھے یہ خوف ہے کہ ابتدا میں وحی کے بار کو برداشت نہ کرسکوں۔

تو سُنیے" ورقہ نے دریافت حال کیا تب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گذرا ہوا واقعہ سُنایا، ورقہ نے سُنا تو کہا: ہٰذا الناموس الذی کان ینزل علیٰ موسیٰ۔ یہ وہ فرشتہ (جبرئیل) ہی جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی الٰہی لے کر آیا کرتا تھا، کاش کہ میں اُس وقت تک زندہ رہوں جب تیری قوم تجھ کو تیرے وطن (مکہ) سے نکالیگی" آپ نے دریافت کیا: کیا میری قوم مجھ کو وطن سے بے وطن کریگی" ورقہ نے کہا: "بیشک ایسا ہوگا اور جس پیغام کے لیے خدا نے آپ کو پیغمبر بنایا ہی تو اس خدمت پر جو بھی مامور ہوا اُس کے ساتھ یہی صورت پیش آئی ہی، پس اگر وہ وقت میری زندگی میں آیا تو میں پوری قوت کے ساتھ تیری حمایت کرونگا" مگر ورقہ کو یہ وقت نہیں آیا اور اس سے قبل ہی اُن کا انتقال ہوگیا۔[۵]

حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی

صدیقہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی حدیث میں نزولِ وحی کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو فوری تاثر ہوا اُس کو خود زبانِ مبارک سے اس طرح ظاہر کیا گیا ہی "انی خشیت علیٰ نفسی" اور پھر اُس کے متصل ہی حضرت خدیجہ کے تسکین دہ الفاظ منقول ہیں تو یہ واقعہ کا ایسا پہلو ہی جس کی فطری صداقت اور غیر مصنوعی سادگی خود بخود دل میں اُتر جاتی ہی اور واقعہ کا نقشہ اس طرح سامنے آجاتا ہی کہ ایک صادقؐ امین ہستی اپنی پاک اور بے لوث زندگی کے ساتھ ایک غار میں محوِ استغراق ہی اس کے قلب میں خدائے برتر کے لیے عشق سے سرشار جذبۂ عبودیت موجزن ہی، وہ شرک اور گناہوں کی آلودگیوں سے نفور و بیزار گوشۂ تنہائی کو پسند کر کے پہاڑ کے ایک غار میں سرگرمِ عبادت ہی، یہ سلسلہ اگرچہ عرصہ سے جاری ہی مگر اچانک ایک روز خدا کا فرشتہ (جبرئیل) جو ہمیشہ سے خدا کے پیغمبروں کے پاس وحی لے کر آتا رہا ہی اُس پر ظاہر ہوتا ہی اور وحی الٰہی کی پیغام رسانی کرتے ہوئے اُس کو نبوت و رسالت کی بشارت دیتا ہی۔ یہ ہستی چونکہ اس سے قبل اس منصبِ جلیل

---

[۵] بخاری باب کیف کان بدء الوحی علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کی حقیقت سے نا آشنا تھی اس لیے اس حیرت زا خبر اور وحی الٰہی کی عظیم ترین روحانی قوت کے زبردست اثر نے جو فوری انقلاب ذاتِ اقدس میں پیدا کیا اُس کی وجہ سے یہ تشویش اور گھبراہٹ کا رونما ہونا ایک فطری بات تھی "خشیت علی نفسی" کی مراد یہ نہیں تھی کہ جان کا خوف آپ کو پریشان کیے ہوئے تھا، ایک عربی نژاد، قریشی الاصل اور شخصی شجاعت کے مالک سے اس قسم کی توقع کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس بارِ عظیم کو برداشت بھی کر سکیگا یا نہیں؟ چنانچہ اس اعلیٰ تاثر کو اُس مقدس انسان کی رفیقۂ حیات خدیجۃ الکبریٰ نے محسوس کرتے ہوئے اُس کے اخلاقِ کریمانہ اور اوصافِ حمیدہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ایسی ہستی ناکام زندگی کے لیے نہیں ہوتی اور خدا کبھی آپ کو رسوا نہیں کریگا، اور پھر اُس مقدس پیغمبر کو ورقہ کے پاس لے گئیں تاکہ ایک ایسے شخص سے جو عرصہ سے خدا کی وحی اور خدا کی کتاب کا ذکر کرتا رہتا ہے، اس اجمال کی تفصیل معلوم کریں۔

اس صاف اور سادہ بات کو دیکھیے اور پھر بعض مستشرقین یورپ کی اُس مضحکہ خیز نکتہ چینی پر نظر ڈالیے جو تعصب اور کوتاہ نظری کی عینک لگا کر کی گئی ہے۔

> "اگر پیغمبر اسلام پر حرا میں وحی الٰہی کا نزول اور فرشتہ کا ظہور ہوا ہوتا تو پھر آپ وحیِ الٰہی سے فیضیاب ہو کر اور منصب رسالت کی بشارت سُن کر یہ کیوں فرماتے "انی خشیت علی نفسی" اور خدیجہ کو تسکین دینے کی ضرورت پیش نہ آتی کیا آپ کو خُدا پر بھروسہ نہیں تھا۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا، حقیقت حال کیا تھی اور اُس کو رنگ و روغن دے کر کیا بنا دیا؟ یہاں نہ خدا پر عدم اعتماد کی کوئی جھلک ہے اور نہ فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول پر ریب و شک کا معاملہ ہے بلکہ اس حقیقت کے اعتراف ہی کی وجہ سے جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اُس کا ایک فطری تاثر ہے جو آپ کی صداقت کا مزید ثبوت فراہم کرتا ہے، کیونکہ اگر اس کے برعکس کہیں آپ اس واقعہ کو اس طمطراق کے ساتھ پیش فرماتے کہ گویا

ذاتِ اقدس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ جانی بوجھی بات ہے تب البتہ اس کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ اس شخص نے (دعوئے نبوت کے لیے) پہلے سے ایک منصوبہ قائم کر رکھا تھا اور حرا کی خلوتیں بھی اسی مقصد کے لیے تھیں چنانچہ اب موقع دیکھ کر اس نے یہ اعلان کر دیا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے۔

بہر حال اس مسئلہ پر ہم نے مختصر طور پر جو کچھ لکھا ہے علماءِ اسلام نے مختلف اسالیبِ بیان کے ساتھ اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے مثلاً مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین بن کثیر (رحمہ اللہ) ارشاد فرماتے ہیں۔

ثم قال: "لقد خشيت على نفسي" وذلك	آپ نے پھر فرمایا "لقد خشیت علی نفسی" یہ اس لیے
لانه شاهد امرًا لم يعهده قبل ذلك	فرمایا کہ آپ نے ایک ایسی حقیقت کا آج مشاہدہ
ولا كان في خلده [1]	کیا کہ اس سے قبل اُس سے واقف نہیں تھے اور

نہ کبھی آپ کے دل میں یہ خیال گذرا تھا کہ ایسا کچھ پیش آئیگا۔

اور حکیم الامۃ شاہ ولی اللہ دہلوی کی لطیف توجیہ کا حاصل یہ ہے۔

پھر آپ پر غارِ حرا میں حق (وحی) کا نزول ہوا، جب فرشتہ اور آپ کے درمیان سلسلۂ کلام ختم ہو گیا تو آپ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جس کو ہم اپنی زبان میں "تشویش و اضطراب" سے تعبیر کرتے ہیں اور حقیقت میں یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس کا پیش آنا فطری تھا اس لیے کہ جب نزولِ وحی کی وجہ سے آپ کے بشری قُویٰ پر ملکوتی صفات نے اثر کیا تو دو متضاد قوتوں کے درمیان تصادم اور پھر ملکوتی قوت کے غلبہ کی وجہ سے آپ کے اندر تشویش پیدا ہو جانا یقینی تھا یہی وجہ ہے کہ ابتداءِ نزولِ وحی کے بعد کچھ مدت تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا کیونکہ انسان بشریت اور ملکیت دو جہات کے درمیان محصور ہے پس جس ہستی کی بشریت پر ملکوتی صفات غالب آکر اُس کو ظلمتوں سے نور کی جانب لے جاتی ہیں تو جس قوت

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۳ صفحہ

کے ساتھ یہ غلبہ اپنا اثر کرتا ہے، انسان اپنے اندر اُسی شدت کے ساتھ بشریت و ملکیت کے درمیان تصادم اور تزاحم محسوس کرتا ہے اور شدتِ تصادم کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کی ملکوتی قوت و استعداد کو اس درجہ کامل و مکمل کر دے جو منصبِ نبوت و رسالت کے لیے ضروری ہے حتیٰ کہ اس کی قوتِ بشری (قوت بہیمی وحیوانی) قوتِ ملکوتی کے ہاتھ میں پوری طرح تابع اور منقاد ہو جاتی ہے اور اب وہ ہستی جس کو فیضانِ نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے مطمئن اور تصادم کی کشمکش سے بالاتر ہو کر اس منصب جلیل (نبوت و رسالت) کی خدمت کے قابل ہو جاتا ہے۔[۱]

بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق

"نبوت" اور "بشریت" کے درمیان اس درجہ نازک رشتہ ہے کہ قرآن حکیم کی "تعلیم" سے قبل پیروانِ مذاہب و ادیان نے اس راہ میں بھی اعتدال کو ترک کر کے افراط اور تفریط کو اُسوہ بنا لیا تھا، اور اس بارہ میں اُن کو سخت ٹھوکر لگی تھی چنانچہ بعض پیروانِ مذہب نے یہ دیکھ کر کہ نبی اور رسول باوجود اس امر کے کہ وہ انسان اور بشر کی شکل و صورت رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی افرادِ انسانی سے جدا ایسی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے جو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے بھی دوسروں کو حاصل نہیں ہوتیں اس لیے دراصل وہ بشر نہیں بلکہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے جس نے انسانوں کی نجات کے لیے جامۂ بشریت اختیار کر لیا ہے۔[۲] اس کے برعکس دوسری جماعت نے یہ کہا کہ نبوت و رسالت کوئی منصب نہیں ہے کہ خدا کی جانب سے "عطیۂ مناصب" کی طرح دیا جاتا ہو بلکہ اخلاقِ کریمانہ اور صفاتِ حمیدہ کا وہ اعلیٰ درجہ ہے جو ہر ایک انسان اپنی روحانی جدوجہد سے حاصل کر سکتا ہے اور کہتے ہیں کہ اگرچہ عطا و بخشش ہر شے کے لیے اسی جانب (خدا کی جانب) سے ہے لیکن کسی شے کا بطور "منصب" عطا ہونے کی حدود میں محدود رہنا اور

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۱۳۔ [۲] اوتار اور ابن اللہ کا عقیدہ دراصل ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔

روحانی جد وجہد سے ہر شخص کے حاصل کر لینے کے لیے اُس کا دروازہ کھلا رہنا ان دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ "نبوت" بھی اور درجاتِ روحانیت کی ہی طرح ہے اور عطاء منصب کی شکل میں خاص امتیاز نہیں رکھتی

قرآنِ حکیم نے اس افراط وتفریط کو ختم کرنے کے لیے "نبوت ورسالت کی حقیقت کو" بہت عمدہ طریقوں سے آشکار کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کے لیے جو مختلف درجاتِ ہدایت کا سلسلہ قائم کیا ہے اُس کا اعلیٰ درجہ "ہدایت وحی" کا ہے اور یہ انسان کی روحانیت اور مقصدِ حیات کی کامرانی کا کفیل وضامن ہے اور جبکہ ہدایت کا یہ سلسلہ "انسانی راہنمائی کے لیے" ہے تو عقلِ تسلیم کا تقاضا یہ ہے کہ یہ درجہ "انسان" ہی کو بخشا جائے لیکن کیا ہر شخص کو جُدا جُدا بخش دیا جائے، نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ یہاں درجاتِ عقل مختلف ہیں اور درجاتِ استعداد میں بھی تنوع موجود ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ کسی خاص ہستی کو اس کے لیے چن لیا جائے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انتخاب کی نوعیت کیا ہونی چاہیے، یہ کہ جو عمدہ صلاحیتوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مجاہدات اور ریاضات کے ذریعہ نفس پر قابو پائے یا یہ کہ خدائے تعالیٰ جس کو یہ درجہ عطا فرمائے اُس کی صلاحیتوں اور اُس کی استعدادات کی تخلیق ہی اس طرح کر دے کہ صدق وامانت اس کا مایۂ خمیر بنا ہوا ور خارجی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہ ہو، یہ جُدا امر ہے کہ خدائے برتر کے سامنے اظہارِ عبودیت اور تقرب الی اللہ کے لامتناہی فیض سے فیضیاب ہونے کے لیے اس سلسلہ کو کبھی کلیتہً ترک نہ کرے۔ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عقل وبصیرت اس فیصلہ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ یہاں دوسری شکل عمل میں آنی چاہیے، اس لیے کہ جس طرح خدائے برتر کے مقررہ قانونِ قدرت نے "ہدایت وحی" سے پہلے کے مختلف درجاتِ ہدایت کو انسان کے مجاہدہ وریاضت پر موقوف نہیں رکھا اور اس بخشش وفیض کو حسبِ حال "عطیۂ الٰہی" کی حیثیت میں رکھا ہے یعنی

"وجدان" "حواس" اور "عقل" یہ سب درجاتِ ہدایات کا جب یہی حال ہے کہ وہ جدوجہد سے نہیں بلکہ "عطیۂ الٰہی" سے ملتے ہیں تو "ہدایتِ وحی" بھی جس کو بخشا جائے وہ بطور "منصب و عطیہ" کے ہی عطا ہو۔ البتہ یہ ازبس ضروری ہے کہ جس کو بھی بخشا جائے اُس کی روحانی صلاحیتیں اور استعدادات ہر طرح اس منصب کی اہل ہوں اور ایسی ہستی کو عطا نہ ہو کہ اُس کی صلاحیت و استعداد عطا کرنے والی کی بے سلیقگی پر چشمک زن ہو۔

غرض "نبی" اور "رسول" اُس ہستی کو کہتے ہیں جو لوازمِ بشریت کے ساتھ اپنے تقدس و طہارت اور اخلاقِ حسنہ و اوصافِ حمیدہ کے اُس بلند مقام پر فائز ہو اور اُس کے صفات صدق و امانت اس درجہ مسلّم ہوں کہ اُس کو "بشرِ معصوم" کہہ سکیں، وہ نہ خدا ہوتا ہے اور نہ ابن خدا بلکہ خدا کی جانب سے "ہدایتِ وحی کا حامل" "مخلوقِ خدا کے لیے "خدا کا ایلچی" اور اُن کی ہر قسم کی "رشد و ہدایت کا کفیل" ہو، چونکہ وہ بشر ہے اس لیے افرادِ نسلِ انسانی سے تعلق رکھتا ہے اور چونکہ ہر قسم کی آلودگیوں اور گناہوں سے پاک اور "معصوم" ہے، اس لیے اس کو اللہ سبحانہ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل ہے پس نبوت و رسالت کا بشریت کے ساتھ یہی وہ تعلق ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے بری اور حقیقتِ حال کے لیے آئینہ دار ہے۔ اور اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود زبانِ وحی ترجمان سے ظاہر فرمایا ہے "انما انا قاسم واللہ یعطی"۔ خدا دینے والا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں" یعنی ایک جانب خدا سے "وحی ہدایت" حاصل کرتا ہوں اور دوسری جانب خدا کے بندوں تک اُس کو پہنچا دیتا ہوں۔ یہی میرا فریضۂ رسالت و نبوت ہے۔ اور اسی حقیقت کو قرآنِ حکیم نے مختلف اسالیبِ بیان کے ساتھ اس سلسلہ کے غلط کار لوگوں کی ہدایت کے لیے اس طرح بیان کیا ہے۔

قُلْ سُبْحٰنَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ کہہ دیجیے پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے میں نہیں ہوں مگر انسان اور خدا کا ایلچی (رسول)

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِىَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ

(الاعراف)

وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا چاہتا ہے، اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا، اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے (گناہوں کی پاداشِ عمل سے) خبردار کرنے والا اور (نیک عمل پر) بشارت دینے والا ہوں۔

قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ۙ وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ

(مریم)

(عیسیٰ نے) کہا: "میں اللہ کا بندہ ہوں، اُس نے مجھ کو (ہدایتِ انسانی کے لیے) کتاب دی اور مجھ کو "نبی" بنایا اور اُس نے مجھ کو بابرکت کیا، خواہ میں کسی جگہ ہوں۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى

(طٰہٰ)

تم (موسیٰ و ہارون) اُس (فرعون) کے پاس جاؤ اور کہو۔ ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کر دے اور اُن پر سختی نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آ گئے۔ اُن پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا

(النساء)

یہ تمام رسول (خدا پرستی و نیک عملی کے نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکارِ حق کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے (اور اس لیے بھیجے گئے تھے) کہ اُن کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں اور (خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔

وَمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔ (احزاب)	اور (نیکی کے انجام پر) بشارت دینے والا اور (بدی کے انجام سے) ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی راہ کی طرف اس کے حکم سے اور بھیجا روشن چراغ بنا کر۔
عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۔ لِيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (الآیۃ) (الجن)	وہ (خدا) غیب کی تمام باتوں کا جاننے والا ہے پس وہ اپنے غیب (کے معاملات) پر کسی کو خبردار نہیں کرتا مگر جس کو پیغمبر بنا کر چن لے پس بلاشبہ وہ (خدا) اس رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان چلاتا ہے (یعنی اُس کو اس بات سے محفوظ رکھتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی خبر میں شیطان یا اس کا نفس کوئی ملاوٹ کر سکے اور اُس کو شبہ پڑ جائے کہ یہ خدا کی وحی ہے یا کچھ اور) تاکہ خدا یہ ظاہر کر دے کہ انھوں نے (رسولوں نے) بلاشبہ اپنے پروردگار کے پیغام (ٹھیک ٹھیک) پہنچا دیے)

اِن آیات کی تفسیر میں حضرت شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہ) یہ تحریر فرماتے ہیں

"یعنی رسول کو خبر دیتا ہے غیب کی پھر چوکیدار (فرشتے) رکھتا ہے اُس کے ساتھ کہ اُس میں شیطان دخل نہ کرنے پاوے اور اپنا (رسول کا) نفس غلط نہ سمجھے یہی معنی ہیں اس بات کے کہ پیغمبروں کو عصمت ہے اوروں کو نہیں اور اُن کا معلوم "بے شک" ہے اوروں کے معلوم میں شبہ ہے۔ ۱۲ منہ

"نبی" اور "رسول" سے متعلق مسطورۂ بالا افراط و تفریط کے ساتھ ساتھ مشرکین عرب ایک نئی گمراہی میں مبتلا تھے وہ کہتے تھے کہ اول تو "پیغمبر" کا وجود ہی ہمارے لیے اچنبھے کی بات ہے اور اگر یہ اچنبھا ہونا ہی تھا تو اس کے لیے ہماری طرح کا ایک انسان ہی کیوں چنا گیا، کیوں ایک "فرشتہ" نہ بھیجا گیا، اور اگر انسان ہی بھیجا تھا تو یا تو مکہ اور طائف کی کسی متمول، سرمایہ دار ہستی کو پیغمبر بنایا جاتا اور نہ اس کو ہی غیب سے خزانے اور سب نظیر باغات

عطا کیے جاتے تب ہم سمجھتے کہ بیشک یہ خدا کا فرستادہ ہے۔

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ۝ أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ......

اور وہ (مشرکین) کہتے ہیں، یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے ساتھ آسمان سے فرشتہ اُترتا اور وہ خدا کے پیغام سے خبردار کرتا یا ایسا کیوں نہ ہوا (کہ ہماری آنکھوں دیکھتے) اُس پر آسمان سے خزانہ اترآتا یا قدرتی باغ ہوتا کہ وہ (ہر وقت مرضی کے مطابق) اُس کے (پھل) کھاتا....

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُونَ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ۝ (فرقان)

اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی ایسے ہی پیغمبر بھیجے تھے جو کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (یعنی پیغمبری کے لیے بشریت منافی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے لیے انسان ہی پیغمبر ہونا چاہیے) اور ہم نے (انسانوں میں سے انسان ہی کو پیغمبر بنا کر) ایک دوسرے کی آزمایش کا سامان کر دیا کہ آیا تم صبر و استقامت کا ثبوت دیتے ہو یا نہیں اور تیرا پروردگار بلاشبہ (انسانوں کے کردار کا) دیکھنے والا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكًا لَقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُونَ ۝ (انعام)

اور وہ کہتے ہیں اس پر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) کیوں فرشتہ نہیں اُتارا گیا اور اگر ہم فرشتہ اُتارتے تو البتہ (نتائج اعمال کا) فیصلہ کر دیا جاتا اور پھر وہ مہلت نہ دیے جاتے، اور اگر ہم اس کو فرشتہ کر دیتے تو بھی (انسانوں کی ہدایت کے لیے اس کو بصورت انسان ہی ظاہر کرتے اور (اس طرح) ہم پھر اُن لوگوں کو اس شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب مبتلا ہیں۔

اس جگہ اُن کی گمراہی کو دو دلائل سے واضح کیا ہے ایک یہ کہ ایمان و اعتقاد کی زندگی سرتاسر "غیب"

سے متعلق ہی پس اگر انسان کو اسی عالم میں عالمِ غیب کے معاملات کا مشاہدہ کرا دیا جائے اور پھر بھی وہ انکار پر جما رہے تو خدا کا قانون "امہال" (مہلت کا قانون) نافذ نہیں ہوگا بلکہ نتائجِ اعمال کا فوراً ہی ظہور ہو کر رہیگا اور یہ اُن کے لیے بھی مضر ہے اور خدا کی حکمتِ رحمت و ربوبیت کے بھی خلاف ہی۔ دوسری دلیل یہ کہ انسان دنیا میں اگر فرشتے کے ذریعہ "ہدایت وحی" کو بھیجا جائے تو انسان کس طرح اس سے مانوس ہو سکتے ہیں پھر اگر اُسے بھی انسان ہی کی شکل میں بھیجیں تو شبہ کرنے والوں کا شبہ اسی طرح قائم رہیگا اس لیے عقل و نقل دونوں کا فیصلہ یہی ہی کہ ہدایتِ انسان کے لیے "انسان" ہی کو مبعوث ہونا چاہیے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ	اور لوگوں کے پاس جب ہدایت آپہنچی تو اُن کو ایمان
جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا	لانے سے کسی بات نے نہیں روکا مگر اس نے کہ وہ
اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ	کہتے ہیں "کیا خدا کسی بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجیگا۔ اے پیغمبر!
لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ	کہہ دیجیے "اگر زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتوں کی آبادی
يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ	ہوتی اور وہ اس پر چلتے پھرتے تو ہم ضرور اُن کے لیے
مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل)	آسمان سے فرشتہ کو ہی رسول بنا کر بھیجتے۔
وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا	اور (اے پیغمبر) ہم نے تجھ سے پہلے بھی جن پر وحی
نُّوْحِىْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ	نازل کی ہو وہ انسانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھے
اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ	پس (اے معترضین) اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے
جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا	والوں سے دریافت کر لو اور نہ ہم نے اُن کو بیجان
كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ (الانبیاء)	(دھڑ) بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ
	(خدا کی طرح) ہمیشہ رہنے والے تھے۔

بہرحال ان آیات میں قرآنِ عزیز نے علمی اور تاریخی دونوں قسم کے دلائل سے یہ صاف کر دیا کہ کائناتِ انسانی کی ہدایت کے لیے "انسان" کا نبی اور ہادی ہونا فطری بات

ہے اور اس لیے اقوامِ ماضیہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

پھر اس مسئلہ کی جانب بھی توجہ کی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق سرداری، سرمایہ داری اور جتھہ بندی سے کچھ نہیں ہے اور اُس کے لیے جن فطری اعلیٰ ملکات و استعداد کی ضرورت ہے اُن کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے کہ کون اس "منصب" کا اہل ہے۔

وقالوا لولا نزل ھذا القراٰن	اور وہ کہتے ہیں یہ قرآن کیوں ان دو بستیوں (مکہ
علی رجل من القریتین عظیم	اور طائف) کے کسی سردار پر نازل نہیں ہوا، (تو)
اھم یقسمون رحمۃ ربک نحن	کیا تیرے پروردگار کی رحمت کو یہ تقسیم کرنے والے ہیں
قسمنا بینھم معیشتھم فی	(نہیں، بلکہ) ہم نے ہی ان کے درمیان ان کی
الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم	دنیوی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ہم نے ہی بعض
فوق بعض درجٰت لیتخذ	انسانوں کو بعض پر بلندی درجات عطا کی ہے تاکہ بعض
بعضھم بعضا سخریا ورحمت	بعض کے مسخر رہیں (یعنی بعض مقتدی ہوں اور بعض
ربک خیر مما یجمعون	مقتدیٰ بعض پیغمبر ہوں اور بعض اُمتی) اور تیرے
	پروردگار کی رحمت (نبوت) اُس (دولت و ثروت) سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو وہ خزانہ کیے ہوئے ہیں۔

واذا جاءتھم اٰیۃ قالوا	اور جب اُن کے پاس خدا کی جانب سے کوئی آیت آتی ہے تو یہ
لن نؤمن حتی نؤتی مثل	(مشرکین) کہتے ہیں: "ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب
ما اوتی رسل اللہ اللہ	تک ہم کو بھی وہی چیز (وحی) نہ دی جائے جو خدا کے رسولوں
اعلم حیث یجعل رسلتہ	کو دی گئی (لیکن ایسا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ) اللہ ہی خوب
	جانتا ہے کہ وہ اپنے "منصبِ رسالت" کو کس کے سپرد کرے۔

اور یہ بات تو بہت واضح اور صاف ہے کہ جس شخص کو کوئی منصب عطا کیا جائے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر طرح اس کے لیے جوہرِ قابل اور اہل ہونا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں

کہ ہر ایک جوہرِ قابل کو وہ "منصب" ملے کیونکہ معطی کی مصلحت ہی خوب فیصلہ کر سکتی ہے کہ کس کو ملے اور کس کو نہ ملے چہ جائیکہ جوہرِ قابل بھی نہ ہو۔ اس لیے ضروری ہوا کہ جو نبی اور رسول ہو وہ ہر حیثیت سے "انسانِ کامل" اور گناہوں سے "معصوم" ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو شخص بھی اخلاقِ حمیدہ اور روحانی مجاہدات کے ذریعہ "تقدیس" کا درجہ حاصل کر سکا ہو وہ منصبِ نبوت پر بھی ضرور فائز ہو۔

بہرحال نبوت "منصب" ہے "ڈگری" نہیں ہے، اور اس لیے جن کو دیا بھی جاتا ہے ان کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ تم پر فضلِ خداوندی ہے ورنہ اگر وہ تم سے اس کو سلب کر لینا چاہے تو تمہاری طاقت بلکہ کائنات کی طاقت سے باہر ہے کہ پھر یہ تم کو مل سکے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ	اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو تجھ پر ہم نے وحی کی
اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ	ہے اس کو چھین لیں اور پھر تجھ کو کوئی بھی ایسا کارساز نہ
بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ	ملے جو ہم پر زور ڈال سکے لیکن (یہ جو سلسلۂ وحی جاری
رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ	ہے تو) اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تیرے پروردگار کی رحمت
كَبِیْرًا ۝ (بنی اسرائیل)	سے ہے اور یقین کر کہ تجھ پر تیرے پروردگار کا بڑا ہی فضل ہے

نبی اور مصلح مسطورہ بالا تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چونکہ "نبی" اور "رسول" کو براہِ راست خدائے برتر سے شرفِ مکالمت حاصل ہوتا ہے یا خدا کا معصوم فرشتہ خدا کی وحی لا کر سناتا ہے اس لیے اُس کا ذریعۂ علم "علم یقین" کا وہ درجہ رکھتا ہے جس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی اور اُس کے علاوہ تمام ذرائع علمِ یقین کے اس درجہ سے نیچے ہیں بلکہ اُن کی افادیت "ظن" سے آگے نہیں بڑھتی اس لیے اگر ایک مردِ صالح اپنی قوم یا نوعِ انسانی کی اصلاحِ حال کے لیے اگر کوئی قدم اُٹھائے تو مقدس سے مقدس تر ہونے کے باوجود اُس کے اپنے طریقۂ اصلاح میں غلطی کا وقوع اور امکان دونوں موجود رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ ایسی فاش غلطی کر گذرتا ہے کہ اُس سے فائدہ پہنچنے کی بجائے قوم

کو نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، اس لیے ایک "نکو کار مصلح" یہ کبھی دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ اصلاحِ حال کے لیے جو کچھ اپنی جانب سے کہتا ہے غلطی سے پاک ہے مگر ایک "نبی" اور "رسول" کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ یہ بھی اعلان کرے کہ میں خدا کی جانب سے اصلاحِ حال کے لیے خدا کا پیغام رساں ہوں اور یہ بھی دعویٰ کرے کہ وہ جو "تعلیم و اصلاح" پیش کر رہا ہے خدا کا فرمودہ ہے اور اس لیے ہر قسم کی غلطی اور لغزش سے پاک اور محفوظ ہے، وہ یہ نہیں کہیگا کہ یہ میرے دل کی آواز ہے یا اندر سے جو آواز آتی ہے اُس کا نتیجہ اور ثمرہ ہے بلکہ صاف صاف یہ کہیگا کہ اس میں میرا اپنا کچھ نہیں میں تو صرف ایلچی اور پیغامبر ہوں یہ جو کچھ بھی ہے خدا کا فرمان اور اُس کی "وحی" ہے۔

چنانچہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ ان دونوں باتوں کو واضح کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہر ایک پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلان کرے کہ خدا نے ان کو اپنی "ہدایتِ وحی" کے لیے چن لیا ہے اور وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ اُن پر وحی کیا جاتا ہے اُس کو حرف بہ حرف اُمت تک پہنچائیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝ (الاعراف)	(نوح نے) کہا: اے میری قوم! مجھ کو گمراہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ میں تو تمام کائنات کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں، تم تک اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام پہنچاتا ہوں، اور تمہاری خیرخواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی باتوں میں سے وہ باتیں جانتا ہوں جن سے تم بے خبر ہو

اور حضرت ہود اور قوم کے درمیان مکالمہ میں حضرت ہود نے یہ اعلان فرمایا:

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝	(ہود نے) کہا: اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں لیکن میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝ (الاعراف)

میں اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور (پیغام الٰہی اور خیر خواہی میں) صاحب امانت ہوں۔

اور صالح (علیہ السلام) نے یہ فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ (الاعراف)

(صالح نے کہا اے قوم: بلاشبہ میں نے تم کو اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہی کرنے والوں کو ناپسند کرتے ہو۔

اور حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے یہ ارشاد فرمایا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ (مریم)

اور یاد کرو کتاب (قرآن) میں ابراہیم کا حال، بلاشبہ تھا وہ بہت ہی صادق اور "نبی" جب اُس نے اپنے باپ سے کہا "اے باپ! ایسی چیز کی پوجا کیوں کرتا ہے جو سنتی ہے، نہ دیکھتی ہے اور نہ تجھ کو کسی (نقصان) سے بے پرواہ کرتی ہے (یعنی بت پرستی کیوں کرتا ہو)؟ اے باپ! بلاشبہ مجھ کو علم (وحی) سے وہ حصہ ملا ہے جو تجھ کو حاصل نہیں ہے پس میری پیروی کر میں تجھ کو سیدھی راہ دکھلاؤنگا"

اور لوط (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے مکالمہ کرتے ہوئے یہ فرمایا۔

اذ قال لهم اخوهم الا تتقون ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء)

جب کہا اُن سے اُن کے بھائی (لوط) نے کیا تم پرہیزگاری اختیار نہیں کرتے، بلاشبہ میں تمہارے لیے خدا کا بھیجا ہوا ہوں (اور اس پیغام بری میں) صاحب امانت ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

اور حضرت یعقوب و یوسف (علیہما السلام) کے ایک طویل حیرت زا واقعہ کے

ضمن میں یعقوب (علیہ السلام) کا وہ مقولہ بھی منقول ہے جس میں اُنہوں نے اپنے بیٹے یوسف (علیہ السلام) کو وحی الٰہی کے ذریعہ یہ بشارت دی ہے کہ جس طرح خدا نے تیرے باپ، دادا ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) کو پیغمبری عطا فرمائی اُسی طرح تجھ کو بھی اس منصبِ جلیل سے سرفراز کریگا۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ	اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو چن لیگا" اور تجھ کو تعبیر
يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ	رؤیا کا علم بخشیگا اور تجھ پر اپنی نعمت (نبوت) کی تکمیل
وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ	کریگا اور اولاد یعقوب پر (جو اس کے اہل ہونگے)
يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ	جیسا اُس نے اس سے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم
مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ	اسحٰق پر اس (نبوت) کو پورا کیا بیشک تیرا پروردگار
رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (یوسف)	جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔

اور پھر حضرت یوسف (علیہ السلام) کی تبلیغ و دعوت کا اس طرح قرآن میں مذکور ہے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ	اے میرے قید کے رفیقو! کیا بہت سے آقا اور خداوند
مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ	بہتر ہیں یا یکتا خدا کی ذات جو ہر شئی پر غالب ہے، تم
الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ	اس کے سوا جس کو پوجتے ہو اُن کی حقیقت اس کے
اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ	سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے
اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ	باپ دادوں نے گڑھ لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے
سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ	لیے کوئی دلیل نہیں اُتاری اور حکم تو خدا کے سوا کسی
اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ	کا نافذ نہیں ہے، اُس نے یہی حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا
الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا	کسی کی عبادت نہ کرو، دین کی سیدھی راہ یہی ہے۔
يَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف)	لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

اور حضرت شعیب (علیہ السلام) نے اصحاب ایکہ کے سامنے یہ اعلان کیا۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اصحاب ایکہ نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب اُن سے شعیب
اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ نے کہا، کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، بلاشبہ میں تمہارے
اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا لیے (خدا کی جانب سے) صاحبِ امانت پیغامبر
اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء) ہوں، پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کے دربار میں بے دھڑک یہ اعلان فرمایا

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ اور موسیٰ نے کہا: اے فرعون! بلاشبہ میں جہانوں کے
رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ پروردگار کا پیغمبر ہوں، میرے لیے یہی لائق ہے کہ میں
عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا خدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہوں، میں تمہارے
الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ پروردگار کی طرف سے "دلیل" لے کر آیا ہوں، پس تو
رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۝ میرے ساتھ بنی اسرائیل کو (آزاد کرکے) بھیج دے۔
(الاعراف) (جن کو صدیوں سے غلام بنا رکھا تھا)

اور حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کے واقعہ میں سلیمان (علیہ السلام) نے ملکۂ سبا کو دعوتِ اسلام کے لیے جو نامۂ مبارک تحریر فرمایا تھا اُس کا اسلوب بیان یہ ہے

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور یہ شروع ہے اللہ کے نام سے
اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلَّا جو رحمٰن ہے رحیم ہے بات یہ ہے کہ مجھ پر اپنی بلندی و برتری
تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ کا اظہار نہ کر (کیونکہ میں پادشاہ نہیں بلکہ پیغمبر ہوں) اور
(النمل) میرے پاس خدا کی فرمانبردار بندی بن کر حاضر ہو۔

اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے قبل ایک علاقہ میں خدا کے چند نبی دعوت و تبلیغ اسلام کے لیے مامور کیے گئے تھے اُنھوں نے اپنی قوم سے فرمایا۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّاۤ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝ اُنھوں نے کہا ہمارا پروردگار (خوب جانتا ہے کہ بلاشبہ
وَمَا عَلَيْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ ۝ ہم تمہاری جانب اُس کے بھیجے ہوئے ہیں، اور ہمارے

الْمُبِیْنُ ۝ (یٰسٓ) ہمارے اوپر اس سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں کہ امرِ حق کا صاف اور کھلا پیغام پہنچا دیں۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بار بار بنی اسرائیل کے سامنے یہ اعلان فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور میری بتلائی ہوئی راہ کے سوا کوئی راہ مستقیم نہیں کیونکہ میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں خدا کا فرمودہ ہے۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (مریم)	(عیسیٰ نے کہا بلا شبہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو "کتاب" عطا کی ہے اور اس نے مجھ کو "نبی" بنایا ہے
اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ (الصف)	جب کہا عیسیٰ بن مریم نے اے بنی اسرائیل! بلا شبہ میں تمہاری جانب خدا کی جانب سے بھیجا ہوا (رسول ہوں)

اور خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ میں تو جگہ جگہ یہ حقیقت بہت نمایاں نظر آتی ہے

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا (الاحزاب)	اے نبی! بلا شبہ ہم نے تجھ کو (حق کے لیے) گواہ اور (نیک عمل کے لیے) بشارت دینے والا اور (بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا اور خدا کے حکم سے اس کی جانب بلانے والا اور (ہدایت و صراطِ مستقیم کے لیے) روشن چراغ بنایا ہے۔
قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے: "اے لوگو! بیشک میں تم سب کی جانب اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اسی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی، کوئی خدا نہیں ہے مگر صرف وہی یکتا ذات، (وہی) زندگی بخشتا

بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ	ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے
الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ	رسول نبی امی پر جو خود اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان
وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (اعراف)	لاتا ہے اور اسی کی پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ۔
اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران)	بلاشبہ اللہ کے نزدیک (ہمیشہ سے) دین (حق) اسلام
فَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا	ہی ہے، جو شخص اسلام کے ماسوا کو دین بنانا چاہے
فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران)	تو خدا کے یہاں وہ قبول نہیں ہے۔

غرض پیغمبر اور نبی کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوتِ اصلاح اور تعلیمِ حق پر خود بھی ایمان لائے اور کائنات کے سامنے بھی یہ اعلان کرے کہ یہ "پیغام ہدایت" اور یہ "تعلیمِ حق" میری جانب سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے ہے اور اسی نے مجھ کو اپنا ایلچی بنا کر اس کی دعوت کے لیے بھیجا ہے، یہ جو کچھ ہے سب خدا کا اپنا ہے میں تو صرف اس کی جانب پکارنے والا ہوں اور اس میں شک و شبہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور یہ ہر قسم کی لغزش و خطا سے پاک "علم یقین" اور "وحیِ الٰہی" ہے جس کے متعلق خدا کا یہ فیصلہ ہے "لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید" اور "وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ" لیکن "مصلح غیر نبی" کو یہ مجاز حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوتِ اصلاح کے بارہ میں یہ دعویٰ کرے کیونکہ اس کی یہ دعوتِ اصلاح یا کسی پیغمبر اور نبی کی "ہدایت وحی" کی پیروی میں ہوگی تب تو اس کی حیثیت ایک یاددہانی کرنے والے کی ہے اور رہا ہدایت وحی کے اتباع کے ساتھ اس کے اپنے اجتہاد اور ضمیر کی آواز کا بھی دخل ہوگا تو اس کے اس حصۂ اصلاح کا لغزش، خطا بلکہ بعض اوقات غلط روی سے بھی محفوظ رہنا لازمی اور ضروری نہیں ہے۔

کیفیتِ وحی وحی سے متعلق جو حقائق سپردِ قلم ہو چکے ہیں اُن میں ایک یہ اضافہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ عربی میں وحی کے معنی "مخفی اشارہ" کے ہیں، گویا یہ فطرتِ الٰہی کی وہ سرگوشی ہے جو ہر ایک

مخلوق پر اُس کی راہِ عمل کھولتی ہو، چنانچہ قرآن نے شہد کی مکھی کے نظامِ بیت کے متعلق فطری ہدایت کو لفظ "وحی" سے ہی تعبیر کیا ہو۔

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ	اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات
اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ	ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں
مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ (النحل)	میں جو اسی غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لیے چھتے بنائے

اور مذہب و دین کی اصطلاح میں اس الہام کو کہتے ہیں جو خدائے برتر کی جانب سے نبی اور پیغمبر پر اس طرح القاء یا فرشتہ کے ذریعہ نازل کیا جاتا ہو کہ اس مقدس ہستی کو اُس کے منجانب اللہ ہونے کا روز روشن سے بھی زیادہ یقین حاصل ہو جاتا ہو اور کسی قسم کے بھی شک و شبہ اور تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اسی لیے وہ تحدّی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہو کہ یہ "خدا کی وحی" اور اُس کا بخشا ہوا "علم یقین" ہو۔ نزول وحی کی یہ صورت کس طرح پیش آتی ہو اور کون سے وہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ نبی معصوم کو خدا کی وحی کا علم ہوتا ہو؟ قرآنِ عزیز اس کے متعلق یہ کہتا ہو

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ
اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَاۤءِ حِجَابٍ اَوْ	اُس سے (اس دنیا میں بالمواجہ) گفتگو کرے مگر یا وحی
یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا	(کے القاء) کے ذریعہ یا پسِ پردہ، یا بھیجے فرشتہ کو
یَشَاۤءُ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ (شوریٰ)	پس وہ اُس کی (خدا کی) اجازت سے اُس پر وحی

لاتا ہے جو اُس کی (خدا کی) مرضی ہو۔ بلاشبہ وہ (خدا) بلند و بالا حکمت والا ہو۔

غرض "وحی" ایک خاص ذریعۂ علم کا نام ہو جو خدا کی جانب سے اس کے نبیوں اور رسولوں کے لیے مخصوص ہو اور اُس کا تعلق براہِ راست عالمِ قدس اور عالمِ غیب سے ہو اسی بناء پر اگرچہ انبیاء و رسل کو اُس کی معرفت اور اُس کے منجانب اللہ ہونے کا یقین کامل آفتاب عالمتاب سے زیادہ بدیہی ہوتا ہو لیکن وہ اُس کی حقیقی کیفیت کو دوسروں

پر تشبیہ و تمثیل ہی کے ذریعہ واضح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب بعض صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے حضرت اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نزولِ وحی کی کیفیت کے متعلق سوالات کیے تو آپ نے یہ جوابات ارشاد فرمائے

احیاناً یاتینی کصلصلۃ الجرس۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے گویا گھنٹے کی مسلسل گونج ہے" دوی کدوی النحل۔ (کبھی) جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے اس طرح کی گونج محسوس کرتا ہوں" واحیاناً یتمثل لی الملک رجلاً فاعی مایقول۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں ظاہر ہو کر مجھ کو خدا کی وحی سناتا ہے اور میں اُس کو محفوظ کر لیتا ہوں"

اِن جوابات میں کیفیتِ وحی کو اگرچہ قریب الفہم بنانے کی کافی کوشش کی گئی ہے، پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حقیقی کیفیت کو خدا اور خدا کے پیغمبر کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں پا سکتا اور پیغمبر اُس حقیقت کا اذعان اور اُس کے منجانب اللہ ہونے پر غیر متبدل یقین تو رکھتا ہے لیکن جہاں تک پر حقیقی کیفیت کو واضح کرنے سے معذور رہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لیے کہ یہ صورتِ حال تو دنیا کی بن دیکھی اشیاء کے بارہ میں بھی صبح سے شام تک ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جس شخص نے سیب کو نہیں دیکھا اور نہیں چکھا اُس کے سامنے دیکھنے اور چکھنے والا اگرچہ سیب کی حقیقت کا بہتر سے بہتر نقشہ بھی پیش کر دے اور اُس کے رنگ، مزہ، خوشبو، لطافت وغیرہ کی تعبیر بحدِ کمال بھی پہنچا دے تب بھی وہ شخص سیب کو آنکھ سے دیکھنے اور زبان سے چکھنے والے کے مقابلہ میں کسی طرح اس کی حقیقی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو سکتا، وہ بلاشبہ سیب کے متعلق صحیح علم تو حاصل کر لے سکتا ہے لیکن حقیقی ذوق کو ہرگز نہیں پا سکتا، اسی طرح نبی کی تعلیم و تلقین سے ہم "وحی" کے متعلق ایک اجمالی علم ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن اُس حقیقی کیفیت کو نہیں پا سکتے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن میں مسطور ہر سہ اقسامِ وحی میں سے پہلی

قسم "الّا وحیًا" کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے "وھو اشدہ علی فیفصم عنی وقد وعیت ما قال" اور وحی کی یہ صورت مجھ پر بہت سخت گذرتی ہے، پھر جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو وحی الٰہی نے جو کچھ کہا ہوتا ہے وہ سب مجھے محفوظ ہوتا ہے" یعنی جب فرشتہ بشکل انسان تمثل اختیار کرکے وحی الٰہی لاتا ہے یا "من وراء حجاب" براہ راست خدائے برتر سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو یہ دونوں صورتیں آپ پر آسان ہوتی ہیں مگر "القاءِ وحی" کی پہلی شکل سخت گذرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؛ اس کے متعلق علماءِ حق یہ ارشاد فرماتے ہیں۔

خالق کائنات نے انسان کو لوازمِ بشریت کی قیود و شروط کے ساتھ اس درجہ پابند بنا دیا ہے کہ انبیاء و رسل جیسی مقدس اور معصوم ہستیوں کو بھی اپنی تطہیر و تقدیس کے باوجود ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے اس لیے جب اُن پر خدا کی وحی کا نزول ہوتا اور ایسی حالت میں اُن پر عالمِ قدس کے تمام اثرات چھا جاتے اور انوار و تجلیات کی آغوش میں وہ حضرتِ حق سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں تو اس حالت میں اُن پر دو قسم کی کیفیتوں میں سے ایک کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ اُس کے بشری خواص کو مغلوب کرکے اُس کی روحانی کیفیات کو عالمِ قدس کی جانب اس درجہ بلند اور رفیع کیا جائے کہ وہ حضرتِ حق کی وحی کے اثرات قبول کرنے اور محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکے اور چونکہ جذب و انجذاب کی اس خاص حالت اور عالمِ آب و گل سے عالمِ قدس کی جانب اس مخصوص رفعت میں بشری خصوصیات اور روحانی موثرات کے درمیان سخت قسم کا تصادم پیدا ہو جاتا ہے اس لیے اس تصادم اور تزاحم سے نبی پر ابتداءً ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ جب یہ تصادم ختم ہو کر عالمِ قدس کے تمام پاک اور لطیف اثرات اُس ہستی پر چھا جاتے ہیں اور وہ اُن میں محو اور مستغرق ہو کر لذتِ وحی کو پا جاتی ہے تو پھر یہ اذیت و تکلیف یکلخت جاتی رہتی ہے اور اُس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور یہ سب کچھ چند دقیقوں میں ہو گذرتا ہے۔

یہی وہ صورتِ وحی ہے جس کی کیفیات کو ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے "صلصلۃ الجرس" اور "دوی النحل" کی تمثیلات میں سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے تمثیلات میں اس پہلو کے اختیار کرنے کی وجہ بھی مسطورۂ بالا حقیقت ہے اس لیے کہ اس صورتِ خاص میں جب بشری حواس و ادراکات پر عالمِ قدس کے روحانی اثرات کا غلبہ ہوتا ہے تو اول حواس و ادراکات میں اضطراب و بےچینی پیدا ہو جاتی ہے، اور حاسۂ سمع کہ جس کا تعلق سماعت وحی سے ہے وہ شروع میں ایک خاص قسم کی گونج محسوس کرتا ہے جو اس عالمِ پست سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی اور اس کے بعد وہ "وحیِ الٰہی" کی اصل کیفیت سے لذت اندوز ہوتا اور اس کو "علم یقین" اور "اذعانِ حق" کے ساتھ پالیتا ہے کیونکہ عالم قدس کے قوی مؤثرات اس پر غالب آکر "وحی الٰہی" کے حصول کا ہر طرح اہل بنا دیتے ہیں مگر دوسروں پر اس حقیقت کے تمام و کمال سمجھانے میں ان علامات و اثرات کے اظہار سے آگے نہیں جاتا جن کو ابھی "صلصلۃ الجرس" اور "دوی النحل" کی تعبیرات میں سن چکے ہو وحی الٰہی کی اس نوع کے علاوہ دوسری ہر دو انواع یعنی وراءِ حجاب کلامِ الٰہی کی سماعت یا فرشتہ کے ذریعہ وحی کے نزول" میں صورتِ حال برعکس ہوتی ہے اور اس وقت نبی کے بشری خواص کو عالمِ قدس کی جانب رغبت دینے اور عالمِ خاک وگل سے عالمِ نور کی جانب جذب وانجذاب سے متاثر کرنے کی تکلیف نہیں دی جاتی بلکہ عالمِ قدس کی تمام کیفیات خود ہبوط و نزول کرتی اور نبی کی روحانیت کو متاثر بناتی ہیں اور یا فرشتہ بحکم حضرتِ حق اپنے ملکوتی جسد کو جامۂ انسانیت کے ساتھ متمثل کر لیتا اور عالمِ قدس کے اثرات اور بشری خواص میں امتزاج پیدا کر کے نبی کے حضور حاضر ہوتا اور وحی الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور اس لیے ان دونوں صورتوں میں نبی اور رسول کو پہلی قسم کے تصادم سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

کیفیتِ وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی | چونکہ یورپ کے دورِ علمی کی بنیاد خالص مادیات پر قائم ہے اور

روحانی علوم اور ماورا مادیات کے ناقابلِ انکار حقائق کے لیے وہ کوئی جگہ دینے کو آمادہ نہیں ہے اس لیے بعض مستشرقین نے جب وحی الٰہی کی پہلی قسم کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال سُنے جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور وہ حالات پڑھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نزولِ وحی کی اس خاص صورت میں آپ کرب اور اضطراب محسوس فرماتے اور سردی کے ایام میں آپ کی پیشانی پر پسینہ آجاتا اور آپ پر بیخودی کے سے آثار نظر آنے لگتے تو انہوں نے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کہ یہ نزولِ وحی کی کیفیت نہیں ہوتی تھی بلکہ (العیاذ باللہ) آپ کو ہسٹریا کا دورہ ہو جاتا تھا۔

یہ مستشرقین پرزور الفاظ میں آپ کی صداقت و امانت کو تسلیم کرتے ہیں، آپ کی تعلیماتِ حق کو سراہتے اور کائنات انسانی کے لیے آپ کی تعلیمات کو "تعلیم کامل" مانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ کے دعویٰ "الہام و وحی الٰہی" کا انکار کرتے اور کیفیتِ وحی کو مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔ "سبحانك هذا بهتان عظيم"

درحقیقت یہ حضرات یا تو ازرہ تعصب ناقابلِ انکار تعلیمِ حق کے تسلیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جس سے تعلیمِ حق (اسلام) پر کاری ضرب لگ سکے اور تعصب کے الزام سے بھی بچ جائیں اور یا پھر اس علمی حقیقت سے بے بہرہ ہیں جس کو تفصیل کے ساتھ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ نزولِ وحی کی یہ کیفیت "مرض" نہیں تھا بلکہ اپنے اثرات اور محرکات کی بنا پر ایک فطری صورت حال تھی جس کا پیش آنا ازبس ضروری تھا اور دراصل یہ کیفیت دماغ حواس اور اعضائے انسانی کو مفلوج نہیں بناتی تھی جیسا کہ ہسٹریا وغیرہ میں ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس تمام مادی قویٰ میں روحانی کوائف کی ایسی برقی رو دوڑا دیتی ہے جس سے چند لمحات کے بعد ان کے اندر ایسی زبردست اور مافوق المادہ قوت پیدا ہو جاتی تھی۔ جس کے ذریعہ اُس ہستی (نبی) میں عالمِ قدس سے پوری طرح وابستہ ہو کر خدا کی وحی اور اس کے کلام کو سُننے اور قلب و دماغ میں بخوبی محفوظ رکھنے کی صلاحیت رونما ہو جائے، چنانچہ

اِسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا "فیفصم عنی وقد وعیت ما قال" شدت وکرب کی یہ کیفیت جلد ہی مجھ سے زائل ہو جاتی ہے اور میں وحی الٰہی کو تمام وکمال محفوظ کر لیتا ہوں"

کیا ہسٹریا کے دوروں کا کوئی مریض ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جس پر ایک جانب مرض کا مسلسل حملہ ہو رہا ہو اور دوسری جانب وہ علمی وعملی صلاحیتوں، معاشی ومعادی حکمتوں، اور دینی ودنیوی نعمتوں، کے لیے ایسا کامل ومکمل دستور وآئین اور اعمال افکار پیش کر رہا ہو، کائنات جس کا جواب نہ رکھتی ہو اور دوست ودشمن دونوں اُس کی رفعت وبلندی کا اعتراف کرتے ہوں؟ کیا دماغی فتور جو کہ ہسٹریا کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور دماغی رفعت وبلندی جس کے ثمرات حیرت زا اور عملی دنیا میں وقیع سے وقیع تر ہوں دونوں یکجا جمع ہو سکتے ہیں؟ اور اگر نہیں ہو سکتے اور بلاشبہ نہیں ہو سکتے تو حقیقتِ حال کو نظر انداز کرتے ہوئے "وحی الٰہی سے متعلق" مستشرقین کا یہ دعویٰ کس درجہ حقیر اور بے وقعت ہو جاتا ہے، صاحبِ عقل وبصیرت اس کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں؟

نزولِ وحی کا پہلا دور

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے سورۂ علق کی یہ آیات نازل ہوئیں

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ	پڑھو! اپنے پروردگار کے نام سے، جس نے پیدا کیا،
خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ	پیدا کیا انسان کو خونِ بستہ سے، پڑھو! اور تیرا
عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ	پروردگار جو سب سے زیادہ برگزیدہ ہے وہ ہستی ہے
الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ	جس نے سکھایا لکھنا، سکھایا انسان کو وہ سب کچھ
الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝	جو وہ نہیں جانتا تھا۔

ان آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرتِ انسان جو خدا کی سب سے بہتر اور سلسلۂ کائنات کی سب سے ترقی یافتہ مخلوق ہے اور اسی وجہ سے وہ کائناتِ ہست وبود میں "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے اُس کی خلقی کمزوریوں کا یہ حال ہے کہ اس کی نمود کی ابتداء

آبِ نجس اور خونِ بستہ سے ہوئی ہے، لیکن قدرتِ حق نے جب اس کو مقامِ رفیع بخشنے کا ارادہ کیا اور "اسفلِ سافلین" کے لائق مخلوق کو "درجاتِ علیا" پر فائز کرنا چاہا تو اُس کو وہ صفتِ اعلیٰ عطا فرمائی جو صفاتِ الٰہی میں مبدء الصفات ہے یعنی اُس کو "صفتِ علم کا مظہر" بنایا، اُس کو "قلم کے ذریعہ" لکھنا سکھایا اور علوم وعرفان کا مہبط ومحور ٹھہرایا پھر اس جانب بھی اشارہ کیا کہ بہ سلسلۂ اسباب ومسببات حصولِ علم کے تین ہی طریقے ہیں "ذہنی، لسانی، رسمی" اور علمِ ذہنی الفاظ اور رسوم ونقوش کا محتاج نہیں ہوتا، اور علمِ لسانی علمِ ذہنی کا محتاج ہے، مگر رسوم ونقوشِ کتابت سے بے نیاز، اور علمِ رسمی رسم الخط اور نقوش کا بھی محتاج ہے۔ پس اگر "علمِ رسمی" کا کسی جگہ مذکور ہو تو لسانی اور ذہنی علوم کا ذکر خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے سے بلند ہر دو علوم کے لیے بہترین معتبر ہے اور ظاہر ہے کہ علمِ رسمی "قلم" کا محتاج ہے۔ لہذا قرآن عزیز نے "علّم بالقلم" کہہ کر لطیف پیرایۂ بیان میں اس پوری حقیقت کو واضح کر دیا اور اس کی مزید تشریح "علّم الانسان مالم یعلم" سے کر دی۔ اور اس معجزانہ اسلوب کی غرض وغایت یہ ہے کہ ایک جانب "علم" اور "نبوت" کے درمیان کیا علاقہ ہے اس کا اظہار ہو جائے اور دوسری جانب انسان کو اپنے مقصدِ حیات کا صحیح علم ہو جائے۔

نزولِ وحی کا دوسرا دور

غارِ حرا میں منصبِ نبوت سے سرفرازی کے وقت سورۂ علق کی یہ چند آیات نازل ہو کر وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ حرا میں فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول سے فوری طور پر نبوت ورسالت کے جو خصائص واثرات ذاتِ اقدس پر وارد ہوئے ہیں وہ اچھی طرح راسخ ہو جائیں اور صلاحیت واستعدادِ نبوت ورسالت کی تکمیل ہو جائے تاکہ آئندہ سلسلۂ وحی کے قوی موثرات ومحرکات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بشری خواص کے لیے اجنبی نہ رہیں، اس لیے کچھ عرصہ کے لیے نزولِ وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "فترتِ وحی" کہتے ہیں۔

لیکن ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حرا میں پیش آمدہ کیفیت وصورتِ حال سے جو فطری تشویش پیدا ہوئی تھی جب اس نے سکون وطمانیت کی شکل اختیار کرلی تو نزول وحی کی روحانی کیفیات نے اس درجہ لطف اندوز کیا کہ آپ اس "فترت" کو برداشت نہ کرسکے اور لطیف و عمیق جذبات نے اس حد تک اضطراب و بے چینی کی شکل اختیار کرلی کہ گاہ گاہ ناموسِ اکبر (جبرئیل امین) ظاہر ہوکر آپ کو صبر و تسکین کی دعوت دیتے اور یقین دلاتے تھے کہ اپنی تمام لطافتوں اور حسن و کمال کے ساتھ نبوتؐ و رسالت کا یہ سلسلہ آپ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہوچکا ہے اور "فترت" کا یہ دور محض عارضی ہے اس لیے آپ اندوہگیں نہ ہوں تب آپ تسکین پاتے اور وقتِ موعود کے منتظر رہتے کہ کچھ عرصہ بعد[1] نزول وحی کا دوسرا دور شروع ہوا اور سب سے اول سورۂ مدثر کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَ	اے کملی پوش! اٹھ اور لوگوں کو گمراہی کے انجام سے
رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ	ڈرا اور اپنے پروردگار کی عظمت وجلال کو بیان کر
وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۙ وَ لَا تَمْنُنْ	اور لباس کو پاک کر اور بتوں سے جدا رہ، اور زیادہ
تَسْتَكْثِرُ ۙ وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ؕ	حاصل کرنے کی نیت سے حُسنِ سلوک نہ کر، اور اپنے پروردگار
	کے معاملہ میں (اذیت و مصیبت پر) صبر اختیار کر۔

ان آیات نے گویا انسانی مقصدِ حیات کی تکمیل کردی کیونکہ سورۂ علق میں کہا گیا تھا کہ انسانیتِ کبریٰ کے لیے "صحیح علم" شرط ہے یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اب یہ بتایا جارہا ہے کہ علم صحیح کی رفعت و بلندی کے اعتراف کے باوجود انسانیت کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے کہ علم صحیح کے ساتھ "عمل صحیح" بھی موجود ہو اس لیے کہ اگر علم صحیح ہے اور عمل صحیح مفقود تو اس علم کی افادیت معطل اور بیکار ہے اور اگر عمل ہے اور علم صحیح ندارد تو وہ عمل موجبِ زیان و نقصان ہے، رشد و ہدایت اور صراطِ مستقیم کے لیے دونوں ہی کا وجود ضروری ہے اور تب ہی انسان "انسانیتِ کبریٰ"

[1] فترۃ کا زمانہ کس قدر رہا ہے اس سلسلہ میں چھ ماہ سے ڈھائی سال تک کے متعلق روایات پائی جاتی ہیں اور محدثین کا رجحان چھ ماہ کی جانب زیادہ ہے۔

حاصل کرسکتا ہے۔

غرض جس طرح سورۂ علق کی آیات نے "علمِ نافع" کی جانب اشارات کیے اسی طرح سورۂ مدثر نے "عملِ نافع" کی اساسی تفاصیل ظاہر کی ہیں۔ خدا کی ہستی اور اُس کی ربوبیت کاملہ کا اعتراف، باطنی طہارت و پاکیزگی کا کمال، ظاہری طہارت و پاکی کا لزوم، بے غرض اور بے لوث اخلاقِ حمیدہ کی اساس "احسان" پر استقامت اور قبولِ حق اور نیک عمل کے نتائج پر صبر" ان آیات کا حاصل ہیں اور یہی وہ بنیادی امور ہیں جن میں علمِ حق اور عملِ صحیح کی تمام کائنات سمو دی گئی ہے۔

نیز ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے سورۂ علق اور سورۂ مدثر کا یہ خطاب اور پیغامِ حق اشارہ ہے اس جانب کہ یہ نظامِ عمل منصبِ رسالت کے لیے "تکمیلِ نفس" اور دعوت و ہدایت کے لیے "مرتبۂ اولین" کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی مستقبلِ قریب میں "بعثتِ عامہ" کا باعث ثابت ہوگا۔

اعلانِ دعوت و ارشاد کی پہلی منزل

کلامِ الٰہی کے اس حکم کے بعد جو کہ تبلیغ و دعوتِ حق کا پہلا پیغام تھا، دعوت و ارشاد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اب ذاتِ حق نے سورۂ شعراء کی آیات نازل فرما کر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ فیصلہ سُنایا کہ سب سے پہلے اہلِ قرابت اور رشتہ داروں کو دعوتِ حق دیجیے تاکہ دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑے اور یوں بھی قریش اور بنی ہاشم کے قبولِ حق کا اثر تمام عرب قبائل پر پڑنا لازمی ہے اس لیے کہ وہ سب قبائل کے سرخیل اور سرگروہ ہیں اور ساکنانِ حرم ہونے کی وجہ سے تمام عرب پر اُن کا دینی اور دنیوی اثر ہے۔ سورۂ شعراء میں ہے۔

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ	اور (اے پیغمبر!) اپنے قریبی ناطہ والوں کو (گمراہی سے)
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ	ڈراؤ اور جو مسلمان تیرے پیرو ہیں اُن کے لیے اپنے بازوؤں
اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَإِنْ	کو پست رکھو (یعنی نرمی اور تواضع سے پیش آ) اگر وہ

وكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا ـوْنَ ۚ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ ـيْمِ ۙ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ ـمُ ۙ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

نافرمانی کریں تب تو اُن سے کہہ دے میں تمہارے ان اعمال (بد) سے بری ہوں، اور غالب، رحم کرنے والی ذات پر بھروسہ کر جو تجھ کو اُس وقت بھی دیکھتی ہے، جب تو اُس کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے اور اُس وقت بھی جبکہ تو سجدہ کرنے والوں میں مل کر اُس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ سُننے، جاننے والا ہے۔

گویا یہ "تکمیلِ علم و عمل" اور "منصبِ رشد و ہدایت کے فیضان" کے بعد دوسرا درجہ تھا جس
ن حق اور دعوتِ اسلام کی عملی صورت اختیار کرنے کے لیے تحریک کی گئی چنانچہ
یات شاہد ہیں کہ آپ نے صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اُس زمانہ کے طریقِ اعلان
ق "یا صباحا" "یا صباحا" کہہ کر خانوادہ قریش کو پکارا اور جب سب جمع ہو گئے تو
ل دے کر سمجھایا کہ بلاشبہ میں خدا کا پیغمبر اور رسول اور صراطِ مستقیم کے لیے ہادی
ں۔ ارشاد فرمایا۔

لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک لشکر جرار جمع ہے اور تم پر حملہ کے لیے آمادہ تو کیا تم مجھ کو صادق سمجھو گے "اَوَمُصَدِّقِیَّ؟" لوگوں نے کہا: ہم نے تجھ کو ہمیشہ "الصادق الامین" پایا ہے تو جو کچھ کہیگا حق اور صداقت پر مبنی ہوگا۔ تب آپ نے فرمایا: تو لوگو! میں تم کو خدائے واحد کی جانب بلاتا ہوں اور اصنام پرستی کی نجاست سے بچانا چاہتا ہوں، تم اُس دن سے ڈرو جب خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال و کردار کا حساب دینا ہے۔

یہ صدائے حق جب قریش کے کانوں میں پہنچی تو وہ حیران رہ گئے اور باپ دادا کے
ت پرستی" کے خلاف آواز سُن کر برافروختہ ہونے لگے گویا سب میں ایک آگ سی
ور سب سے زیادہ آپ کے حقیقی چچا ابولہب کو طیش آیا اور غضبناک ہو کر

کہنے لگا" تبالک سائر الیوم اما دعوتنا الا لھٰذا ۔ تو ہمیشہ ہلاکت و رسوائی کا مُنہ دیکھے کیا تو نے اس غرض سے ہم کو بلایا تھا[1]"

عجب منظر ہے کہ چند گھڑیاں پہلے جس محمد بن عبداللہ کی صداقت و امانت اور خصائلِ حمیدہ سے ساری قوم متاثر رہ کر اس کی عظمت و عزت کرتی اور اس کے ساتھ والہانہ محبت کا اظہار کرتی تھی وہی آج اس اعلان پر کہ میں "محمد رسول اللہ" ہوں یکلخت بیگانہ و نفور اور خون کی پیاسی بن گئی ۔

دعوت وارشاد کی دوسری منزل

سیرت کی کتابوں میں پڑھ آئے ہو کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خاندان اور برادری کے لوگوں کو راہِ حق دکھانے اور اُن کی ایمانی اور اخلاقی حالت درست کرنے کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا مگر قریش کے چند اصحاب کے سوائے کسی نے آپ کی دعوت پر لبیک نہ کہا اور عداوت و بغض کو اپنا شعار بنائے رکھا، تب دعوت و ارشاد نے ترقی کے تیسرے زینہ پر قدم رکھا اور ذاتِ حق کی جانب سے حکم ہوا، اے داعیِ حق! خاندان اور برادری کے انکار و جحود سے متاثر و غمگین نہ ہو اور اپنی مفوضہ خدمت پر استقامت کے ساتھ قائم رہو کیونکہ سعادت و شقاوت تمہارے قبضہ میں نہیں ہے تمہارا کام تو صرف ابلاغ (پہنچانا) ہے۔ البتہ اب خاندان کے دائرہ سے آگے بڑھ کر مکہ اور اطراف مکہ کے قبائل و اقوام کو بھی یہ پیغام حق سناؤ اور دعوت و ارشاد کا یہ تحفہ اُن کے سامنے بھی رکھو تاکہ جو سعید روحیں "پیغام حق" کے لیے مضطرب اور بے چین ہیں وہ اس پر لبیک کہہ کر تسکین پائیں، اور روحِ تشنہ کو آبِ حیات سے سیراب کریں ۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ	اور (دیکھو) یہ کتاب (قرآن) ہے جسے ہم نے (توراۃ کی طرح)
مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ	نازل کیا، برکت والی اور جو کتاب اس سے پہلے نازل ہو
وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ	چکی ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس لیے نازل کی

[1] سورۂ لہب کا نزول ابولہب کی اسی گستاخانہ جرأت کے انجامِ بد کا اظہار کرتا ہے۔

حَوْلَهَا۔ (انعام) تاکہ تم ام القریٰ (یعنی شہر مکہ) کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے چاروں طرف ہیں (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا۔ (شوریٰ)

اور اسی طرح ہم نے تم پر قرآن نازل کیا زبانِ عربی میں تاکہ تم (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ شہر مکہ کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے آس پاس ہیں۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ حق کو مکہ کی تحدید سے آزاد کر کے اطرافِ مکہ کے لیے عام کر دیا اور طائف، حنین، اور یثرب (مدینہ) تک اپنی صدائے حق کو پہنچایا، بلکہ مہاجرین کے ذریعہ حبشہ کے عیسائی بادشاہ اصحمہ تک کو کلمۂ حق سنایا۔

بعثتِ عامہ اس کے بعد دعوت و ارشاد کی وہ تیسری منزل پیش آئی جو "بعثت محمدی" کا نصب العین اور مقصدِ وحید، اور تمام انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مقابلہ میں ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے طغرائے امتیاز تھی یعنی خدائے برتر نے آپ کی بعثت کو "بعثتِ عام" قرار دیا اور حکم ہوا کہ آپ نہ صرف قریش کے لیے نہ صرف اُم القریٰ (مکہ) اور اطرافِ مکہ کے لیے نہ صرف عرب کے لیے نبی و رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں بلکہ آپ کی بعثت تمام کائنات انسانی کے لیے ہوئی ہے اور آپ عرب و عجم اور اسود و احمر سب کے لیے پیغامبر اور خدا کے ایلچی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (السبا)

اور ہم نے تم کو تمام کائناتِ انسانی کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے (اعمالِ نیک پر) خوشخبری سنانے اور (اعمالِ بد پر) لوگوں کو ڈرانے کے لیے اور اکثر (جاہل) لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ

پاک اور برتر ہے وہ ذات جس نے حق و باطل کے درمیان تمیز دینے والی کتاب نازل فرمائی اپنے بندے

نذیراً (فرقان) (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کو (انجام بد سے) ڈرائے

دعوتِ اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفرؓ کی تقریر

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سرزمینِ عرب میں مبعوث ہوئے اس لیے فطری طریقِ کار کے پیشِ نظر سب سے اول قومِ عرب ہی اُن کی دعوت و ارشاد کا مخاطب قرار پائی تاکہ جو قوم کل چوپایوں کی گلہ بان تھی نورِ نبوت سے مستنیر ہو کر کائناتِ انسانی کی گلہ بان بن جائے اور خدائے برتر کے سب سے بزرگ تر پیغمبر و رسول کے سایۂ رحمت میں تربیت پا کر کائناتِ ہدایت کے لیے "خیرِ امت" کا لقب پائے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ عرب جیسی سرکش جاہل تمدن و حضارۃ سے یکسر محروم اور اخلاقی و ملی جذبات و احساسات سے قطعاً منحرف قوم پر "اسلام کی دعوت" نے فوری طور پر کیا اثر کیا تاکہ ہم بآسانی یہ اندازہ کر سکیں کہ جس مذہب کے بنیادی اصول و عقائد اور افکار و اعمال نے ایسی قوم کے تمام شعبہ ہائے حیات میں حیرت زا اور عظیم الشان انقلاب پیدا کر کے اُس کو روحانی دنیا کا انسان بنا دیا اُس مذہب کی صداقت کے لیے تنہا یہ ایک کارنامہ ہی روشن دلیل بن سکتا ہے۔

مشرکینِ مکہ کی پیہم مخالفت، ایذا رسانی، اور ہولناک طریقہائے عذاب نے جب مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت کو افریقہ کے مشہور ملک حبشہ کی جانب ہجرت پر مجبور کر دیا اور وہ عیسائی حکمراں اصحمہ کی حکومت میں پناہ گزیں ہو گئے تو سردارانِ قریش اس کو بھی برداشت نہ کر سکے اور اصحمہ کے دربار میں مشاہیر کا ایک وفد بھیج کر یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو اس لیے اُن کے حوالہ کر دے کہ یہ بددین ہو کر اور باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر قوم میں تفرقہ پیدا کرنے کا باعث بنے اور یہاں رہ کر بھی حکمران کے دین کے مخالف ہیں۔

اصحمہ نے وفد کا مطالبہ سن کر مسلمانوں کو جوابدہی کے لیے دربار میں طلب اور اسلام کے متعلق دریافتِ حال کیا۔ تب حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) نے اسلام سے متعلق تقریر فرمائی اور اس کی مقدس تعلیم کا مختصر اور جامع نقشہ کھینچ کر اصحمہ کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ یہی وہ تقریر ہے جو دراصل عرب کے دورِ جاہلیت اور قبولِ اسلام کے دور کی انقلابی کیفیت کا

مجمل مگر بہترین خاکہ ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) نے بادشاہ اور درباریوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا۔

بادشاہ! ہم پر ایک طویل تاریک زمانہ گذرا ہے اُس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے، اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شعار تھا، مردار خواری، زناکاری، لوٹ مار، قطع رحمی صبح و شام کا ہمارا مشغلہ، ہمسایوں کے حقوق سے ہم بیگانہ، رحم و انصاف سے ہم ناآشنا، اور حق و باطل کے امتیاز سے ہم ناواقف، غرض ہماری زندگی سرتاسر درندوں کی طرح تھی کہ قوی ضعیف کو کچلنے اور توانا، ناتوان کو ہضم کر لینے کو اپنے لیے فخر اور طغرائے امتیاز سمجھتا تھا،

رحمتِ خدا کا کرشمہ دیکھیے کہ اس نے ہمارے اندر ایک بزرگ پیغمبر مبعوث کیا جس کے نسب سے ہم واقف، جس کی صداقت، امانت و عصمت پر دوست و دشمن دونوں گواہ، جس کی قوم نے اُس کو "محمد الامین" کا لقب دیا، وہ آیا اور اس نے ہم کو خدا کی توحید کا سبق دیا، خدائے واحد کی جانب بلایا، اُس نے تبلایا کہ خدا کا کوئی سہیم و شریک نہیں، وہ شرک سے پاک ہے، بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لیے قابلِ ترک ہے اور صرف خدائے واحد ہی کی عبادت حقِ عبدیت ہے، اُس نے ہم کو حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا، ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حسنِ سلوک سکھایا قتل و غارت کی رسم بد کو مٹایا، زناکاری کو حرام اور فحش کہہ کر اس ننگِ انسانیت عمل سے ہم کو نجات دلائی، نکاح میں محارم اور غیر محارم کا فرق بتایا، جھوٹ بولنے، ناحق مالِ یتیم کھانے کو حرام فرمایا، نماز اور خیرات و صدقات کی تعلیم دی اور ہر حیثیت سے ہم کو حیوانیت کے قعرِ ذلت سے نکال کر انسانیتِ کبریٰ کے مرتبہ پر پہنچایا۔

بادشاہ! ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول کیا اور اس پر صدق دل سے ایمان لائے یہی ہمارا وہ قصور جس کی بدولت یہ مشرکین کا وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو ہم کو ان کے حوالے کر دے۔[1]

حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) نے اسلام کے صاف اور سادہ مگر روشن اصول کو جب اصحمہ کے سامنے جرأتِ حق کے ساتھ پیش کیا تو حبشہ کے حکمراں نے مسلمانوں کو اپنی پناہ سے نکال کر وفد کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا اور پھر حضرت جعفرؓ نے خوش الحانی کے ساتھ سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت کیں تو نجاشیِ حبشہ بیحد متاثر ہوا اور آبدیدہ ہو کر اسلام کی صداقت پر ایمان لے آیا اور حضرت جعفرؓ کے دستِ حق پرست پر مشرف باسلام ہو گیا۔

یہ ہی دعوتِ اسلام کا مختصر خاکہ جس نے دنیا کے شب رنگ اور تاریک ترین خطۂ انسانی کو ایک بہت ہی قلیل عرصہ میں مثلِ آفتاب تابناک اور روشن ترین بنا دیا۔ اس خاکہ میں اعتقادات، اخلاق اور اعمالِ حسنہ کا وہ تمام عطر موجود ہے جس کو قرآن عزیز نے مختلف سورتوں میں حسب حال اور مناسب مقام بہ کثرت بیان کیا ہے بلکہ پورا قرآن ان ہی روشن حقائق کا ہادی و مرشد ہے۔

قرآن اور تجدید دعوت | نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جبکہ بعثتِ عام ہے تو از بس ضروری ہوا کہ کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت کے لیے خدا کا جو پیغام آپ کے ذریعہ آئے وہ آخری پیغام اور کامل و مکمل پیغام ہو اور فطرت کے ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو کہ عقل سلیم اور فطرتِ مستقیم تمام کائناتِ انسانی کے لیے اس کو ابدی اور سرمدی پیغام یقین کرے، اسی پیغامِ الٰہی کا نام "القرآن" یا "الکتاب" ہے۔

قرآن کی تعلیم، اور اس کی دعوت و اصلاح کی حقیقت معلوم کرنے سے قبل چند لمحات کے لیے مذاہب عالم کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول و تاریخ ابن کثیر جلد ۳۔

قرآن کے نزول سے قبل کائناتِ انسانی پر چار مذہبی تصور حاوی اور فکر و نظر ذہنی پر اثر انداز تھے۔ ہندومت، مجوسی، یہودی اور مسیحی۔

ہندومت تصورِ الٰہی کے متعلق خواص اور عوام کے لیے دو جدا جدا تخیلات رکھتا تھا، خواص کے لیے وحدۃ الوجود[1] اور عوام کے لیے اصنام پرستی، وحدۃ الوجود کا تصور اس درجہ فلسفیانہ تھا کہ خدا کا صحیح تصور کسی طرح اس راہ سے ممکن نہ تھا، اس لیے کہ اگر ایک جانب وہ ہر وجود کو خدا یا خدا کا جز مانتا ہے تو دوسری جانب خدا کے لیے کوئی محدود و متعین تخیل بتانے سے عاجز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندومت کے تمام اسکولوں (مذاہب) میں اصنام پرستی ہی کو مذہبی امتیاز رہا اور وہ توحیدِ خالص کو مقبولِ خواص و عوام نہ بنا سکا۔ چنانچہ ویدک دھرم، بُدھ مت، جین مت وغیرہ بلکہ جدید اصلاحی اسکول (مذہب) آریہ سماج سب کے سب توحیدِ خالص کے تصور سے خالی ہیں۔

مجوسی مذہب کا اعتقادی تصور تو صاف صاف "ثنویت" کی بنیادوں پر قائم ہے یعنی وہ خدا کے تصور و تخیل کو خیر و شر کی جدا جدا دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ نور اور خیر کا خدا (یزداں) اور ظلمت و شر کا "اہرمن" ہے اور اس طرح خدائے خیر اور خدائے شر دو خدا کائناتِ ہست و بود پر متصرف اور باہم متقابل ہیں۔

یہودی مذہب اگرچہ خدا کے تصور میں مدعی توحید رہا ہے لیکن موجودہ تورات کے اوراق شاہد ہیں کہ اُس کی نگاہ میں خدا کی ہستی تجسم سے پاک نہیں ہے اسی لیے تورات کا تخیلی خدا کہیں حضرتِ یعقوب سے کشتی لڑتا نظر آتا ہے اور یعقوب اُس کو پچھاڑ دیتا ہے اور کہیں اُس کی آنکھیں درد ہونے لگتا ہے اور وہ اُس کی وجہ سے چیختا نظر آتا ہے، کبھی وہ بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنا لیتا ہے تو کبھی مصر سے خروج کے وقت بادل اور آگ کا ستون بن کر بنی اسرائیل کی راہنمائی کرتا نظر آتا ہے اور کبھی اُس کی آنکھیں دکھنے آجاتی ہیں وغیرہ وغیرہ اور اس تصور کا آخری مظاہرہ حضرت عزیر (عزرا) علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرنے پر منتج ہو جاتا ہے۔

[1] یہاں وحدت الوجود سے مراد ہر وجود کو خدا ماننے کا تصور ہے۔

اسی طرح مسیحی تصور بھی تجسیم و تشبیہ کے چکر میں آکر حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا مان لیتا، اور اس طرح مشرکانہ عقیدہ "اوتار" کا تخیل اپنا لیتا ہے (اور اقانیم ثلثہ (تثلیث) اور مریم پرستی میں حقیقی خدا پرستی کو گم کر بیٹھا ہے۔ خدا کی ہستی سے متعلق یہ وہ تصورات تھے جس میں دنیا کے بڑے بنیادی مذاہب نزولِ قرآن کے وقت مبتلا نظر آتے ہیں۔

اِن سب مذاہب میں توحیدِ حقیقی سے غفلت نے رسالت یعنی دعوتِ حق کے داعی کی شخصیت کے متعلق بھی غلط تصورات پیدا کر دیے تھے چنانچہ ہندوستان کے مذہبی تصور میں تو رسالت و نبوت اپنے صحیح معنی میں نظر ہی نہیں آتی اور وہ نبی و رسول کے مفہوم سے ہی یکسر نا آشنا نظر آتا ہے اور مجوسی، یہودی اور مسیحی مذاہب کے معتقدات میں اگر یہ تصور پایا بھی جاتا ہے تو افراط و تفریط کی شکل میں کبھی "ابن اللہ" ہو کر اور کبھی "بداخلاق و بداعمال انسان" کا پیکر بن کر جیسا کہ تورات میں حضرت لوط علیہ السلام اور اُن کی بیٹیوں کا ان کے ساتھ اختلاط کا واقعہ مذکور ہے (العیاذ باللہ من ہذہ الخرافات والافترارات)

گویا اُن کے نزدیک یا تو "رسول" اور داعی حق کی شخصیت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی اور یا پھر خدا، خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا بن کر سامنے آتی ہے اور اس لیے جس طرح وہ حقیقی توحید سے بیگانہ نظر آتے ہیں اسی طرح رسالت و نبوت کے صحیح تصور سے بھی محروم ہو چکے ہیں

اسی طرح عالم آخرت کے متعلق بھی ان مذاہب کے تصور کی دنیا افراط و تفریط سے خالی نہیں تھی، بعض مذاہب میں تو کائناتِ انسانی مختلف چولوں کے چکر میں گرفتار نظر آتا اور آواگون (تناسخ) کے ناقص فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کا ذہن منت بنا ہوا ہے اور ایک حد پر پہنچ کر "برہم" یعنی خدا میں جذب ہو جانا نجات کا آخری نقطہ متعین کیا جاتا ہے۔ نیز خیر و شر کی جزا و سزا کے بارہ میں ایک قادرِ مطلق خدا نہیں بلکہ ایک جبری قانون میں جکڑی ہوئی مجبور ہستی کا تصور پیش کرتا ہے اور بعض اگرچہ تناسخ کے غلط عقیدہ سے جُدا یوم معاد اور یوم حساب کے تصور سے آشنا بھی ہیں لیکن اُن کے نزدیک بھی عالمِ آخرت کا معاملہ اعمالِ صالحہ و سیئہ یا

افعال و کردار کے حق و باطل کی جزا و سزا سے وابستہ نہیں ہو بلکہ نسلی امتیازات اور جماعتی فرقہ بندی اور یا پھر "کفارہ" کے ساتھ مربوط ہی۔

ان چار بنیادی مذاہبِ عالم کے علاوہ مشرکین اور فلاسفہ کی بعض ایسی جماعتیں بھی تھیں جو نہ خدا کی ہستی کی قائل ہیں اور نہ عالمِ آخرت کی اور خدا کی ہستی پر اگر ایمان بھی رکھتی تھیں تو سیکڑوں، ہزاروں بلکہ بے تعداد بتوں کی باطل پرستی کے ساتھ ملوث و مجروح۔

غرض یہ تھے مذاہبِ عالم کے وہ ذہنی تصورات اور فکری معتقدات جن پر کائناتِ انسانی کی روحانی اور سرمدی سعادت کا مدار سمجھا جاتا تھا اور جو بلاشبہ اپنے نتائج و ثمرات کے لحاظ سے کائناتِ انسانی کو مشعلِ ہدایت دکھا کر "انسانیتِ کبریٰ" کے درجہ تک پہنچانے اور انسانوں کا خدا کے ساتھ حقیقی معبود و عبد ہونے کا رشتہ قائم کر کے دین و دنیا کی خیر و فلاح تک پہنچانے میں قطعی تہی دامن تھے۔

ان ہی حالات میں "اسلام" کی دعوت و تبلیغ یا "تعلیمِ حق" نے رونمائی کی اور کائناتِ انسانی کے ہر شعبۂ حیات میں گوناگوں انقلاب پیدا کر کے نیا عالم پیدا کر دیا اور آفتابِ ہدایت کی روشنی سے منور بنا کر اُس کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔

توحید | نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا کے کلام (قرآن) کے ذریعہ سب سے پہلے اسی عقیدۂ توحید پر روشنی ڈالی اور توحیدِ خالص کی حقیقت واضح کر کے تمام کائناتِ انسانی کو اُس کی جانب دعوت دی۔

قرآنِ عزیز کی دعوتِ توحید کا حاصل یہ ہو کہ اللہ ایک ایسی ہستی کا نام ہو جو اپنی ذات و صفات میں ہر قسم کے شرک سے پاک اور وراء الورا ہو۔ نہ اُس کا کوئی سہیم و شریک ہو اور نہ اُس کا ہمتا و ہمسر، اس لیے "ابنیت" کا عقیدہ ہو یا "اوتار" کا، صنم پرستی ہو یا ثنویت و تثلیث یہ سب باطل ہیں وہ یکتا و بے ہمتا ہو، باپ، بیٹا اور اس قسم کی نسبتوں سے پاک ہو، پرستش کے قابل وہ خود ہو نہ کہ اُس کے مظاہر اور اُس کی مخلوقات

وہ جس طرح تجسم و تشبہ سے بالاتر ہے اسی طرح اُس کا نہ کوئی مقابل ہے اور نہ کوئی حریف نہ سہیم

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ "اللہ" اُس ہستی کا نام ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود اور خدا نہیں ہے

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ "اللہ" وہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی نہ خدا ہے نہ معبود وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور زندگی کا بخشنے والا

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا۔ پس تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اُس کا شریک نہ بناؤ۔

لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ۔ اللہ کا کسی کو شریک نہ بنا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ اور خدا تمہارا ایک ہی خدا ہے۔

یہ اور اسی مضمون کی بے شمار آیات ہیں جو قرآن عزیز میں توحیدِ خالص کی داعی اور منادی ہیں لیکن سورۂ اخلاص یا سورۂ توحید میں جس معجزانہ اختصار کے ساتھ توحید سے متعلق موجودہ مذاہب کے ناقص اور غلط تصورات کو باطل کرتے ہوئے توحیدِ خالص کی تعلیم دی گئی ہے وہ خود اپنی نظیر ہے۔

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔ اَللّٰہُ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے اللہ یکتا ذات ہے

الصَّمَدُ۔ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ۔ اللہ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔ اُس کا کوئی ہمسر اور سہیم و شریک ہے۔

ایک مرتبہ توحید سے متعلق مذاہبِ عالم کی تعلیم پر اور نظر کیجیے اور پھر ان چند مختصر آیات کو غور و فکر کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے تو آپ اندازہ کر سکیں گے کہ پہلی دو آیات میں توحیدِ خالص کا صحیح اور حق تصور پیش کر دیا گیا ہے، قرآن کہتا ہے کہ اللہ ایسی ہستی کا نام ہے جو یکتا و بے ہمتا ہے، ساری کائنات اُس کی محتاج ہے اور وہ ہر قسم کی احتیاج سے پاک اور بے نیاز ہے، وہ صمد ہے یعنی مجموعۂ کمالات صرف صمدیت کا حصہ ہے اور بس۔

اس کے بعد وہ نصاریٰ اور یہود سے مخاطب ہو کر شمع ہدایت دکھاتا ہے کہ اللہ اُس ہستی کو کہتے ہیں جو باپ اور بیٹے جیسی فانی نسبتوں سے بالاتر ہے، وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا، تعالی اللہ علواً کبیرًا، اور اسی طرح ہندو دھرم سے کہتا ہے کہ ایسی لازوال ہستی کی مقدس شان اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ کسی انسان یا حیوان کے جسم میں محدود ہو کر "اوتار" کہلائے یا اس معبودِ مطلق کے ساتھ چھوٹے چھوٹے معبودوں کا سلسلہ قائم کر کے کسی مخلوق کو اس کا سہیم و شریک ٹھہرایا جائے۔ سبحٰنک ھٰذا بھتان عظیم۔ اور وہ مجوس اور ویدک دھرم کے اُن پجاریوں کو مخاطب کرتا ہے جو اُس کو یزداں کہہ کر اہرمن کو اُس کا مقابل حریف تسلیم کرتے ہیں یا رُوح (جیو) اور مادہ (پرکرتی) کو خدا کے ساتھ ازلی و ابدی (قدیم و غیر مخلوق) کہہ کر ان چیزوں کو خدا کا کفو اور ہمسر بتلاتے ہیں، اور کہتا ہے "ولم یکن لہٗ کفواً احد" خدا اُس ہستی کا نام ہے جس کا نہ کوئی ہمسر اور حریف ہے اور نہ اُس کی طرح انادی (قدیم) اور غیر مخلوق ہے۔

غرض قرآنِ عزیز نے خدا کی ذاتِ واحد سے متعلق ان تمام نسبتوں کا قطعی انکار کر کے جو توحیدِ خالص کے کسی طرح بھی معارض ہوتی تھیں اُس کو یکتا اور بے ہمتا ظاہر کیا ہے اور اس طرح شرک فی الذات اور شرک فی الصفات کا قلع قمع کر دیا ہے اور شرک فی الالوہیۃ اور شرک فی الربوبیۃ کے خلاف توحید اور صرف توحید کو ہی اسلام کا بنیادی تصور قرار دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے توحید کے تمام اطراف و جوانب کو نقص و خام کاری سے پاک کر کے حقیقی توحید کے تصور کی جانب راہنمائی کی اور اُس کو ہر قسم کے تجسم سے وراء الورا بتلا کر توحیدِ کامل کی جانب دعوت دی اسی طرح اُس نے توحید کے اس فلسفیانہ عقیدہ کو بھی باطل ثابت کیا جو اس باب میں تفریط کی حد تک بڑھ کر صفاتِ الٰہی کا بھی منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ قادر ہے بغیر قدرت کے، خالق ہے بغیر خلق کے، بصیر ہے بغیر رویت کے سمیع ہے بغیر سمع کے وغیرہ وغیرہ۔ اس عقیدہ کا حاصل یہ ہے

کہ خدا ایسی ہستی کا نام ہے جس کے لیے "تعطل" لازم ہے جیسا کہ پہلی تعلیمات کا حاصل یہ تھا کہ کسی نہ کسی رنگ میں خدا کے لیے تجسم ضروری ہے۔

قرآن نے کہا کہ پہلی کیفیت اگر افراط پر مبنی تھی تو یہ تفریط پر قائم ہے اس لیے کہ ایک ذات کے لیے متعدد صفاتِ کمال کا ہونا ذات کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہے۔ اس لیے بلا شبہ وہ سمیع و بصیر ہے سنتا ہے اور دیکھتا ہے، لاریب وہ قدرتِ کاملہ کے ساتھ قادر ہے اور صفتِ رحم و کرم کے ساتھ رحیم و کریم ہے البتہ اُس کی صفتِ سمع و بصر، صفتِ رحم و کرم وغیرہ صفات کا انسانی صفاتِ سمع و بصر سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات میں بے ہمتا اور یکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے۔

لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع البصیر ہ — اُس (خدا) کی کوئی مثال نہیں اور حقیقت ہے کہ وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے۔

غور فرمائیے کہ کس معجزانہ تعبیر کے ساتھ ایک ہی آیت اور ایک ہی جملہ میں اُس کی صفاتِ کمالیہ کا اعتراف بھی مذکور ہے اور یہ بھی وضاحت موجود کہ خدا کی ان صفات کو انسانی صفات کی طرح نہ سمجھو بلکہ اُس کی ذات کی طرح اُس کی صفات بھی "لیس کمثلہ شیٔ" کے عنوان سے معنون اور انسانی صفات کی حقائق کے مقابلہ میں بے مثال و بے نظیر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدائے برتر کی توحید جب ہی حقیقی توحید کہلا سکتی ہے کہ اس میں نہ تجسم کا عقیدہ شامل حال ہو اور نہ تعطل کا کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں بلکہ عقیدہ یہ ہو کہ اللہ اپنی ذات میں بھی بے ہمتا و یکتا ہے اور اپنی صفات میں بھی اور وہ ہر طرح کے شرک و کفو سے پاک، اور برتر ہے۔

رسالت | توحید حقیقی کے ثبوت کے بعد قرآن نے "رسالت" کے بنیادی عقیدہ کی اصلاح بھی ضروری سمجھی اور اُس نے تبلایا کہ کسی تعلیم کے حسن و قبح میں معلّم کی شخصیت کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اچھی تعلیم کا معلم بدعمل انسان ہو یا بری تعلیم کا معلم نیکوکار اور

جبکہ یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ خدا ہر ایک انسان کے ساتھ براہِ راست ہمکلام نہیں ہوتا تو ازبس ضروری تھا کہ کائناتِ انسانی کی ہدایت کے لیے ایک انسان ہی کو معلم بنایا جائے اور وہی خدا کی جانب سے رسالت اور پیغامبری کا فرض انجام دے۔

پس بشری اوصاف سے متصف یہ انسان نہ خدا ہوگا اور نہ خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار بلکہ بشر اور انسان ہی رہیگا نیز خدا کے پیغامبر ہونے کی وجہ سے پاکی اور تقدس کا جو رشتہ اس کو خدا کی درگاہ سے وابستہ ہے اس کے پیشِ نظر اس کی ہستی کا نہ انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ اُس کو دوسرے انسانوں کے مساوی کہا جاسکتا ہے اس لیے قرآن نے جگہ جگہ مسیح ابن مریم اور عزیر (علیہم السلام) کے متعلق اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہ خدا کے مقدس رسول ہیں، خدا یا خدا کے بیٹے نہیں ہیں نیز یہ بھی بتلایا کہ اگر ایک انسان تمہاری طرح کھاتا بھی ہے اور پیتا بھی اور بازاروں میں چلتا پھرتا، خرید و فروخت کرتا اور گھر میں اہل وعیال کے ساتھ معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ وہ خدا کا فرستادہ "رسول" نہیں ہے اور کس طرح یہ جائز ہے کہ ایک صادق و امین ہستی کے اس دعویٰ کو تم محض قیاس کی بنا پر جھٹلادو کہ وہ خدا کا رسول نہیں ہے۔

قرآن نے ان حقائق کو جن صاف اور واضح تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے گذشتہ صفحات میں آپ اُن کا مطالعہ فرما چکے ہیں۔

پس جس کتاب میں نبوت و رسالت سے متعلق صحیح تصور موجود نہ ہو وہ کبھی اپنی مذہبی تعلیمات کی صداقت کی مکمل تصویر نہیں پیش کرسکتا، یہی وہ عقیدہ ہے جس کی حقیقت میں "ایمان بالرسل" "ایمان بالکتب" "ایمان بالملائکہ" سب بنیادی عقائد سمٹ کر جذب ہو جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جبکہ ہدایتِ انسانی کے لیے خدائے تعالیٰ اپنی پیغامبری کے لیے ایک انسان اور بشر کو ہی چن لیتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ انسان نے جب سے اس کائنات

میں قدم رکھا ہے اُسی وقت سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ قائم ہے

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا کوئی گروہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جس میں

نَذِيْرٌ۔ (فاطر) ہماری جانب سے نذیر (پیغامبر) نہ گذرا ہو۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد) اور ہر قوم کے لیے ہادی آئے ہیں

مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ ان میں سے بعض کے واقعات کا ہم نے قرآن میں

مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ تذکرہ کر دیا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا تذکرہ قرآن میں

(المومن) نہیں کیا۔

اور یہ یقین لانا بھی ضروری ہے کہ جبکہ خدا ایک ہے اور اُس کی تعلیم ایک تو بلاشبہ تمام پیغمبرانِ خدا کی بنیادی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے اور اس لیے اگر خدا کے کسی ایک برحق نبی و رسول کا بھی انکار کر دیا گیا تو گویا اُس نے پوری دعوتِ قرآنی کا انکار کر دیا پس یہ ایمان ضروری ہوا۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ ہم خدا کے پیغمبروں میں پیغمبر ہونے کے لحاظ سے کسی کے درمیان

مِّنْ رُّسُلِهٖ کوئی فرق نہیں کرتے (کہ ایک کو مان لیں اور دوسرے کا انکار کر دیں)

لہٰذا جب تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ازبس ضروری ہوا تو اُن پر نازل شدہ تمام کتب سماویہ پر بھی ایمان لانا جزءِ ایمان ہوگا ورنہ تو ایک جانب سے ایمان لا کر دوسری جانب سے اُس پیغمبر کی صداقت کا انکار لازم آئیگا اور جب رسالت اور رسالت کے ساتھ کتبِ سماویہ پر ایمان حقیقت ثابتہ بن جائے تو ملائکۃ اللہ پر اس لیے ایمان لانا ضروری ہوگا کہ خدا کے ان پیغمبروں نے یہ صاف صاف اعلان کیا ہے کہ خدا کی جانب سے اُن پر یہ وحی خدا کا فرشتہ لے کر آتا ہے تو اب یا ہم اس پیغمبر کی صداقت کا انکار کر دیں اور یا پھر بن دیکھے فرشتہ پر اس لیے ایمان لے آئیں کہ تبلانے والی ہستی اپنے کردار و اعمال میں ہر طرح صادق و امین اور عوارضِ دماغی و قلبی "جنون و سحر" سے ہر طرح پاک ہے۔ اور ضروری نہیں ہے کہ جس شے کو آنکھوں نے نہ دیکھا ہو اور کانوں نے نہ سُنا ہو وہ حقیقت میں بھی غیر موجود ہو کیونکہ یہ ایک مسلّمہ

اصول ہو کہ کسی شئ کے عدم علم سے اس شئ کا عدم لازم نہیں آتا یعنی یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو ہم نہیں جانتے وہ واقع میں بھی موجود نہ ہو۔

یوم آخرت نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا کے آخری اور مکمل پیغام قرآن کے ذریعہ تیسری بنیادی اصلاح "یوم آخرت" سے متعلق فرمائی۔

مذاہب عالم اس سلسلہ میں بھی راہ مستقیم سے دور گم راہی اور افراط و تفریط کے بحر ظلمات میں پھنسے ہوئے تھے، وہ یا تو آواگون (تناسخ) کے چکر میں یوم آخرت کے اس تصور سے

لہ اس موقعہ پر اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کی تفصیل اگرچہ بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہو تاہم اس قدر سمجھ لینا ضروری ہو کہ تناسخ (آواگون) کا عقیدہ اس اساس پر قائم ہو کہ ہر ایک انسان کی موجودہ زندگی سابق میں کیے ہوئے اعمال کا ثمرہ اور نتیجہ ہو ورنہ کائنات میں یہ تنوع ہرگز نہ ہوتا کہ کوئی انسان ہو تو کوئی حیوان اور کوئی نباتات و جمادات، نیز انسانوں میں کوئی عالم ہو تو کوئی جاہل اور کوئی صحتیاب ہو تو کوئی مریض اور کوئی امیر کبیر ہو تو کوئی مفلس و محتاج وغیرہ وغیرہ۔

اس عقیدہ کا مقصد یہ ہوا کہ بغیر عمل و کردار کے اگر عالم میں یہ تغیرات موجود ہیں تو یہ خدا کی صفت عدل کے منافی ہو لیکن اس عقیدہ کی خام کاری اور بطلان کی مختلف وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہو کہ اگر روح اپنے اعمال کی وجہ سے مختلف جون بدل کر ان تغیرات عالم کا باعث ہو جو مجموعۂ کائنات کے حسن کا باعث ہیں اور جس کی بدولت یہ پورا کارخانہ مکمل نظام کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کے لیے فطری اور نیچرل طور پر گنہگار، بدکار اور بداعمال ہونا از بس ضروری ہو تاکہ مجموعۂ کائنات کا یہ حسن نہ صرف یہ کہ پیدا ہو بلکہ قائم رہے جس کا تغیرات اور تنوعات پر مبنی ہونا از بس ضروری ہو

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجیے کہ جون بدل کر آواگون کی زندگی اگر اعمال کی جزاء و سزا سے متعلق ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت انسان کے لیے نکوکار بننے کی جگہ زیادہ سے زیادہ بدکار رہنا چاہیے تاکہ آئندہ نظام عمل میں یہ تنوع باقی رہے جس کا باقی رہنا عقل و فطرت کے مطابق ہو، ورنہ تو حیوانات، نباتات، جمادات کے فقدان سے انسانی دنیا کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائیگا۔

تناسخ کے ناقص فلسفیانہ عقیدہ پر یقین رکھنے والوں نے اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا ہو کہ ایک چیز اپنی انفرادیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی قبیح اور بری معلوم ہو لیکن مجموعۂ کائنات کے پیش نظر اس کا وجود بھی اپنے اندر ضرور حسن رکھتا ہو۔ مثلاً تل (خال) اپنے رنگ و روپ میں کیسا ہی سیاہ فام (باقی بر صفحہ ۳۳۳)

قطعاً بیگانہ ہو چکے تھے اور قیامت (پرلے) کا تعلق انسانی اعمال کی جزاء و سزا و یوم الحساب سے غیر متعلق سمجھ چکے تھے اور یا پھر اس دن نجات کا مدار اور جزاء و سزا کا معیار اعمال و کردار کی جگہ نسل و خاندان اور سوسائٹی کی معاشرتی گروہ بندی پر سمجھ بیٹھے تھے اور کفارہ کو عقیدہ بنا کر حساب و محاسبۂ اعمال سے مطمئن ہو چکے تھے۔ اور مشرکین اور بعض فلاسفہ نے تو یوم آخرت کے وجود ہی کا انکار کر دیا تھا اور ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ آج کا مردہ انسان کل کس طرح زندگی اختیار کر لیگا اور سیکڑوں اور ہزاروں برس کی بوسیدہ ہڈیاں یوم حساب میں کس طرح جسم بن کر اپنی روح کے لیے لباس بن سکینگی۔

قرآن نے نازل ہو کر دنیاءِ انسانی کو تبلایا کہ اس صاف اور واضح بات کے سمجھنے میں آخر تم پر کیوں وحشت طاری ہوتی ہے اور کیوں تمہاری عقل اس کو نہیں تسلیم کرتی کہ جس خالقِ کائنات اور بدیع السموات والارض نے نمونہ اور نقشہ کے بغیر یہ عجیب و غریب عالم آفرینش کر دیا وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ ماضی میں مخلوق اور حال میں مردہ و بوسیدہ ہستی کو مستقبل میں دوبارہ وجود عطا فرما دے اور اس کے منتشر اجزاء کو جمع کر کے دوبارہ وہی ہیئت جسمانی عطا اور سابق روح کو اس میں واپس کر دے۔

یا تو صاف کہو کہ اس کائنات کو کسی بلند و بالا ہستی نے پیدا نہیں کیا جس کو خدا (اللہ) کہتے ہیں اور اگر یہ مانتے ہو تو یہ قطعاً عقل کے خلاف ہے کہ جو ابتدائی آفرینش کر سکے وہ اس آفرینش کو دُہرا نہ سکے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۱) کیوں نہ ہو لیکن محبوب کے رخسار پر نہ خود حسین بن جاتا ہے بلکہ حسنِ محبوب کو دوبالا کر دیتا اور حافظ شیرازی جیسے صوفی کو "خالِ محبوب" پر سمرقند و بخارا بخش دینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اسی طرح عالم کائنات میں انفرادی طور پر کسی کا مریض ہونا، اپاہج و معذور ہونا، ناقص الخلقت ہونا وغیرہ گو قبیح اور قابلِ افسوس نظر آتے ہوں مگر مجموعۂ کائنات کے حُسن کے لیے فطری (نیچرل) ہیں اور اسی نوع پر ہی دنیا کے نظام کا بقا ہے اور خالقِ کائنات کے کمالات آفرینش کا آئینہ دار۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن — اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ۝ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (پ۱۶)

اور انسان کہتا ہے کہ بھلا جب میں مرگیا تو کیا میں قبر سے زندہ نکالا جاؤں گا۔ کیا انسان یہ یاد نہیں کرتا کہ ہم نے پہلے اُسے پیدا کیا حالانکہ وہ کوئی چیز نہیں تھا۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝ (پ۲۳)

اور ہماری نسبت باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش کی حقیقت کو بھول گیا، کہتا ہے کہ ہڈیاں جب گل کر خاک ہوگئی ہوں تو کون ہے جو اُن کو زندہ کرکے کھڑا کردے؟ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجیے! کہ جس نے ان ہڈیوں کو اول بار پیدا کیا تھا وہی ان کو زندہ کرے گا اور وہ سب کا پیدا کرنا جانتا ہے۔

یہ مشرکین کہ تھے جو خدا اور خالقیتِ خدا کے تو قائل تھے مگر دوسری زندگی کے منکر و کافر اور جاحد تھے پھر اُس نے اُن کو بھی مخاطب کیا جو کہتے تھے کہ آخرت کا تصور اس لیے فضول ہے کہ یہ کائنات کسی کی مخلوق ہی نہیں۔ مادہ اور اس کی حرکت یونہی ازل سے ابد تک کائنات کا روپ رنگ اختیار کیے ہوئے ہے اور حرکت و کشش دو قوتیں اس نظامِ عالم کے ہر قسم کے تنوعات کے کفیل ہیں۔ قرآن نے کہا یہ گمراہ کن تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے وہ یہ کہ عقل اور سائنس کے خلاف یہ سمجھ لیا گیا کہ ذراتِ مادہ (اجزاء اثیریہ) میں شعور و ارادہ نہ ہونے کے باوجود حرکت، قوتِ استعداد، اور کشش کے ذریعہ خود بخود ایسی اشیاء وجود پذیر ہو سکتی ہیں جن کا مواد (میٹریل) ان ذرات میں موجود نہیں یعنی مادہ میں بالقوہ بھی نہ شعور ہے اور نہ ارادہ، نہ جذبات ہیں، نہ احساسات، نہ ادراکات ہیں اور نہ عقل و تمیز ورنہ تو جسم کو بالقوہ ان صفات کا حامل کہنا بجا ہوتا لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ جسم کو نہ شعوری کہہ سکتے ہیں نہ جذباتی، نہ ذی ادراک کہا جا سکتا ہے اور نہ ذی عقل و صاحبِ تمیز پس "بل" وجدان" جو فطری دلائل ہیں سب سے

مضبوط اور نیچرل دلیل ہے وہ اس حقیقت کو تسلیم کراتی ہے کہ جبکہ تمام موجوداتِ عالم میں انسان "موجوداتِ عالم کی ارتقائی ہستی اور اشرف الموجودات ہے، اور اس میں جذبات، حسیات، ادراکات، شعور اور عقل جیسے لطیف اوصاف موجود نظر آتے ہیں حالانکہ یہ اشیاء مادے کی قوت و استعداد میں یہ معدوم تھے، تو اس میں قطعاً شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان سے بلند ضرور ایک ایسی ہستی موجود ہے جو قدرت و ارادہ کی علی الاطلاق مالک اور تمام موجودات کی خالق ہے اور اس میں بھی کوئی ریب و شک نہیں کہ انسان ایسی ذی عقل و ذی شعور اور صاحبِ ارادہ ہستی کی تخلیق محض بے فائدہ نہیں ہے اور اس کی زندگی کے اعمال و کردار بے وجہ اور مہمل نہیں ہیں اور جبکہ ہم اس دنیا میں انسانوں کے اعمال و کردار کی جزا و سزا کا مظاہرہ نہیں دیکھتے تو وجدان ہی ہمارے لیے رہنمائی کرتا ہے کہ ایک ایسا دن ضرور مقرر ہے جب کائنات انسانی اپنے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا نتیجہ و ثمرہ پائیگی۔ اور اسی کو یوم القیامہ، یوم الآخرہ اور یوم الحساب کہتے ہیں چونکہ یہ دن اپنی پائیداری اور قیام کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے یوم القیمۃ کہلاتا ہے اور چونکہ دنیاءِ موجودہ کے بعد ہے اس لیے یوم الآخرہ ہے اور چونکہ جزاء و سزا اور اعمال کے محاسبہ پر مشتمل ہوگا اس لیے یوم الحساب ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا اور منکرین کہتے ہیں کہ قیامت ہم کو تو کبھی نہیں آئیگی۔

السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے، ہاں، ہاں مجھ کو

لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ (بہم) اپنے پروردگار کی قسم جو عالم الغیب ہے قیامت تو تم کو ضرور پیش آکر رہیگی

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل اور بیکار چھوڑ دیا

سُدًى . . . . اَلَيْسَ . . . جائیگا . . . . کیا وہ اس پر

ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟

الْمَوْتٰى

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ — گواہ ہو انجیر و زیتون (کے باغات سے سرسبز و شاداب

سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ — مقام بیت اللحم جہاں حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی) اور

الْاَمِيْنِ لَقَدْ خَلَقْنَا — گواہ ہو طورِ سینا (جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے

الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ — سرفرازی نصیب ہوئی) اور گواہ ہو (یہ بلد امین مکہ جہاں

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ — محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی) کہ بلاشبہ

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا — ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر قوام سے بنایا، پھر اس کو

الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ — نشیبوں کے سب سے نیچے مقام پر دھکیل دیا مگر وہ انسان

مَمْنُوْنٍ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ — جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لیے بے منت

بِالدِّيْنِ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ — احسان اجر و ثواب ہے تو اب وہ کیا بات ہے جو تجھ کو دین

الْحٰكِمِيْنَ (التین) — (قیامت) کے جھٹلانے پر آمادہ کر رہی ہے کیا اللہ حاکموں میں سب سے بہتر حاکم نہیں ہے؟

اور سچ تو یہ ہے کہ قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ آخرت کے انکار پر منطقی دلائل قائم کرنے اور سفسطہ اور غلط روش کو اختیار کرکے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی آخر ضرورت کیا ہے جبکہ انسان کی سب سے قریب اور سب سے زیادہ مضبوط دلیل "وجدان" خود بخود اس جانب راہنمائی کر رہی ہے کہ یہ نظامِ عالم جس طرح حیرت زا اور محیّر العقول نظامِ فطرت سے منظم اور قوانینِ فطرت کے ہاتھوں میں مسخر ہے ہو نہیں سکتا کہ یہ خود رو نظام ہو اور جبکہ اس کا کوئی خالق ضرور ہے تو اُس نے خیر و شر کے ثمرات و نتائج کے لیے بھی ضرور کوئی وقت مقرر کیا ہے ورنہ یہ کامل و مکمل نظام ثمرہ اور نتیجہ کے پیشِ نظر ایک مہمل شی ماننی پڑے گی پس نتیجہ اور ثمرہ کا وہ دن ہی "یوم آخرت" کے نام سے موسوم ہے جو نہ تناسخ کے چکر سے وابستہ ہے اور نہ ازلیت و ابدیت عالم کا حامل ہے بلکہ جس طرح عالم کی ہر شی کا ایک آغاز ہے اور ایک انجام اسی طرح خود اس پورے عالم کا بھی ایک آغاز اور انجام از بس ضروری ہے۔

پس مومن اور مسلم وہی ہے جو توحیدِ خالص، رسالت کے صحیح تصور اور یوم آخرت پر یقینِ کامل کے سررشتہ کے ساتھ پیوستہ ہو اور یہی وہ تین بنیادی عقائد ہیں جو دین کے حقیقی تصور یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر اور ایمان بالآخرہ سب ہی پر حاوی ہیں اور یہی وہ دینِ کامل ہے جس کی تشریح قرآنِ عزیز نے سورۂ بقرہ کے آخری رکوع میں اس طرح کی ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ

رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایمان رکھتے ہیں اُس شے پر جو اُس پر اُن کے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے (یعنی قرآن) اور ہر ایک (ایماندار) ایمان رکھتا ہے خدا پر، فرشتوں پر، سماوی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر وہ کہتے ہیں خدایا ہم تیرے پیغمبروں کے درمیان کسی ایک کو بھی پیغمبر تسلیم کرنے کے سلسلہ میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے تیرا حکم سُنا اور اُس کی پیروی کی، اے پروردگار ہم تجھ سے مغفرت کے خواہاں ہیں اور ہم کو آخرکار تیری ہی جانب لوٹنا ہے۔

مابعد الطبیعاتی عقائد و افکار سے متعلق قرآنِ حکیم کی یہی وہ اصلاحی اور انقلابی تعلیمات تھیں جن کو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اوّل عرب کے سامنے روشناس کیا اور پھر تمام کائناتِ انسانی تک پہنچا کر مذاہب کی دنیا ہی بدل ڈالی اور اسلام کی اس دعوتِ توحید نے مذاہبِ عالم میں ہلچل پیدا کردی اور کسی نہ کسی رنگ میں اُن کو توحیدِ حقیقی کے اس ارتقائی نقطہ کی جانب جھکنا پڑا۔

اور اُس نے صرف یہی نہیں کیا کہ خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان رشتۂ معبودیت و عبودیت ہی کو صحیح نقطۂ نظر پر استوار اور عقائد اور مابعد الطبیعاتی افکار کے رُخ روشن

کو آشکار کر دیا، بلکہ اس نے "ایمان اور عمل صالح" کو دین کی بنیاد بنا کر اخلاق، معاشرت، معاش غرض مذہب اور اجتماعی سیاست سب ہی کو اصلاح و انقلاب کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کی صحیح راہنمائی کا حق ادا کر دیا

یہ بحث چونکہ طویل الذیل ہے اور آیت وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کی تفسیر کے ضمن میں شرح و بسط کی محتاج اس لیے یہ مقام اس کی وسعت کو برداشت نہیں کر سکتا۔

اسراء (معراج)

"اسراء" کے معنی شب میں لیجانے کے ہیں، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وہ بے نظیر شرف و مجد اور حیرت زا واقعہ جس میں خدائے برتر نے اپنے رسول کو مسجد حرام (مکہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور وہاں سے ملاءِ اعلیٰ تک بجسد عنصری اپنی نشانیاں دکھلانے کے لیے سیر کرائی "چونکہ شب کے ایک حصہ میں پیش آیا تھا اس لیے "اسراء" کہلاتا ہے۔

"معراج" عروج سے مشتق ہے جس کے معنی چڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں اور اسی لیے معراج زینہ کو بھی کہتے ہیں، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چونکہ اس شب میں ملاءِ اعلیٰ کے منازلِ ارتقاء طے فرماتے ہوئے سبع سماوات، سدرۃ المنتہیٰ، اور اس سے بھی بلند ہو کر آیات اللہ کا مشاہدہ فرمایا اور ان واقعات کے ذکر میں زبانِ وحی ترجمان نے "عُرِجَ بِیْ" کا جملہ استعمال فرمایا اس لیے اس باجبروت اور پرعظمت واقعہ کو "معراج" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعض علماء نے اصطلاحی فرق و امتیاز کے لیے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس واقعہ کا وہ حصہ جس کا ذکر بصراحت سورۂ بنی اسرائیل میں ہے قرآنی تعبیر کے اتباع میں "اسراء" ہے اور وہ حصہ جس کا تذکرہ سورۂ النجم اور صحیح احادیث میں ہے ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعبیر "ثُمَّ عُرِجَ بِیْ" کی مناسبت سے "معراج" کے عنوان سے معنون ہے۔

واقعہ کی وحدت اس لیے دو مختلف تعبیروں اور واقعات کی تفصیلات میں جزوی اختلاف کے پیش نظر تطبیقِ روایات کی خاطر اس واقعہ کے تعدد ہونا تاریخی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے ہرگز صحیح نہیں ہے اور مشہور محقق، جلیل القدر محدث، مفسر، اور مورخ حافظ عماد الدین بن کثیر کا یہ ارشاد بلاشبہ درست اور حقیقتِ حال کے لیے کاشف ہے۔ فرماتے ہیں۔

ان تمام روایتوں کو جمع کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ واقعہ معراج صرف ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے اور راویوں کی عبارات کے بعض حصص کا ایک دوسرے سے کچھ مختلف اور تفصیلات میں کم و بیش ہونا وحدتِ واقعہ پر اثر انداز نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے انسان خطا کاری سے محفوظ نہیں ہیں۔

سو ان روایات کے جزوی اختلافات کو دیکھ کر جن علماء نے تعدد واقعہ کا مسلک اختیار کیا اور ہر ایک مختلف روایت کو جدا جدا واقعہ بنا دیا اور اس طرح یہ دعویٰ کر دیا کہ معراج کا واقعہ متعدد بار پیش آیا ہے۔ انہوں نے بعید از قیاس بات کہہ ڈالی اور قطعاً غلط راہ روی اختیار کرلی اور حقیقتِ حال سے دور پڑ گئے......... یہ مسلک اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ نہ سلف صالحین سے تعددِ واقعہ منقول ہے اور نہ تاریخی دلائل اس کے مؤید ہیں اور اگر ایسا ہوتا تو خود نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ضرور بصراحت اس سے مطلع فرماتے اور راویانِ روایت بلاشبہ اس کو روایت کرتے۔[1]

تحقیق تاریخ و سنہ یہ عدیم النظیر واقعہ کب پیش آیا؟ اس کے تعین میں اگرچہ متعدد اقوال مذکور ہیں لیکن ان دو باتوں پر سب کا اتفاق نظر آتا ہے، ایک یہ کہ واقعہ معراج قبل از ہجرت پیش آیا اور دوسری بات یہ کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ (رضی اللہ عنہا) کی وفات کے بعد وقوع میں آیا اور چونکہ واقعہ ہجرت باتفاق ۱۳ نبوت کو پیش آیا اور بخاری میں مذکور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت کے مطابق حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہجرت سے تین سال قبل اور ایک دوسری روایت کے

[1] ترجمہ عبارت تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۲ مطبوعہ مصر (جدید)

پیشِ نظر نمازِ پنجگانہ کی فرضیت سے قبل ہو چکی تھی[1] تو اب واقعۂ معراج کو ہجرت سے قبل کے ان تین برسوں کے اندر ہی ہونا چاہیے۔

نیز کتب تاریخ و سیرت دونوں شاہد ہیں کہ معراج اور ہجرت کے درمیان کوئی اہم واقعہ موجود نہیں ہے اور بہ تحقیقِ نظر ان ہر دو کے درمیان نہایت گہرا رشتہ اور ربط و علاقہ پایا جاتا ہے۔ تو بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعہ معراج ہجرت سے بہت قریب زمانہ میں پیش آیا ہے اور درحقیقت یہ واقعہ ہجرت ہی کی پُرجلال و عظمت "تمہید" تھی۔

غالباً ابن سعد نے طبقات میں اور امام بخاری نے اپنی الصحیح الجامع میں اسی لیے واقعہ معراج اور ہجرت کو کسی تیسرے واقعہ کی مداخلت کے بغیر آگے پیچھے بیان کیا ہے۔ اور جو حضرات بخاری کے ابواب و تراجم کی باہمی ترتیب کی دقیقہ سنجی سے واقف اور ان کے تفقہ کی بالغ نظری سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن کا رجحان یہ ہے کہ ان ہر دو واقعات کے درمیان زمانہ اور تعلق دونوں اعتبار سے انتہائی قربت ہے۔

تو اب یہ کہنا آسان ہے کہ جو اربابِ سیر و تاریخ یہ فرماتے ہیں کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال یا ڈیڑھ سال قبل پیش آیا اُن کا ارشاد پایۂ تحقق رکھتا ہے۔

پھر مہینہ اور تاریخ کے تعین میں بھی متعدد اقوال موجود ہیں مگر راجح قول یہ ہے کہ مہینہ رجب کا تھا اور تاریخ ۲۷ تھی۔ چنانچہ ابن عبد البرؒ امام نووی اور عبد الغنی مقدسی رحمہم اللہ جیسے مشہور اور جلیل القدر محدثین کا رجحان اسی جانب ہے کہ رجب تھا اور آخر الذکر فرماتے ہیں کہ ۲۷ تھی اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اُمتِ مرحومہ میں ہمیشہ سے عملاً اسی پر اتفاق بھی رہا ہے۔

قرآنِ عزیز اور واقعۂ معراج

قرآنِ عزیز میں اسرا یا معراج کا واقعہ دو سورتوں بنی اسرائیل اور النجم میں مذکور ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں مکہ (مسجد حرام) سے بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) تک سیر کا تذکرہ ہے اور سورۂ النجم میں ملاءِ اعلیٰ کی سیر و عروج کا بھی ذکر موجود ہے اور اگرچہ عام طور پر

---

[1] فتح الباری جلد ۷، ص ۱۷۹۔

یہ سمجھا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کی صرف ابتدائی آیات ہی میں یہ واقعہ مذکور ہے. مگر حقیقت حال یہ ہے کہ پوری سورۃ اسی عظیم الشان واقعہ سے متعلق ہے اور سورۃ کی تمام آیات اسی کا تکملہ ہیں. اس دعوے کے لیے ایک صاف اور واضح دلیل خود اسی سورۃ میں یہ موجود ہے کہ وسط سورہ میں آیت "وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس" میں اسی واقعہ معراج کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس سے قبل حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام کے واقعاتِ دعوت و تبلیغ اسی سلسلہ میں بطور شواہد و نظائر پیش کیے گئے ہیں کہ منکرین نے ہمیشہ اسی طرح خدا کی صداقتوں کو جھٹلایا ہے جس طرح آج واقعہ معراج کو جھٹلا رہے ہیں۔

احادیث اور واقعہ معراج کا ثبوت

مشہور محدث زرقانیؒ کہتے ہیں کہ معراج کا واقعہ پینتالیس صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے اور پھر اُن کے نام بھی شمار کرائے ہیں[1]۔ ان صحابہ میں مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی اور یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ چونکہ انصار صحابہ مکہ میں موجود نہیں تھے اس لیے اُن کی روایات صرف شنیدہ ہیں اس لیے کہ ایسے اہم واقعہ کو جس کا اسلام کی ترقی کے ساتھ بہت گہرا تعلق اور ہجرت کے واقعہ کے ساتھ خصوصی ربط ہے صحابہ نے براہِ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی دریافت حال کیا ہوگا اور اگر مہاجرین سے بھی سُنا ہوگا تو پھر ذاتِ اقدس سے تصدیق ضرور کی ہوگی، چنانچہ شداد بن اوسؓ کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

قلنا یا رسول اللہ کیف أسری بک[2]	ہم نے (صحابہ نے) عرض کیا: اے خدا کے رسول! آپ کو معراج کس طرح ہوئی؟

لفظ "قلنا" یہ ثابت کر رہا ہے کہ بلا شبہ معراج سے متعلق صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے عام مجمع میں نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا جاتا تھا جن میں مہاجرین و انصار سب ہی شریک ہوتے تھے۔ اور مالک بن صعصعہؓ جو انصاری صحابی ہیں اُن کی روایتِ معراج میں ہے۔

اِنّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدّثھم[3]	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے (صحابہ سے) یہ واقعہ بیان فرمایا

[1] جلد ۶ ص ۱۶۔ [2] ترمذی [3] بخاری کتاب المعراج

واقعہ کی نوعیت | چونکہ یہ واقعہ اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ طویل بھی تھا اس لیے بربنار بشریت واقعہ کے اصل تفصیلی حالات میں اتحاد و اتفاق اور بحدِ تواتر روایات منقول ہونے کے باوجود متعدد روایات کی فروعی تفصیلات میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ معمولی توجہ سے رفع کیا جا سکتا ہے۔ اور بلاشبہ ان جزئی اختلافات سے اصل واقعہ کی حقیقت پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا خصوصاً جبکہ قرآنِ عزیز نے ان عجیب اور حیرت زا واقعات کو نصِ قطعی سے واضح کر دیا ہے جن کے متعلق ملحدین اپنے الحاد و زندقہ کے ذریعہ باطل تاویلات پیش کر کے اس واقعہ کی معجزانہ حیثیت کا انکار کرتے ہیں

واقعہ معراج و اسراء اور قرآنِ عزیز | سورۂ بنی اسرائیل میں واقعہ اسراء بیت المقدس تک کی سیر سے وابستہ ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ	پاکی ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندہ کو (یعنی
لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی	پیغمبر اسلام کو) راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَكْنَا	تک کہ اس کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی
حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ	ہے، سیر کرائی اور اس لیے سیر کرائی، کہ اپنی نشانیاں
السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (بنی اسرائیل)	اسے دکھائیں۔ بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی، دیکھنے والی ہے۔
وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰكَ	اور وہ دکھلاوا جو تجھ کو ہم نے دکھایا سو لوگوں کی
اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (〃)	آزمائش کے لیے (دکھلایا)

اور سورۂ النجم میں ملاء اعلیٰ تک عروج کا ذکر بھی موجود ہے

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی ۔ مَا ضَلَّ	شاہد ہے ستارہ جبکہ غروب ہو، تمہارا رفیق نہ گمراہ ہوا اور
صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی ۔ وَمَا	نہ بھٹکا، اور وہ نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے
یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا	یہ نہیں ہے مگر حکم جو اس کو بھیجا گیا ہے اس کو بتلایا ہے

وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ ۝ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۝ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۝ وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۝ عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَىٰ ۝ عِندَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ ۝ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۝ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ۝ (النجم)

سخت قوتوں والے زور آور (فرشتہ) نے (کہ یہ خدا کی وحی ہے) جو سیدھا بیٹھا اور تھا وہ آسمان کے اونچے کنارہ پر، پھر وہ قریب ہوا پس جھک آیا پھر رہ گیا (دونوں کے درمیان) دو کمان بلکہ اُس سے بھی نزدیک کا فرق پس خدا نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی نازل فرمائی جو بھی وحی بھیجی، اُس (بندہ) نے جو دیکھا (اس کے) دل نے جھوٹ نہیں کہا (یعنی آنکھ کی دیکھی بات کو جھٹلایا نہیں بلکہ تصدیق کی) تو کیا تم اُس سے اُس پر جھگڑتے ہو جو اُس نے خود دیکھا ہے (یعنی واقعہ پر جھگڑتے ہو) اور اُس (بندہ) نے خدا کو دیکھا ایک (خاص) نزول کے ساتھ جبکہ وہ بندہ سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک موجود تھا جس کے پاس آرام سے رہنے کی بہشت (جنت الماویٰ) ہے، اس وقت سدرہ (بیری کا درخت) پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا، اس رؤیت کے وقت نہ نگاہ بہکی اور نہ حد سے متجاوز ہوئی، بلاشبہ اُس (بندہ) نے اُس حالت میں اپنے پروردگار کے بڑے بڑے نشان دیکھے۔

سورۂ بنی اسرائیل اور واقعۂ معراج

یہاں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ النجم کی تفسیر کا موقع نہیں صرف اشارات ہی پر اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر ایک جانب یہ آیات اپنے مکمل تفسیری حق کا مطالبہ کرتی ہیں تو دوسری جانب کتاب اپنے سیاق و سباق کے پیشِ نظر اختصار کی طالب ہے، بہرحال حسب ضرورت (دونوں) کا لحاظ رکھتے ہوئے اس قدر گذارش ہے کہ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیت میں واقعۂ اسراء کے متعلق جو کچھ کہا گیا اُس کی اگر تحلیل کی جائے تو بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اُس کا فیصلہ یہی ہے کہ واقعۂ اسرا

بحالتِ بیداری بجسدِ عنصری پیش آیا ہے اور اس مطلب سے ہٹ کر جب اس کو روحانی یا منامی رؤیا کہا جاتا ہے تو تاویلاتِ باردہ کے بغیر دعویٰ پر دلیل قائم نہیں ہو سکتی

بنی اسرائیل میں اس واقعہ کی ابتداء خدائے برتر کی قدوسیت اور سبحانیت کے بعد لفظ "اسریٰ" سے ہوئی ہے۔ یہ لفظ "س، ر، ی۔ سریٰ یسریٰ" سے ماخوذ ہے۔ لغت میں جس کے معنی "رات میں چلنے" کے آتے ہیں

سریٰ، یسریٰ، سریً و سرایۃً الخ سار لیلاً (منجد) سریٰ، یسریٰ، سریۃً میں سریٰ کے معنی ہیں وہ رات میں چلا۔

اور "اسریٰ" کے معنی بھی "شب میں لے چلا" آتے ہیں چنانچہ کتب لغت میں ہے۔

اسریٰ، اسراءً۔ سار لیلاً (منجد) اسریٰ کے معنی ہیں "رات میں چلا"

یہی معنی اقرب الموارد، قاموس، لسان العرب اور تمام کتب لغت میں بصراحت مذکور ہیں۔ اور اسی لفظ اسریٰ کو جب متعدی بنانا چاہتے ہیں یعنی "راتوں رات لیجانا" ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو "ب تعدیہ" بڑھا دیتے ہیں۔ اس موقعہ کے علاوہ قرآن عزیز میں جہاں جہاں "اسراء" اور اس کے مشتقات آئے ہیں ان تمام مقامات میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورہ ہود میں لوط علیہ السلام کے واقعہ میں ہے۔

قَالُوا يٰلُوطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ

فرشتوں نے کہا: لوط! ہم تو تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے (فرشتے) ہیں۔ یہ تجھ تک ہرگز نہیں پہنچ پائینگے۔ پس تو اپنے لوگوں کو کچھ رات گئے (یہاں سے) لے نکل۔

یہ آیت "فاسر باھلك بقطعٍ من الّيل" سورہ دخان میں بھی موجود ہے، اور سورہ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ (طٰہٰ)

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا۔

اور سورۂ شعراء میں ہے۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (شعراء) اور ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جا، تمہارا تعاقب ضرور کیا جائیگا۔

اور یہی آیت سورۂ دخان میں بھی مذکور ہے۔

ان تمام آیات میں لفظ "اسراء" کا جس طرح اطلاق کیا گیا ہے اُس سے دو حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے ایک یہ کہ "اسراء" اُس سیر اور اُس چلنے کو کہتے ہیں جو رات میں پیش آئے اس لیے دن یا شام کے چلنے پر "اسراء" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ کہ "سریٰ یا اسراء" ان تمام آیات میں روح مع جسد پر اطلاق ہوا ہے یعنی لوطؑ اور موسیٰ علیہما السلام اور اُن کے متبعین جن کے لیے یہ حکم ہو رہا ہے کہ وہ دشمنوں سے بچ کر راتوں رات ان بستیوں (مصر اور سدوم) سے نکل جائیں، ان کا رات کے حصہ میں نکل جانا نہ خواب کی شکل میں تھا اور نہ روحانی طور پر اور نہ رؤیا کشفی کے طریقہ پر بلکہ عالم بیداری میں روح مع جسد کے تھا۔

پس جبکہ قرآن کے ان تمام اطلاقات میں اسراء کے یہ معنی بغیر کسی تاویل کے قابلِ تسلیم ہیں تو بنی اسرائیل کی آیت "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی" میں "اسراء" کو روح مع جسد تسلیم کرنے میں کیوں پس و پیش ہو اور کس لیے اس واقعہ کو فقط روحانی، منامی یا بین النوم و الیقظہ کشفی طریقہ کے ساتھ مخصوص کیا جائے؟ جبکہ اس آیت "اسریٰ بعبدہ لیلاً" میں ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو اس اسراء کو قرآن کے عام اطلاقات سے جدا معنیٰ پر دلالت یا اشارہ کرتا ہو۔

رہا یہ مسئلہ کہ بنی اسرائیل کی آیت "وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس" کے لفظ "رویا" سے فائدہ اُٹھا کر یہ کہنا کہ چونکہ "رویا" عالم خواب پر بولا جاتا ہے اس لیے اسراء کا واقعہ منامی یا روحانی تھا، بدیں وجہ صحیح نہیں ہے کہ عربی بول چال میں جس طرح رویا کا

اطلاق خواب کی حالت پر ہوتا ہے اسی طرح وہ اس رویت پر بھی بولا جاتا ہے جس کا مشاہدہ آنکھ بحالتِ بیداری کرتی ہے۔ چنانچہ عربی کے نہایت مستند اور مشہور لغت لسان العرب میں یہ تصریح موجود ہے۔

وقد جاء رؤیا فی الیقظۃ　　اور بلاشبہ رؤیا بیداری میں عینی مشاہدہ کے لئے بھی آتا ہے

اور صاحب لسان نے جاہلی شاعر راعی کے اس شعر کو اس معنی کے لئے سند ٹھہرایا ہے۔

فکبّر للرؤیا وھش فؤادہ　　وبشّر نفساً کان قبل یلومھا

اس نے تکبیر کہی اور اس کا دل مسرت سے لبریز ہوگیا اور اس نے اپنے نفس کو جس کو پہلے ملامت کرتا تھا خوشخبری دی اس منظر کو دیکھکر جس کا اس نے عینی مشاہدہ کیا۔

اسی طرح متنبی کے اس مصرعہ کو بھی سند قرار دیا ہے۔

ورؤیاك احلیٰ فی العیون من الغمض

اور تیرا دیدار (میری) آنکھوں میں نیند سے بھی زیادہ لذیذ ہے۔

ان مستند اقوالِ عرب کے بعد "رویا" کو صرف خواب کی حالت کے ساتھ مخصوص کر دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اب جبکہ "اسریٰ بعبدہ" میں "اسراء" کے متبادر معنی "سیرِ روح مع جسد" کے ہیں اور "رویا" کا اطلاق دونوں قسم کی رویت پر ہوتا رہا ہے تو اس مقام پر "اسراء" کا قرینہ اس امر کا متقاضی ہے کہ یہاں "بحالتِ بیداری عینی مشاہدہ" کے معنی ہی متعین ہونے چاہئیں اور دوسرے معنی قیاسی اور تاویلی حیثیت سے زیادہ وقیع نہیں ہیں۔

بعض معاصر علماء نے "اسراء" کو روحانی قرار دیتے ہوئے لسان العرب کے پیش کردہ سندات کو اول تو مستند ہی تسلیم نہیں کیا اور بالفرضِ تسلیم کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان ہر دو شاعروں راعی اور متنبی کے شعر و مصرعہ سے رویا کے معنی "خواب میں رویت" ہی کے نکلتے ہیں نہ کہ رویارِ بصری کے مگر تعجب یہ ہے کہ دونوں باتیں محض دعویٰ پر ہی ختم ہو گئی ہیں اور دعوے کے لئے زحمتِ دلیل کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ تسلیم کر لیجئے کہ لغتِ عرب کے لئے متنبی مستند نہیں ہے

اگر مشہور جاہلی شاعر راعی کس لیے غیر مستند قرار پایا جبکہ کلام عرب کی سند کے لیے جاہلی شعراء سے زیادہ کوئی سند مقبول نہیں سمجھی گئی، نیز راعی نے جبکہ جملہ "فکبّر" کو "للرؤیا" کے ساتھ وابستہ کیا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ "رؤیا" کی وجہ سے اس نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور ظاہر ہے کہ نعرۂ تکبیر خواب میں بلند نہیں ہوا تھا بلکہ عالم بیداری کا واقعہ تھا، اسی طرح متنبی کے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ شب وصل میں تیرے دیدار کے مقابلہ میں نیند ہیچ ہے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نیند خود بہت شیریں ہے مگر دیدار محبوب کے مقابلہ میں اس کی شیرینی بھی بے حقیقت ہے۔

اس لغوی حقیقت کے آشکارا ہو جانے کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) کا یہ ارشاد جو صحیح بخاری میں مذکور ہے "رؤیا عین اُریہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" سونے پر سہاگا ہے کیونکہ وہ لغت عرب کے امام بھی ہیں اور ترجمان القرآن بھی اور اُن کے مقابلہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا یہ ارشاد پیش کرنا قطعاً مرجوح ہے کہ وہ اسراء کو رؤیا یعنی خواب مراد لیتے ہیں۔

مرجوح اس لیے ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہما) سے جو روایات اس سلسلہ میں منقول ہیں وہ بلحاظ صحت روایت وہ درجہ نہیں رکھتیں جو حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت کو حاصل ہے بلکہ محدثین کے نزدیک بچند وجوہ اُن کی صحت غیر مستند ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کتب حدیث کی بجائے فقط سیرت کی روایت ہے اور پھر محمد بن اسحٰق اس کے متعلق یہ کہتے ہیں "حدثنی بعض آل ابی بکر" مجھ سے یہ روایت ابوبکر کے خاندان کے ایک فرد نے بیان کی ہے اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ روایت منقطع ہے کیونکہ درمیان کا ایک راوی مجہول ہے جس کے متعلق کوئی علم نہیں کہ وہ کس درجہ کا راوی ہے نیز اس روایت کے طرق میں بھی باہم اختلاف ہے اس لئے بعض روایت میں ہے "ما فقدت جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر گم نہیں پایا، حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ

حریم نبوی میں ہجرت کے بعد داخل ہوئی ہیں اور واقعہ معراج ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے تو حضرت عائشہ کا "ما فقدت - میں نے گم نہیں پایا" فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے! اس لیے بلاشبہ اس روایت میں جرح ونقص ہے۔

اسی طرح حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت بھی سیرت میں منقول روایت ہے جس کو محمد بن اسحٰق نے یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس سے روایت کیا ہے اور محدثین اس پر متفق ہیں کہ یعقوب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا، اس لیے یعقوب اور حضرت معاویہ کے درمیان ضرور کوئی راوی متروک ہے جس کا روایت میں کوئی ذکر نہیں ہے پس یہ روایت بھی مجروح و منقطع ہے اور بروایت ابن اسحٰق حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا یہ قول "فقال کانت رؤیا من اللہ صادقۃ" حضرت معاویہ نے کہا: معراج اللہ تعالیٰ کی جانب سے سچا خواب تھا، کسی طرح بھی صحت کو نہیں پہنچتا۔

اب ایک مرتبہ پھر احادیث معراج پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ ایک جانب بخاری ومسلم اور صحاح کی وہ روایات ہیں جو متن و سند کے لحاظ سے مسلّم اور صحت کے اعلیٰ معیار پر قائم سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی تفصیلات واقعہ معراج کو بجسدِ عنصری ظاہر کرتی ہیں اور اسی لیے جمہور صحابہ اسی مسلک کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور دوسری جانب محمد بن اسحٰق کی سیرت میں منقول اور حضرت عائشہ اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کی جانب منسوب وہ روایات ہیں جن کی صحت تک مجروح ہے، اسی لیے بات صرف یہی نہیں ہے کہ جو شخص سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں "رویا" بمعنی "خواب" لیتا ہے اس کا قول درست نہیں ہے بلکہ بلحاظ سند یہ انتساب بھی صحیح نہیں ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما رویاءِ منامی کے قائل ہیں۔ کیونکہ جن جلیل القدر محدثین ومفسرین نے اس قول کو ان بزرگوں کی جانب منسوب کیا ہے اس کا مدار محمد بن اسحٰق کی یہی یہ دو روایات ہیں اور ان دونوں کی صحت کا حال ابھی روشن ہو چکا۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے بعض روایات میں واقعہ کی ابتدا اس طرح مذکور ہے "بینا انا نائم" یا "بین النائم والیقظان" یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحالتِ خواب تھے یا بیداری اور خواب کی درمیانی حالت میں تھے کہ خدا کا قاصد "جبرئیل" آیا۔ نیز بخاری کی شریک والی روایت کے ختم پر ہے "فاستیقظ وھو فی المسجد الحرام" اور آپ جاگ اٹھے جبکہ آپ مسجد حرام میں تھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ گذرا خواب میں گذرا۔

مگر یہ اس لئے صحیح نہیں کہ پہلے دو جملوں کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ جب معراج یا اسراء کا واقعہ پیش آنے والا تھا تو اس وقت آپ سو رہے تھے لیکن واقعہ بحالتِ بیداری پیش آیا جیسا کہ باقی تمام روایات سے ظاہر ہوتا ہے اور بقول قرطبی (رحمہ اللہ) دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ راوی اس بیداری کا ذکر کر رہا ہے جو علی الصباح نمازِ فجر کے لئے ہوئی یعنی اگرچہ آپ ابتدائے شب میں ام ہانی کے مکان میں سوئے تھے مگر کچھ حصۂ شب میں جب معراج کا واقعہ پیش آیا اور آپ اس سے فارغ ہو کر کرۂ ارضی پر واپس تشریف لے آئے تو باقی رات مسجدِ حرام میں سو کر گذاری اور جب آپ صبح کو بیدار ہوئے ہیں تو لوگوں نے مسجد حرام میں آپ کو پایا۔

علاوہ ازیں شریک کی روایت میں تعبیر و ادا کی فاش غلطیاں ہو گئی ہیں جن پر محدثین نے تنبیہ فرمائی ہے مثلاً ان کی روایت کہتی ہے کہ معراج کا واقعہ بعثت سے بھی قبل پیش آیا "انہ جائہ ثلثۃ نفر قبل ان یوحی الیہ وھو نائم فی المسجد الحرام" آپ کے پاس تین فرشتے بعثت اور نزولِ وحی سے قبل اس حالت میں آئے کہ آپ مسجد حرام میں سو رہے تھے، چنانچہ امام نووی، خطابی، ابنِ حزم، عبدالحق، قاضی عیاض (رحمہم اللہ) نے شریک کی روایت پر سخت تعاقب کیا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں:-

"شریک نے اس روایت میں بہت سی غلطیاں کی ہیں جن کا علمائے نے انکار کیا ہے اور مسلم نے بھی یہ الفاظ کہہ کر شریک کے اوہام پر تنبیہ کی ہے" شریک نے روایت

میں مقدم و موخر کر دیا ہے اور کم و بیش کر دیا ہے۔ اوہام میں سے ایک وہم یہ ہے کہ شریک کی روایت میں ہے "معراج کا واقعہ نزولِ وحی سے قبل پیش آیا ہے" حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے اور اس قول کا کوئی راوی بھی موافق نہیں ہے حافظ عبد الحق رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الجمع بین الصحیحین میں اس شریک والی روایت کو نقل کر کے کہا ہے کہ شریک نے اس میں بہت سی غیر معروف (نا قابلِ قبول) باتیں بڑھا دی ہیں اور غیر معروف الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا ہے کیونکہ اسراء کی حدیث کو حفاظِ حدیث کی ایسی جماعت نے نقل کیا ہے جو بلند پایہ اور ہر قسم کی جرح سے محفوظ اور مشہور ائمہ حدیث ہیں مثلاً ابن شہاب زہری، ثابت بنانی، قتادہ، عن انس اور ان میں سے کوئی ایک حافظِ حدیث بھی ان اجزاء کو بیان نہیں کرتا جن کو شریک نے بیان کیا ہے اور شریک محدثین کے نزدیک حافظ حدیث نہیں ہے۔

بہرحال فتح الباری میں معراج اور اسریٰ کے متعلق اتحاد و تغایر کی بحث کرتے ہوئے حافظ ابن حجر یہی فیصلہ فرماتے ہیں کہ معراج بحالتِ بیداری اور روح مع الجسد ہوئی ہے۔

فمنھم من ذھب الی ان الاسراء والمعراج وقعا فی لیلۃ واحدۃ فی الیقظۃ بجسد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وروحہ بعد المبعث والی ھذا ذھب الجمھور من علماء المحدثین والفقہاء المتکلمین وتواردت علیہ ظواھر الاخبار الصحیحۃ ولا ینبغی العدول عن ذلک اذ لیس فی	پس ان علماء میں سے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ بلا شبہ واقعات اسراء و معراج دونوں ایک ہی رات میں بحالت بیداری جسم اور روح کے ساتھ بعثت کے بعد پیش آئے۔ تمام محدثین، فقہاء اور متکلمین کا یہی مذہب ہے اور صحیح احادیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اور اس سے تجاوز کرنا یعنی اس کا انکار کرنا نامناسب ہے۔ اس لئے کہ ایسا ہونا عقل کے نزدیک محال نہیں ہے کہ تاویل کرنے کی احتیاج ہو۔

العقل ما يحيله حتى يحتاج الى تاويله[1]

اور قاضی عیاض شفاء میں یہی تحریر فرماتے ہیں:-

وذهب معظم السلف والمسلمين	جلیل القدر سلف صالحین اور بزرگ ترین مسلمان
الى ان الاسراء بالجسد وفي اليقظه	اس جانب ہیں کہ اسراء جسد عنصری بیداری میں
وهو الحق وهذا قول ابن عباس	پیش آیا اور یہی مذہب حق ہے اور یہی ابن عباس جابر
وجابر وانس وحذيفة وعمر وابي	حذیفہ، عمر، ابوہریرہ، مالک بن صعصعہ، ابو حبہ
هريرة ومالك بن صعصعة وابي	بدری، ابن مسعود (رضی اللہ عنہم) اور ضحاک، سعید
حبة البدري وابن مسعود والضحاك و	بن جبیر، قتادہ، ابن مسیب، ابن شہاب، ابن زید
سعيد بن جبير وقتادة وابن المسيب و	حسن، ابراہیم نخعی، مسروق، مجاہد، عکرمہ،
ابن شهاب وابن زيد والحسن وابراهيم	ابن جریج (رحمہم اللہ) کا قول ہے اور یہی
ومسروق ومجاهد وعكرمة وابن	دلیل ہے حضرت عائشہ کے قول کی اور یہی طبری
جريج وهو دليل قول عائشة و	کا قول ہے اور ابن حنبل کا اور مسلمانوں کی جماعت
هو قول الطبري وابن حنبل و	عظیم کا اور یہی قول ہے متاخرین میں سے اکثر
جماعة عظيمة من المسلمين وهو قول	فقہاء، محدثین، متکلمین اور مفسرین کا
اكثر المتاخرين من الفقهاء و	
المحدثين والمتكلمين والمفسرين	

اور خفاجی نسیم الریاض میں قاضی عیاض کی اس عبارت "وهو دليل قول عائشة" کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ بات بظاہر خلاف معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ عائشہ صدیقہ کی جانب جو قول منسوب ہے وہ اس کے قطعاً خلاف ہے لیکن قاضی عیاض (رحمہ اللہ) کا یہ دعویٰ ہے کہ جلیل القدر صحابہ کی یہ نقول اس امر کی دلیل ہیں کہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی جانب

[1] فتح الباری جلد ۷ ص ۱۵۶ مطبوعہ البہیۃ المصریہ [2] نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض

منسوب قول صحیح نہیں ہے اور وہ بھی جمہور ہی کے ساتھ ہیں۔

الحاصل قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ بغیر کسی تاویل کے بصراحت یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسراء اور معراج کا واقعہ بجسد عنصری اور بحالت بیداری پیش آیا ہے اور ان دلائل کو بطور فہرست اس طرح شمار کرایا جا سکتا ہے۔

(۱) سورہ بنی اسرائیل کی آیت "اسری بعبدہ" میں اسراء کے متبادر معنی وہی ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت لوط علیہما السلام سے متعلق آیات میں ہیں یعنی بحالت بیداری اور بجسد عنصری رات میں لے چلنا۔

(۲) آیۃ "وما جعلنا الرؤیا التی اریناک" میں "رؤیا" بمعنی عینی مشاہدہ ہے نہ کہ خواب یا روحانی رویت اور لغت عرب میں "رؤیا" کے یہ معنی مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔

(۳) آیۃ "الا فتنۃ للناس" میں قرآن نے اس واقعہ کو اقرار وانکار کی شکل میں ایمان و کفر کے لیے معیار قرار دیا ہے اور اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مشاہدہ یا خواب پر بھی مشرکین و منکرین کا انکار و جحود ممکن اور ثابت ہے لیکن اس جگہ تبادر یہی ظاہر کرتا ہے کہ واقعہ کی عظمت و فخامت کے پیش نظر منکرین کا انکار اس لیے شدید سے شدید تر ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو عینی مشاہدہ کی طرح بیان فرمایا ہے۔

(۴) سورہ النجم کی آیت "ما زاغ البصر وما طغیٰ" میں رویت جبرئیل نہیں بلکہ واقعہ اسراء کا مشاہدہ عینی مراد ہے۔ اور سورۃ کی آیت "ما زاغ البصر وما طغیٰ" میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا قلب نے ہو بہو اس کی تصدیق کی اور واقعہ سے متعلق نہ رویت عینی نے کجی اختیار کی اور نہ رویت قلبی نے اس حقیقت کا انکار کیا بلکہ دونوں کی مطابقت نے اس کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

(۵) صحیح حدیث میں ہے کہ جب مشرکین نے اس واقعہ کے انکار پر یہ حجت قائم کی کہ اگر یہ صحیح ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی موجودہ جزئی تفصیلات بتائیں

لہ جلد ۲ صفحہ ۲۸۹۔

کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ نہ انھوں نے بیت المقدس کو کبھی دیکھا ہے اور نہ بغیر دیکھے جزئی تفصیلات بتائی جاسکتی ہیں تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے بیت المقدس کے درمیانی حجابات منجانب اللہ اٹھا دیئے گئے اور آپ نے ایک ایک چیز کا مشاہدہ کرتے ہوئے مشرکین کے سوالات کے صحیح جوابات مرحمت فرمائے جن میں مسجد کی بعض تعمیری تفصیلات تک زیرِ بحث آئیں، یہ دلیل ہے اس امر کی کہ مشرکین یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ اسراء کو بحالتِ بیداری اور بجسدِ عنصری ہونا بیان فرما رہے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خیال کی تردید نہیں فرمائی بلکہ اس کی تائید کے لئے معجزانہ تصدیق کا مظاہرہ فرما کر ان کو لاجواب بنا دیا۔

(۶) ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے بسندِ صحیح منقول ہے کہ قرآن میں مذکور "رویا" سے مراد "رویا عین" ہے نہ کہ خواب یا روحانی مشاہدہ۔

(۷) آیۃ "وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس والشجرۃ الملعونۃ فی القرآن" میں یہ مذکور ہے کہ واقعہ اسراء اور جہنم کے اندر سینڈھ کے درخت کا موجود ہونا اور آگ میں نہ جلنا یہ دونوں واقعے اقرار وانکار کی صورت میں ایمان و کفر کے لئے آزمائش ہیں پس جبکہ جہنمیوں کی غذا کے لئے ایک مادی خاردار درخت کا موجود ہونا سرسبز وشاداب رہنا اور آگ سے نہ جلنا مشرکین کے انکار کا باعث ہو، بلاشبہ اسراء کے واقعہ میں بھی آزمائش کا پہلو یہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح زمان ومکان کی قیود کو توڑ کر بجسدِ عنصری و بحالتِ بیداری وہ سیر کرلی جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل اور والنجم میں اور صحیح احادیث میں ہے اور یقیناً مشرکین نے اسی کا انکار کیا جس کے رد میں قرآن نے اس کو "الا فتنۃ للناس" کہہ کر اس قدر اہمیت دی ورنہ تو انبیاء علیہم السلام کے روحانی مشاہدات اور خواب کے واقعات کا انکار تو ان کے لئے ایک عام بات تھی۔

(۸) اسراء کا واقعہ جب پیش آیا تو صبح کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن صحابہ کی مقبل

میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا وہ سب باتفاق یہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ بجسدِ عنصری بحالت بیداری پیش آیا مثلاً حضرت عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرتِ عبد اللہ ابن مسعودؓ وغیرہ اور اس کے برعکس ذیل کے قائلین ہیں حضرت امیر معاویہؓ اور حضرتِ عائشہؓ کے اسمار گرامی ہیں جن کا اسلام یا حرمِ نبوی سے تعلق اس واقعہ سے برسوں بعد مدینہ کی زندگی پاک سے وابستہ ہے اس لئے واقعہ کے ایام میں موجود اصحابہ کا قول راجح ہے۔

(۹) حضرتِ عائشہؓ اور حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہما) کا جو مسلک جمہور کے خلاف منقول ہے وہ بلحاظ درجۂ روایت وصحتِ سند نہ صرف مرجوح بلکہ مجروح ہے اس لئے اول تو ان بزرگوں کی جانب اس قول کا انتساب ہی درست نہیں اور بالفرض صحیح بھی ہو تو جمہور کے مسلک کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے مرجوح ہے وذٰلک تسع اٰیات بیّنات۔

والنجم اور واقعہ معراج | واقعۂ معراج کی تفصیلات اگرچہ مستند، مشہور اور مقبول روایات و احادیث سے ثابت ومنصوص ہیں لیکن خود قرآنِ عزیز (والنجم) میں بھی بنص صریح بعض وہ تفصیلات مذکور ہیں جن کو بنی اسرائیل کے اجمال کی تفسیر کہنا چاہیئے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چند آیات کی تفسیر بھی بیان کردی جائے۔

"والنجم اذا ھوٰی ما ضلّ صاحبکم وما غوٰی" نجم، ستارہ کو کہتے ہیں اور "النجم" کہہ کر کبھی خاص ستارہ ثریا پر بھی اطلاق کرتے ہیں اور "ہوٰی" کے معنی سقوط وغروب کے ہیں اور والنجم میں "واو" قسم کے لئے ہے جس سے استعمالاتِ قرآنی میں اکثر مضمون مابعد کی اہمیت کے پیشِ نظر استشہاد مقصود ہوتا ہے "ضلّ" ضلالت سے ہے گمراہ ہونے اور بھٹک جانے کو کہتے ہیں اور "غوٰی" غوایت سے جس کے معنی بے راہ روی اور بہک جانے کے ہیں۔

پس ہر دو آیات کا مطلب یہ ہوا کہ شب دیجور کے یہ ستارے یا ثریا اس امر کی شہادت ہیں کہ جس طرح نظامِ شمسی میں ثریا بلکہ تمام ستارے طلوع سے غروب تک ایسے محکم اور مضبوط نظامِ فطرت میں منسلک ہیں کہ مقررہ وقت ومعین رفتار کے ساتھ بغیر بھٹکے

بچلے ہوئے جاری وساری ہیں ٹھیک اسی طرح روحانی نظام شمسی کے تمام ستارے (انبیاء علیہم السلام) بھی نبوت ورسالت کے مقررہ اصول و معین راہ پر جاری وساری رہے ہیں اور کبھی خدا کے معین کردہ نظام نبوت سے نہ بھٹکے اور نہ بے راہ ہوئے تو پھر یقین کرو کہ اس نظام روحانیت (نبوت) کا آفتاب عالمتاب یعنی تمہارا رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھی نہ بھٹکا اور نہ بے راہ ہوا، اور ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ ایسا ہوتے پر سارا نظام نبوت ہی درہم برہم ہوکر رہ جاتا اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ تمہارے سامنے جس شب کا ذکر ہو رہا ہے اُس شبِ دیجور میں ثریا جیسے روشن ستارہ کا طلوع ہوکر غروب ہوجانا اس پورے نظام شمسی کے تغیر و فنا کی بولتی تصویر ہے پس اگر تمہارا رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کسی ایسے واقعہ کا اظہار کرتا ہے جو عام قانونِ قدرت کے پیشِ نظر عجیب و غریب معلوم ہوتا اور اس نظامِ شمسی کے ایک خاص دورِ انقلاب اور حیرت زا تغیر کا پتہ دیتا ہے تو تم کو یقین کرنا چاہیے کہ یہ واقعہ بلاشبہ عالمِ وجود میں آیا اور تمہارا رفیق اس معاملہ میں نہ بھٹکا اور نہ بے راہ ہوا بلکہ جو کچھ دیکھا اور جو کچھ نقل کیا وہ سب حرف بحرف حق اور مبنی برحقیقت ہے

"وما ینطق عن الھوی" "نطق" گویائی اور "ہوی" خواہش نفس۔ ان ھو الا وحیٌ یُوحیٰ" "وحی"۔ وہ یقینی الہام جو خدا کی جانب سے نبی پر نازل ہوتا ہے اور جس کے خدا کی جانب سے ہونے میں کسی قسم کا شک و تردد نہیں ہوتا یعنی رسالت"۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ تمہارے رفیق کی صدق مقالی کا یہ عالم ہے کہ وہ خدا کی باتیں کبھی بھی اپنی خواہش نفس سے نہیں کہتا بلکہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ خدا کی ہی وحی سے ہوتا ہے۔

"علمہ شدید القویٰ، ذومرۃ فاستویٰ۔ وھو بالافق الاعلیٰ، ثم دنیٰ فتدلیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ۔" "علمہ" تعلیم، سکھلانا۔ "شدید القویٰ" زبردست روحانی طاقتوں والا "مرۃ" زور آور" فاستویٰ" استواء، سیدھا ہو بیٹھنا۔ "افق الاعلیٰ" آسمان کا

اونچا کنارا "دنیٰ" دنو، قریب ہونا "فتدلّٰی" تدلّی، جھک آنا" قاب قوسین" دو کمان کی مقدار "ادنیٰ" قریب یا کم۔

"صاحبِ وحی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور وحی نازل کرنے والے (خدا) کے باہم رشتہ وحی کا اظہار کرنے کے بعد ضرورت تھی کہ ان دونوں کے درمیان جو وحی کے لیے رابطہ ہے یعنی جبرئیل کچھ اُس کے متعلق بھی کہا جائے، کیونکہ مشرکین مکہ اُس کی شخصیت اور اس کے فرض کی تفصیلات سے قطعاً ناآشنا تھے اور یوں بھی وحی کی عظمت، صاحب وحی کی جلالت اور وحی نازل کرنے والی ہستی کے جلال وجبروت کا تقاضا تھا کہ رابطۂ وحی کی شخصیت کے بعض نمایاں اوصاف کو بھی بیان کیا جائے اس لیے ارشاد ہوا۔ اُس پر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) جو وحی لاتا ہے وہ زبردست روحانی وجسمانی طاقتوں کا پیکر ہے، وہ پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی حقیقی ہیئت وصورت میں صاف نمایاں نظر آیا اور آپ نے اُس کو آسمان کے بلند کنارے پر دیکھا، پھر وہ قریب ہوگیا پس (پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب) جُھک آیا، پھر ہوگیا اتنا قریب جیسا کہ دو کمان کی مسافت یا اس سے بھی قریب تر۔

"فاوحی الی عبدہ ما اوحی، ما کذب الفؤاد ما رأی، افتمارونہ علی ما یری" "فؤاد" قلب "رأی" رویت بصر "تمارونہ" ممارات بمعنی مقابلہ کرنا جھگڑا کرنا۔

جب صاحب وحی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور وحی کے لانے والے (جبرئیل علیہ السلام) کے درمیان صورت حال یہ پیش آئی تو اُس کے بعد موحی (وحی کرنے والے خدا) نے اپنے بندے پر جو کچھ چاہا وہ براہِ راست وحی فرمائی یعنی اب اُس مقامِ رفیع پر بلا کر جہاں کسی مخلوق کا گذر نہ ہوا اور نہ ہو، مخاطب کو کیا بتلایا جائے کہ خدا اور اس کے پیغمبر کے درمیان کیا کچھ وحی کی سرگوشیاں ہوئیں، کیونکہ کسی کو وہ رفعت جب نصیب ہی نہیں تو وہ اُن حقائق کو سمجھ ہی کیا سکتا ہے لہٰذا اسی قدر کافی ہے کہ یہ یقین کرلو کہ خدا نے جو چاہا اپنے بندہ (محمد صلی اللہ

علیہ وسلم) سے بات چیت کی اور یہ کہ اس کی آنکھ نے اس شب میں جن اسرارِ الٰہی کو دیکھا قلب نے اس کو جھوٹا نہیں کہا، بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کے بارے میں چشم و قلب دونوں کے درمیان مطابقت و تصدیق کا ہی سلسلہ قائم رہا تو پھر اے مخاطبین جو کچھ اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا ہے کیا تم اس کے متعلق جھگڑتے ہو؟

"وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی، عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی، عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی

اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی"

"نزلۃ اخریٰ" ایک قسم کا نزول یا دوسری مرتبہ "سدرہ" بیری کا درخت" سدرۃ المنتہیٰ، ملاءِ اعلیٰ کا ایک مقامِ رفیع "جنۃ الماویٰ" نیکوں کے قیام کی جنت" یغشیٰ" غشیان، ڈھانپ لینا۔

حالانکہ جھگڑنے کی کوئی بات نہیں اس لئے کہ اس نے وحی کرنے والے (خدا) کو ایک خاص کیفیتِ نزول کے ساتھ دیکھا ہے اور اس وقت دیکھا جب وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تھے جس کے قریب جنت الماویٰ ہے اور اس وقت اس سدرہ کو ڈھانپنے والے شے (یعنی فرشتوں) نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یا یہ کہئے کہ اس نے جبریلؑ کو دوسری مرتبہ (اصلی ہیئت میں) دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے قریب الخ پس نہ مشاہدۂ جلوۂ حق کوئی جھگڑنے کی بات ہے اور نہ رویتِ جبرئیل کہ جس کو اس سے قبل بھی اس نے دیکھا ہے اور چشمِ حق میں اور قلبِ حق آگاہ کے لئے ان میں سے ایک بات بھی قابلِ نزاع نہیں۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی، لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی۔

"زاغ" زیغ، کجی، "طغیٰ" طغیان، سرکشی، خلافِ حق رجحان۔

بہرحال اس کے مشاہدۂ حق پر کوئی جھگڑے اور انکار کرے یا تسلیم کرے اور حق جانے حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے لیلۃ الاسراء میں جو کچھ بھی مشاہدات کئے اور آنکھوں سے جو کچھ بھی دیکھا اس چشمِ حق بین نے حقیقتِ حال کے خلاف نہ کسی قسم کی کجی اختیار کی اور نہ وہ راہ سے بے راہ ہوئی اور بلا شائبہ شک و شبہ اس نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے نشان

۱؎ مشکلات القرآن ص ۲۴۰ تا ۲۶۰

دیکھے۔

واقعہ کی تفصیلات

وہ نشان کیا تھے جن کو اس جگہ "لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی" کہا اور بنی اسرائیل میں "لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا" فرمایا اور اسی سورہ میں دوسرے مقام پر وما جعلنا الرؤیا التی اریناك الا فتنۃ للناس" کہہ کر ان کی اہمیت کو روشناس کرایا تو بخاری ومسلم میں منقول صحیح، مشہور اور مقبول روایات کا مجموعی بیان یہ ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صبح کو ارشاد فرمایا: گذشتہ شب میرے خدا نے مجھ کو اپنے خاص مجد و شرف سے نوازا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ شب گذشتہ جبکہ میں سو رہا تھا رات کے ایک حصہ میں جبرئیل آئے اور مجھ کو بیدار کیا ابھی پوری طرح جاگ بھی نہ پایا تھا کہ حرم کعبہ میں اٹھا لائے اور تھوڑی دیر لیٹا تھا کہ پوری طرح بیدار کر کے اول میرا سینہ چاک کیا اور (ملاء اعلیٰ کے ساتھ مناسبتِ تام پیدا کرنے کے لئے عالم دنیا کی کدورتوں کو) دھویا اور ایمان وحکمت سے بھر دیا۔ اس کے بعد حرم کے دروازہ پر لایا گیا اور وہاں جبرئیل نے میری سواری کے لئے خچر سے کچھ چھوٹا جانور براق پیش کیا جو سپید رنگ تھا۔ جب میں اس پر سوار ہو کر روانہ ہوا تو اس کی سبک رفتاری کا یہ عالم تھا کہ حدِ نگاہ اور حدِ رفتار یکساں نظر آتی تھی کہ اچانک بیت المقدس جا پہنچے یہاں جبرئیل کے اشارہ پر براق کو مسجد کے دروازہ کے اس حصہ سے باندھ دیا جس سے انبیاء بنی اسرائیل مسجد اقصیٰ کی حاضری پر اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے (اور جو اُس وقت تک بطور یادگار قائم تھا) پھر میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعات پڑھیں اب یہاں سے ملاء اعلیٰ کی طیاری شروع ہوئی تو اول جبرئیل نے میرے سامنے دو پیالے پیش کئے ان میں سے ایک شراب (خمر) سے لبریز تھا اور دوسرا دودھ (لبن) سے تو میں نے دودھ کا پیالہ قبول کیا اور شراب کا پیالہ مسترد کر دیا، جبرئیل نے یہ دیکھ کر کہا: آپ نے دودھ کا پیالہ قبول کر کے دینِ فطرت کو اختیار کیا (یعنی خدا کی جانب سے جو میں نے آپ کو یہ دو[2] پیالے پیش کئے تو دراصل یہ تمثیل تھی دینِ فطرت اور دینِ زیغ کی مگر آپ نے اس حقیقت کو پہچان

لیا اور دودھ کے پیالہ کو قبول فرما کر جو دینِ فطرت کی تمثیل تھا دینِ فطرت کو قبول فرمایا۔ اس کے بعد ملاءِ اعلیٰ کا سفر شروع ہوا اور جبرئیل کی ہمرکابی میں براق نے آسمان کی جانب پرواز کی، جب ہم پہلے آسمان (سماءِ دنیا) تک پہنچ گئے تو جبرئیل نے نگہبان فرشتوں سے دروازہ کھولنے کو کہا نگہبان فرشتہ نے دریافت کیا، کون ہے؟ جبرئیل نے کہا: میں جبرئیل ہوں۔ فرشتہ نے دریافت کیا: تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبرئیل نے جواب دیا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فرشتہ نے کہا: کیا خدا کے مدعو ہوکر آئے ہیں؟ جبرئیل نے کہا: بیشک تب فرشتہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا: ایسی ہستی کا آنا مبارک ہو۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو حضرت آدم (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی۔ جبرئیل نے میری جانب مخاطب ہوکر کہا: یہ آپ کے والد (اور نسل انسانی کے مورث اعلیٰ) آدم (علیہ السلام) ہیں آپ ان کو سلام کیجیے میں نے ان کو سلام کیا اور انہوں نے جوابِ سلام دیتے ہوئے فرمایا "مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح۔ خوش آمدید برگزیدہ بیٹے اور برگزیدہ نبی" اس کے بعد دوسرے آسمان تک پہنچے اور پہلے آسمان کی طرح سوال وجواب ہوکر دروازہ میں داخل ہوئے۔ تو وہاں یحییٰ وعیسیٰ (علیہما السلام) سے ملاقات ہوئی جبرئیل نے ان کا تعارف کرایا اور کہا کہ آپ سلام پیشقدمی فرمائیے، میں نے سلام کیا اور ان دونوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا "مرحبا بالاخ الصالح والنبی الصالح، خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی" پھر تیسرے آسمان تک پہنچ کر یہی مرحلہ پیش آیا اور جب میں آسمانِ ثالث میں داخل ہوا تو حضرت یوسف (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی، جبرئیل نے تقدیمِ سلام کے لیے کہا اور میرے سلام کرنے پر یوسف (علیہ السلام) نے بھی جوابِ سلام کے بعد یہی کلمہ کہا: "خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی"۔ بعد ازاں چوتھے آسمان پر اسی سوال وجواب کے ساتھ حضرت ادریس (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی اور پانچویں آسمان پر حضرت ہارون (علیہ السلام) سے، اور چھٹے آسمان پر موسیٰ (علیہ السلام) سے اسی طرح ملاقات ہوئی لیکن جب میں

وہاں سے روانہ ہونے لگا تو حضرت موسیٰ پر رقت طاری ہوگئی، میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا: مجھے یہ رشک ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے ایسی ہستی کو جو میرے بعد مبعوث ہوئی یہ شرف بخش دیا کہ اُس کی اُمت میری اُمت کے مقابلہ میں چند در چند زیادہ جنت سے فیضیاب ہوگی۔ اس کے بعد سابق سوالات وجوابات کا مرحلہ طے ہوکر جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی جو بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے اور جس میں ہر روز ستر ہزار نئے فرشتے (عبادت کے لیے) داخل ہوتے ہیں، اُنھوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: "مبارک اے میرے برگزیدہ بیٹے اور برگزیدہ نبی" یہاں سے پھر مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا (تمہاری بول چال میں یہ ایک انتہا کی بیری کا درخت ہے) جس کا پھل (بیر) ہجر کی ٹھلیا کی برابر ہے اور جس کے پتے ہاتھی کے کان کی طرح چوڑے ہیں[1]۔ اس پر ملائکۃ اللہ جگنو کی طرح بے تعداد چمک رہے تھے اور خدا کی خاص تجلی نے اس کو حیرت زا طور پر روشن و پرکیف بنا دیا تھا

اسی سفر میں میں نے چار نہروں کا بھی معائنہ کیا ان میں سے دو ظاہر نظر آتی تھیں اور دو باطن میں بہہ رہی تھیں۔ یعنی دو نہریں جن کا نام نیل[2] اور فرات[3] ہے آسمانِ دنیا پر نظر پڑیں اور دو نہریں جنت کے اندر موجود پائیں اور ان مشاہدات کے بعد مجھ کو شراب (خمر) دودھ

---

[1] سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق مختلف روایات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان پر ہے اور اس کی شاخیں ساتویں آسمان سے بھی نکل گئی ہیں۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے چیزیں زمین پر اترتی اور زمین سے اوپر چڑھکر وہاں تک پہنچتی ہیں گویا نزول وعروج کا مقام اتصال ہے اس مقام سے آگے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ نہ جبریل علیہ السلام اور دوسرے ملائکۃ اللہ کا گذر ہوا اور نہ کسی نبی مرسل کا۔

محدثین کہتے ہیں کہ یہ مقام اس درخت کی شکل میں دراصل "ایمان وحکمۃ" کی حقیقت کو متشکل ومصور ظاہر کرتا ہے اس لیے کہ ایمان نیت صالح، قول صالح اور عمل صالح کا جامع ہے۔ پس یہ درخت اپنے پھل کے ذائقہ اپنی خوشبو اور اپنے سایہ ہر سہ صفات کے لحاظ حقیقت ایمان کا مظہر ہے، یعنی اس درخت کے پھل کا لذیذ ذائقہ نیت صالح کا مظہر ہے اور عمدہ خوشبو قول صالح اور راحت بخش سایہ عملِ صالح کا مظہر ہے اور اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی تشبیہ شجر کے ساتھ دی ہے: ارشاد مبارک ہے "الایمان بضع وسبعون شعبۃ الحدیث۔ باقی صفحہ ٣٦٠ پر

اور شہد کے پیالے پیش کئے گئے اور میں نے دودھ کو قبول کر لیا اس پر جبریل نے مجھے بشارت سنائی کہ آپ نے "دینِ فطرت" کو قبول کر لیا (یعنی جو ہر قسم کی کدورتوں سے پاک اور شفاف ہے عمل میں شیریں اور خوشگوار اور نتیجہ میں حد درجہ مفید اور احسن ہے)۔

پھر خدائے تعالیٰ کا خطاب ہوا کہ تم پر شبانہ روز پچاس نمازیں فرض قرار دی گئیں جب میں ان اسرارِ الٰہی کے مشاہدات سے فارغ ہو کر نیچے اترنے لگا تو درمیان میں موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انھوں نے دریافت کیا: معراج کا کیا تحفہ لائے؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں۔ انھوں نے فرمایا: تمہاری امت اس بارِ گراں کو برداشت نہ کر سکے گی اس لئے واپس جائیے اور تخفیف کی التجا کیجئے کیونکہ میں تم سے قبل اپنی امت کو آزما چکا ہوں، چنانچہ میں درگاہِ الٰہی میں رجوع ہوا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے پانچ کی تخفیف ہو گئی موسیٰ علیہ السلام تک لوٹ کر آیا تو انھوں نے پھر اصرار کیا کہ اب بھی زیادہ ہیں اور کم کراؤ اور میں اسی طرح چند مرتبہ آتا جاتا رہا حتیٰ کہ صرف پانچ نمازیں رہ گئیں۔ مگر موسیٰ (علیہ السلام) مطمئن نہیں ہوئے اور فرمایا میں بنی اسرائیل کا کافی تجربہ اور ان کی اصلاح کر چکا ہوں اس لئے مجھے اندازہ ہے کہ آپ کی امت یہ بھی برداشت نہ کر سکے گی اس لئے تخفیف کے لئے مزید عرض کیجئے تب میں نے کہا کہ اب عرض کرتے شرم آتی ہے، میں اب راضی برضا اور اس کے فیصلہ کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہوں۔ جب میں یہ کہہ کر چلنے لگا تو ندا آئی "ہم نے اپنا فرض نافذ کر دیا اور اپنے بندوں کے لئے تخفیف کر دی یعنی مشیتِ الٰہی قبل ہی یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ امتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بصورتِ ادا اگرچہ پانچ نمازیں فرض رہیں گی مگر ان کا اجر و ثواب پچاس ہی کی برابر ہوگا اور یہ تخفیف ہمارا فضل و کرم ہے۔

حاشیہ صفحہ سابق

یا تو یہ مراد ہے کہ جس وقت آپ نے جنت میں دو نہریں دیکھیں تو آپ نے اسی وقت جب دنیا کی جانب نگاہ کی تو وہاں سامنے نیل اور فرات بہتی ہوئی نظر آئیں اور یا یہ ملاءِ اعلیٰ کی نہروں کے اسی طرح نام ہیں جس طرح دنیا کے دو دریا نیل اور فرات ہیں۔

ان ہی روایات میں ہے کہ آپ نے جنت و جہنم کا بھی مشاہدہ کیا اور پھر مشاہدہ کی تفصیلات بھی منقول ہیں۔

معراج میں رویت باری

کیا معراج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتِ احدیت کے جمالِ جہاں آرا کا بے حجاب مشاہدہ کیا؟ صحیح روایات میں اس مسئلہ کے متعلق جو تعبیرات مذکور ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاہدہ ضرور کیا تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس مشاہدہ کی کیفیت کے حقیقی اظہار سے اس لیے قاصر ہیں کہ دنیوی تعبیرات میں کوئی تعبیر ایسی موجود نہیں کہ بلند سے بلند ترین مخلوق اس کے ذریعہ جمالِ جہاں آرا کی کیفیت و حقیقت کو بیان کر سکے اس لیے آپ نفسِ واقعہ کا اقرار فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں منقول ہے "رأیتہ نوراً" میں نے اس کو نور دیکھا" اور مشاہدہ کے باوجود جمالِ جہاں آرا کی ناقابلِ بیان کیفیت کا پھر ان الفاظ میں اظہار بھی فرماتے جاتے ہیں "نوراً انّی اراہ۔ اس نورِ بحت کا حقیقی مشاہدہ کہاں ہو سکتا تھا"

یہی حضرت عبداللہ بن عباس کے مقابلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے رویتِ باری کی نفی میں آیت قرآنی کا یہ استدلال لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار۔ اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کا یعنی دیکھنے والوں کی پوری حقیقت کا ادراک کیے ہوئے ہے' اس لیے مرجوح ہے کہ آیت میں موجودہ دنیا کی مادی اور محدود بصارت کے مشاہدہ کا انکار ہے جو بلا ریب حق ہے لیکن ملاءِ اعلیٰ کا وہ مقامِ معراج جہاں زمان و مکان اور حدود و قیود سے آزاد اسرارِ الٰہی کے مشاہدات کے لیے کسی کو نوازا گیا ہو تو اس کے مشاہدۂ حقیقت کا یہ آیت کسی طرح انکار نہیں کرتی۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے زمانہ سے آج تک محققین علماء کی ایک کثیر جماعت سلفاً عن خلف سورۂ والنجم کی آیت "افتمارونہ علی ما یریٰ" "ما کذب الفؤاد ما رایٰ" کی تفسیر میں صحیح احادیث کی استمداد سے یہ ثابت کرتی رہی ہے کہ ان مقامات میں رویت

سے "رویتِ باری" مراد ہے۔ چنانچہ محقق عصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ نے سورۂ والنجم کی دقیق و لطیف اور بے بہا تفسیر میں اس حقیقت کو باحسن وجوہ بیان فرمایا ہے۔[1]

ہجرت

ہجرت لفظ "ہجر" سے ماخوذ ہے جس کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں اور اسلام کی اصطلاح میں "اللہ کے لیے ترکِ وطن کر دینا" ہجرت کہلاتا ہے۔

ہجرتِ حبش اللہ کے دین پر استقامت اور کلمۂ حق کی حفاظت کی خاطر فدا کارانِ اسلام کو ترکِ وطن کی پہلی آزمائش اس وقت پیش آئی جبکہ کفارِ مکہ اور مشرکین قریش نے ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر مسلمانوں کے لیے ان کے محبوب وطن (مکہ) میں دینِ حق پر قائم رہتے ہوئے لمحاتِ زندگی کو ناممکن بنا دیا اور اب ترکِ وطن کے علاوہ کوئی چارہ کار باقی نہ چھوڑا۔ پس مٹھی بھر مسلمانوں پر مشرکین کے ناقابلِ برداشت مظالم اور مسلمانوں کے حیرت زا صبر و استقلال نے دنیا، تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا جو "ہجرتِ حبش" کے عنوان سے معنون ہے۔

حبشہ کا موجودہ فرمانروا اصحمہ[2] عیسائی تھا اور دینِ مسیحی کا عالم بھی، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ سردست حبشہ کو ہجرت کر جائیں توقع ہے کہ اصحمہ کی حکومت اُن کا خیر مقدم کریگی اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر دینِ حق پر قائم و مستقیم رہ سکینگے۔

ہجرت کے اس دور کی نمایاں شخصیت حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) اور اُن کی

---

[1] تفسیر کا یہ حصہ فتح الملہم شرح مسلم جلد اوّل لعلامہ شبیر احمد عثمانی اور مشکلات القرآن لحضرۃ الشاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہٗ دونوں میں منقول ہے اور اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔

[2] حبشہ کے بادشاہ کا لقب "نجاشی" تھا جو "نجوس" کا معرب ہے۔ نجوس حبشی زبان میں حکمراں کو کہتے ہیں۔

رفیقۂ حیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر حضرت رقیہ (رضی اللہ عنہا) ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقدس جوڑے کو رخصت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ لوط اور ابراہیم (علیہما السلام) کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جو خدا کی راہ میں ہجرت کر رہا ہے۔[1] پھر آہستہ آہستہ یہ تعداد اسّی تک پہنچ گئی، ان مہاجرین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد بھائی حضرت جعفرؓ بھی تھے، یہی وہ مرد حق کوش ہیں جنہوں نے قریش کے وفد کی مہاجرین سے متعلق زہر چکانی اور مطالبۂ مراجعت کے سلسلہ میں نجاشیِ حبشہ کے دربار میں اسلام پر بے نظیر تقریر فرمائی اور جس کا ذکر صفحات گذشتہ میں ہو چکا ہے۔

ہجرت مدینہ کے اسباب

اا نبوت موسم حج کے موقعہ پر اعراء اور منی کے درمیان مقام عقبہ میں یثرب (مدینہ) کے چند لوگوں نے شب کی تنہائی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام حق سنا اور اسلام قبول کر لیا۔ یہ چھ یا آٹھ اشخاص تھے۔ دوسرے سال چند سابق اشخاص اور بعض دوسرے حضرات نے جو تعداد میں بارہ تھے حاضر خدمت ہو کر اسلام پر تبادلۂ خیالات کیا اور مشرف باسلام ہو گئے ان کے اسماءِ گرامی بروایت محمد بن اسحٰق یہ ہیں:۔ ابو امامہ، عوف بن الحارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر، معاذ بن حرث، ذکوان بن عبد قیس خالد بن مخلد، عبادہ بن صامت، عباس بن عبادہ، ابو الہیثم، عدیم بن ساعدہ[2]

حضرت عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ ہم نے عقبۂ اولی میں حسب ذیل شرائط کے ساتھ اسلام پر بیعت کی تھی

(۱) خدائے واحد کے ماسوا کسی کی پرستش نہیں کرینگے۔

(۲) چوری نہیں کرینگے۔

(۳) زنا نہیں کرینگے۔

(۴) اپنی اولاد کو قتل نہیں کرینگے۔

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۴ صفحہ ۴۰   [2] البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۱۴۹

(۵) کسی پر جھوٹی تہمتیں نہیں لگائینگے اور نہ کسی کی غیبت کرینگے۔

(۶) اور کسی بھی اچھی بات میں آپ کی (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی) نافرمانی نہیں کرینگے

بیعت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر تم نے ان شرائط کو پورا کیا تو تمہارے لیے جنت کی بشارت ہے اور اگر تم ان برائیوں میں سے کسی کے مرتکب ہوئے تو پھر تمہارا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے چاہے بخش دے اور چاہے جرم پر سزا دے۔

اس واقعہ نے مدینہ کے ہر گھر میں اسلام کا چرچا کر دیا اور آہستہ آہستہ ہر ایک خاندان میں آفتابِ اسلام کی ضیا باری ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ اوس و خزرج کی تمام شاخوں میں سے ۱۳؁ نبوت کو تہتر۷۳ مرد اور دو۲ عورتیں اسی مقام عقبہ پر موسم حج میں شب کی تاریکی کے اندر آفتابِ نبوت کی درخشانی سے فیضیاب ہونے جا پہنچے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے چچا عباس (رضی اللہ عنہ) کو ہمراہ لے کر وہاں پہنچ گئے اور اُن کے سامنے اسلام پر ایک موثر وعظ فرمایا جس سے اُن کے قلوب نورِ ایمان سے جگمگا اُٹھے۔ اس کے بعد انصار اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اس امر پر گفتگو ہوئی کہ اگر ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نزولِ اجلال فرمائیں تو اشاعتِ اسلام کو بھی بہت زیادہ فائدہ پہنچے اور ہم کو بھی فیضیاب ہونے کا بخوبی موقع میسر آئے اور اس سلسلہ میں جانبین سے محبت و مودت کے قول و قرار بھی ہوئے جن کی تفاصیل کتبِ سیر و تاریخ میں مذکور ہیں۔ ان ہی حضرات میں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ اشخاص کو منتخب فرما کر دعوت و تعلیمِ اسلام کے لیے اپنا نقیب مقرر فرمایا۔[۱]

یثرب (مدینہ) میں اسلام کی اشاعت نے جب اس طرح روز افزوں ترقی اختیار کر لی تو اب وحی الٰہی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی جاں نثارانِ اسلام کو اجازت دی کہ وہ مشرکین مکہ کی ہولناک ایذا رسانی سے محفوظ ہو جانے کے لیے مدینہ ہجرت کر جائیں اور

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ جلد ۳ صفحہ ۱۵۰-۱۵۱۔

خدا کے لیے ترکِ وطن اختیار کریں، چنانچہ آہستہ آہستہ مسلمانوں نے مدینہ کو ہجرت شروع کر دی مشرکین مکہ نے یہ دیکھ کر مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لیے مظالم میں اور اضافہ کر دیا اور انسدادِ ہجرت کے لیے ممکن ذرائع کو اختیار کیا مگر فداکارانِ اسلام کا جذبۂ ہجرت فرو نہ ہوا بلکہ وہ کثرت کے ساتھ مال، جان، آبرو اور اولاد کی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اللہ کی راہ میں وطنِ عزیز کو خیرباد کہتے رہے اور اکثر ایسا ہوا کہ جب اہلِ مکہ نے اُن کے اموال اور اہل و عیال کو ساتھ لے جانے سے روک دیا تو ان مردانِ خدا نے صبر آزما زندگی کے ساتھ ہجرتِ حق کی خاطر ان کو بھی وہیں چھوڑا اور تنہا خدا کے بھروسہ پر مدینہ روانہ ہو گئے۔

ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اب مکہ میں مشاہیر مسلمانوں میں سے صرف ابوبکر اور علی (رضی اللہ عنہما) ہی باقی رہ گئے تھے[1] اور ایک قلیل تعداد باقی مسلمانوں کی تھی تب قریش نے سوچا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے اسلام کو مٹا دینے کا اس سے بہتر دوسرا کوئی موقع نہیں آئیگا۔

دارالندوہ

چنانچہ تمام سردارانِ قریش قُصَی بن کلاب کے قائم کردہ گورنمنٹ ہاؤس "دار الندوہ" میں جمع ہوئے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل سے متعلق سازشی مجلسِ مشاورت قائم کی۔ اس مجلس میں عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، طعیمہ بن عدی، جبیر بن مطعم، حارث بن عامر، نضر بن حارث، ابوالبختری، زمعہ بن اسود، حکیم بن حزام، ابوجہل، نبیہ بن الحجاج، منبہ بن الحجاج، اُمیہ بن خلف جیسے صنادیدِ قریش شریکِ مشورہ تھے مشورہ شروع ہونیوالا ہی تھا کہ ایک شیطان "شیخ نجدی" دارالندوہ کے دروازہ پر آموجود ہوا اور شرکتِ مجلس کا خواستگار بنا۔ قریشِ مکہ نے ہم مشرب پاکر بخوشی اجازت دی اور اب مشورہ شروع ہوا۔ مختلف اہل الرائے نے مختلف رائیں دیں لیکن شیخ نجدی نے ہر ایک رائے کو غلط قرار دیا آخر ایک شخص نے کہا: تمام قبائل میں سے ایک ایک جوان لیجیے اور اُن سے کہیے کہ وہ یک، دفعۃً

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۱۷۵۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حملہ کر کے قتل کر دیں اس سے کام بھی بن جائیگا اور بنو عبدِ مناف کسی سے قصاص لینے کی جرأت بھی نہ کر سکینگے اور صرف خونبہا پر معاملہ طے ہو جائیگا۔ شیخ نجدی نے اس رائے کو بہت سراہا اور یہی رائے طے پا گئی۔ اِدھر جبرئیل نے وحی الٰہی کے ذریعہ ذاتِ اقدس کے سامنے اس پوری داستان کو کہہ سنایا اور عرض کیا کہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ آپ آج کی شب اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سُلا کر خود مدینہ کو ہجرت کر جائیے چنانچہ وحی الٰہی کے مطابق آپ قریش کے نوجوانوں کی حراست کے باوجود سورۂ یٰسین کی چند آیات " فاغشینا ھم فھم لا یبصرون " پڑھتے ہوئے اور " شاھت الوجوہ " فرما کر مٹھی بھر خاک اُن کے سروں پر ڈالتے ہوئے صاف بچ کر نکل گئے اور حضرت ابوبکرؓ کے مکان جا کر اور وحی الٰہی کا مژدۂ رفاقت سنا کر اُن کو ہمراہ لیے مدینہ کو روانہ ہو گئے۔

ہجرت کا یہ واقعہ ربیع الاول سنہ ۱۳ نبوت دوشنبہ کے روز پیش آیا، یہ واقعہ اپنے خصوصی حالات اور معجزانہ اثرات کے ساتھ بہت مشہور اور صحیح احادیث و روایات میں مذکور ہے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سفرِ ہجرت میں رفاقت کی عظمت و جلالت کے لیے رہتی دنیا تک قرآن عزیز اس طرح ناطق ہے۔

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ اِذْ	دوسرا تھا دو کا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے کہ یہ
یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا	اپنے رفیق (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا، ابوبکر غم نہ کھا
	بلاشبہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے " لاتحزن " فرمایا " لاتخف " نہیں فرمایا، یہ اس لیے کہ " خوف " اور " حزن " کے لغوی فروق میں سے ایک دقیق فرق یہی ہے کہ عموماً " خوف " اپنی مضرت کے سلسلہ میں ہوا کرتا ہے بخلاف حزن کے کہ وہ اس رنج کو کہتے ہیں جو اکثر دوسرے کی مصیبت کی وجہ سے خود کو پیش آتا ہے۔ گویا قرآنِ عزیز بنصِ صریح

ؔ دشمن رو سیاہ ہوں۔

ناطق ہے اس حقیقت کے لیے کہ ابوبکر کو اپنی جان اور اپنی ذات کا خوف نہیں تھا بلکہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری اور مشرکین کے ہاتھوں ظلم رسانی کا حزن و ملال جانکاہی پر آمادہ کیے ہوئے تھا پس حضور قدسی صفات نے ابوبکر کی اس حالت کا اندازہ لگایا تو لاتخف کی جگہ لاتحزن ارشاد فرمایا اور ساتھ ہی "ان اللہ معنا" فرما کر ابوبکر کی رفاقت کی مقبولیت پر بھی مہرِ تصدیق ثبت فرمادی۔ دنیا اپنے بغض و عناد اور زندقہ و الحاد سے جو چاہے کہے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر کی "معیتِ حقہ" کے لیے قرآن کے جملہ "اللّٰہ معنا" کی ناطقیت کے بقا و دوام کو ساری کائنات بھی مل کر مٹانا چاہے تو نہیں مٹا سکتی۔ ذٰلکَ فضلُ اللّٰہِ یُؤتیہِ من یشاءُ وَاللّٰہُ ذُو الفضلِ العظیم۔

قرآنِ عزیز اور ہجرتِ مدینہ

واقعۂ معراج میں گذر چکا ہے کہ درحقیقت اسراء تمہید تھی ہجرت کے عظیم الشان واقعہ کی یعنی واقعۂ اسراء کے عجائبات اس امر کی تمہید تھے کہ اب آپ کی تبلیغی زندگی کا دور ایک دوسرا رُخ اختیار کرنے والا ہے جو کامرانیوں اور کامیابیوں سے بھرپور ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ پہلے آپ کو قبلتین اور ملاءِ اعلیٰ کے اسرار و غوامض سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ مکی زندگی جب مدنی حیات میں منقلب ہو تو اس سے قبل نبوت و رسالت کے کمالات غایتِ قصویٰ تک پہنچ چکے ہوں اور آپ کا منصب ہدایت اُس مقام رفیع تک جا پہنچے

۱۵ ہو جہاں خدا کی بلند سے بلند ترین مخلوق کا بھی گذر نہ ہوا ہو تاکہ آپ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" کے شرف کو حاصل کر سکیں

پس سورۂ بنی اسرائیل از ابتداء تا انتہاء ہجرت مدینہ کے ہی اسرار و لطائف سے معمور ہے چنانچہ ابتدائی آیات میں اسراء کا بیان ہے اور پھر ذکر آ گیا ہے رشد و ہدایت کے اصول کا اور درمیان میں امم سابقہ اور اُن کے ہداۃ انبیاء و رسل کے واقعاتِ تبلیغی کا تذکرہ، شواہد و نظائر بن کر سامنے آجاتا ہے اور اس ضمن میں معراج کے حِکَم و اسرار کا بھی ذکر ہوتا جاتا ہے اور اس کے بعد "رب ادخلنی مدخل صدق۔ الآیۃ" سے مکہ سے خروج اور مدینہ کی ہجرت کا ذکر شروع ہو جاتا ہے

اور یہ ذکر آخر سورت تک جاری رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور حضرت قتادہ (رحمہ اللہ) نے مسطورۂ ذیل ہر دو آیات کے سلسلۂ مضامین کو ہجرت مدینہ سے ہی وابستہ قرار دیا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ	اور قریب تھا کہ وہ (مشرکین) البتہ تجھ کو عاجز کر دیتے
الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا	سرزمین (مکہ) سے تاکہ تجھ کو اس سے نکال دیں اور
لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا	ایسی حالت میں اُن کی ہلاکت بہت قلیل عرصہ میں
(اسریٰ)	سامنے آجاتی۔

یہ مشرکین کے حق میں سخت قسم کی تہدید و تخویف ہے کہ جب بھی تمہارے مظالم کی بدولت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت مدینہ پیش آئیگی تمہاری اجتماعی زندگی کی ہلاکت قریب سے قریب تر ہو جائیگی، گویا ہجرت مدینہ اسلام کی روز افزوں ترقی اور معاندین اسلام کی موت و ہلاکت کے لیے تقدیر مبرم ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ	اور کہیے! اے میرے پروردگار مجھ کو داخل کر (مدینہ)
صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ	میں اچھا داخلہ اور نکال مجھ کو (مکہ) سے عزت کے
صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ	ساتھ اور میرے لیے اپنی جانب سے زبردست
لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا	نصرت و مدد عطا کر۔

اسی طرح سورۂ انفال میں بعض واقعات کے ضمن میں ہجرت مدینہ کا تذکرہ موجود ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اور (وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب منکرین تیرے خلاف
لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ	سازش کر رہے تھے تاکہ تجھ کو قید کرلیں یا مار ڈالیں
يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَ	یا (مکہ سے) نکال دیں اور وہ اپنی سازشوں میں
يَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ	لگے ہوئے تھے اور خدا (اس کے خلاف) تدبیر کر چکا
الْمٰكِرِيْنَ ۝	تھا اور اللہ تدبیر کرنیوالوں میں سب سے بہتر تدبیر ہے

اور اسی طرح سورہ توبہ میں صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) کی عظمت و جلالتِ قدر کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ہجرت مدینہ کا ذکر اس طرح موجود ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ	اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرو گے
اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ	تو (نہ کرو) اوس کی اللہ تعالیٰ نے اس وقت
اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ	مدد فرمائی جب اُس کو منکرین نے (مکہ سے) نکالا جبکہ
لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ	وہ دونوں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ) غار میں (حرا
اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ	میں روپوش) تھے جب وہ رسول اپنے رفیق (ابوبکرؓ سے)
لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ	کہہ رہا تھا، تو غم نہ کھا بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے پس اللہ
كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا	نے اُس پر اپنا سکینہ (طمانیت) اتارا اور اُس کو ایسے لشکر
وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝	کے ذریعہ قوت پہنچائی کہ تم اُس کو نہیں دیکھ رہے تھے اور

(اس طرح) خدا نے کافروں کا کلمہ پست کر دیا اور اللہ کا کلمہ ہی سب سے بلند ہے اور بلاشبہ اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔

ہجرت؟ اسلام میں "ہجرت" ایک اہم فریضہ ہے، کون نہیں جانتا کہ انسان کے لیے وطن، مال اور اہل و عیال کس، درجہ عزیز ہوتے ہیں اور وہ ان ہی متاعِ گرانمایہ پر اپنی دنیوی عیش و راحت اور بقاءِ حیات کا مدار سمجھتا ہے لیکن اُس کی انسانیت اور انسانیت کا ارتقاء ان تمام مقاصدِ حیات سے بھی ایک بلند اور رفیع مقصدِ زندگی کا طالب ہے اور وہ خالقِ کائنات اور رب العالمین کی معرفت ہے جس کی ربوبیت نے اُس کو یہ جامۂ ہستی عطا کیا، اسی معرفت کا نام "دین" اور "ملت" ہے۔ انسان جب اس مقصدِ حقیقی کو پالیتا ہے تو پھر اُس کی نگاہ میں اس درجہ وسعت اور رفعت پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کی ان تمام رنگینیوں اور نیرنگیوں کا دامنِ وسیع بھی اُس کو تنگ نظر آتا اور وہ اس تنگ دامنی سے عاجز ہو کر آخرکار "حیاتِ روحانی" کی آغوش میں ہی تسکین پاتا ہے اور جب اس مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس حیاتِ باقی "دینِ حق" کی خاطر وہ دنیا کی تمام متاعِ گرانمایہ تن، من، دھن حتیٰ کہ اہل و

عیال کو بھی تج دیتا ہے اور اس دُرِ بے بہا کو آنچ تک نہیں آنے دیتا جس کا نام "ایمان" ہے۔ اسی حقیقت حال کو اسلام کی مقدس اصطلاح میں "ہجرت" کہا جاتا ہے۔

اسی بنا پر "ہجرت" ایک صادق الایمان اور مخلص مسلمان اور منافق اور کافر ہستی کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے بہترین کسوٹی" اور معیار ہے نیز فضائے روحانی کا تھرمامیٹر معلوم کرنے کے لیے "جہاد" اور "ہجرت" ہی ایسے دو "مقیاس الحرارت" ہیں جن سے مومنوں کے ایمان کی حرارت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

قرآن عزیز نے "ہجرت" کی اہمیت پر جگہ جگہ توجہ دلائی ہے اور اُس کو ایمان و اسلام کی کسوٹی قرار دیا ہے جس کے لیے یہ مقامات خصوصیت کے ساتھ قابلِ مطالعہ ہیں۔

(۲۱۸/۲، ۱۹۵/۳، ۷۴/۸، ۲۰/۹، ۱۱۱/۱۶، ۵۸/۲۲، ۱۰۰/۴، ۴۱/۱۶، ۹۷/۴)

ابتداءِ اسلام میں مکہ دار الکفر اور دار الحرب تھا، اس لیے وہاں سے مدینہ کو ہجرت کر جانا اسلام کے اہم ترین فرائض میں سے تھا تاکہ مسلمان مدینہ میں امن و عافیت کے ساتھ احکامِ اسلام کی پیروی کر سکیں اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اسلام کے مقصدِ عظمیٰ "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کی یا دوسرے الفاظ میں "اعلاءِ کلمۃ اللّٰہ" کی صحیح خدمت انجام دے سکیں مگر جب سنہ ۸ ہجری میں "فتح مبین" نے مکہ کی اس حالت کو بدل کر "دار الاسلام" بنا دیا تو اب ہجرت کا یہ خاص فرض ختم ہو گیا اور زبان وحی ترجمان نے "لا ھجرۃ بعد الفتح"[۱] فرما کر اس حقیقت کا اعلان کر دیا، البتہ اب بھی مرکز توحید کے ساتھ والہانہ عشق و محبت کے جذبہ میں مکہ اور مدینہ ہجرت کر کے جانا اجر و ثواب کا ضرور استحقاق پیدا کرتا ہے۔

اور اگر کسی مقام اور کسی ملک میں بھی مسلمانوں کے لیے حیاتِ ایمانی کے پیشِ نظر وہی صورتِ حال پیدا ہو جائے جو اسلام کے ابتدائی دور (مکی دور) میں تھی تو اُس وقت مسلمانوں کے لیے وہی احکام عائد ہو جائیں گے جو "مکی دور" کے متعلق قرآن و حدیث اور اُن سے مستنبط "فقہ اسلامی"

---

[۱] فتح مکہ کے بعد مدینہ کی ہجرت فرض نہیں رہی۔

میں پائے جاتے ہیں اور اصولی طور پر اُس وقت صرف دو ہی اسلامی مطالبے سامنے آجائینگے یا "جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ اس حالت کا انقلاب" اور یا پھر "ہجرت" اور کسی طرح بھی یہ جائز نہیں ہوگا کہ حالتِ راہنہ (موجودہ حالت) پر قناعت کر کے مطمئن زندگی بسر کی جائے

کہ جب دار الکفر اور دار الحرب تھا تو اُس وقت ہجرتِ مدینہ کو اسلام نے کس درجہ اہمیت دی اور اس مقصدِ رفیع کے لیے مسلمانوں سے کس درجہ قربانی اور ایثارِ نفس کا مطالبہ کیا۔ آیاتِ ذیل سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران)

جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور میری راہ میں لڑے اور مارے گئے میں ضرور اُن کے گناہ اُن سے دور کر دونگا اور اُن کو ایسی جنتوں میں داخل کرونگا جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں، یہ بدلہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (انفال)

جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اللہ کے نزدیک بہت بلند رتبے والے ہیں۔ اور وہی کامیاب ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ

بیشک جن کو فرشتوں نے ایسی حالت میں موت سے دوچار کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے اُن سے (فرشتوں نے) پوچھا کہ تم کس حالت میں

---

[1] البتہ جہاد فی سبیل اللہ کے طرق و اسباب ہر وقت کے تقاضے کے پیشِ نظر ہی عمل واجب ہوگا۔

قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃً	تھے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور تھے
فتھاجروا فیہا فاولٰئک ماواھم	فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی کہ
جہنم وساءت مصیرا ہ الا	تم اُس میں ہجرت کر جاتے سو یہی ہیں جن کا ٹھکانا
المستضعفین من الرجال و	جہنم ہی اور وہ بہت بُری جگہ ہی۔ مگر وہ کمزور مرد اور
النساء والولدان لایستطیعون	عورتیں اور بچے جو ہجرت کے لیے کوئی حیلہ نہیں
حیلۃ ولا یھتدون سبیلا ہ	کر سکتے اور نہ (ہجرت کے لیے) راہ پاتے ہیں تو یہ
فاولٰئک عسی اللہ ان یعفوا	وہ ہیں کہ اُمید ہی اللہ تعالیٰ اُن کو معاف کر دے
عنھم وکان اللہ عفوًا غفورًا ہ	اور اللہ بے شبہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہی۔

غزوات

غزوۂ بدر

غزوہ ارباب سیر و حدیث نے یہ اصطلاح مقرر کر لی ہی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں جس لشکر کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوں اس کو سریّہ اور جس میں بنفسِ نفیس خود شرکت فرمائیں اُس کو "غزوہ" کہتے ہیں۔

بدر قرآنِ عزیز نے جن اہم غزوات کا تذکرہ کیا ہی اُن میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت غزوۂ بدر کو حاصل ہی۔ بدر دراصل ایک کنوئیں کا نام ہی جس کی نسبت سے یہ وادی بھی بدر ہی کہلاتی ہی، یہ وادی مکہ اور مدینہ کے درمیان مدینہ سے قریب سلطانی راستہ[1] پر واقع ہی، اسی جگہ وہ اہم غزوہ پیش آیا جس نے دنیا کی تاریخِ ادیان و ملل ہی کا نہیں بلکہ ہر شعبۂ حیات کا رُخ پلٹ کر ظلم سے عدل کی جانب پھیر دیا۔

[1] حکومتِ عثمانی کے دورِ شباب میں مکہ سے مدینہ جانے کے لیے جو راہ مقرر ہوئی وہ "سلطانی راہ" کہلاتی ہی۔

واقعہ | یہ واقعہ چونکہ ادیان و ملل کی تاریخ انقلاب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس لیے راویانِ حدیث و سیرت نے اس کے ہر ایک جزء کی تفصیل کو واضح طور پر بیان کیا ہے تاکہ اُس تاریخی واقعہ کا کوئی گوشہ بھی تشنۂ تکمیل نہ رہے لیکن ہم اس مقام پر مختصر مگر جامع الفاظ میں اس کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں۔

ہجرتِ مدینہ مشرکین کے لیے کچھ اس درجہ برہمی اور اشتعال کا باعث ہوئی اور وہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کو اپنی ناقابلِ برداشت ایذا رسانی سے محفوظ دیکھ کر کچھ اس درجہ برافروختہ ہوئے کہ اب اُنہوں نے طے کر لیا کہ جس قیمت پر بھی ہو سکے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینا چاہیے چنانچہ اس کے لیے اُنہوں نے ہجرت سے متصل ہی معرکہائے جنگ کی ابتدا کر دی اور غزوۂ بواط اور غزوۂ عشیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے غزوات اسی سلسلہ میں پیش آئے مگر مشرکین مکہ کی آتشِ حسد کے لیے یہ کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہو جائے۔

اس ارادہ کی تکمیل کے لیے انہوں نے ضروری سمجھا کہ سامان حرب و ضرب بافراط میسر آئے اور اس کے لیے بہترین طریقہ یہ سوچا کہ ابو سفیان کی سرکردگی میں ایک قافلۂ تجارت شام کی منڈیوں میں جائے اور نفع کثیر حاصل کر کے اُس سے سامانِ جنگ مہیا کیا جائے اور اس جذبہ نے جوش و خروش کی یہ کیفیت پیدا کر دی کہ جب قافلۂ تجارت کی طیاری شروع ہوئی تو مکہ کے ہر متنفس نے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ اس تجارت کے لیے پیش کیا حتیٰ کہ ایک بڑھیا (عجوز) نے بھی اپنی محنت کی معمولی پونجی اس خدمت کے لیے پیش کر دی اور تقریباً مشترکہ قریشیوں پر مشتمل یہ قافلہ ابو سفیان کی قیادت میں شام کو روانہ ہو گیا۔

مشہور محدث و مفسر ابن جریر طبری اپنی کتاب "تاریخ الامم والملوک" میں قریش کی اس کیفیت کا اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں۔

وقد کانت الحرب بینھم قبل ذلك | اور قافلہ کی روانگی سے قبل مسلمانوں اور قریش مکہ

فقتلت قتلى وقتل ابن الحضرمي	کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی اور ان لڑائیوں میں
في ناس بنخلة واسرت أسارى	لوگ مارے جا چکے تھے اور (مشہور مشرک) ابن
من قريش .... وكانت تلك	حضرمی مارا جا چکا تھا اور قریش کے لوگ قیدی بھی
الواقعة هاجت الحرب بين	بنائے جا چکے تھے اور یہ واقعہ قریش کے اور مسلمانوں
رسول الله صلى الله عليه وسلم	کے درمیان جنگ کے مشتعل ہو جانے کا باعث بن
وبين قريش ..... وذلك قبل	گیا اور یہ سب کچھ ابوسفیان اور اس کے رفقاء کے
مخرج ابي سفيان واصحابه الى	شام کی جانب قافلہ تجارت کی شکل میں نکلنے سے
الشام [1]	قبل پیش آ چکا تھا۔

اور جلیل القدر محدث و مفسر ابن کثیر (رحمہ اللہ) اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

باب سرية عبد الله بن جحش	باب سریہ عبد اللہ بن جحش (سریہ نخلہ) جو سبب
التي كان سبباً لغزوة بدر العظمى	بنا بدر کبریٰ کے غزوہ کا اور جس کے متعلق قرآن نے
وذلك يوم الفرقان يوم التقى	یہ کہا اور یہ دن ہے حق و باطل کے نکھر جانے کا وہ
الجمعان والله على كل شيء قدير [3]	دن جبکہ (حق و باطل کی جنگ کے لیے) دو جماعتیں
	آپس میں ملیں اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

قریش کا تجارتی قافلہ جب نفع کثیر حاصل کر کے شام سے واپس ہو کر مکہ جا رہا تھا بدر سے قریب ہو کر گذرا، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا آپ نے فوراً صحابہ کو جمع کر کے مشورہ فرمایا تب بعض حضرات نے تو بخوشی اس کے مقابلہ کے لیے آمادگی ظاہر کی اور بعض نے یہ سمجھ کر کہ کسی اہم جنگ کا معاملہ نہیں ہے اس کے تعاقب پر آمادگی کا ثبوت نہیں دیا چنانچہ ابن کثیر نے بروایت محمد بن اسحٰق اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

[1] جلد ۲ ص ۲۶۷ [2] ابن حضرمی اسی غزوہ میں مارا گیا [3] جلد ۳ ص ۲۴۸

وقال ھذہ عیر قریش فیھا — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، یہ قریش کا قافلہ
اموالھم فاخرجوا الیھا لعل — جا رہا ہے جس میں اُن کا مال تجارت ہے اُس کا تعاقب
اللہ ینفلکموھا فانتدب الناس — کرو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اُس کو تمہارے لیے مالِ
فخفف بعضھم وثقل بعض و — غنیمت بنا دے پس لوگوں کو اس کے لیے پکارا گیا تو
ذلک انھم لم یظنوا ان رسول — بعض نے اس کو پسند کیا اور بعض نے نکلنے میں گرانی
اللہ یلقی حربًا — محسوس کی اور یہ عدول حکمی کے پیش نظر نہیں بلکہ

اس لیے تھی کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جنگ کے ارادہ سے نہیں جا رہے ہیں

مسلمانوں کا یہ لشکر جو قافلہ کے تعاقب میں نکلا سامانِ حرب سے بے پرواہ ہو کر مدینہ سے نکلا، مشہور روایت کے مطابق ان کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی جبکہ بحمداللہ مدینہ کے اندر ہی مسلمانوں کی آبادی ہزار ہا بالغ نفوس پر مشتمل تھی اور چند تلواریں ، دو تین گھوڑے ساٹھ زرہ اور صرف ساٹھ اونٹ اُن کا متاعِ جنگ تھا درآنحالیکہ مسلمانوں کے پاس بلکہ خود نکلنے والے مجاہدین کے پاس مدینہ میں بیش از بیش سامانِ جنگ اور اونٹ گھوڑے موجود تھے ۔ غرض یہ لشکر جنگی لشکر نہیں تھا بلکہ فدا کارانِ توحید کا ایک مختصر سا قافلہ تھا جو قریش کے حرب و ضرب کے سرمایہ پر قابض ہو کر دشمن کو بے مایہ بنانے نکلا تھا ۔

ابو سفیان کو مسلمانوں کے تعاقب کا حال معلوم ہوا تو گھبرایا اور فوراً ضمضم نامی ایک شخص کو اجیر بنا کر مکہ روانہ کیا کہ وہ قریش کو اس معاملہ کی خبر دے اور مدد طلب کرے قریش نے جب حقیقتِ حال کو سنا تو ان میں بہت زیادہ جوش پیدا ہو گیا اور تمام سردارانِ قریش[۲] آمادہ جنگ ہو کر اپنے اپنے لشکر کو لے نکل کھڑے ہوئے اور اس کر و فر سے نکلے کہ تعداد میں ایک ہزار تھے ، نیزے اور تلواریں بے شمار تھیں ، سات سو زرہ ، ستر گھوڑے اور بے تعداد اونٹ تھے وہ اونچی بنے ، نیزے اور تلواریں سجے ، ڈھالیں اور بکتر لگائے نشہ

[۱] جلد ۳ ص ۲۵۶ [۲] ابو لہب کے علاوہ سب ہی تھے ، ابو لہب بیمار تھا اس لیے اُس نے اپنا قائم مقام دیا تھا

غرور میں جھومتے ہوئے بدر کی جانب بڑھے۔

اِدھر مسلمان آگے بڑھتے ہوئے جب وادیٔ صفراء کے قریب پہنچے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسبس بن عمرو اور عدی بن الزغباء کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ قافلہ کا حال معلوم کر کے آئیں ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ یہ دونوں بدر پہنچے تو وہاں کنویں کے قریب قبیلہ جہینہ کا ایک شخص مجدی بن عمرو موجود تھا اور نزدیک ہی دو لڑکیاں آپس میں بات چیت کر رہی تھیں۔ ایک نے دوسری سے کہا کہ کل یا پرسوں یہاں قریشی قافلہ آنے والا ہے میں اس میں کام کروں گی اور تیرا قرض اُتار دوں گی اور پھر مجدی نے اُس لڑکی کی تصدیق کی بسبس نے یہ سُنا تو وہ اور عدی اونٹوں کو پانی پلا فوراً روانہ ہو گئے[۵]

دوسری جانب ابوسفیان ڈرتا اور چھپتا چھپاتا قافلہ سے آگے بڑھ کر تجسس حال کے لیے بدر پہنچا، مجدی وہاں موجود تھا، ابوسفیان نے دریافت کیا تو نے کسی اجنبی کو تو یہاں نہیں دیکھا۔ مجدی نے کہا اور تو نئی بات نظر نہیں آئی البتہ تھوڑی دیر ہوئی کہ غیر متعارف دو آدمی ضرور یہاں آئے تھے اور اونٹوں کو پانی پلا کر واپس ہو گئے۔ ابوسفیان کنویں کے پاس گیا تو اونٹوں کی لید پڑی دیکھی اُس نے لید کو کُریدا تو کھجور کی گٹھلیاں نکلیں ابوسفیان نے یہ دیکھ کر کہا بلاشبہ یہ اونٹ یثرب کے تھے اور تیزی کے ساتھ قافلہ تک پہنچا اور حالات سے باخبر کر کے قافلہ کا رُخ ساحل کی جانب پھیر دیا اور بدر کو بائیں ہاتھ چھوڑتا ہوا مکہ کو چل دیا۔[۶]

اس مدت میں مسلمان وادیٔ صفراء سے گذر کر وادیٔ ذفران تک پہنچ چکے تھے یہاں اُترے تو ایک جانب بسبس اور عدی سے یہ معلوم ہوا کہ عنقریب ابوسفیان کا قافلہ بدر پہنچنے والا ہے اور دوسری جانب یہ پتہ لگا کہ مکہ سے قریش ایک ہزار جمعیۃ لے کر کروفر کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کی غرض سے بدر کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

---

[۴] مسلم و ابوداؤد [۵] تاریخ ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۶۵ و سیرت ابن ہشام و روض الانف جلد ۲ [۶] ایضاً

ابوسفیان نے جب ساحلی جانب اختیار کرلی اور اس کو یقین ہوگیا کہ مسلمان میرے تعاقب کے لیے بدر کی جانب آئینگے تو میں اُن کی زد سے محفوظ رہونگا اس لیے اُس نے مکہ کی جانب دوسرا قاصد روانہ کیا کہ اب جنگ کی ضرورت نہیں ہے میں مسلمانوں کی زد سے بچ کر جلدی مکہ پہنچ جانے والا ہوں، قریش بدر کے قریب آپہنچے تھے کہ قاصد نے ابوسفیان کا پیغام سُنایا مگر ابوجہل نے واپسی کے لیے سختی کے ساتھ انکار کردیا اور کہا کہ اب یہ ضروری ہے اور مسلمانوں کا قلع قمع کرکے اس کانٹے کو ہمیشہ کے لیے نکال دینا ہے۔[1]

بہرحال مسلمانوں کو جب وادی ذفران میں یہ دونوں خبریں ملیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے دوبارہ مشورہ ضروری سمجھا کیونکہ اب معاملہ کٹھن تھا، مسلمان بے سروسامان، اور پھر تھوڑی تعداد میں تھے اور دشمن ہر طرح وقت کے ہتھیاروں سے مسلح کثیر سامانِ جنگ کے مالک اور تعداد میں تین گنے سے بھی زیادہ اور بقول ارباب سیرت انصار اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت سفر کو صد ہزار باعث نازش ومباہات سمجھتے اور ہمرکاب رہتے تھے لیکن عقبۂ ثانیہ کے وقت وہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ یہ معاہدہ کرچکے تھے کہ جب تک قریش یا غیر قریش اپنی جانب سے مدینہ پر حملہ آور نہ ہوں انصار مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کے لیے مجبور نہیں ہونگے[2]

مشورہ کے لیے یہ اہم وجوہ تھیں جن کے پیش نظر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ دشمن سر پر ہے اور قافلہ قریب اب بتاؤ کیا چاہتے ہو جنگ کرکے حق و باطل کا فیصلہ یا بغیر کانٹا لگے قافلہ پر قبضہ، مسلمانوں نے جب یہ سُنا تو بعض نے طبعی طور پر جنگ کی مخالفت کی اور اس بارہ میں گرانی محسوس کی انہوں نے کہا: یا رسول اللہ ہم جنگ کے ارادے سے نہیں نکلے تھے اس لیے بے سروسامان ہیں ہم تو اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ قافلہ پر قبضہ کرکے واپس چلے جائیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کمزور

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۶ [2] سیرت و تاریخ کی کتابوں میں عموماً یہ قول مذکور ہے۔

رائے کو ناپسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا، قافلہ کو چھوڑو اب اُس قوم کے متعلق رائے دو جو تمہارے مقابلہ کے لیے مکہ سے نکل آئی، بعض لوگوں نے جب دوبارہ عذر کیا تو آپ نے پھر پہلی بات لوٹا دی تب جلیل القدر صحابہ ابوبکرؓ عمرؓ علیؓ (رضی اللہ عنہم) سمجھ گئے کہ مرضیِ مبارک حق و باطل کی جنگ سے وابستہ ہے اس لیے انہوں نے جذبۂ وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم ہر طرح جنگ کے لیے تیار ہیں اور اسلام کی خاطر آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو حاضر ہیں اور حضرت مقداد نے تو اس شد و مد کے ساتھ فداکارانہ جذبات کا اظہار کیا کہ صحابہ کو اُن کی تقریر پر رشک ہونے لگا۔ مگر آپ اب بھی نگاہِ مبارک سے کسی بات کے طالب نظر آ رہے تھے یہ دیکھ کر انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہٗ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم انصار کی جانب اشارہ ہے کہ ہم کچھ عرض کریں اور پھر انصار کی جانب سے پوری وفاداری اور فداکاری کا یقین دلاتے ہوئے نہایت موثر تقریر فرمائی، مہاجرین و انصار کی یہ تقاریر سُن کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک مسرت سے تمتما اُٹھا[1] اور آپ نے ارشاد فرمایا:۔

"اب اللہ کے نام پر آگے بڑھو اور بشارت حاصل کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ دو گروہ (قافلہ اور مشرکین مکہ کا لشکر) میں سے ایک کو تمہارے قبضہ میں دیدونگا اور قافلہ نہیں بلکہ مشرکین کا لشکر تمہارے قبضہ میں دے دیا جائیگا اور خدا کا وعدہ بلاشبہ سچا ہے اور قسم بخدا میں جنگ سے قبل ابھی سے قوم کے سرداروں کی قتل گاہ کو دیکھ رہا ہوں[2]۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے بدر پہنچ کر زمین پر ہاتھ رکھ رکھ کر بتایا کہ اس جگہ فلاں قریشی مارا جائیگا اور یہاں فلاں قتل ہوگا۔"

سلف سے خلف تک تمام مفسرین، محدثین اور اصحاب سیر و تاریخ اس پر متفق ہیں کہ یہی وہ مشورہ ہے جس کے متعلق سورۂ انفال کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔

---

[1] بخاری و مسلم، نسائی و عامہ کتب سیر و تاریخ [2] زرقانی جلد ۱ ص ۴۸۰۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ	(انفال ۹) اللہ اور رسول کے لیے ہیں، اس لیے کہ تیرے
بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	پروردگار نے تجھ کو حق کے لیے تیرے گھر سے نکالا اور حالت
لَكٰرِهُوْنَ ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ	یہ ہو گئی کہ مسلمانوں کا ایک فریق اس نکلنے پر گرانی کا اظہار
بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى	کر رہا تھا اور وہ تجھ سے حق کے بارہ میں حق کے ظاہر
الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ وَاِذْ يَعِدُكُمُ	ہو جانے کے بعد جھگڑا کر رہے تھے گویا وہ آنکھوں دیکھتے
اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ	موت کے منہ میں ہنکائے جا رہے ہیں اور (یہ واقعہ
اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ	اس وقت پیش آیا) جبکہ اللہ تم کو وعدہ دے رہا تھا کہ
غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ	دونوں فریق (قافلہ اور مشرکین مکہ کا لشکر) میں سے
لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ	ایک فریق کو تمہارے قبضہ میں دے دیگا اور تم یہ شبہ
بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ	کرتے تھے کہ تم کو وہ گروہ ملے جس کے مقابلہ میں کانٹا
الْكٰفِرِيْنَ ۙ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ	بھی نہ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے وعدہ کے
يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ	کلمات سے حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی
الْمُجْرِمُوْنَ ۝	جڑ کاٹ دے اور اس طرح حق کو حق کر دے اور باطل
	کو باطل، اگرچہ مجرموں کو یہ بات پسند نہ آئے۔

اب مسلمان آگے بڑھے اور بدر کے قریب پہنچ کر مدینہ کی جانب والے رُخ "عدوۃ الدنیا" پر خیمہ زن ہو گئے اور مشرکین آگے بڑھے تو بدر پہنچ کر مدینہ سے دور مکہ کی جانب والے رُخ "عدوۃ القصویٰ" پر اترے اور محاذِ جنگ کا نقشہ اس طرح بنا کہ مسلمان اور مشرکین بالمقابل تھے اور ابوسفیان کا قافلہ اس وقت ساحل کی جانب نیچے نیچے مشرکین کے لشکر کی پشت پر سے گذر رہا تھا کہ جب وہ چاہیں تو مشرکین مکہ کی نصرت و مدد کے لیے بے روک ٹوک آسکتے اور کمک کا کام دے سکتے ہیں اور پھر یہ عجیب صورتِ حال تھی کہ مسلمانوں کا محاذِ جنگ اس درجہ ریتیلا تھا کہ انسانوں اور چوپاؤں دونوں کے قدم ریت

میں دھنسے جارہے تھے اور چلنا دشوار ہو رہا تھا مگر مشرکین کا محاذِ جنگ ہموار اور پختہ فرش کی طرح تھا۔ غرض دشمن تعداد میں تین گنے سے زیادہ، سامانِ جنگ میں پوری طرح مکمل، ذرائع رسل و رسائل میں ہر طرح مطمئن، جائے وقوع نہایت عمدہ اور ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ قافلہ کی کمک متوقع تھی اور خود اپنی حالت یہ کہ تعداد میں بہت کم، اسلحۂ جنگ برائے نام، سامانِ حرب نہ ہونے کے برابر ہواریوں کا شمار برائے بیت، جائے وقوع حد درجہ خراب اور ان تمام ناسازگار حالات کے ساتھ کمک قطعاً غیر متوقع، اور حد یہ کہ دشمن پانی پر قابض اور مسلمان اس سے محروم۔

ظاہر ہی کہ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کو اُن کی ذاتی رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو اُن کی عقل و خرد بہ اسباب ظاہر اس کے سوا اور کیا فیصلہ کر سکتی تھی کہ وہ اس وقت کو ٹال دیں اور دشمن سے کسی ایسے دوسرے وقت کے لیے جنگ کا قول و قرار کریں کہ وہ بھی دشمن کی طرح ہر حیثیت سے جنگ کے لیے طیار ہوں، چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں نے وادیِ ذفران میں شوریٰ کے وقت ابتداءً یہی کہا بھی مگر وحی الٰہی کے ذریعہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خدا کا یہ وعدہ کہ تم کو "عیر اور نفیر" دونوں میں سے ایک پر مسلط کر دیا جائیگا۔ صرف اس شکل میں پورا ہونے والا ہی کہ مسلمان مشرکین کے لشکر (نفیر) کا مقابلہ کریں اور حق و باطل کے اس معرکہ میں مسلمان کامیاب ہوں اور مشرکین ناکام و خاسر اس لیے مسلمانوں نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مرضی پاکر ہمہ قسم کی بے سرو سامانی کے باوجود خود کو حق و باطل کی معرکہ آرائی کے لیے والہانہ و فداکارانہ جذبۂ پاک کے ساتھ پیش کر دیا۔

ایسی صورتِ حال کو قرآنِ عزیز نے اس معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ظاہر کیا ہی

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا	اگر تم اللہ پر اور اس (غیبی مدد) پر یقین رکھتے ہو جو ہم نے
عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ	فیصلہ کر دینے والے دن اپنے بندہ پر نازل کی تھی جبکہ
الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو چاہیے

لہ قافلہ اور مخالفین کا لشکر۔

قَدِيرٌ ۝ إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (انفال)

کہ اس تقسیم پر (یعنی مال غنیمت کی مقررہ تقسیم پر) کاربند ہو اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ (بدر کا) دن تھا کہ تم ادھر قریب کے ناکہ پر تھے اُدھر دشمن دور کے ناکہ پر اور قافلہ تم سے نچلے حصہ میں تھا (یعنی سمندر کے کنارے کنارے گذر رہا تھا) اگر تم آپس میں لڑائی کی بات ٹھہراتے تو ضرور جنگ کے وقت کے بارہ میں تم اختلاف کرتے کیونکہ تم چاہتے کہ کسی حالت میں جنگ نہ ہو اور دشمن چاہتا کہ ضرور جنگ ہو (یعنی تمہیں دشمنوں کی کثرت اور اپنی بے سروسامانی کا اندیشہ تھا اور قافلہ پر تسلط آسان نظر آرہا تھا اور دشمن اپنی اپنی کثرت اور ساز و سامان کے بل پر گھمنڈ کیے تھا) لیکن اللہ نے دونوں لشکروں کو بھڑا دیا تاکہ جو بات ہونے والی تھی اُسے کر دکھائے، نیز اس لیے کہ جسے ہلاک ہونا ہے اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہنے والا ہے اتمام حجت کے بعد زندہ رہے اور بلاشبہ اللہ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ ۝ بَلَىٰ ۚ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ

اور اللہ تمہاری مدد کر چکا ہے بدر کی لڑائی میں اور تم کمزور حالت میں تھے پس اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم شکر گزار رہو (یہ جب ہوا) کہ تو مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کیا تم کو کافی نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد کو آسمان سے اُترنے والے تین ہزار فرشتے بھیجے۔ ہاں بلا شبہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو اور پھر ایسا ہو کہ دشمن اسی دم تم پر چڑھ آئے تو تمہارا پروردگار (بھی) پانچ ہزار نشان رکھنے والوں سے تمہاری مدد

الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ	کریگا اللہ نے یہ صرف اس لیے کیا کہ تمہارے لیے
اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ	خوشخبری ہو اور اس کی وجہ سے تمہارے دل مطمئن
قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ	ہو جائیں اور مدد اور نصرت جو کچھ بھی ہو اللہ کی ہی
عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ لِيَقْطَعَ	طرف سے ہو اس کی طاقت سب پر غالب ہو اور
طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ	وہ اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہو اور نیز
فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۝	اس لیے تاکہ منکرین حق کی جمعیت و طاقت کا ایک
(آل عمران)	حصہ بیکار کر دے انہیں اس درجہ ذلیل وخوار کر دے
	کہ وہ نامراد ہو کر الٹے پاؤں پھر جائیں۔

دعائے نصرت غرض اس حالت میں دونوں فریق جنگ کے لیے صف آرا ہوئے تو اول آپ نے مسلمانوں کی صفوف کو درست فرمایا اور پھر اس عریش (خس پوش جھونپڑی) کے نیچے جا کر جو آپ کے لیے میدان جنگ میں بنا دی گئی تھی درگاہ الٰہی میں الحاح وتضرع کے ساتھ دعا شروع کی اور عرض کیا۔

اللّٰهُمَّ انجز لی ما وعدتنی اللّٰهم	خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ (نصرت) فرمایا اس کو
ان تهلك هذه العصابة من	پورا کر۔ خدایا! اگر یہ مٹھی بھر مسلمان ہلاک ہو گئے تو
اهل الاسلام لا تعبد فی	پھر خطۂ زمین پر کوئی تیرا عبادت گذار باقی نہیں
الارض[1]	رہیگا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو قریب آئے اور عرض کیا: "خدا کے رسول! بس کیجیے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کریگا"

غیبی نصرت اور امداد اور آخر یہی ہوا بھی کہ ہر قسم کے ناسازگار حالات اور اس درجہ کمزوری کے باوجود کہ کسی مسلمان کا اس معرکہ سے صحیح سالم بچ کر نکل جانا خود ایک معجزہ ہوتا مسلمانوں کو غیبی نصرت وامداد نے بامراد اور کامیاب کیا، فتح ونصرت نے قدم چومے اور تاریخ عالم کا

[1] صحیح مسلم۔

ایک بے نظیر اور حیرت زا انقلاب پیش کر دیا اور مشرکین قریش کے تمام سردار اور مشہور نبرد آزما ہی قتل نہیں ہوئے بلکہ شرک و کفر کی اجتماعی طاقت کا ہی خاتمہ ہو گیا۔

یہ غیبی نصرت کیا تھی؟ قرآنِ حکیم اس کا جواب متعدد آیات میں یہ دیتا ہے۔

(۱) مسلمانوں کی نگاہ میں دشمنوں کی تعداد اصل تعداد سے کم نظر آئی تاکہ مسلمان مرعوب نہ ہوں اور مشرکین کی نگاہوں میں مسلمان مٹھی بھر معلوم ہوئے تاکہ وہ جنگ سے جی نہ چرائیں اور معرکہ حق و باطل ٹل نہ جائے۔ " اِذْ يُرِيكَهُمُ اللّٰهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا (الی) وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُورُ " (انفال) اور ایک وقت میں دو گنے معلوم ہوئے تاکہ مسلمانوں سے مرعوب ہو کر رہ جائیں۔ قد كان لكم آية في فئتين التقتا فئة تقاتل في سبيل الله واُخرى كافرة يرونهم مثليهم رأي العين والله يؤيد بنصره من يشاء ان في ذلك لعبرة لاولي الابصار (آل عمران)

(۲) مسلمانوں کی دعا پر اوّل اُن کی مدد ایک ہزار فرشتوں سے کی گئی " اِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّي مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِينَ " اور پھر یہ تعداد بڑھا کر تین ہزار کر دی گئی " اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِينَ " اور اگر دشمن تم پر یک لخت حملہ کر دے تو ہم تین ہزار کی بجائے پانچ ہزار سے مدد کریں گے " يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِينَ "

(۳) مسلمانوں پر عینِ معرکہ کے وقت اونگھ طاری کر دی جس کے چند منٹ بعد اُن کی بیداری نے اُن میں ایک نئی تازگی اور نئی روح پیدا کر دی " اذ يغشيكم النعاس امنة منه "

(۴) آسمان سے پانی برسا کر مسلمانوں کے لیے ریتیلی زمین کو پختہ فرش کی طرح بنا دیا اور نشیب کی وجہ سے حوض نما گڑھے میں پانی جمع کر دیا اور دشمنوں کی زمین کو کیچڑ کی دلدل بنا ڈالا " وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ "

نتیجۂ جنگ | بہرحال معرکۂ جنگ بپا ہوا اور دونوں جانب سے نبرد آزما ایک دوسرے کے مقابل ہوکر "ہَلْ مِنْ مبارزہ" پکارنے اور دادِ شجاعت دینے لگے اور پھر یکا یک عمومی جنگ شروع ہوگئی، مسلمان اول تو جنگ مغلوبہ لڑے مگر فراغت دعاء کے بعد جب میدانِ جنگ میں آکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "شاہت الوجوہ" چہرے روسیاہ ہوں پڑھتے ہوئے مٹھی بھر خاک اور کنکریاں دشمنوں کی جانب پھینکیں تو خدائے برحق کی معجزانہ قدرت سے ہوا کے ذریعہ اس کے ذرات تمام مشرکین کی آنکھوں تک پہنچا دیے اور وہ اس ناگہانی پریشانی سے مضطرب ہوکر آنکھیں ملنے لگے اور جنگ مغلوبہ" جنگ غالبہ" کی شکل میں بدل گئی۔

وَمَا رَمَيْتَ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) اور تو نے جب (کنکریاں) پھینکیں تو در
اِذْ رَمَيْتَ	حقیقت تو نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں (کیونکہ انسانی ہاتھ
وَلٰكِنَّ	ایک مٹھی میں اتنے بڑے لشکر کے ہر آدمی پر رمی نہیں کر سکتا تھا یہ جو
اللّٰهَ رَمٰى ۔	کچھ ہوا اسی کے ہاتھ پر خدا کا معجزہ ہوا)

اور دیر نہیں لگی کہ مشرکین کے بڑے بڑے آدمی مارے گئے اور دشمنوں کے پیر اکھڑ گئے وہ بھاگتے تھے مگر بھاگنے کا موقع نہ پاتے تھے چنانچہ اُن کے ستر آدمی قتل ہوئے اور ستر گرفتار اور باقی نے راہِ فرار اختیار کی۔

مسلمان اگرچہ خدا کی نصرت اور اُس کے فضل سے کامیاب ہوئے اور فتح و کامرانی کے مالک بنے تاہم بائیس مجاہدین نے بھی جامِ شہادت نوش کیا۔

جنگ بدر نے تاریخ عالم کا رُخ بدل دیا | بدر کا معرکہ مورخین اور اصحابِ سیر سے بھی اگرچہ اپنی تاریخی اہمیت کا اعتراف کراتا ہی اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ معرکہ بدر ایک ہنگامی معرکہ نہیں تھا بلکہ اُس نے قریشِ مکہ کی قوت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور مسلمانوں کو اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے راہیں کھول دیں، لیکن وہ بھی اس حقیقت حال سے شاید بے خبر

ہیں کہ معرکۂ بدر صرف مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی آویزش حق و باطل کا معرکہ نہیں تھا بلکہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اس وقت دنیا ایک موڑ پر کھڑی تھی اور تاریخ عالم کا اشہب تیز گام اس موڑ پر حیران و سرگرداں کھڑا تھا کہ کس جانب رُخ کرے اس لیے یہ انقلاب عالمگیر انقلاب تھا صفحۂ عالم پر اگر بدر کا معرکہ پیش نہ آتا اور مشرکین مکہ کی طاقت شکست و ریخت نہ ہوتی تو بلاشبہ نہ صرف حجاز، نہ صرف عرب و عجم بلکہ کائناتِ ہستی کا ہر ایک بحر و بر ظلم، سرکشی اور باطل سے دوچار رہتا، آزادیِ ضمیر فنا ہو جاتی، جذباتِ حق مٹ کر رہ جاتے اور یہ سب قوتِ جبریل پر اپنے لیے آپ جگہ پیدا کر لیتے اب جبکہ بدر کا معرکہ پیش آگیا اور مشرکین مکہ کی قوت ٹوٹ گئی تو دنیا نے موڑ سے آگے بڑھ کر وہ راہ اختیار کر لی جو آزادیِ ضمیر، عدل و نصفت، حق پرستی اور نکوکاری کی راہ تھی، جہاں ضعیفوں کی نصرت فرض اور بیچاروں کے لیے چارۂ کار مہیا تھا اس لیے خدا کا یہ عظیم انسان احسان کہ بدر میں حق کو فتح و کامرانی نصیب ہوئی صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں تھا بلکہ تمام کائناتِ انسانی پر احسانِ عظیم تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب فرمایا۔

> بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے، جنگ واٹرلو کے تمام مورخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷ اور ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کی درمیانی رات میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا۔ کیونکہ اس صورت میں نپولین کو زمین خشک ہونے کا بارہ بجے تک انتظار نہ کرنا پڑتا سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ بلوشر کے پہنچنے سے پہلے ویلنگٹن کو شکست ہو جاتی واٹرلو میں اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا، لیکن اگر بدر میں نہ ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت و سعادت کا نقشہ اُلٹ جاتا۔ اسی طرف پیغمبر اسلام نے اپنی دعا میں اشارہ کیا تھا: اللّٰھم ان تھلك ھذہ العصابۃ فلا تعبد فی الارض = خدایا! اگر خدام حق کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہوگئی تو کرۂ ارضی میں تیرا سچا عبادت گذار کوئی نہیں رہیگا[1]

[1] ترجمان القرآن جلد ...

قرآنِ عزیز کی روشنی میں غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

غزوۂ بدر سے متعلق بیان کردہ تفصیلات جمہور علماء اسلام کے نزدیک مسلم ہیں، خصوصاً اس مسئلہ میں تو سلف و خلف میں سے کسی کی بھی دو رائے نہیں ہیں کہ مسلمان جب مدینہ سے نکلے تو صرف "قافلہ" پر حملہ مقصود تھا لیکن وادی ذفران میں پہنچ کر قدرتی حادثہ نے ایک دوسرے مقابلہ سے دوچار کر دیا اور یہ مشرکینِ مکہ کی وہ یورش تھی جو مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ظہور میں آئی اور اب مسلمانوں کو "عیر" و "نفیر"[1] دو کے ساتھ واسطہ پڑ گیا اس لیے یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کو بذریعہ وحی یہ بشارت سنائی گئی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائیگا اور بعض مسلمانوں نے اگرچہ انسانی کمزوری کی بنا پر "نفیر" کے مقابلہ میں "عیر" کو ترجیح دینے کا خیال ظاہر کیا مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی نے اطلاع کر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ "نفیر" کے مقابلہ کو مقدر کر چکا ہے اور اس کا وعدہ اسی شکل میں پورا ہوگا اس لیے ذاتِ اقدس کا رجحان اسی جانب ہوا اور مشورہ کے بعد آخر وہی فیصلہ ہوا جو خدا اور خدا کے رسول کی مرضی تھی۔ چنانچہ قرآنِ عزیز کی آیات "کما اخرجك ربك من بيتك بالحق الآیۃ" اور "اذ انتم بالعدوة الدنيا وهم بالعدوة القصوىٰ والركب اسفل منكم الآیۃ" اسی حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں۔

مگر جمہور کے ان مسلمات کے خلاف مولانا شبلی (مرحوم و مغفور) نے سیرۃ النبی جلد اول میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسلمان شروع ہی میں مدینہ سے صرف "نفیر" کے لیے نکلے تھے اور خدا کے وعدہ "عیر و نفیر" کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "عیر و نفیر" کے متعلق جو مشورہ کیا اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے جو کتبِ سیر میں مذکور زبردست تقاریر فرمائیں وہ سب وادی ذفران میں نہیں بلکہ مدینہ ہی میں ہو چکا تھا۔

مولانا مرحوم نے اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے طویل بحث فرمائی ہے اور احادیث و سیر میں مذکور واقعات کی ترتیب کا اس لیے انکار کر دیا ہے کہ وہ اس ترتیب

---

[1] عیر = قافلہ، اور نفیر = دشمنوں کا لشکر

کو قرآن کی تصریحات کے خلاف سمجھتے ہیں اور یہ کہ بعض صحیح احادیث و روایات بھی اُن کے خیال کی ہی تائید کرتی ہیں۔

چونکہ یہ مسئلہ علمی نظر و فکر سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ازبس ضروری ہے کہ قرآنِ عزیز ہی کی روشنی میں مناظرانہ اسلوب سے بچ کر خالص تحقیقی رنگ میں اس پر محاکمہ کیا جائے تاکہ اصل حقیقت واضح ہو سکے۔

قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کی تفصیلات دیتے ہوئے دو جگہ بصراحت اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ "نفیر" کا معاملہ مدینہ سے "عیر" کی خاطر نکلنے کے بعد اچانک سامنے آیا اور اس لیے بعض مسلمانوں نے نفیر کے مقابلہ کو ابتداءً خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور گراں محسوس کیا۔

(۱) پہلا مقام سورۂ انفال کی وہ چند آیات ہیں جو کما اخرجك ربك من بيتك بالحق" سے شروع ہو کر "واضربوا منهم كل بنان" تک مسلسل چلی گئی ہیں جو تقریباً سات یا آٹھ آیات ہیں۔

قرآنِ عزیز نے ان آیات میں اُس پورے واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے جو معرکۂ بدر میں از اول تا آخر پیش آیا یعنی مدینہ سے نکلنے پر مسلمانوں کے سامنے کیا کیا صورتیں پیش آئیں وہ سب ہی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے بیان کی گئی ہیں پس جس طرح کما اخرجك ربك من بيتك" کے ساتھ "وان فريقا من المؤمنين لكارهون" کا تعلق ہے اسی طرح "واذ يعدكم الله احدى الطائفتين" اور "اذ تستغيثون ربكم" اور "اذ يغشيكم النعاس" "وينزل عليكم من السماء ماءً" وغیرہ واقعات کا بھی تعلق ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مولانا شبلی مرحوم بھی جمہور کے ساتھ اس پر متفق ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا درگاہِ الٰہی میں استغاثہ پیش کرنا، ملائکہ کی مدد کا آنا، مسلمانوں پر اونگھ طاری کر کے تازہ دم کر دینا آسمان سے پانی کا برس کر مسلمانوں کے حق میں رحمت ثابت ہونا، یہ کل معاملات اُس آن ہی پیش نہیں آ گئے تھے جس آن میں مسلمان مدینہ سے نکلے تھے بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ تھا جو ایک

مدت کے اندر وقوع پذیر ہوتا رہا ہو۔

پس اگر بقول مولانا ئے مرحوم آیت "کما اخرجك ربك" میں اُس آن کے ماسوا جو مدینہ سے خروج کے ساتھ مربوط ہے اور کچھ مُراد نہیں ہے، تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ باقی وہ تمام واقعات جو اس آیت کے ساتھ مربوط کر کے بیان ہوئے ہیں گو کلام مستانف ہی کی حیثیت میں کیوں نہ ہوں" وہ سب بھی اسی ایک آن سے متعلق ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ قطعًا باطل اور خلاف واقعہ ہے۔

اس لیے اس آیت کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ قرآنِ عزیز عام بول چال اور محاورہ کے مطابق یہ کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو ذرا اُس واقعہ کی جانب بھی نظر کرنی چاہیے جب پروردگار نے تم کو ایک مرتبہ مدینہ سے باہر حق کی خاطر نکالا تھا اور تمہارے سامنے ایسی صورتِ حال پیش آگئی تھی کہ تم پر یہ گراں گذرنے لگا تھا کہ کیوں ہم مدینہ سے باہر نکلے کہ آخر کار ہمارے سامنے یہ صورت گراں بار...... آگئی اور یہ وقت وہ تھا جبکہ خدا نے تم سے "عیر و نفیر" میں سے ایک کا وعدہ کیا، وغیرہ وغیرہ

یہی وجہ ہے کہ تمام مفسرین آیت "وان فریقا من المومنین لکارھون" کے متعلق عربیت کے قاعدہ سے یہ فرما رہے ہیں۔

والجملة فی موضع	اور یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے اور یہ حالِ مقدرہ ہے اس لیے کہ جس کراہت
الحال وھی حال	کا آیت میں ذکر ہو رہا ہے وہ مدینہ سے نکلنے کے بعد پیش آئی تھی جیسا کہ
مقدرة لان الکراھة	ان شاء اللہ ابھی تجھ کو معلوم ہو جائیگا۔ یا یوں کہیے کہ یہ اُس پوری
وقعت بعد الخروج	حالت کا نقشہ بیان ہو رہا ہے جو مدینہ سے نکلنے کے وقت سے معرکہ بدر
کما تراہ ان شاء اللہ	کے ختم تک پیش آئی (یعنی "اخرجک" میں اخراج سے زمانہ ممتد
تعالیٰ او یعتبر ذٰلك ممتدًا[1]	مُراد ہے آنی مُراد نہیں ہے)

[1] روح المعانی جلد ۹ ص ۱۵۲ و ابن کثیر و روح البیان والبحر المحیط وغیرہ۔

تو اب صورتِ حال یہ بنی کہ جو شخص "نکلکر ھون" میں مذکورہ واقعۂ کراہت کو آنی قرار دیتا ہے اور اس پورے واقعہ کو مدینہ کے اندر ہونا ثابت کرتا ہے اُس کے پاس تو صرف ایک ایسا تخمینی احتمال ہے جس کا ثبوت اُن قرائن سے قطعاً نہیں ملتا جو مابعد آیات میں موجود ہیں اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ آیت "اخرجك" میں اخراج آنی نہیں ہے بلکہ وہ ممتد مدت مراد ہے جس میں یہ معرکہ پیش آیا تو بعد کی تمام آیات بلاشبہ اُس کے دعوے کے لیے واضح قرینہ مبنی اور دعوے کی تصویب کرتی نظر آتی ہیں

(۲) دوسرا مقام سورۂ انفال ہی کی وہ آیات ہیں جو "ما انزلنا علیٰ عبدنا یوم الفرقان یوم التقی الجمعان" سے شروع ہوکر "والی اللہ ترجع الامور" پر ختم ہوتی ہیں، ان آیات میں قرآنِ حکیم نے اوّل مسلمانوں اور مشرکوں کے محاذِ جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ مسلمانوں کا محاذِ جنگ مدینہ سے قریب وادی میں تھا اور مشرکین مکہ ان کے بالمقابل جانب بعید کی وادی میں خیمہ زن تھے اور اس وقت ابوسفیان کا قافلہ مسلمانوں کی وادی سے نیچے نیچے سمندر کے کنارہ اس طرح گذر رہا تھا کہ وہ مکی فوج کی پشت پر تھا کہ اگر وہ چاہے تو مسلمانوں کی زد سے محفوظ ہوکر بے خوف اپنی فوج کی مدد کرسکتا ہے "واذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصویٰ والرکب اسفل منکم" اور اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ صورتِ حال مسلمانوں کے لیے اس درجہ ناساز گار تھی کہ اگر تقدیرِ الٰہی یہ فیصلہ نہ کرلیتی کہ بدر کا معرکہ ضرور پیش آئیگا اور اس کا انجام مسلمانوں کے حق میں ہوگا اور جنگ کے معاملہ کو مسلمانوں اور مشرکوں کے باہمی عہد و پیمان پر چھوڑ دیا جاتا تو مسلمان آپس میں بھی مختلف المیعاد ہو جاتے بعض کہتے کہ اس میدان میں حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے تو اچھا اور بعض کہتے کہ ہم ان ناسازگار حالات میں ہرگز جنگ کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے دوسرے وقت کے لیے جنگ کو ٹال دینا چاہیے اور "نفیر" کی جگہ "عیر" کو قبضہ میں کرلینا چاہیے جیسا کہ پیش آیا اور بعض کو جنگ کا معاملہ سخت گراں گذرا اور ہوسکتا تھا کہ سب ہی مسلمان یہ چاہتے کہ اس وقت

معرکۂ جنگ بپا نہ ہو اور مشرکین اپنے ساز و سامان کے زعم پر یہ اصرار کرتے کہ اسی وقت اور اسی جگہ معرکہ ہو جانا ازبس ضروری ہے اور یہ نقشہ سامنے آجاتا "لو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد" مگر ہوا یہ "ولکن لیقضی اللہ امرًا کان مفعولا"

ان آیات میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر مشرکین مکہ کی فوج کشی کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مدینہ ہی میں مشورہ فرمایا تھا جس کا ذکر تمام کتبِ حدیث و سیرت میں موجود ہے اور اسی مقام پر خدا نے احدی الطائفتین کا وعدہ فرما کر اپنے نبی کو وحی کے ذریعہ یہ بھی بتا دیا تھا کہ خدا کی مرضی معرکۂ حق و باطل کی ہے قافلہ پر تسلط کی نہیں ہے تو پھر عقل حیران ہے کہ ان تمام امور کے معلوم ہو جانے کے بعد مسلمان خود کو کس لیے بے سر و سامان سمجھ رہے تھے اور کس وجہ سے بعض مجاہدینِ اسلام جنگ سے جی چرا رہے تھے جبکہ مدینہ میں مسلمانوں کے پاس ہزاروں اونٹ موجود تھے، گھوڑے بھی کچھ کم نہیں تھے سو پچاس گھوڑوں کا مہیا ہونا معمولی بات تھی تلواروں اور نیزوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی اور ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ جب اُن کو دشمنوں کی عددی طاقت کا بھی صحیح اندازہ تھا تو آخر وہ کیا سبب تھا کہ مسلمان جن میں انصار بھی ہیں اور مہاجرین بھی صرف تین سو تیرہ ہی کی تعداد میں کیوں نکلے؟ اور نکلے بھی اس بے سر و سامانی کے ساتھ کہ نیزے اور تلواریں تک بھی ہر ایک کے پاس موجود نہیں چہ جائیکہ باقی سامانِ حرب و ضرب مکمل ہوتا اور کیا بدر کے اس واقعہ کے علاوہ کسی بھی ایسے غزوہ یا سریہ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے مدینہ میں بیٹھ کر تیاری فرمائی ہو اور مسلمانوں میں دشمن کے مقابلہ کے لیے وہ ہراسانی اور گرانی پیدا ہوئی ہو جس کا ذکر قرآن ان جملوں میں کرتا نظر آتا ہے "وان فریقًا من المؤمنین لکارھون" "یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت" "ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد"

کیا ہمارے سامنے غزوۂ تبوک (غزوۂ عسرت) کا نقشہ موجود نہیں ہے کہ دشمن کی تعداد

لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے اور مشرکین مکہ جیسے غیر متمدن نہیں بلکہ متمدن عیسائی طاقت سے معاملہ ہے جو ہر قسم کے متمدن سازو سامان جنگ سے مسلح ہے اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نہیں مدینہ کے قرب وجوار میں نہیں بلکہ خود دشمن کے گھر پر جاکر معرکۂ حق و باطل گرم کرنا چاہتے ہیں اور گرمی کا یہ عالم ہے کہ منافقین "لاتنفروا فی الحر" کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کو بزدل بنانا چاہتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک مسلمان بھی ہراساں نہیں، گراں خاطر نہیں بلکہ پروانہ وار نثار ہونے کو ایک دوسرے پر بازی لیجانے کے لیے مدینہ سے تبوک کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔

بات بالکل صاف ہے کہ مسلمان درحقیقت اس بے سروسامانی کے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ قافلہ پر قبضہ کرنے کے لیے نکلے تھے اور اُس کے لیے یہ جمعیت اور یہ صورتِ حال کافی تھی لیکن بدر کے قریب پہنچ کر اچانک صورتِ حال تبدیل ہوگئی اور مسلمانوں کو دو باتوں کا ایک ساتھ علم ہوا ابوجہل مکہ سے لشکرکشی کرکے آرہا ہے اور ابوسفیان کا قافلہ بدر سے گذر کر مکہ جارہا ہے تب وہ سب کچھ پیش آیا جس کو تفصیل کے ساتھ سُن آئے ہو اور یہی وہ حالت تھی جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا "وانّ فریقا من المؤمنین لکارھون" اور "لو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد"

بہر حال ان ہر دو مقامات کا تبادر، کلامِ الٰہی کا سیاق وسباق اور آیات کے اندر موجود قرائن و دلائل کے سامنے مصنفِ سیرت النبی کا "کما اخرجك ربك من بیتك" کے اجمال سے بے دلیل ایک دعویٰ کر دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اور آیت "وانّ فریقًا من المؤمنین لکارھون" میں 'و' حالیہ کے لیے بقاعدۂ عربیت ہرگز یہ ضروری نہیں کہ حال اور ذوالحال کا زمانہ اس طرح ایک ہو کہ دونوں آنِ واحد سے وابستہ ہوں بلکہ زمانہ کا امتداد نہ صرف ممکن الوقوع بلکہ اکثر الوقوع ہوتا ہے نیز "حال مقدرہ" کی مثالیں کلامِ عرب میں بیشتر موجود ہیں اور حال مقدرہ کا حاصل یہ ہے کہ جو واقعہ کسی ایک بات کی بناء

پر آئندہ قریبی زمانہ میں پیش آنے والا ہو اُس کو بر سبیل تقدیر واو حالیہ کے ساتھ اس طرح بیان کر دیا جاتا ہے کہ گویا وہ اسی آن میں پیش آیا ہو، کیونکہ اُس کا پیش آنا یقینی ہو اور اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہونگے کہ مدینہ سے خروج اس حالت میں ہوا کہ جب صورت حال نازک بن کر سامنے آئی تو مسلمانوں کے ایک گروہ پر گراں گذرنے لگا کہ اے کاش مدینہ سے کیوں نکلے جو اس صورت کے ساتھ دوچار ہونا پڑا۔

(۲) یہ بھی صحیح نہیں ہو کہ کاروانِ تجارت مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح بچ کر نکل گیا تھا کہ مسلمان اُس کا تعاقب نہ کرسکیں اور اُس کو قابو میں نہ لاسکیں چنانچہ آیت " والرکب اسفل منکم" اس پر صاف دلالت کر رہی ہے۔ البتہ مسلمانوں کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ جو کچھ قافلہ کے متعلق معلوم ہوا تھا اُس کے پیش نظر یہ خیال اب بھی تھا کہ ابوسفیان کا قافلہ بدر ہی کے راستہ سے گذریگا اور اس لیے وہ وادی ذفران میں مشورہ کے وقت کاروانِ تجارت کے طالب تھے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا کہ دونوں میں سے کسی ایک گروہ پر تم کو ضرور مسلط کر دینگے۔ درحقیقت حال کے پیش نظر ہی یہ بھی اپنے رسول کو بتلا دیا کہ " عیر" سے نہیں بلکہ " نفیر" سے تم کو واسطہ پڑیگا اور تم کامیاب ہوگے اس صورتِ حال کو اگرچہ بعض اصحابِ سیرت نے واضح نہیں کیا مگر محققین اربابِ سیر نے اس حقیقت کو مستند روایات سے ثابت کیا ہے۔

چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری اور شیخ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں بسند اس واقعہ کو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ونحن بالمدینۃ انی اخبرت عن عیر ابی سفیان	ہم مدینہ میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے ابھی معلوم ہوا کہ ابی سفیان کا کاروانِ تجارت شام سے آرہا ہے کیا تم تیار رہو کہ اس سے قبل اس کی راہ گھیر لو

انما مقبلة فصل لكم ان تخرج قبل هذه العير لعل الله يغنمناها فقلنا نعم فخرج وخرجنا فلما سرنا يوما او يومين قال لنا ما ترون في قتال القوم فانهم قد اخبروا بخروجكم فقلنا لا والله ما لنا طاقة لقتال العدو ولكنا اردنا العير (الحديث)[1]

کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس بہانہ ہم کو مال غنیمت عطا کر دے۔ ہم سب نے عرض کیا "ہاں"۔ پس آپ بھی نکلے اور ہم بھی نکلے، ابھی ایک یا دو دن کی مسافت پر ہی پہنچے تھے کہ آپ نے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ اہل مکہ فوج کشی کے ارادہ سے آ رہے ہیں، اب کیا ارادہ ہے؟ تب ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ بقسم بخدا اس حالت میں ہم میں دشمن کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، البتہ قافلہ پر حملہ کا ارادہ ضرور ہے۔

یہ اور اسی قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں جن میں صراحت ہے کہ مسلمان وادی قران میں کاروانِ تجارت پر حملہ آور ہونے کے متوقع تھے اور وجہ یہی تھی کہ اُن کے جاسوسوں نے بدر میں اس کے آنے کی خبر دی تھی۔

(۳) آیت "تودّون انّ غیر ذات الشوکۃ تکون لکم (الآیہ)" میں جمہور کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جانب ہیں جس جانب خدا ہے اور جب بعض مسلمانوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخ کو پہچان کیا تو پھر وہ بھی خدا اور خدا کے رسول کی مرضی ساتھ ہو گئے اس لیے اس حقیقت کو ان جذباتی الفاظ سے بے حقیقت نہیں بنایا جاسکتا۔

> ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں[2]۔

(۴) واقعہ کی نوعیت دراصل وہ نہیں ہے جس کو بزعم خود مصنف سیرت النبی نے گڑھ کر بیان

[1] تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح الباری جلد ۴ ص ۲۶۱۔ [2] سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۲۲۱

کر دیا اور پھر اس پر سوالات قائم کر دیے بلکہ نوعیتِ واقعہ وہ ہے جس کو ہم بصراحت و بدلائل ابھی بیان کر آئے ہیں اور جس کو تسلیم کرنے کے بعد شبہ اور اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

(۵) لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ "مسلمانوں میں جو لوگ صحیح و تندرست ہوتے ہوئے بھی گھروں میں بیٹھے رہے تو وہ اُن کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتے جو اپنی جان و مال کے ذریعہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں"

بیشک صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے "کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے دونوں برابر نہیں ہو سکتے اور یہ صحیح ہے کہ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ پہلے آیت میں "غیر اولی الضرر" کا جملہ نہیں نازل ہوا تھا تو آیت سُن کر حضرت عبداللہ بن ام مکتوم خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے نابینا ہونے کا عذر کیا اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا "غیر اولی الضرر"

لیکن اس کے باوجود مصنف سیرت النبی کا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔

یہ نتیجہ اخذ کرنا اس لیے درست نہیں ہے کہ اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق تین صحابیوں سے روایات منقول ہیں ان میں سے دو صحابہ زید بن ثابت اور براء بن عازب رضی اللہ عنہما تو غزوۂ بدر سے جُدا اس کا نزول بیان کرتے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ) بدر کے ساتھ اس کو وابستہ فرماتے ہیں لہٰذا اس اختلاف کو دیکھ کر مشہور اور محقق محدثین اور شارحینِ بخاری، ابن تین اور بدر الدین عینی رحمہما اللہ یہ فرماتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ عام قاعدہ ہے کہ اگرچہ کسی آیت کا تاریخی اور حقیقی شانِ نزول ایک خاص واقعہ سے متعلق ہو لیکن اس آیت کے مفہوم و مصداق میں جس قدر واقعات و جزئیات داخل

ہو سکتی ہیں اُن سب کے متعلق یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس آیت کا شانِ نزول یہ واقعہ ہے۔[1]

لہذا جبکہ تمام علمارِ تفسیر اس پر متفق ہیں کہ یہ اس آیت کا تاریخی شانِ نزول بدر کا واقعہ نہیں ہے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد اسی عموم کے اعتبار سے ہے کہ جبکہ بدر کے معرکہ میں بھی مسلمان دو حصوں پر منقسم تھے ایک شریک جنگ اور دوسر مدینہ میں مقیم تو بلاشبہ فضیلتِ درجات میں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بطریق تفسیر یہ فرمایا ہے "لا یستوی القاعدون من المؤمنین عن بدر والخارجون الی بدر" بطور واقعہ اس کو نقل نہیں کیا اور اسی لیے حضرت عبداللہ ابن مکتوم کے واقعہ کا بھی ذکر نہیں فرمایا اور ترمذی میں اس قسم کی تفصیل اگر منقول ہے تو خود ترمذیؒ نے یہ کہہ کر اس تفصیل کو کمزور کر دیا ہے " ہذا حدیث حسن غریب من ہذا الوجہ من حدیث ابن عباس - یہ حدیث اس تفصیلی طریقہ پر ابنِ عباس سے بسند حسن غریب ثابت ہوئی ہے" یعنی اس ایک راوی کے علاوہ دوسرا کوئی طریقِ سند موجود نہیں ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کا واقعہ منقول ہو لو اسی لیے امام بخاری نے اس تفصیل کو قابل ترک سمجھ کر فقط تفسیر کو ہی لیا ہے۔

پس اس آیت کو بھی اپنے دعوے کے لیے سند بنانا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

(۶) کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے اُن کی نسبت قرآن مجید میں ہے" وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ - اُن لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور خدا کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔ اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے الخ"

یہ بھی مصنف سیرت النبی کا ایک انوکھا استدلال ہے اس لیے کہ جن روایات میں

[1] فتح الباری جلد ۸ ص ۲۱۱ مصری، عینی جلد ۸ ص ۵۶۳

یہ ہے کہ کفار قریش قافلۂ تجارت کے بچانے کے لیے نکلے ان ہی میں یہ بھی بصراحت موجود ہے کہ جب ابوسفیان نے قاصد کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ہم مسلمانوں کی زد سے بچ گئے ہیں تم اب واپس مکہ چلے جاؤ تو ابوجہل نے صاف انکار کر دیا وہ کہا کہ اب تو ہم مسلمانوں کا قلع قمع کر کے ہی جائینگے اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے کفار قریش کو بدر کی جانب اس نخوت کے ساتھ پیش قدمی کے لیے ابھارا جس کا ذکر قرآن حکیم اس آیت میں کر رہا ہے۔

اس کے بعد مولانا ے مرحوم نے احادیث سے اپنے مقصد کی تائید چاہی ہے۔ اور اس سلسلہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ تمام ذخیرۂ حدیث میں کعب بن مالک کی روایت کے علاوہ کہیں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت پر حملہ آوری کے لیے نکلے نیز کعب بن مالک کی روایت مولانا کے نزدیک متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری میں اس طرح منقول ہے۔

عن عبد اللہ بن کعب قال کعب لم اتخلف عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوۃ غزاھا الا غزوۃ تبوک غیر ان کنت تخلفت فی غزوۃ بدر ولم یعاتب احد تخلف عنھا انما خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرید عیر قریش حتی جمع اللہ بینھم وبینھم علی غیر میعاد[۱]	کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہیں تھا اور جو اس میں شریک نہیں ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا

حضرت کعب کی اس روایت کی تائید ذخیرۂ حدیث میں دیگر روایات سے بھی ہوتی

[۱] جلد ثانی کتاب الغزوات۔

ہے چنانچہ گذشتہ صفحات میں ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث جس کو ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم سے تمام محدثین وارباب سیر نے نقل کیا ہے گذر چکی ہے۔ اس میں صراحت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اول مدینہ سے ابوسفیان کے قافلہ کے لیے نکلے اور جب ایک یا دو دن کی مسافت پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کفار مکہ کا لشکر مقابلہ کے لیے آ رہا ہے تب آپ نے پھر مشورہ کیا اور اسی مشورہ میں بعض مسلمانوں نے جنگ کے حق میں گرانی کا اظہار کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذخیرۂ حدیث میں کعب کی روایت کے علاوہ کوئی روایت اس کو ظاہر نہیں کرتی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ابوسفیان کے قافلہ کے لیے نکلے تھے۔

رہا کعب کی حدیث کا معرضِ بحث ہونا تو یہ دعویٰ خود محلِ نظر ہے جو حسب ترتیب لائق توجہ ہے۔

(۱) فرماتے ہیں کہ حضرت کعب چونکہ غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے اس لیے ان کی روایت اس موقعہ پر مشاہدہ و واقفیت کی روایت نہیں۔

میدانِ استدلال میں یہ عجیب دلیل ہے اس لیے کہ جب مصنف سیرۃ النبی کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے شروع ہی میں کفار قریش سے جنگ کے ارادہ سے نکلے تھے اور مدینہ میں ہی مشہور تاریخی مشورہ فرمایا تھا تو کعب بن مالک خواہ غزوہ بدر میں شریک نہ ہوئے ہوں لیکن مدینہ میں بہرحال موجود تھے اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انصار و مہاجرین سے مشورہ فرمائیں اور موجود صحابہ شرکت نہ کریں لہذا حضرت کعب کی روایت کو مشاہدہ و واقفیت کی روایت تسلیم نہ کرنا قطعاً بے سند ہے البتہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جنگ کے متعلق مشورہ مدینہ سے باہر کسی وادی میں ہوا تھا تب بیشک یہ کہا جا سکتا ہے کہ کعب اگر اس مشورہ کے متعلق کچھ فرمائیں تو وہ مشاہدہ و واقفیت کی روایت نہیں ہوگی کیونکہ وہ غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے۔

(۲) اس واقعہ کی روایت سے ان کا مقصود یہ ہے کہ غزوۂ بدر کی اہمیت کم ہو جائے تاکہ عدم شرکت سے اُن کا وزن کم نہ ہو۔

مولانا کا ایک صحابی کے متعلق یہ سوءِ ظن بھی قطعاً بے سند اور بے دلیل ہے اس لیے کہ حضرت کعب بدر کی اہمیت کو کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُس کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہی اُن کو اس پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنی عدم شرکت کے لیے یہ معذرت پیش کریں کہ اُن کو یہ سعادت اس لیے نصیب نہ ہو سکی کہ جب مسلمان مدینہ سے نکلے تھے تو چونکہ کاروانِ تجارت کے لیے نکلے تھے اس لیے سب کی شرکت ضروری نہیں تھی تاہم جو نکلے اُن کو وہ بے نظیر شرف ہاتھ آگیا جس سے ہم جیسے محروم رہ گئے۔

کعب بن مالک رضؓ کی اس روایت میں ایک اور باریک نکتہ مستور ہے جو مولانا کے دعوے کو یکسر پادر ہوا بنا دیتا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت کعبؓ اس جانب بھی توجہ دلا رہے ہیں کہ اگر بدر کا معرکہ غزوۂ تبوک کی طرح مدینہ کے اندر ہی طے شدہ ہوتا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے اس ہی غرض کے لیے نکلتے تو یہ ناممکن تھا کہ اس قدر اہم اور عظیم الشان غزوہ کے لیے "نفیرِ عام" نہ ہوتا اور جو لوگ جی چرا کر یہاں بیٹھ رہتے واپسی پر اُن سے بازپرس نہ کی جاتی جبکہ غزوۂ تبوک میں انہی کعب اور ان کے دو رفقا سے عدم شرکت پر اس قدر سخت بازپرس ہوئی تھی کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مقاطعہ کا حکم صادر فرما دیا تھا اور جب تک اُن کی توبہ کے قبول پر وحی الٰہی کا نزول نہیں ہوا تقریباً پچاس دن مقاطعہ کا سلسلہ جاری رہا، اس لیے یقین کرنا چاہیے کہ غزوہ تبوک میں مجھ پر ناراضی کا اظہار اور مقاطعہ کا اعلان اور بدر میں ان امور کا فقدان بلاشبہ اس لیے تھا کہ معرکۂ بدر ارادی نہیں تھا بلکہ حسبِ اتفاق بالکل اچانک پیش آگیا اور درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مدینہ سے "عیر" کے ہی لیے نکلے تھے۔ غرض حضرت کعب غزوۂ بدر کی حیثیت کو کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اپنے عذرِ عدمِ شرکت کی معقولیت کو ظاہر کرنا اور واقعہ کی نوعیت کو واشگاف کرنا چاہتے ہیں۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ مصنف سیرت النبی تو یہ معلوم کرسکیں کہ قرآن ناطق ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ہی کفار قریش کے مقابلہ میں نکلے اور اُن کے نقول احادیث بھی یہی صراحت کررہی ہیں لیکن کعب بن مالک پر ساری عمر یہ حقیقت آشکارا نہ ہوسکی ہاں یہ بات جدا ہے کہ مولانا کے نزدیک کعب بن مالک اپنی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے جان بوجھ کر کذب بیانی تک پر آمادہ ہوگئے۔ مگر میں تو اس کے تصور سے بھی کانپ اٹھتا ہوں۔

(۳) مولانا کے نزدیک بخاری میں مذکور کعب بن مالکؓ کی روایت حضرت انس کی اُس روایت کے بھی خلاف ہے جو مسلم اور مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے۔

عن انس ان رسول اللہ صلعم	حضرت انس سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
شاور حین بلغہ اقبال ابی	وسلم کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپ
سفیان قال فتکلم ابو بکر	نے مشورہ طلب کیا حضرت ابوبکر بولے تو آپ نے توجہ
فاعرض عنہ فتکلم عمر فاعرض	نہ فرمائی پھر حضرت عمر بولے آپ نے اُن کی طرف بھی
عنہ فقام سعد بن عبادہ فقال	توجہ نہ کی پھر سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے اور کہا یا
ایانا ترید یا رسول اللہ والذی	رسول اللہ کیا آپ کا روئے خطاب ہم انصار کی
نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضھا	طرف ہے، خدا کی قسم اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپ
البحر لاخضناھا الخ	حکم دیں تو ہم ڈال دینگے الخ

یعنی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا اُسی وقت آپ نے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اور ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہوچکا ہے اس بنا پر محقق طور پر ثابت ہوگیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لیے آپ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی

مگر مولانا کا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اس روایت میں راوی نے ایک

بہت بڑی غلطی کردی ہے وہ یہ کہ اُس نے انصار مقررین میں سعد بن عبادہؓ کا نام لیا ہے حالانکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اور تمام ذخیرۂ حدیث میں اس تقریر کو حضرت مقدادؓ کی جانب منسوب کیا گیا ہے اور یہی صحیح و درست ہے، البتہ سعد بن عبادہ نے اسی قسم کی تقریر حدیبیہ کے موقع پر کی تھی جس کا ذکر روایات میں بکثرت موجود ہے تو ثابت ہوا کہ اس روایت میں راوی نے واقعہ کو خلط ملط کر دیا ہے پس حدیث انسؓ کے ابتدائی جملوں میں بھی یا تو ابہام و اجمال ہے اور یا راوی کے وہم کی وجہ سے مدینہ کے ابتدائی مشورہ اور وادی ذفران کے مشہور تاریخی مشورہ کے درمیان خلط ہو گیا ہے، چنانچہ مشہور محدث اور بخاری کے شارح حافظ ابن حجرؒ بھی روایت انس کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں

ووقع فی مسلم ان سعد بن عبادةؓ هو الذی قال ذلك وكذا اخرجه ابن ابی شیبة من مرسل عكرمة وفیه نظر لان سعد بن عبادة لم یشهد بدرًا ... ویمكن الجمع بأن النبی صلی الله علیه وسلم استشارهم فی غزوة بدر مرتین الاولی وهو بالمدینة اول ما بلغه خبر العیر مع ابی سفیان وذلك مبیّن فی روایة مسلم. ... ووقع عند الطبرانی ان سعد بن عبادة قال ذلك بالحدیبیة

اور مسلم میں ہے کہ سعد بن عبادہ نے یہ تقریر کی جو مقداد کی جانب منسوب ہے اور ابن ابی شیبہ نے بھی مصنف میں اسی طرح عکرمہ کے مرسل کے ذریعہ نقل کیا ہے اور اس پر اعتراض واقع ہوتا ہے اس لیے کہ سعد بن عبادہ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے۔ ہاں حدیث مسلم کے اس مضمون کو دوسری صحیح احادیث کے ساتھ اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ دراصل بدر کے معاملہ میں دو مشورے ہوئے ہیں ایک مدینہ کے اندر ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو سفیان کے قافلہ کا حال معلوم ہوا مسلم کی روایت میں شاید اس کا ذکر ہے اور دوسرا مشورہ راستہ میں وادی ذفران میں ہوا جیسا کہ فتح الباری میں بصراحت مذکور ہے، اور طبرانی

وھٰذا اولیٰ بالصواب۔ میں ہے کہ دراصل سعد بن عبادہؓ کی یہ تقریر حدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی (اور راوی نے اس جگہ خلط ملط کردیا ہے) اور یہی صحیح اور درست ہے۔

غرض حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی مولانا کا استدلال صحیح نہیں ہے رہا یہ معاملہ کہ انصار جب قافلہ کے لیے مدینہ سے نکل چکے تھے تو پھر اس اہمیت کے ساتھ وادیِ ذفران میں اُن کی رائے معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی تھی تو یہ شبہ بھی نادرست ہے کیونکہ سابق میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے نکلتے وقت بھی ابوسفیان کے قافلہ پر قابض ہونے کے لیے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا تھا وہ غالباً اس لیے کیا ہوگا کہ انصار بھی شریک ہونا چاہتے ہیں اور جب اچانک جنگ کا یہ معاملہ بہت ہی شدید پیش آگیا اور صورت حال انتہائی نازک ہوگئی تو انصار سے دریافت کرنا ازبس ضروری تھا کہ اس حالت میں بھی وہ مدینہ سے باہر معرکہ آرائی کے لیے طیار ہیں یا نہیں۔

بہرحال بخاری، نسائی، ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں مذکور غزوۂ بدر سے متعلق روایات کے خلاف مسلم کی روایت انسؓ کے آخری ٹکڑوں میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ سب اُسی مشورہ سے متعلق ہے جو وادی ذفران میں مدینہ سے باہر ہوا تھا اور تمام صحیح روایات کے خلاف یہ راوی کا وہم ہے کہ اُس نے پہلے ٹکڑے کے ساتھ دوسرے ٹکڑوں کو اس طرح خلط ملط کردیا ہے کہ گویا یہ سب کچھ ابوسفیان کے قافلہ کے وقت ہی پیش آیا تھا اور اس پر بھی مستزاد یہ کہ اس روایت میں کفار قریش سے جنگ کا اشارہ تک بھی نہیں ہے کہ مولانا کے لیے دلیل بن سکے بلکہ ابوسفیان کے قافلہ کا ہی مذکور ہے اس لیے مولانا کو پھر اس روایت کے ٹکڑوں کو بھی اپنے موافق بنانے میں تکلفات کرنے پڑے ہیں۔

اسی طرح مولانائے مرحوم کا حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی اس روایت سے استناد بھی صحیح نہیں جس میں بدر کے واقعہ کا ان الفاظ میں ذکر ہے۔

عن علی قال لما قدمنا المدینۃ	حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں
اصبنا من ثمارھا فاجتویناو	پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے۔
اصابنا بھا وعک وکان النبی صلی	اس لیے ہم بیمار ہو گئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ علیہ وسلم یتخبر عن بدر فلما	بدر کو پوچھا کرتے تھے، جب ہم کو خبر ملی مشرکین
بلغنا ان المشرکین قد اقبلوا	آرہے ہیں تو رسول اللہ بدر کو چلے۔ بدر ایک کنویں
سار رسول صلعم الی بدر وبدر	کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔
بئر فسبقنا علی المشرکین الیھا۔ (الحدیث)	

یہ روایت طویل ہے مگر اس میں ابتدائی واقعات کو نظر انداز کر کے صرف معرکے کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے چنانچہ اس میں نہ مدینہ کے اندر مشورہ کا ذکر ہے، نہ بعض مسلمانوں کی کراہت اور گرانی کا تذکرہ ہے نہ مہاجر و انصار کی ولولہ انگیز تقاریر مذکور ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں کی تعداد اور بے سروسامانی تک کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے اور اس پر طرہ یہ کہ مدینہ کی آمد کے وقت مہاجرین کی ناموافق آب و ہوا کے بعد ہی متصل بدر کے واقعہ کا ذکر شروع کر دیا گیا ہے حالانکہ اس درمیان میں کتنے سرایا اور دوسرے اہم واقعات پیش آ چکے تھے جو کتب احادیث میں بسند صحیح منقول ہیں

پس اگر حضرت علی کی یہ روایت اس بات کے لیے سند ہو سکتی ہے کہ اس میں قافلہ کے لیے نکلنے کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ مشرکین مکہ سے جنگ کا ہی ذکر ہے تو بلا شبہ یہ روایت اُس شخص کے لیے ہی سند ہو سکتی ہے جو بدر کے معرکہ سے متعلق اُن تمام ابتدائی واقعات کا انکار کر دے جس کا اس روایت میں ذکر موجود نہیں ہے حالانکہ قرآن اور دوسری روایات میں بصراحت وہ واقعات مذکور ہیں۔

روایت و درایت کا مسلمہ اصول ہے کہ جب ایک ہی واقعہ سے متعلق مفصل و مجمل دونوں قسم کی روایات بسند صحیح موجود ہوں تو ہمیشہ مجمل کی تفصیل و تشریح مفصل ہی کے ذریعہ

کی جائیگی اور اگرچہ بہت سے مقامات پر مولانا بھی اس کو تسلیم فرماتے ہیں مگر یہاں نہ معلوم کیوں نظرانداز کرنا چاہتے ہیں

تفصیل و اجمال کی اس حقیقت کے پیشِ نظر ابن جریر نے اپنی تاریخ میں امام احمد نے مسند میں ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور بیہقی نے دلائل میں بدر کی مفصل و مجمل روایات کے ضمن میں اس روایت کو بھی نقل کر دیا ہے اور جن روایات میں قافلہ کا تذکرہ ہے اور جن میں نہیں ہے اُن سب کو بیان کر کے ایک دوسرے کے متضاد نہیں سمجھا ہے۔

مصنف سیرۃ النبی قرآن اور احادیث سے استشہاد کے بعد واقعہ کے بعض پہلوؤں سے عقلی استشہاد کرنا چاہتے ہیں جو قابل توجہ ہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر سے قبل جس قدر سرایا بھی بھیجے ہیں اُن میں سے کسی ایک میں بھی انصار کو نہیں بھیجا پس اگر مدینہ میں ہی مشورہ نہ ہوا ہوتا تو کاروانِ تجارت کے مقابلہ میں بھی انصار نہ نکلتے حالانکہ وہ مہاجرین سے زیادہ تعداد میں نکلے یعنی کل فوج (۳۰۵) تھی جن میں (۷۰) مہاجرین تھے باقی سب انصار۔

لیکن یہ استشہاد بھی اس لیے درست نہیں ہے کہ کاروانِ تجارت کا یہ معاملہ چونکہ زیادہ اہم نہیں تھا اور دشمن میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چاہا کہ اس سلسلہ میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے اس میں انصار کا بھی حصہ ہو مگر عقبیٰ میں انصار کے معاہدہ کے پیش نظر ضرورت تھی اس بات کی کہ اُن سے مشورہ لیا جائے کہ وہ نکلنا چاہتے ہیں یا نہیں چنانچہ کاروانِ تجارت کے سلسلہ میں مدینہ کے اندر ہی مشورہ کیا گیا تھا جس میں انصار نے بخوشی رفاقت کو منظور کیا تھا چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابن اسحٰق سے بسند یہ روایت کی ہے۔

لما سمع رسول اللہ صلی اللہ	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ابوسفیان کی شام
علیہ وسلم بابی سفیان مقبلاً	سے آمد کا حال سُنا تو مسلمانوں کو کاروانِ ابوسفیان

من الشام ندب المسلمين اليهم و	کے لیے پکارا اور فرمایا: یہ قریش کا کارواں ہے اس
وقال هذه عير قريش فيها اموالهم	میں اُن کا مال تجارت ہے، پس اس کے لیے نکلو
فاخرجوا اليها لعل الله ينفلكموها	یہ تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ مالِ غنیمت تمہارے
فانتدب الناس فخف بعضهم و	ہاتھ لگا دے پس لوگ تیار ہو گئے، بعض نے
ثقل بعضهم ذلك انهم لم يظنوا	تو اس مقابلہ کو پسند کیا اور بعض کو نکلنا شاق گذرا
ان رسول الله صلی الله علیه	کیونکہ اُن کو یہ خیال ہی نہیں تھا کہ رسول اللہ
وسلم لم يلقى حربًا [1]	صلی اللہ علیہ وسلم اس سفر میں جنگ سے دوچار ہونگے

اس روایت کا جملہ "لعل اللہ ینفلکموھا" اور "لم یظنوا ان رسول اللہ لم یلقی حربا" صاف پتہ دے رہے ہیں کہ انصار اس مرتبہ اس لیے مدینہ سے نکلے کہ جنگ کا اندیشہ نہیں تھا اور کثیر مالِ غنیمت کی توقع تھی اور اسی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرتبہ اُن کو ہمراہ لینے کا ارادہ فرمایا۔

(۲) ابو سفیان کا کاروانِ تجارت جب شام سے روانہ ہو کر حدودِ مدینہ وشام سے نکل گیا اور مکہ کی راہ پر پڑ گیا تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جاسوسوں نے اطلاع دی اس سے قبل اطلاع نہ ہو سکی لہذا مولانا ئے مرحوم کا یہ عقلی استدلال بھی واقعہ کی اصل حقیقت کو نہیں بدل سکتا کہ مکہ سے شام کو جو قافلہ تجارت جاتا تھا وہ مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا اس لیے شام سے آنے والے قافلے کے لیے آپ کو شام کی جانب بڑھنا چاہیے تھا نہ کہ مکہ کی جانب کہ جہاں قریش کے اثرات زیادہ تھے۔

جب ارادۂ الٰہی یہ ہو چکا تھا کہ بدر میں معرکۂ حق و باطل اس طرح بپا ہو کہ بظاہر اسباب مسلمانوں کے سامنے اچانک بے سر و سامانی کی حالت میں دشمن ساز و سامان کے ساتھ آدھمکے اور پھر خدا کی معجزانہ نصرت و یاری ظہور میں آئے تو پھر اس پر تعجب کیسا کہ مسلمانوں کو اُس وقت تک قافلہ کا علم نہ ہو سکا جب تک کہ وہ مکہ کی راہ پر نہ پہنچ گیا۔

[1] جلد ۳ ص ۲۵۶۔

اس کے بعد مولانا نے جمہور کے مسلک کو پیشِ نظر رکھ کر بایخ و نعات میں اپنی جانب سے واقعۂ بدر کے اسباب کی ایسی ترتیب دی ہے کہ جس پر مولانا کو آخر میں یہ کہنے کا موقع مل سکا۔

کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوشِ عداوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت کے موافق ہے![1]

مولانائے مرحوم بہترین ادیب ہیں اور وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی اچھے سے اچھے واقعہ کو بھی اگر مخالفانہ رنگ دینے کی کوشش کی جائے تو اُس کو الفاظ کی تعبیرات میں بھیانک سے بھیانک رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مسئلۂ طلاق، نکاحِ بیوگان، تعددِ ازدواج جیسے مسائل کے متعلق عیسائی پادریوں اور ہندو آریہ سماجیوں نے جن توہین آمیز اور مضحکہ خیز تعبیرات میں رنگ کر اپنے معتقدین کے سامنے پیش کیا ہے وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں مگر آج کی دنیائے تہذیب و تمدن میں جب اُنہی عیسائیوں اور ہندوؤں نے سیکڑوں اور ہزاروں سال کے تجربہ کے بعد یہ یقین کر لیا کہ سوسائٹی کا "معاشرتی نظام" رحمۃ للعٰلمین کے لائے ہوئے قانون کو اختیار کیے بغیر صحیح نہیں ہو سکتا تو آج وہ پارلیمنٹ، کونسل اور اسمبلیوں کے ذریعہ ان ہی قوانینِ طلاق، نکاحِ بیوگان وغیرہ کو اپنی معاشرت میں شامل اور ان امور کے جواز کے لیے بہتر سے بہتر عقلی دلائل و ادبی تعبیرات اختیار کر رہے ہیں۔

پس غزوۂ بدر کیوں پیش آیا؟ اس کے لیے جمہور نے باتفاق تاریخ و سیرت یہی کہا ہے کہ مسلمانوں کا مدینہ میں محفوظ رہ کر تبلیغ اسلام کرنا مشرکین کو کسی طرح برداشت نہ ہو سکا اور اُنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں شروع کر دیں تھیں کہ اس اثناء میں "سریۂ عبداللہ بن جحش" پیش آگیا جس میں اُن کا مشہور سردار عمرو بن حضرمی قتل ہو گیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان جیسے بہادر سردار قید ہو گئے، اس بناء پر سنہ۔۔

---

[1] سیرت النبی جلد اول ص ۳۱۹

کفارِ مکہ کو اشتعال آجانا ایک فطری بات تھی، چنانچہ مشہور محدث ابنِ کثیر نے اپنی تاریخ میں اس سریہ کا عنوان ہی یہ قائم کر دیا ہے "باب سریہ عبداللہ بن جحش التی کانت سبباً لغزوۃ بدر العظمٰی و ذلک یوم الفرقان یوم التقی الجمعان واللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر" ابھی یہ اشتعال بڑھ ہی رہا تھا کہ ابوسفیان کے کاروانِ تجارت کا قصہ مزید پیش آگیا جو دراصل کاروانِ تجارت نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کے استیصال کا وہ "سرمایہ" تھا جس کے گھمنڈ پر قریش یقین کیے بیٹھے تھے کہ جونہی وہ مکہ میں بحفاظت تمام پہنچ جائیگا سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کے خاتمہ کا سامان ہاتھ آگیا۔

تو اب خود ہی انصاف کیجیے کہ اس میں کون سی بات ایسی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت کے خلاف اور قریش کے جوشِ عداوت کے منافی ہے

اصل بات یہ ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے آرنلڈ کی راہنمائی کے لیے یا اُس کی تقلید میں اس واقعہ کے تمام نقشہ کو جمہور کے خلاف اس لیے پلٹنے کی سعی فرمائی ہے کہ وہ وقت کے عیسائی مستشرقین کے اِس اعتراض سے مرعوب ہو گئے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا انتہائی معیوب بات ہے لہٰذا جو شخص نبوت کا مدعی ہو وہ کیسے ایسا فعل کر سکتا ہے حالانکہ یہ بات مرعوب ہونے کی نہیں تھی بلکہ ضرورت تھی اس امر کی کہ اُن تاریخی اسباب و وسائل کو روشنی میں لایا جائے جن کے پیشِ نظر مشرکین مکہ کے کاروانِ تجارت کو روکنا اور اُن پر قابض ہونا لوٹ کھسوٹ نہیں بلکہ جنگی نقطۂ نظر اور مسلمانوں کی جماعتی بقاء و حفاظت کے اعتبار سے ازبس ضروری تھا۔

صورتِ حال یہ تھی کہ مکہ کے قیام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر تیرہ سال مسلسل مشرکین مکہ نے جو مظالم کیے اُن پر صبر و ضبط کے بعد جب مدینہ کو ہجرت کر گئے تب بھی ان مشرکین نے مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیا اور جنگ و جدل اور سازشی مکرو

ؔ آرنلڈ نے بھی غزوۂ بدر کے متعلق ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

فریب میں لگے رہے چنانچہ ابو داؤد میں ہے۔

ان كفار قريش كتبوا الى ابن ابي ومن كان يعبد معه الاوثان من الاوس والخزرج ورسول الله صلى الله عليه وسلم يومئذ بالمدينة قبل وقعة بدر انكم آويتم صاحبنا وانا نقسم بالله لتقاتلنه او لتخرجنه او لنسيرن اليكم باجمعنا حتى نقتل مقاتلتكم ونستبيح نساءكم (الحديث)[1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لے آئے تھے کہ بدر کے واقعہ سے بہت پہلے کفار قریش نے عبد اللہ بن ابی اور اس کے بت پرست ساتھیوں کو جو اوس و خزرج میں باقی رہ گئے تھے یہ لکھا کہ تم نے ہمارے صاحب کو پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم ان سے لڑو یا ان کو نکال دو، ورنہ تو ہم سب تم پر چڑھ آئینگے اور تمہارے جوانوں کو قتل کرینگے اور تمہاری عورتوں کو باندیاں بنا لینگے۔

پھر معاملہ دھمکیوں تک ہی نہیں رہا بلکہ کاروانِ تجارت کی آمد و رفت کے پردہ میں منافقین اور یہود مدینہ سے برابر مسلمانوں کے استیصال کے لیے مختلف تدابیر پر خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اب کاروانِ تجارت کا مقصد محض تجارتی کاروبار تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ نفع کے حصول کو مسلمانوں کے مقابلہ کی طیاریوں پر صرف کرنا نصب العین بنا لیا گیا۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ دشمن کو اپنے خلاف اور اپنے استیصال کے لیے سازش کرنے، مقابلہ کی طیاریوں میں مشغول رہنے، کاروانِ تجارت کے ذریعہ مدینہ میں مقیم دشمنوں کے ساتھ مشرکین مکہ کو معاندانہ خط و کتابت جاری رکھنے اور خود کاروانِ تجارت کے ذریعہ اپنے استیصال کے لیے سرمایہ فراہم کرنے دینے کے لیے آزاد چھوڑ دینا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے اپنا خاتمہ کرا لینا یا اُن تمام ذرائع کا سدباب کر کے فتنہ کا سر کچل دینے کی کوشش کرنا؟

[1] باب فی خبر النضیر

لہٰذا مسلمانوں نے وہی کیا جو عقل، تدبیر سیاست "اخلاق مدن" کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ واجب اور ضروری تھا یہی وہ امور تھے جن کی جانب ارباب سیر و تاریخ نے بھی توجہ دلائی ہے چنانچہ سب سے پہلے سریہ "سریہ حمزہ" کے متعلق (جو کہ مشرکین کے کاروانِ تجارت سے روکنے کے لیے ہی نکلا تھا) زرقانی شرح مواہب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"فخرجوا یعترضون عیر القریش" جاءت من الشام تریں مکۃ ای یتعرضون لھا یمنعوھا من مقصدھا باستیلائھم الخ[۱]	پس وہ نکلے کہ قریش کے کاروان تجارت کے درپے تھے" جو شام سے مکہ جارہا تھا یعنی وہ یہ چاہتے تھے کہ جس مقصد کے لیے یہ کاروانِ تجارت آجا رہے ہیں اُن پر غلبہ کرکے اُس مقصد کو پورا نہ ہونے دیں

اور ابوسفیان کے جس کاروانِ تجارت کے واقعہ سے بدر کے معرکہ کا تعلق ہے اس کے متعلق تو تمام ارباب سیر و تاریخ متفق ہیں کہ قریش کے اندر مسلمانوں کے استیصال کا جوش و خروش اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ جب ابوسفیان کا کارواں تجارت مکہ سے چلا ہے تو کوئی قریشی و قریشیہ باقی نہیں رہی تھی جس کے پاس ایک مثقال بھی موجود تھا کہ اُس نے اپنا راس المال کاروان کے حوالہ نہ کر دیا ہو۔ زرقانی میں ہے۔

کان فیہا خمسون الف دینار و کان لم یبق قرشی ولا قرشیۃ لہ مثقال الا بعث بہ فی العیر[۲]	کاروانِ تجارت کے ساتھ پچاس ہزار دینار سرخ تھے اور کوئی قرشی و قرشیہ کہ جس کے پاس ایک مثقال بھی موجود تھا ایسے نہیں تھے کہ جس نے قافلہ میں اپنا راس المال نہ لگایا ہو۔

ابوسفیان کا یہ کارواں صرف کاروانِ تجارت ہی نہ تھا بلکہ سامانِ حرب و ضرب کے لیے بنیادِ کار تھا اس کا اندازہ ابوجہل کے اُس قول سے بھی ہوتا ہے جو قافلہ کے گھر جانے

---

[۱] جلد ۱ ص ۴۵۲ [۲] ص ۴۷۶

پھر اس نے قریشیوں کو مشتعل کرتے ہوئے کہا۔

النجاء النجاء علیٰ کل صعب و	نجات حاصل کرو، انتہائی مصیبت و ذلت سے نجات
ذلول عیرکم اموالکم ان اصابہا	حاصل کرو، کاروانِ تجارت کا رواں نہیں ہے تمہارے
محمد لم تفلحوا بعدھا ابدًا ،	مال و دولت کا ذخیرہ ہے اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس پر
	قابض ہوگئے تو پھر تم ہمیشہ کے لیے ناکام و نامراد ہو کر رہ جاؤ گے۔

کیا ابوجہل کا یہ خطرہ محض کاروانِ تجارت کے لٹ جانے پر ہو سکتا تھا ہرگز نہیں بلکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ تجارت کا کارواں نہیں ہے بلکہ سامانِ جنگ کی وہ ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی حفاظت کی خاطر آج کی مہیب جنگوں میں فیصلہ کن لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔

تو اب انصاف فرمائیے کہ اس قسم کے کاروانِ تجارت پر حملہ کر کے دشمن کی تجارت کا سدباب کرنا کونسا گناہ تھا جس کے لیے ہم دوسروں کی ہرزہ سرائی سے مرعوب ہو کر حقائق کا انکار کرنے لگیں۔

مولانا کو یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ زر و مال کے حاجتمند انصار سے زیادہ مہاجرین تھے تو پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس رفاقت میں مہاجرین کے مقابلہ میں انصار کیوں زیادہ تعداد میں تھے، سو ان احتمالاتِ عقلی کا باب تو اس درجہ وسیع ہے کہ جس قدر جی چاہے وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جائیے ورنہ بات صاف ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رجحانِ طبع نے صورت ہی ایسی پیدا کر دی کہ انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ ہو گئی ورنہ شاید حالت برعکس ہوتی البتہ مولانا کی توجیہ کے خلاف یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر مدینہ ہی میں جنگ کے لیے مشورہ ہوا تھا تو پھر وہ مہاجرین جو انصار کے بغیر بھی اب تک مختلف غزوات و سرایا میں سر بکف میدانِ جنگ میں جاتے رہے تھے۔ آج اس عظیم الشان غزوہ میں انصار کے مقابلہ میں کیوں پیچھے رہے؟

اس موقع پر بار بار حضرت سعد بن عبادہ کی تقریر کا حوالہ دینا بھی اس لیے غیر موزوں

ہے جبکہ ہم محدثین سے یہ نقل کر چکے کہ مسلم کی حدیث میں حضرت سعد بن عبادہ کا نام راوی کا وہم ہے اور در اصل اُن کی یہ تقریر حدیبیہ کے موقعہ پر ہوئی تھی نہ کہ معرکۂ بدر کے موقعہ پر

مولانائے مرحوم نے سیرۃ النبی میں طبری کے حوالہ سے اُس روایت کو نقل کرتے ہوئے "جس کو ہم گذشتہ صفحات میں نقل کر آئے ہیں اور جو یہ ثابت کرتی ہے کہ مدینہ میں ابوسفیان کے قافلہ سے متعلق جو مشورہ ہوا تھا اُس میں بعض مسلمان اس لیے نکلتے ہوئے کسمساتے رہے کہ جنگ کا معاملہ نہیں ہے صرف قافلہ کا معاملہ ہے" یہ تنقید فرمائی ہے۔

لیکن یہ واقعات صریح آیات قرآن کے خلاف ہیں قرآن مجید میں بہ تصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسماتے تھے وہ عدم ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اُن کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے مُنہ میں جا رہے ہیں[۱]۔

مگر تنقید فرماتے ہوئے مولانا کو یہ بات فراموش ہوگئی کہ انہوں نے جمہور کے خلاف کوئی دلیل نہیں پیش فرمائی بلکہ جو دعویٰ تھا وہی دلیل بنا کر پیش کر دیا گیا اس لیے کہ جمہور کا دعویٰ مع دلیل تو یہ ہے کہ قرآن عزیز کی زیرِ بحث آیات مدینہ کے مشورہ سے متعلق ہی نہیں ہیں بلکہ وادی ذفران کے مشورہ سے متعلق ہیں جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مدلل خود قرآن سے ہی ثابت کیا جا چکا ہے اور اس روایت میں جس مشورہ کا ذکر ہے وہ قرآن میں مذکور نہیں ہے البتہ احادیث و روایات سیر میں بسند صحیح منقول ہے لہذا دونوں مواقع پر کسمسانے کی وجوہ جدا جدا تھیں اور قرآن نے اس پورے واقعہ کے اُن ہی خاص اجزاء کو بیان کرنا مناسب سمجھا جو مسلمانوں کی بے سروسامانی اور دشمن کی قوت اور پھر مسلمانوں پر خدا کی نصرت کے نزول سے تعلق رکھتے ہیں

طبقات ابن سعد میں ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ایک میل پر پہنچے تو لشکر کا جائزہ لیا ابن عمرؓ اُس زمانہ میں کمسن تھے لہذا اُن کو واپس کر دیا[۲]، اس سے بھی

---

[۱] جلد ا صفحہ ۳۳۲ [۲] اسد الغابہ میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے جلد ۳ صفحہ ۲۲۷

مولانا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے قافلہ کے مقابلہ کے لیے نہیں بلکہ کفار مکہ سے جنگ کے لیے ہی نکلے تھے ورنہ تو ایسے نوخیز لڑکے قافلہ کو لوٹنے میں زیادہ مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ مگر یہ بھی مولانا کا محض قیاس ہی قیاس ہے اس لیے کہ قافلہ کے مقابلہ میں اگرچہ کسی بڑی جنگ کی توقع نہیں تھی مگر بہرحال معمولی جنگ کا تو خطرہ موجود ہی تھا، کیا ابو سفیان اور اس کے تیس چالیس بہادر قریشی ایک ہزار اونٹ پر لدا ہوا سامان آسانی سے حوالہ کر دیتے یہ کیسے ہو سکتا تھا پس اگر معمولی سی جنگ کا بھی خطرہ تھا تو نوعمر لڑکوں کو واپس کر دینا اس کے لیے کس طرح دلیل بن جاسکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہی میں قافلہ کے مقابلہ کو نہیں بلکہ کفارِ مکہ سے فیصلہ کن جنگ کے لیے نکلے تھے؟

اسی طرح استیعاب میں سعد بن خیثمہ کا جو واقعہ مذکور ہے اس سے بھی مولانا کا مقصد حل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اگر باپ کی فرمائش پر بیٹے نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی بجائے باپ کو اس موقعہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلنے دے تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ اگر مسلمان مدینہ سے قافلہ پر حملہ کے لیے نکلے تو اس یقین کے ساتھ نکلے تھے کہ ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی چشم زخم نہیں پہنچیگا اور سب ہی صحیح سالم واپس آجائینگے یہ تو بدقسمتی سے عیسائی مستشرقین سے مرعوب ہو کر ہم نے بزعم خود یہ تصور کر لیا کہ قافلہ پر حملہ کے معنی گویا ڈاکوؤں کا قافلہ لوٹنے کے مرادف ہے۔ مسلمان تو جب بھی دشمنوں کے مقابلہ کو نکلے خواہ وہ براہِ راست جنگ کے ارادہ سے نکلے ہوں یا دشمن کو دوسرے معاملات میں زک دینے ہمیشہ جہاد اور شہادت ہی کے نقطۂ نظر نکلتے تھے اور مال غنیمت تو ان کے لیے خدا کا مزید فضل و احسان تھا جو کبھی بغیر جنگ ہی ہاتھ آگیا اور کبھی خون میں نہانے کے بعد حاصل ہوا۔

اب ہم مصنفِ سیرۃ النبی کے غزوۂ بدر کے متعلق ان تمام دعاوی و شبہات پر تحقیقی

نظر ڈالنے کے بعد جو جمہور کے خلاف اُن کی جانب سے پیش کیے گئے ہیں صرف ایک سوال پر اس بحث کو ختم کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر معرکۂ بدر میں ابتدا ہی سے یہ بذریعہ وحی بتا دیا گیا تھا کہ خدا کی مرضی معرکۂ حق و باطل کی ہے اور قافلہ پر حملہ کرنے یا بقول مولانا کے " قافلہ لوٹنے " کا تصور و تخیل گناہِ عظیم اور شانِ اسلام کے خلاف ہے۔ تو آخر جلیل القدر صحابہ نے ایسا تصور قائم ہی کیوں کیا اور اگر کیا بھی تھا تو قرآن نے " احدی الطائفتین " کا وعدہ کر کے اس گناہِ عظیم کے تصور کی حوصلہ افزائی کیوں کی اور کیوں صاف صاف یہ نہیں کہہ دیا کہ خدائے تعالیٰ ایک لمحہ کے لیے بھی تم کو قافلہ پر قابو پانے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس کا تصور بھی گناہِ عظیم ہے البتہ اس کا وعدہ کرتا ہے کہ تم کو دشمنوں پر قابو دیگا اور تم کامیاب ہو گے تو کیا پھر قرآن عزیز کا " احدی الطائفتین " کا اس طرح ذکر کرنا اس امر کی صاف شہادت نہیں ہے کہ معرکۂ بدر سے قبل ضرور چند اکابرانِ اسلام کی یہ مٹھی بھر جماعت قافلہ کے لیے نکلی تھی مگر اچانک جب کفار مکہ سے سابقہ پڑ گیا اور مسلمانوں نے بے سروسامانی کو دیکھ کر قافلہ پر قبضہ چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اول یہ وعدہ دیا کہ ان دونوں " عیر و نفیر " میں سے ایک تم کو ضرور دینگے اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ اطلاع کر دی کہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ وہ اب قافلہ کی بجائے معرکۂ حق و باطل میں مسلمانوں کو کامیابی عطا کر کے ہمیشہ کے لیے تاریخِ ظلم کا رُخ عدل کی جانب پھیر دینے والا ہے

الحاصل قرآن و حدیث اور تاریخی حقائق کی روشنی میں معرکۂ حق و باطل " غزوۂ بدر " کے متعلق جمہور علماءِ اسلام کا مسلک ہی صحیح ہے اور بلاشبہ واقعات کی صحیح و مستند تفصیلات کسی طرح بھی شانِ نبوت کے خلاف نہیں اور نہ علم الاخلاق و علم الاجتماع اور حق و صدق پر مبنی سیاساتِ مدن کے منافی ہیں۔ " ھذا ھو الحق والحق احق ان یتبع "

غزوۂ اُحُد

اُحُد اُحُد مدینہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے، یہ مدینۂ منورہ سے جانب جنوب تقریباً دو میل (ایک فرسخ) پر واقع ہے۔

غزوۂ اُحُد یہی وہ مقام ہے جہاں شوال ۳؁ ہجری مطابق جنوری ۶۲۵؁ء میں مسلمانوں اور مشرکوں کے مقابلہ میں معرکۂ حق و باطل گرم ہوا اس لیے اس کا نام غزوۂ اُحُد ہے۔

غزوۂ اُحد بھی بہت اہم غزوہ ہے اور اپنی تفصیلات و جزئیات کے اعتبار سے اپنے دامن میں عبرت و موعظت کا بے شمار ذخیرہ رکھتا ہے، اس غزوہ کے تفصیلی حالات کتب حدیث و سیرت اور تفاسیر قرآنِ حکیم میں مکمل طور پر مذکور ہیں۔[1]

اِن حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ بدر میں جو زخم قریش کو لگ چکا تھا اُس نے ناسُور کی شکل اختیار کر لی تھی کیونکہ بدر کے واقعۂ ہائلہ سے قریش کا ہر گھر ماتم گسار اور عرب کے مشرک قبائل نوحہ خواں تھے ابوسفیان نے تو قسم کھالی تھی کہ جب تک بدر کا انتقام نہ لے لونگا نہ غسل کرونگا نہ تبدیلِ لباس، عکرمہ بن ابوجہل اور دوسرے نوجوانوں کی تقریریں اور عورتوں کی نوحہ خوانی قرشیوں اور قبائلِ عرب کو غیرت اور اشتعال دلا کر جنگ کے لیے آمادہ کر رہی تھیں اور اس طرح ابوسفیان کی سرکردگی میں تین ہزار نبرد آزما سورماؤں کا لشکرِ جرار مکہ سے مسلمانوں کو مٹانے کے لیے نکلا اور اُحد کے سامنے آکر خیمہ زن ہو گیا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب ابوسفیان کی طیاریوں کا حال معلوم ہوا تو صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مشورہ فرمایا عمر رسیدہ اور تجربہ کار صحابہ نے یہ رائے دی کہ ہم کو

[1] ہم نے زیادہ حصہ فتح الباری جلد ۷ سے لیا ہے اور باقی سیرت حلبیہ اور زرقانی اور تاریخ کبیر سے

باہر نکل کر جنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مفید طریقہ یہ ہے کہ ہم مدینہ کے اندر ہی دشمن کا انتظار کریں اور جب وہ مدینہ پر حملہ آور ہو تو اُس کا پُرزور مقابلہ کریں، ہمارے اس طرزِ عمل سے اول تو دشمن کو جرأت ہی نہ ہوگی کہ مدینہ پر حملہ آور ہو اور اگر اُس نے اقدام کیا تو بلاشبہ شکستِ فاش اٹھا کر راہِ فرار اختیار کریگا۔ مگر اُن صحابہ کو "جو بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے اور بدر کی فضیلت کو اس وقت حاصل کرنا چاہتے تھے" یہ رائے پسند نہیں آئی اور نوجوانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور اکثریت کی رائے یہ قرار پائی کہ ہم کو دشمنوں کا مقابلہ میدان میں نکل کر ہی کرنا چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اکثریت کا رجحان یہ پایا تو اس پر صاد فرما کر حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے کہ ہتھیار سج کر میدانِ جنگ میں نکلیں، جب آپ حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے تو تجربہ کار اور اکابر صحابہ نے اپنے اصاغر کو اُن کی رائے پر ملامت کی کہ اُنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رجحان کے خلاف کیوں اپنی آزادانہ رائے سے آپ کو پریشان کیا، چنانچہ جب آپ باہر تشریف لائے تو ان نوجوانوں اور شمع اسلام کے پروانوں نے اپنی رائے پر اظہار ندامت کیا اور عرض کیا کہ آپ مدینہ ہی کے اندر دشمن کا مقابلہ کریں یہی مناسب ہے۔ یہ سُن کر حضور اقدس نے ارشاد فرمایا "نبی کی شان کے یہ خلاف ہے کہ جب خدا کی راہ میں ہتھیار سج کر طیار ہو جائے تو پھر معرکۂ حق و باطل کے بغیر ہی اُن کو اُتار دے اب خدا کا نام لے کر میدان میں نکلو"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے نکلے تو ایک ہزار کا لشکر جلو میں تھا، اس لشکر میں تین سو منافقین عبداللہ بن اُبَیّ کی سرکردگی میں ہم رکاب تھے، یہ مدینہ ہی میں مشرکین مکہ کے ساتھ سازش کر چکے تھے کہ مخلص مسلمانوں کو بزدل بنانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرینگے کہ اوّل مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ نکلینگے اور راہ سے ہی اُن سے کٹ کر مدینہ واپس آجائینگے، چنانچہ رأس المنافقین یہ بہانہ کرکے لشکرِ اسلام سے کٹ کر جُدا ہو گیا اور

مدینہ واپس آگیا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم جیسے تجربہ کاروں کی بات نہ مان کر ان نوجوانوں کی رائے کو ترجیح دی تو ہم کو کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالیں۔

مگر منافقین کا مقصد پورا نہ ہوا اور اُن فداکارانِ اسلام پر اُن کی مراجعت کا مطلق کوئی اثر نہ پڑا اور ایسے جانباز اور نثارانِ اسلام پر اثر ہی کیا پڑتا جن کے بچوں کی جانبازی اور اسلام پر فداکاری کا جذبہ اور ولولہ یہ ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر جب لشکر اسلام کا جائزہ لیا اور صغیر السن لڑکوں کو واپسی کا حکم دیا تو رافع بن خدیج جو ابھی کم عمر ہی تھے یہ دیکھ کر پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے کہ دراز قد بن کر جنگ کے سپاہی رہ سکیں، چنانچہ اُن کی تدبیر کارگر ہو گئی اسی طرح جب سمرہ بن جندب صغیر سن شمار کر لیے گئے تو رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہ اگر رافع شریک جنگ ہو سکتا ہے تو میں کیوں خارج کیا جا رہا ہوں جبکہ میں رافع کو کشتی میں پچھاڑ دیا کرتا ہوں، آخر دونوں کی کشتی کرائی گئی اور سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا اور مجاہدین میں شامل کر لیے گئے۔ البتہ مسلمانوں کے دو قبیلے بنو سلمہ اور بنو حارثہ میں کچھ بددلی سی پیدا ہو چلی تھی مگر فداکار مسلمانوں کے جوش و ولولہ کو دیکھ کر اُن کی ہمت بھی بلند ہو گئی

غرض اس ولولہ اور جذبہ کے ساتھ مجاہدین کا لشکر اُحد پہنچا اور دونوں صفیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کو اس طرح صف آرا کیا کہ اُحد کو پس پشت لے لیا اور پچاس تیر اندازوں کو حضرت عبد اللہ بن جبیر کی کمان میں پہاڑ کی ایک گھاٹی پر مقرر فرما دیا کہ فتح و شکست کسی حال میں بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں تاکہ پشت کی جانب سے دشمن حملہ آور نہ ہو سکے۔

اب جنگ شروع ہو گئی اور دونوں صفیں بالمقابل نبرد آزما ہو کر جوہر شجاعت

دکھانے لگیں، ابھی جنگ کو کچھ زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ مسلمانوں کا پلہ بھاری ہوگیا اور مشرکینِ مکہ کا لشکر درہم برہم ہوکر بھاگنے لگا، نبرد آزما مسلمانوں نے جب مالِ غنیمت جمع کرنے کا ارادہ کیا تو تیراندازوں سے صبر نہ ہوسکا اور وہ گھاٹی چھوڑنے پر آمادہ ہوگئے کمان افسر حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے ہرچند روکا اور فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو مگر انہوں نے یہ کہہ کر جگہ چھوڑ دی کہ آپ کا حکم جنگ تک محدود تھا اب جبکہ جنگ ختم ہوگئی تو خلاف ورزی کیسی؟

حصولِ غنیمت کے شوق نے ادھر مسلمان تیراندازوں سے جگہ خالی کرادی اور ادھر خالد بن ولید اپنے جنگی دستہ کے ساتھ (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) میدان خالی دیکھ کر گھاٹی کی جانب سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، اب مسلمان گھبرائے اور اس اچانک حملہ سے ان کے پیر اکھڑ گئے اور اس طرح فتح و نصرت یک بیک شکست سے بدل گئی، اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد و پیش ابوبکر، عمر، علی، طلحہ، زبیر (رضی اللہ عنہم جیسے فداکار موجود تھے، تاہم مسلمانوں کے فرار سے دشمنوں کو موقعہ مل گیا اور ایک شقیِ ازل نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پتھر پھینک کر مارا جس سے آپ کا ایک دندان مبارک شہید ہوگیا، آپ پتھر کے صدمہ سے قریب کی ایک گھاٹی میں گر گئے، ابھی آپ سنبھلے بھی نہ تھے کہ ایک مشرک نے پکار دیا "ان محمداً قد مات" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہوگیا" اس آواز نے مسلمانوں میں اور زیادہ انتشار اور سخت بے چینی پیدا کردی مگر مسلمان فوراً سنبھلے اور ثابت قدم صحابہ نے للکارا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اب ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے آؤ اور جنگ کا فیصلہ کر کے دم لو اس صدائے حق نے مسلمانوں کے دل میں غیرت کا جذبہ پیدا کردیا وہ سب پلٹ پڑے اور حملہ آور ہونے کی غرض سے سمٹ کر یکجا ہوگئے مگر نقشۂ جنگ بدل چکا تھا اور قریش اپنی کامیابی پر نازاں ہوکر میدان سے الگ ہوچکے تھے، مسلمانوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو جلوۂ

جہاں آرا پر نظر پڑتے ہی اُن کے دل میں بھی سکون پیدا ہو گیا اور پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہو گئے غار میں گر جانے سے خود سر میں گھس گیا اور زرہ کی کڑیوں کی زد سے چہرۂ مبارک اور بازوؤں پر بھی ہلکے زخم آ گئے تھے، حضرت علی (رضی اللہ عنہ) اور حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) نے خود کو سر سے نکالا اور زخموں کو دھویا اور بوریا جلا کر راکھ کو زخم کے اندر بھر دیا جس سے خون بند ہو گیا۔

حضرت حمزہ کی شہادت

اس غزوہ میں ستر مسلمان شہید اور بہت سے زخمی ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا، دودھ شریک بھائی بے تکلف دوست اور جاں نثار صحابی حضرت حمزہ کی شہادت اس واقعہ کا زبردست سانحہ ہے، زبانِ وحی ترجمان نے ان کو سید الشہداء کا لقب عطا فرمایا۔

مشرکین مکہ نے اس جنگ میں درندوں اور خونخوار حیوانوں کی طرح مردہ نعشوں کے ناک کان کاٹ ڈالے، اور پیٹ چاک کر کے دل و جگر کو نیزوں کی انی سے چھید چھید کر دل کا نچاز نکالا، ابو سفیان کی بیوی ہند نے تو سید الشہداء کا جگر چاک کر کے دانتوں سے چبا ڈالا حضرت حمزہ کو ایک حبشی غلام وحشی نے شہید کیا تھا جس کی خوشی میں ہند نے اُس کو اپنا سونے کا ہار عطا کیا۔

ابو سفیان اپنی کامیابی کی مسرت میں یہ کہہ رہا تھا " اُعْلُ ھُبَل اُعْلُ ھبل۔ ہبل کی جے ہو، ہبل کی جے ہو" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا تم اس کے جواب میں یہ پکارو " اللہ اعلیٰ واجل، اللہ اعلیٰ واجل"۔ اللہ ہی سب سے بلند و بالا اور بزرگ ہے" ابو سفیان نے پھر طیش میں آ کر کہا " لنا العُزّیٰ ولا عُزّیٰ لکم۔ ہماری مدد گار عُزّیٰ دیوی ہے اور تمہارے پاس عُزّیٰ کا ہمسر نہیں ہے" حضور اقدس نے ارشاد فرمایا اے عمر تم یہ جواب دو" اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم۔ ہمارا والی و مددگار اللہ تعالیٰ ہے اور تمہارا مددگار کوئی بھی نہیں" بہر حال ابو سفیان یہ کہہ کر کہ آئندہ سال پھر بدر میں معرکہ آرائی ہو گی اپنا لشکر لے کر

مکہ واپس چلا گیا۔

قرآنِ عزیز اور غزوۂ احد

مسلمانوں کا غزوۂ اُحد کے لیے طیار ہونا، منافقین کا لشکرِ اسلام سے جُدا ہو کر مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کی سعی کرنا، مسلمانوں کا اوّل خدا کی مدد سے کامیاب ہونا، اور پھر اپنی غلط کاری اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں شکست کھا جانا اور فتح کا شکست سے بدل جانا اور خدائے تعالیٰ کا مسلمانوں کی تسلی کرنا، ان تمام امور کو قرآن عزیز نے آلِ عمران میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ محمد بن اسحٰق سے منقول ہے۔

انزل اللہ فی شان احد ستین آیۃ من آل عمران[1]	اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد کی شان میں آل عمران کی ساٹھ آیتیں نازل فرمائی ہیں۔
وروی ابن ابی حاتم من طریق للمسور بن مخرمۃ قال قلت لعبد الرحمٰن بن عوف اخبرنی عن قصتکم یوم احد قال اقرء العشرین ومائۃ من آل عمران تجدھا واذ غدوت من اھلک تبوئ المؤمنین مقاعد للقتال الی قولہ امنۃ نعاسًا (الآیات)[2]	اور ابن ابی حاتم نے بہ طریق مسور بن مخرمہ روایت کیا ہے کہ وہ کہتے تھے میں نے عبدالرحمٰن بن عوف سے عرض کیا آپ غزوۂ اُحد کا اپنا قصہ بیان فرمائیں، انہوں نے فرمایا تم آل عمران کی ایک سو بیس آیات پڑھو تو تم کو سارا واقعہ معلوم ہو جائیگا یہ آیات یہاں سے شروع ہو کر اذ غدوت من اھلک تبوئ المؤمنین مقاعد للقتال" امنۃ نعاسًا الآیۃ پر ختم ہوتی ہیں۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ	اور (اے پیغمبر! قابلِ ذکر ہے وہ بات) جبکہ تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے (اور اُحد کے میدان میں) لڑائی کے لیے

[1] فتح الباری جلد ۷، ص ۲۷۸ [2] فتح الباری جلد ۷، ص ۲۷۸۔

لِلْقِتَالِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ	مورچوں پر مسلمانوں کو بٹھا رہے تھے اور اللہ سب کچھ
اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ	سُننے والا جاننے والا ہے۔ پھر جب ایسا ہوا تھا کہ تم میں
اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا	سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں (اور
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ	واپس لوٹ چلیں) حالانکہ اللہ مددگار تھا اور جو ایمان رکھنے
الْمُؤْمِنُوْنَ ہ (آل عمران)	والے ہیں اُن کو چاہیئے کہ ہر حال میں اللہ پر ہی بھروسہ رکھیں۔
وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ	اور دیکھو، نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو، تم ہی سب سے برتر
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	و اعلیٰ ہو بشرطیکہ تم سچے مومن ہو۔ اگر تم نے (احد میں) زخم کھایا
اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ	ہے تو دوسروں کو بھی ویسے ہی زخم (بدر میں) لگ چکے ہیں۔
مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَ	دراصل یہ (ہار جیت کے) اوقات ہیں جنہیں ہم انسانوں
تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ	میں اِدھر اُدھر پھراتے رہتے ہیں علاوہ بریں یہ اس لیے
النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ	تھا تاکہ اس بات کی آزمائش ہو جائے کون سچا ایمان
اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ	رکھنے والا ہے کون نہیں اور اس لیے کہ تم میں سے ایک
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ہ	گروہ کو (ان وقائع اور ایام کے نتیجوں کا) شاہد حال بنائے
(الآیات) (آل عمران)	اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ ظلم کرنیوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔

غزوۂ احزاب (غزوۂ خندق)

غزوۂ احزاب تمام غزوات میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے نرالا ہے، اس لیے کہ اس غزوہ میں مسلمانوں کو تمام کافر جماعتوں سے بیک وقت واسطہ پڑا اور قبائل عرب، یہود اور اُن کے حلیف سب کے سب جمع ہو کر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے نکلے تھے اور مدینہ کے اندر بھی منافقین کا گروہ خفیہ اُن کی مدد کر رہا تھا۔ حزب کے معنی چونکہ "گروہ" کے ہیں اور "احزاب" اُس کی جمع ہے اس لیے یہ غزوہ احزاب کہلایا۔

درجبکہ حضرت سلمان (رضی اللہ عنہ) کے مشورہ سے مسلمانوں نے پہلی مرتبہ خندق کھود کر مدینہ کو دشمن سے محفوظ رکھنے کی تدبیر اختیار کی اس لیے اس کو غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔

یہ غزوہ شوال ۵ھ مطابق فروری ۶۲۷ء میں پیش آیا جبکہ ابوسفیان دس ہزار پر مشتمل لشکر جرار کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کے لیے مکہ سے نکلا۔ اس واقعہ سے متعلق تاریخ و سیر کی کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری میں بھی بہت کافی تفصیلات ملتی ہیں اور اس کے بہت سے اہم اجزاء پر روشنی پڑتی ہے۔

مختصر طور پر واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کی نقل و حرکت کا علم ہوا تو حسب دستور آپ نے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مشورہ فرمایا، حضرت سلمان فارسی نے عرض کیا ہم اہل فارس کا دستور یہ ہے کہ ایسے موقع پر خندق کھود کر دشمن سے خود کو محفوظ کر لیتے اور اُس کو مجبور بنا دیتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورہ کو قبول فرما کر خندق کھودنے کا حکم دیا اور کدال لے کر خود بھی بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی کائناتِ انسانی کی تاریخ میں آقا اور غلام، حاکم اور محکوم، افسر و ماتحت، مخدوم و خادم کے درمیان یہ پہلا منظر تھا جو آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا کہ دو جہان کا سردار ہاتھ میں کدال لیے، تین دن کے فاقہ سے پیٹ پر پتھر باندھے مہاجرین و انصار کے ساتھ خندق کھودنے میں برابر کا شریک نظر آتا ہے بلکہ ایک سخت پتھر کے حائل ہو جانے پر جب سب صحابہ نے زور لگا لیا اور اُس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور خدمتِ اقدس میں اس واقعہ کو پیش کیا تو آپ نے "بسم اللہ" کہہ کر کدال کی ایک ضرب سے اُس کو پارہ پارہ کر دیا[1]۔

آپ کے ساتھ صحابہ بھی تین شبانہ روز بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے دینِ حق کی

---

[1] بخاری باب غزوۂ احزاب۔

حمایت اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر مصروفِ کار تھے۔ ایک جانب اگر لبثنا ثلثۃ ایام لانذوق طعاما کا مظاہرہ تھا تو دوسری جانب زبانِ وحی ترجمان پر یہ دعائیہ کلمہ جاری تھا "اللھم ان العیش عیش الآخرۃ فاغفر الانصار والمھاجرہ۔ خدایا عیش تو آخرت کا عیش ہے پس تو انصار و مہاجرین کو مغفرت سے نواز" اور جب جاں نثاران توحید شمع نبوت سے یہ سنتے تو پروانوں کی طرح والہانہ جوش کے ساتھ یہ کہہ کر قربان ہونے لگتے "نحن الذین بایعوا محمدا۔ علی الجھاد مابقینا ابدا۔ ہم وہ ہیں جنہوں نے زندگی بھر کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر لی ہے" اور جب شمعِ نبوت کے پروانوں سے آپ یہ والہانہ رجز سنتے ہیں تو مسرت و شادمانی کے ساتھ پھر ارشاد فرماتے ہیں۔

اللھم لاخیر الاخیر الآخرہ　　　فبارک فی الانصار والمھاجرہ

" خدایا! خیر و نیکی تو آخرت ہی کی ہے پس تو انصار و مہاجرین کے درمیان اپنی برکت کا نزول فرما"

اور براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ خندق میں خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی کہ خندق سے مٹی اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر منتقل کر رہے تھے اور جسد مبارک گرد آلود ہو رہا تھا اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا　　　ولا تصدقنا ولا صلینا

قسم بخدا اگر خدا کی ہدایت رہنمائی نہ کرتی تو نہ ہم کو ہدایت نصیب ہوتی اور نہ صدقہ و نماز

فانزلن سکینۃ علینا　　　وثبت الاقدام ان لاقینا

پس اے خدا! تو ہم پر طمانیت نازل فرما اور میدانِ جنگ میں ہم کو ثابت قدم رکھ۔

ان الاولی قد بغوا علینا　　　اذا ارادو فتنۃ ابینا

اور جن لوگوں نے ہم پر سرکشی کرتے ہوئے چڑھائی کی ہے جب اُنہوں نے فتنہ کا ارادہ کیا تو ہم نے انکار کر دیا (یعنی اُن کو ناکام کر دیا) اور انتہائی جوش کے ساتھ "ابینا" کو بلند آواز سے کہتے جاتے تھے

---

[1] بخاری باب غزوۃ الاحزاب

خندق کی کھدائی کا کام چند روز جاری رہا اور اس طرح دشمن سے حفاظت کا پوری طرح سامان ہو گیا لیکن جب محاصرہ کو بیس روز ہو گئے تو یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی اور مسلسل محاصرہ سے کچھ اکتا گئے اور مضطرب ہونے لگے اس وقت خدا کی نصرت نے نزول کیا اور مسلمانوں کی کامرانی کے اسباب مہیا ہو گئے۔ ہوا یہ کہ کفار کے لشکر میں ایک شخص نعیم بن مسعود نخعی تھا یہ گو ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن اس کے قلب میں صداقت اسلام گھر کر چکی تھی اس لیے اس نے اپنی ہوشیاری سے مشرکین مکہ اور یہود مدینہ کے درمیان بے اعتمادی پیدا کر دی اور جنگ کے معاملہ میں دونوں فریق میں ایسا اختلاف پیدا ہو گیا کہ ایک نے دوسرے کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے انکار کر دیا، اور ابھی مشرکین مکہ واپس بھی نہیں ہوئے تھے کہ قدرت کی جانب سے ہوائے تند کا ایسا طوفان اٹھا کہ جس نے آن کی آن میں دشمن کے تمام لشکر کو زیر و زبر کر ڈالا، خیمے اکھڑ اکھڑ کر گرنے لگے چوپائے بھڑک بھڑک کر بھاگنے لگے اور سارے لشکر میں ابتری پھیل گئی اور دشمن نے محاصرہ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے فتنہ سے نجات دی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی موقعہ پر ارشاد فرمایا "نصرت بالصبا واهلكت العاد بالدبور" اللہ تعالیٰ کی جانب سے مجھ کو پُروا ہوا کے ذریعہ فتح عطا کی گئی اور عاد پچھوا ہوا سے ہلاک کیے گئے تھے"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دشمن کی خبریں معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی تو تین مرتبہ آپ نے دریافت کیا کہ اس خدمت کو کون انجام دیگا اور تینوں مرتبہ حضرت زبیر بن عوام نے پیش قدمی کر کے عرض کیا: اس خدمت کے لیے میں حاضر ہوں تب آپ نے ارشاد فرمایا "ان لكل نبي حواريا وان حواري الزبير" ہر ایک نبی کے حواری ہوتے ہیں اور میرے حواری زبیر ہیں

اور اس موقعہ پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی" اللھم منزل

الکتاب، سریع الحساب، اھزم الاحزاب، اللھم اھزمھم و زلزلھم۔ اے کتاب (قرآن) کے نازل کرنے والے خدا! اے جلد حساب لینے والے، تو مشرکین کی جماعتوں کو شکست دیدے، الہی ان کو فرار کرا اور اُن کو ڈگمگا دے"۔

لا الہ الا اللہ وحدہ، اعز جندہ، ونصر عبدہ، و غلب الاحزاب وحدہ فلا شیٔ بعدہ۔ کوئی خدا نہیں اللہ کی ذات کے ماسوا جو یکتا و بے ہمتا ہے، اُس نے اپنے لشکر (مسلمانوں) کو عزت بخشی اور اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی، اور یکتا ذات احزاب (سب جماعتوں) پر غالب ہے، اور اُس کے ماسوا سب فانی ہے

یہی وہ غزوہ ہے جس میں مشغولیتِ جہاد کی وجہ سے حضور اقدس اور صحابہ کی نماز عصر قضا ہوگئی اور آپ نے مغرب کے وقت دونوں نمازوں کو ادا کیا[1]۔

قرآن عزیز اور غزوۂ احزاب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں یہ آیت غزوۂ خندق ہی کے متعلق نازل ہوئی۔

اِذْ جَاءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ	اور جب چڑھ آئے (مشرکین) تم پر اوپر کی جانب سے
اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ	اور نیچے کی جانب سے اور جب پھر گئیں (دہشت
وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ[2]	کی وجہ سے) آنکھیں اور پہنچ گئے دل گلوں تک
(احزاب)	(یعنی کلیجے مُنہ کو آگئے)

قرآنِ حکیم میں اسی غزوہ کی نسبت سے ایک سورہ کا نام ہی احزاب ہوگیا۔ اس سورۃ کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ	اے ایمان والو! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو تم پر اس
اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ	وقت کی گئی جب تم پر (مشرکین کے) لشکر چڑھے تھے
فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا	پس ہم نے اُن پر ہوا کو اور ایسے لشکروں کو بھیج دیا

---

[1] بخاری باب الجہاد [2] بخاری باب غزوۂ احزاب۔

لَمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	جن کو تم نہیں دیکھ رہے تھے اور جو کام بھی تم کرتے
بَصِيْرًا ۝ (الی) وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى	ہو اللہ تعالیٰ اُن کاموں کا دیکھنے والا ہے۔" وَكَانَ
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝	اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا" تک۔

واقعۂ حُدیبیہ

حدیبیہ مکہ مکرمہ سے جدہ کی جانب ایک منزل پر واقع ہے اور آج کل شمیسیہ کے نام سے مشہور ہے۔ حدیبیہ دراصل کنویں کا نام ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے ساتھ "فتح مبین" اور "بیعت رضوان" کی مقدس تاریخ وابستہ ہے۔

سنہ ۶ ہجری مطابق فروری سنہ ۶۲۸ء ماہ ذیقعدہ روز دوشنبہ وہ وقتِ سعید تھا کہ سرورِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) چودہ سو صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے جلو میں ادائِ عمرہ کے ارادہ سے مکۂ معظمہ روانہ ہوئے[1]۔ اور جب ذوالحلیفہ پہنچے تو قربانی کے جانوروں کے قلادے ڈالا اور احرام باندھا اور بنی خزاعہ کے ایک شخص کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ قریش کے حالات کا اندازہ لگا کر خبر دے، حضورِ اقدس جب غدیرِ اشطاط[2] پہنچے تو جاسوس نے آکر خبر دی کہ قریش کو آپ کی آمد کی اطلاع ہو چکی ہے اور وہ قبائل کو جمع کر کے مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اُن کا ارادہ ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا تو صدیق اکبر نے عرض کیا "خدا کے رسول! ہم تو بیت اللہ کے قصد سے نکلے ہیں جنگ یا قتل و قتال ہمارا مقصد نہیں ہے لہٰذا ہم بیت اللہ کی زیارت کو اپنا مقصد سمجھتے ہوئے ضرور آگے بڑھتے رہیں گے اور جو جماعت خواہ مخواہ سدِّ راہ ہو گی اُس سے مجبوراً لڑنا پڑیگا"

مشورہ کے بعد ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "امضوا علی

---

[1] فتح الباری جلد ۷ ص ۳۵۴ [2] مکہ کے قریب ایک مقام ہے۔

بسم اللہ۔ اب خدا کا نام لے کر بڑھے چلو۔[1]

زائرینِ بیت اللہ خدا کے عشق میں چور اور بیت اللہ کی زیارت میں مسرور مکہ کی جانب قدم بڑھائے چل رہے تھے کہ خدا کے رسول نے فرمایا، خالد بن ولید فوج کا دستہ لیے غمیم میں گھات لگائے تمہارا منتظر ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس جانب سے کاوا کاٹ کر داہنی جانب چلیں اور اچانک بے خبری میں اُس کے مقابل پہنچ جائیں، جب مسلمان اچانک خالد بن ولید کے دستۂ فوج کے سامنے آگئے تو اپنی گھات کو ناکام دیکھ کر خالد گھبرا گئے دستۂ فوج کو لے تیزی کے ساتھ مشرکین مکہ کے پاس جا پہنچے اور اُن کو مسلمانوں کی آمد سے مطلع کیا۔

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اُس ٹیلہ پر پہنچے کہ اُس کے بعد وادی میں اُتر کر مکہ پہنچ جانا تھا تو اچانک آپ کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی صحابہ نے یہ دیکھ کر اس کو چوکے دیے، بھڑکایا اور کوشش کی کہ کسی طرح وہ اُٹھ کھڑی ہو مگر وہ نہ اُٹھی۔ لوگ جب بار بار "حَلْ حَلْ"[2] کہہ کر تھک گئے تو کہنے لگے "خلأت القصواء، خلأت القصواء، قصواء نافرمان ہو گئی" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنا تو فرمایا: "ماخلأت القصواء، وما ذاک لھا بخلق، ولکن حبسھا حابس الفیل قصواء ہرگز نافرمان نہیں ہوئی اور نہ یہ اس کی عادت ہے بلکہ اس کو اُس خدا نے روک دیا، جس نے ہاتھی والوں کو روک دیا تھا" یعنی قریش مکہ کی بیہودگی اور جنگی ذہنیت کی وجہ سے چونکہ جنگ کی صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس لیے خدا کی مرضی یہ ہے کہ ہم اُس وقت تک آگے نہ بڑھیں جب تک کعبہ کی حرمت کا عہد نہ کر لیں۔

چنانچہ اس ارشاد کے بعد ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والذی نفسی بیدہٖ لا یسئلونی خطۃ یعظمون فیھا حرمات اللہ الا اعطیتھم ایاھا۔ "اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ مجھ سے جو بھی ایسی بات چاہیں گے کہ اُس میں حُرمات اللہ کی عظمت اُن کے پیشِ نظر ہو تو میں ضرور اس کو پورا کروں گا"۔

---

[1] بخاری باب غزوۃ الحدیبیہ [2] اونٹنی کو اُٹھانے کے لیے بولتے ہیں۔

حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) جب یہ اعلان فرما چکے تو اب جو قصوا کو کھڑا ہونے کے لیے ڈپٹا وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور چل پڑی اور حدیبیہ کے میدان میں جا پہنچی[1]

جب زائرین بیت اللہ کا مقدس قافلہ حدیبیہ میں فروکش ہو گیا تو صلاح یہ قرار پائی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا جائے تاکہ وہ مشرکین مکہ پر یہ واضح کریں کہ ہمارا ارادہ بجز زیارتِ بیت اللہ کے اور کچھ نہیں، لہذا تم کو روکنا مناسب نہیں ہے

حضرت عثمان جب مکہ میں داخل ہوئے اور ابو سفیان وغیرہ سے مل کر گفتگو کی تو انہوں نے ایک نہ سُنی اور کہنے لگے کہ تم اگر چاہتے ہو کہ تنہا طوافِ بیت اللہ کرو تو کر لو ورنہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن کے دوسرے رفقاء کو ہرگز مکہ میں داخل نہیں ہونے دینگے

حضرت عثمان نے فرمایا "یہ تو میں ہرگز نہیں کر سکتا کہ خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بغیر طواف اور عمرہ کو ادا کر لوں" قریش نے جب حضرت عثمان کا یہ اصرار دیکھا تو اُن کو واپس جانے سے روک لیا۔

بیعت رضوان | یہ خبر مسلمانوں تک اس طرح پہنچی کہ عثمان قتل کر دیے گئے مسلمانوں کے لیے یہ خبر ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس سے ہر شخص مضطرب اور بے قابو ہوا جا رہا تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مسلمانوں سے اس بات پر بیعت لی کہ مر جائینگے مگر ہم میں سے کوئی ایک بھی راہِ فرار اختیار نہیں کریگا، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب سب مسلمانوں سے بیعت لے چکے تو اُن میں حیرت زا والہانہ جوش و خروش پیدا ہو گیا جس کی خبر شدہ شدہ مکہ بھی پہنچ گئی، مشرکین مکہ بہت گھبرائے اور خوف زدہ ہو کر مسلمانوں تک یہ خبر پہنچائی کہ قتل عثمانؓ کی خبر غلط ہے اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) صحیح و سلامت حدیبیہ واپس تشریف لے آئے[2]

چونکہ جہاد کی یہ بیعت بہت ہی نازک اور اہم موقعہ پر لی گئی اور مسلمانوں نے پورے

---

[1] بخاری کتاب الشروط [2] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۷-۱۶۸

ولولہ اور جذبۂ ایثار کے ساتھ اس بیعت کو کیا اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اس فداکاری کی قدر و منزلت فرمائی اور سورۂ فتح میں اپنی رضا اور خوشنودی کا پروانہ مرحمت فرما کر ان کے اس کارنامہ کو زندۂ جاوید بنا دیا اور اسی حقیقت کے پیشِ نظر اسلامی تاریخ میں اس کا نام "بیعتِ رضوان" قرار پایا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ	بلاشبہ اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جبکہ وہ تیرے
يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ	ہاتھ پر اس درخت کے نیچے بیعت کرنے لگے اور
مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ	جان لیا اللہ نے جو اُن کے جی میں تھا پس اُتارا
عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝	اُن پر اطمینان وسکون اور انعام میں دیا اُن کو ایک
(الفتح)	"فتح قریب"[1]

مسلمانوں کے فداکارانہ جوش اور والہانہ جذبہ نے مشرکین مکہ پر ایسا اثر کیا کہ اب وہ خود صلح پر آمادہ ہو گئے اور پیش قدمی کر کے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شرائط صلح طے کرے تاکہ یہ قضیہ ختم ہو جائے مگر یہ شرط بہرصورت رہے گی کہ مسلمان اس سال نہیں بلکہ آئندہ سال عمرہ کر پائیں گے[2]

معاہدۂ صلح سہیل بن عمرو جب مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کے نقطۂ خیال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور طویل گفت و شنید کے بعد حسب ذیل دفعات پر دونوں جانب سے معاہدہ کی تصدیق و توثیق عمل میں آگئی۔

(۱) اس سال مسلمان مکہ میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس چلے جائیں۔

(۲) آئندہ سال مسلمان مکہ میں بغرض عمرہ اس طرح داخل ہوں گے کہ معمولی حفاظتی ہتھیاروں کے علاوہ کوئی جنگی ہتھیار ساتھ نہیں ہوگا اور تلواریں نیام کے اندر ہی رہیں گی اور صرف تین

---

[1] حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں "واثابھم فتحا قریبا" میں فتح قریب سے مراد "فتح خیبر" ہے جو حدیبیہ کے بعد پیش آیا اور مسلمانوں کو جس میں بہت مال غنیمت ہاتھ آیا اور یہی صحیح قول ہے۔ جلد ۷ ص ۳۵۵۔

[2] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۷-۱۶۸۔

دن قیام کرینگے اور جب تک وہ رہینگے ہم مکہ چھوڑ کر پہاڑیوں پر چلے جائینگے۔

(۳) معاہدہ کی مدت کے اندر دونوں جانب امن و عافیت کے ساتھ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہیگا

(۴) اگر کوئی شخص مکہ سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مسلمان ہو کر بھی مدینہ چلا جائیگا تو اُس کو مکہ واپس کرنا ہوگا اور اگر مدینہ سے کوئی شخص مکہ بھاگ آئیگا تو ہم اُس کو واپس نہیں دینگے[۱]

(۵) تمام قبائل آزاد ہیں کہ ہر دو فریق میں سے جو جس کا حلیف بننا پسند کرے اُس کا حلیف بنجائے

(۶) یہ معاہدہ دس سال تک قائم رہیگا اور کوئی فریق اس مدت کے اندر اس کی خلاف ورزی نہیں کریگا۔

معاہدہ کی تحریر کے وقت نام مبارک کے ساتھ "رسول اللہ" لکھنے پر سہیل نے اعتراض کیا تھا، آپ نے فرمایا کہ ہر چند یہ واقعہ اور حقیقت جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم کو چونکہ صلح مقصود ہے اس لیے تم اگر یہ پسند نہیں کرتے تو مجھ کو اصرار نہیں اور یہ فرما کر آپ نے کاتب معاہدہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو حکم دیا کہ وہ اس جملہ کو محو کر دیں، حضرت علی (رضی اللہ) سے یہ کب ممکن تھا کہ وہ اس جملہ کو اپنے ہاتھ سے مٹائیں جسکی نسبت نے ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر کے ظلمت کو نور سے، شرک کو ایمان سے اور جہل کو علم سے بدل ڈالا۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب یہ محسوس کیا تو مقام تحریر کو معلوم کر کے دست مبارک سے اُس جملہ کو محو کر دیا۔[۲]

معاہدہ جب مکمل ہو گیا تو مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ اس میں ہمارا پہلو کمزور رہا اور صورت حال یہ ہو گئی کہ گویا ہم نے دب کر صلح کی ہے حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط

---

[۱] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۸-۱۶۹۔ [۲] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۸۰۔

نہ ہو سکا اور اعلاءِ کلمۃ اللہ اور اسلام کی سربلندی کے جذبہ نے مجبور کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کریں "یا رسول اللہ! کیا یہ حدیبیہ کا واقعہ "فتح" ہے" حضور اقدس نے ارشاد فرمایا "ہاں، قسم بخدا بلاشبہ یہ "فتح" ہے"۔

یہ واقعہ جو اپنی دفعاتِ معاہدہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بظاہر شکست اور ذلت کا باعث نظر آتا تھا "فتح مبین" کیسے تھا؟ تو اس کا جواب جلیل القدر محدثین کی زبانی سُنیے۔ امامِ حدیث و سیرت زہری (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں۔

اسلام میں جو عظیم الشان فتوحات شمار کی گئی ہیں اُن میں سب سے پہلی "فتح عظیم" صلح حدیبیہ ہے۔ اس لیے کہ اس سے قبل برابر کفار و مشرکین سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری تھا اور جب یہ "صلح" عمل میں آ گئی تو اس کی وجہ سے ہر دو فریق کو امن و اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع میسر آیا اور تبادلۂ خیالات کی آزادی نصیب ہوئی نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص بھی اسلام کو اپنی عقلِ صحیح سے جانچتا اور اس کی حقیقت پر غور کرتا اس کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ باقی نہ رہتا تھا کہ وہ فوراً اسلام قبول کر لے، چنانچہ ان دو سال میں (جب تک معاہدہ پر عمل رہا اور مشرکین نے اپنی جانب سے اس کی خلاف ورزی نہیں کی) لوگ اس قدر مسلمان ہوئے کہ اس سے قبل کی پوری مدت میں اسی قدر یا اس سے بھی کم مسلمان ہوئے تھے[1]۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

اس مقام پر "فتح مبین" سے مراد واقعہ حدیبیہ ہے، صلح حدیبیہ نے درحقیقت "فتح مبین" (فتح مکہ) کے لیے راہ کھول دی یہ اس لیے کہ جب جنگ کا خطرہ درمیان سے جاتا رہا اور امن و اطمینان کی صورت پیدا ہو گئی تو مکہ اور مدینہ کے درمیان سلسلۂ آمد و رفت بے خوف و خطر ہونے لگا اور حضرت خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) اور (حضرت) عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) جیسے شجیع اور مدبر حضرات

---

[1] فتح الباری جلد، ص ۳۵۵ [2] ایضاً

کا اسلام اسی صلح کا کارنامہ ہے اور یہی اسباب ترقی آہستہ آہستہ "فتح مکہ" کا باعث بنے[1]

اور ابن ہشام، امام زہری کی توجیہ کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

زہری کے قول کی تائید اس حقیقت حال سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ واقعہ حدیبیہ میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے ہیں تو چودہ سو مسلمان جلو میں تھے اور دو سال بعد جب فتح مکہ کے لیے نکلے ہیں تو دس ہزار کی تعداد تھی[2]

الفتح الاعظم

رمضان المبارک ۸ ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء میں "فتح مکہ" کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا

اس واقعہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ حدیبیہ کے معاہدہ میں یہ طے پا گیا تھا کہ قبائل عرب اس کے لیے آزاد ہونگے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قریش میں سے جس کے بھی حلیف بننا چاہیں بن جائیں، جب معاہدہ پر دونوں جانب سے دستخط ہو گئے تو فوراً عرب کے قبیلہ خزاعہ نے اعلان کیا کہ ہم مسلمانوں کے حلیف ہونا پسند کرتے ہیں اور قبیلہ بنو بکر نے کہا کہ ہم قریش کے حلیف بننا چاہتے ہیں اور دونوں قبائل اس طرح الگ الگ دو جماعتوں کے حلیف ہو گئے۔

تقریباً ڈیڑھ سال تو معاہدہ پر ہر دو جانب سے پوری طرح عمل ہوتا رہا لیکن ڈیڑھ سال کے بعد ایک نیا واقعہ پیش آیا وہ یہ کہ بنی خزاعہ اور بنی بکر کے درمیان عرصہ سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہ چکا تھا جو اس درمیانی مدت میں اگرچہ بند رہا مگر اچانک کسی بات پر پھر جنگ چھڑ گئی اور بنو بکر ایک شب کو مقام ذنیرہ[3] میں بنو خزاعہ پر جا چڑھے۔ قریش کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہنے لگے شب کا وقت ہے اور مسلمان یہاں سے بہت دور ہیں آج موقعہ ہے کہ بنی خزاعہ کو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حلیف ہونے کا مزہ

---

[1] فتح الباری جلد ۷، ص ۳۵۵ [2] ایضاً [3] مکہ کے قریب ایک مقام ہے۔

چکھا دیا جائے چنانچہ انہوں نے بھی بنی بکر کا ساتھ دیتے ہوئے بنی خزاعہ کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ عمرو بن سالم نے جب یہ حال دیکھا تو ایک وفد لے کر دربار قدسی میں استغاثہ کیا اور بنی خزاعہ کی دردناک حالت کو پیش کرتے ہوئے طالب امداد ہوا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: واللہ لا منعکم مما امنع نفسی منہ۔ قسم بخدا میں جس چیز کو اپنی ذات سے روکونگا تم کو بھی اُس سے ضرور محفوظ رکھونگا۔[1]

ادھر قریش کو جب یہ علم ہوا تو وہ ڈرے اپنی حرکت بیجا پر نادم ہوئے، اور انہوں نے ابوسفیان کو مامور کیا کہ وہ مدینہ جائے اور مسلمانوں کے اشتعال کو دور کرنے کی یہ تدبیر کرے کہ قریش چاہتے ہیں کہ سابق معاہدہ کی مدت میں مزید اضافہ اور از سر نو معاہدہ کی توثیق ہو جائے ابوسفیان مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ (رضی اللہ عنہا) کے گھر میں داخل ہوا جو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رفیقۂ حیات تھیں۔ ابوسفیان نے جونہی ارادہ کیا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ جائے ام حبیبہ نے فوراً اُس کو سمیٹ دیا اور کہنے لگیں: "باپ: یہ خدا کے نبی کا بچھونا ہے" ابوسفیان نے کہا: "پھر کیا ہوا میں تیرا باپ ہوں" ام حبیبہ نے کہا: "یہ صحیح مگر تو مشرک ہے اور یہ پیغمبر خدا کا پاک بستر" ابوسفیان اگرچہ اُس وقت بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا مگر اس حیرت زا واقعہ نے اُس کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سمجھا کہ حقیقتِ حال کیا ہے؟[2]

غرض وہ دربارِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض معروض کرنے لگا، آپ نے دریافت فرمایا: "یہ تجدید و توثیق کی کیا حاجت ہے کیا کوئی نیا واقعہ پیش آگیا ہے؟ ابوسفیان نے عرض کیا "نہیں کوئی نئی بات نہیں ہے"۔ تب آپ نے ارشاد فرمایا: "تو مطمئن رہو کہ ہم اپنے عہد پر قائم ہیں" ابوسفیان اس جواب کو سُن کر مطمئن نہ ہوا اس لیے کہ وہ حقیقتِ حال کو چھپا کر جھوٹ بول چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اس طرح نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دھوکا دے کر اپنا

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۲۷۸۔ [2] ایضاً

مقصد پورا کرلے لیکن اس صاف اور سچے جواب نے اُس پر اوس ڈال دی اور اُس کا مقصد پورا نہ ہوسکا۔ تب اُس نے صدیق اکبر، فاروق اعظم، علی حیدر (رضی اللہ عنہم) کی خدمت میں حاضر ہوکر جدا جدا گفتگو کی اور چاہا کہ معاملہ قریش کے حسب مُراد طے ہوجائے لیکن اُس کی مُراد بر نہ آسکی اور بے نیل ومرام مکہ واپس ہوگیا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) کو صورتِ حال سے آگاہ فرمایا، حضرت صدیق نے عرض کیا: "یارسول اللہ! ہمارے اور قریش کے درمیان تو معاہدہ ہے" آپ نے ارشاد فرمایا: "تھا مگر قریش نے خود نقضِ عہد کردیا ہے"

اب جہاد کی تیاری شروع ہوئی مگر عام طور پر کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ کس جانب ارادہ ہے، آپ نے اطرافِ مدینہ میں نفیرِ عام کرادیا کہ جو شخص بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے وہ رمضان تک مدینہ پہنچ جائے۔ آپ پوری کوشش فرمارہے تھے کہ کسی طرح ہماری طیاری کا حال قریش کو معلوم نہ ہوجائے کیونکہ آپ کی دلی خواہش یہ تھی کہ مکہ میں جنگ بپا نہ ہونے پائے اور قریش مرعوب ہوکر منقاد ومطیع ہوجائیں کہ اسی اثنا میں ایک حادثہ پیش آگیا۔

حاطب بن بلتعہ کا واقعہ

حاطب بن بلتعہؓ ایک بدری صحابی تھے اُن کے اہل وعیال مکہ ہی میں تھے کہ یہ صورت حال پیش آگئی اُنھوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس واقعہ کا حال بہرحال مشرکین کو معلوم ہو ہی جائیگا سو اگر میں بھی قریش مکہ کو اس کی اطلاع کردوں تو ہمارا (مسلمانوں کا) کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا اور میں اُن کی ہمدردی حاصل کرکے اپنے اہل و عیال کو اُنکی مضرت سے بھی محفوظ رکھ سکونگا مشرکین مکہ کے نام ایک مکتوب لکھدیا، نبی اکرمؐ کو بذریعہ وحی الٰہی یہ معلوم ہوگیا اور آپ نے حضرت علی، مقداد، زبیر (رضی اللہ عنہم) کو مامور فرمایا کہ روضۂ خاخ جاؤ وہاں ناقہ سوار عورت ملیگی، وہ جاسوس ہے اُس کے پاس ایک خط ہے وہ اُس سے چھین لو۔ یہ حضرات روضۂ خاخ پہنچے تو عورت کو موجود پایا، اُنھوں نے خط کا مطالبہ کیا، عورت نے

انکار کیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے مگر جب انہوں نے جامہ تلاشی کی دھمکی دی تو مجبور ہو کر اس نے سر کے بالوں میں سے ایک پرچہ نکال کر دیا، یہ پرچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو وہ حضرت حاطب کا خط تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی جانب مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا "حاطب یہ کیا؟ حاطب نے عرض کیا: یا رسول اللہ! عجلت نہ فرمائیں، یہ خط میں نے اس لیے لکھا کہ میں جانتا ہوں کہ مدینہ میں مقیم سب مہاجرین کا مکہ کے قریشیوں کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا رشتہ اور تعلق ہے ایک میں ہی ایسا ہوں جس کا اُن کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تو میں نے یہ صرف اس یقین پر کیا کہ مسلمانوں کو تو اس بات سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور میں اس طرح قریش کی ہمدردی حاصل کر کے اپنے اہل و عیال کو محفوظ کر سکوں گا، یا رسول اللہ! بخدا میں نے ہرگز ہرگز یہ کام ارتداد اور کفر پر رضا کی نیت سے نہیں کیا میں اب بھی اسلام کا شیدائی اور فدائی ہوں۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ سب سُن کر ارشاد فرمایا "حاطب نے تمہارے سامنے سچ سچ بات کہہ دی" حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن اُڑا دوں" نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "حاطب بدر کے مجاہد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے شرکاءِ بدر کے لیے یہ ارشاد فرمایا ہے: "اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم" حاطب کے واقعہ پر ہی قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی " یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ (الی) فقد ضل سواء السبیل[1]"

بہرحال رمضان کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) دس ہزار جان نثاروں کے ساتھ مکہ کی جانب روانہ ہوئے، آپ جب قُدید اور عسفان کے درمیان کدید تک پہنچے تو دیکھا کہ مسلمانوں پر روزہ کی سختی حد سے متجاوز

---

[1] بخاری۔ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

ہوتی جارہی ہو تب آپ نے پانی طلب فرمایا اور مجمع کے سامنے نوش فرمایا تا کہ صحابہ دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ مسافرت اور پھر جہاد کے موقعہ پر افطار کی اجازت ہو اور قرآن کی دی ہوئی رخصت کا یہی مطلب ہو۔

اسی سفر میں ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ مسلمان ہوکر حاضر خدمت ہوئے، آپ نے حکم دیا کہ اہل و عیال کو مدینہ بھیج دو اور تم ہمارے ساتھ رہو۔

اسلامی لشکر جب مکہ کے قریب پہنچا تو ابو سفیان چھپ کر لشکر کا صحیح اندازہ کر رہے تھے کہ اچانک مسلمانوں نے گرفتار کرکے خدمت اقدس میں پیش کیا، آپ نے ابو سفیان پر نگاہِ کرم ڈالتے ہوئے معاف کر دیا اور قید سے آزاد کر دیا، ابو سفیان نے رحمۃ للعٰلمین کا یہ خلق دیکھا تو فوراً مشرف باسلام ہوگئے اسی طرح عبد اللہ بن ابی اُمیہ بھی اسلام کا والہ و شیدا بن کر حاضر خدمت ہوئے، آپ نے ان حضرات کے قبول اسلام پر بہت مسرت کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا "لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین" نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرتِ عباس سے فرمایا کہ ابو سفیان کو ابھی مکہ واپس نہ جانے دو اور سامنے کی پہاڑی پر لیجاؤ تا کہ وہ مسلمانوں کی شوکت و طاقت کا اندازہ کر سکے۔

ابو سفیان اور حضرت عباس (رضی اللہ عنہما) پہاڑی پر کھڑے ہوئے اسلامی لشکر کا نظارہ کر رہے تھے اور مہاجرین و انصار قبائل کے جُدا جُدا لشکر اپنے پرچم لہراتے ہوئے سامنے سے گذر رہے تھے اور ابو سفیان اُن کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے کہ انصاری قبیلہ کا ایک لشکر پاس سے گذرا اس لشکر کا پرچم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا، اُنھوں نے ابو سفیان کو دیکھا تو جوش میں آکر کہنے لگے "الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الکعبۃ" آج کا دن جنگ کا دن ہو، آج کعبہ میں بھی جنگ حلال ہو" ابو سفیان

سلہ بخاری باب المغزوات

کی نسلی عصبیت پھڑک گئی اور کہنے لگا "یا عباس حبذا یوم الذمار۔ اے عباس جنگ کا دن مبارک ہو"

جب سب لشکر اسی طرح گذر گئے تو آخر میں ایک چھوٹی سی جماعت کے جلو میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سامنے سے گذرے حضرت زبیر (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ میں پرچم تھا اور وہ آگے آگے چل رہے تھے ابو سفیان کی نگاہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو اُس نے خدمتِ اقدس میں سعد اور اپنے درمیان مکالمہ کا حال سُنایا، یہ سُن کر ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "سعد نے جھوٹ بولا، ھٰذا یوم یعظم اللہ فیہ الکعبۃ ویوم تکسی فیہ الکعبۃ۔ آج کا دن وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں کعبہ کی عظمت کو بالا کریگا اور آج کعبہ پر غلاف چڑھایا جائیگا" اور یہ فرما کر حضرت سعد کو برطرف کرکے پرچم اور لشکر کی سیادت حضرت سعد کے بیٹے کو عطا کر دیئے۔

اب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت خالد بن ولید کو حکم فرمایا کہ تم مکہ کے زیریں حصہ کی جانب سے داخل ہونا اور کسی کو قتل نہ کرنا ہاں اگر کوئی خود اقدام کرے تو دفاع کی اجازت ہے اور بنفسِ نفیس مکہ کے بلند حصّہ سے داخل ہوئے، حضرت خالد سے بعض قبائل کے افراد نے مزاحمت کی اور اس لیے اُن کے ہاتھوں چند مقتول ہو گئے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کسی مزاحمت کے مکہ میں داخل ہوئے[۱]۔

جب مرالظہران میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کو قبولِ اسلام کے لیے خدمت اقدس میں پیش کیا تھا تو یہ بھی عرض کیا تھا: یا رسول اللہ ابوسفیان میں فخر کا مادہ ہے اس لیے اگر اس کو کوئی امتیازی حیثیت نصیب ہو جائے تو بہتر ہو۔ آپ نے ارشاد فرمایا: "من دخل دار ابی سفیان فھو امن" جو شخص ابوسفیان کے مکان میں داخل ہو جائیگا اُس کو امن ہے"

غرض جب آپ باعزت و اجلال مکہ میں داخل ہوئے تو اُس وقت یہ اعلان کرا دیا (۱) جو

[۱] بخاری جلد ۲

مکان بند کر کے بیٹھ جائے اُس کو امن ہے (۲) جو ابوسفیان کے مکان میں پناہ لے اُس کو امن ہے (۳) جو مسجد حرام میں پناہ لے اُس کو امن ہے۔

البتہ اس امنِ عام اور عفوِ عظیم سے چند ایسی ہستیوں کو مستثنیٰ فرمادیا جنھوں نے اسلام کے خلاف بہت زہر چکانی کی تھی اور مسلمانوں کی ایذا رسانی میں بہت زیادہ حصہ لیا تھا مگر اُن میں سے اکثر اُس وقت چھپ گئے یا فرار ہو گئے اور آہستہ آہستہ عفوِ عام سے مستفیض ہو کر مشرف باسلام ہو گئے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کا عَلَم سپید رنگ تھا اور آپ کا پرچم عقاب نامی سیاہ رنگ تھا، سر پر مغفر اوڑھے اور اُس پر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے اور سورہ "انا فتحنا" پڑھتے ہوئے آیات کو بلند آواز سے دہراتے جاتے تھے اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ درگاہِ الٰہی میں خشوع و خضوع کے ساتھ ناقہ پر اس درجہ جھکے ہوئے تھے کہ چہرۂ مبارک ناقہ کی پیٹھ کو مس کر رہا تھا۔

بت شکنی جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ نے حکم فرمایا کہ کعبہ سے تمام بت نکال کر پھینک دیے اور جلا دیے جائیں اور دیواروں پر جو تصاویر منقوش ہیں وہ مٹا دی جائیں۔ چنانچہ جب تین سو ساٹھ بتوں کے سرنگوں ہونے کا وقت آیا تو دو مورتیاں حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل کی اس حالت میں سامنے آئیں کہ اُن کے ہاتھوں میں پانسوں کے تیر تھے، آپ نے دیکھ کر فرمایا۔ خدا اُن مشرکوں کو مارے یہ خوب جانتے تھے کہ یہ دونوں مقدس ہستیاں اس ناپاک بات سے مقدس اور پاک تھے

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کعبہ کا طواف کیا اور پھر بتوں کے سامنے کھڑے ہو کر لکڑی سے اُن کو چرکا دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے "جاء الحق وزھق الباطل وما یبدئ الباطل وما یعید۔ حق آپہنچا اور باطل مٹ گیا اور باطل نہ کسی شئے کو پیدا کرے اور اور نہ پھیر کر لائے (یعنی باطل تو خود فنا ہونے کے لیے ہے)

رحمۃ للعالمین کی شان

کعبہ جب بتوں کی نجاست و تلویث سے پاک کر دیا گیا تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کعبہ میں داخل ہوئے اور اُس کے گوشوں میں گھومتے ہوئے بلند آواز سے تکبیرات کہتے رہے اور نماز نفل ادا کی، باہر تشریف لائے تو مصلّی ابراہیم پر جا کر نماز ادا کی، جب آپ اور صحابہ وضو فرما رہے تھے تو مشرکین انگشت بدنداں حیران تھے کہ بایں فتح و کامرانی نہ جشن ہے نہ کبر و نخوت کا اظہار بلکہ درگاہِ الٰہی میں اظہارِ عبودیت کے لیے ہر ایک مجاہد بیتاب نظر آتا ہے بلاشبہ یہ "بادشاہت" نہیں بلکہ دوسرا ہی کوئی عالم ہے۔ آپ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہمارے لیے دو خدمتیں حجابہ اور سقایہ[1] جمع فرما دیجیے اور کعبہ کی کنجی ہمارے حوالہ کر دیجیے[2] لیکن نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت علی کے متعدد بار عرض کرنے کا کوئی جواب نہیں دیا اور بار بار یہی فرمایا "عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟" جب عثمان حاضر ہوئے تو آپ نے کعبہ کی کلید اُن کے حوالہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ھاك مفتاحك یا عثمان الیوم یوم برّ و وفاء۔ عثمان! لو یہ اپنی کنجی آج کا دن بھلائی اور وفاءِ عہد کا دن ہے"[3]

اب لوگ منتظر تھے کہ دیکھیے جن مشرکین نے برسوں تک آپ کو اور مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذا دی، مصائب میں مبتلا کیا آج اُن کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے؟

آپ نے تمام قریشی قیدیوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور جب سب خدمتِ اقدس میں پیش ہوئے تو آپ نے دریافت فرمایا: "اے قریشی گروہ! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کس طرح پیش آؤں" اُنھوں نے جواب دیا "ہم آپ سے خیر کی اُمید رکھتے ہیں"۔ آپ نے یہ سُن کر زبان وحی ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا: اذھبوا فانتم الطلقاء۔ جاؤ تم سب آزاد ہو" یہ سُننا تھا کہ نہ صرف قریش کے بلکہ ہر ایک صاحبِ بصیرت کے سامنے

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۳۰۰ [2] سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانے کی خدمت بنی ہاشم کے سپرد تھی اب وہ کلید برداری کا شرف بھی جمع کرنا چاہتے تھے۔ [3] یہ وہی عثمان بن طلحہ ہیں جنھوں نے کلید کعبہ طلب کرنے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دی تھی لیکن رحمت عالمیاں کی درگاہ میں انتقام بے حقیقت شے تھی اس لیے آپ نے اُن ہی کے خاندان میں یہ سعادت باقی رہنے دی یہی خاندان آج تک کعبہ کا مجاور اور شیبی کے لقب سے مشہور ہے کیونکہ حضرت عثمان بن طلحہ بنو شیبہ ہی سے تھے۔ ا۔ ہ ص ۴۹۳

یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ بادشاہ اور پیغمبر کی زندگی کا امتیازی نشان کیا ہے؟ پیغمبرانہ زندگی نہ ذاتی عداوت وکدورت کو کوئی وقعت دیتی ہے اور نہ اُس کا غیظ وغضب ہوائے نفس کے تابع ہوتا ہے، ایک نبی کو اگر صبر آزما حد تک ایذا وتکلیف دی جائے اور پھر موذی شخص رحم کا طالب ہو تو وہ بلاشبہ "عفو وکرم" ہی پائیگا اور مکارمِ اخلاق کے ہر پہلو کا مظاہرہ دیکھیگا۔ چنانچہ اس درمیان میں جب ایک شخص لرزتا، کانپتا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے شیریں گفتاری کے ساتھ ارشاد فرمایا "هوّن علیك فانی لست بملك انما انا ابن امراءة من قریش کانت تاکل القدید" گھبراؤ نہیں، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں میں تو خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا ہی بیٹا ہوں۔

اسی عفو وکرم کا یہ نتیجہ نکلا کہ زعماءِ قریش جوق درجوق حاضرِ خدمت ہوتے اور دولتِ اسلام سے مشرف ہوکر سعادتِ کبریٰ سے محظوظ ہوتے تھے، چنانچہ حضرت معاویہؓ حضرت عمرؓ کے والد ابو قحافہؓ جیسے حضرات اسی دن مسلمان ہوئے۔

خطبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر ایک اہم خطبہ بھی دیا جو اسلام کے بہت سے احکام کی اساس وبنیاد ہے اس خطبہ کے چند اہم اعلانات یہ ہیں۔

(۱) مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے۔

(۲) معاملات اور قضایا میں مدعی کے ذمہ گواہوں کا پیش کرنا اور گواہوں کی عدم موجودگی میں مدعیٰ علیہ کے ذمہ حلف اُٹھانا ہے۔

(۳) کسی عورت کو تین دن کا سفر بغیر ذی رحم محرم کے درست نہیں ہے۔

(۴) صبح اور عصر کے بعد کوئی نفل نماز نہیں ہے اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ جائز نہیں ہے۔

(۵) اے گروہ قریش! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے نخوتِ جاہلیت اور باپ دادا

کے نام ونسب پر فخر کا خاتمہ کر دیا ہے آگاہ رہو! کہ تمام انسانی دنیا آدم کی اولاد ہے اور آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے۔ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ

فتح مکہ اور قرآن عزیز سورۂ فتح، حدید، نصر ان تینوں سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے متعلق اشارات فرمائے ہیں۔ مثلاً سورہ الفتح میں ہے:۔

وَیَنْصُرَكَ اللّٰہُ نَصْرًا عَزِیْزًا اور خدا تجھ کو مدد دیگا زبردست مدد۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ فتح مکہ کی جانب اشارہ ہے۔

اور سورۂ حدید میں ہے:۔

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی (حدید)	تم میں برابر نہیں ہیں وہ جس نے کہ خرچ کیا فتح مکہ سے پہلے اور جہاد کیا ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے اُن سے جو کہ خرچ کریں فتح مکہ کے بعد اور جہاد کریں اور سب سے وعدہ کیا ہے اللہ نے خوبی کا

اور سورۂ نصر میں ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۝	جب آجائے اللہ کی مدد اور فتح (مکہ) اور تم دیکھو لوگوں کو کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں۔

یہاں باجماع امت "الفتح" سے مراد فتح مکہ ہے۔

حافظ ابن حجرؒ امام شعبیؒ سے نقل فرماتے ہیں۔

"انا فتحنا لك فتحا مبینا" میں "فتح مبین" صلح حدیبیہ کی جانب اشارہ ہے اور "فجعل من دون ذلك فتحا قریبا" میں "فتح قریب" سے بھی صلح حدیبیہ کے ہی

ثمرات و نتائج مراد ہیں اور سورۂ نصر کی آیت "اذا جاء نصر اللہ والفتح" میں "نصر و فتح" سے باتفاق فتح مکہ مراد ہے۔[1]

اور اس نقل کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

ان آیات کے مفہوم و مراد میں صلح حدیبیہ اور فتح مکہ سے متعلق جو مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور موجب اشکال بنتے ہیں شعبی کی اس تقریر سے تمام اقوال میں مطابقت بھی ہو جاتی ہے اور اشکال بھی دور ہو جاتا ہے[2]

سورۂ الفتح، النصر، اور الحدید کی مسطورۂ بالا آیات کا مصداق فتح مکہ ہے یا صلح حدیبیہ؟ اس بارہ میں مختلف اقوال و روایات اور امام شعبی کی توجیہ اور اس پر حافظِ حدیث ابن حجر کی تائید و تصدیق کے مطالعہ کے بعد بھی ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ سورۂ فتح میں "فتح مبین" "نصر عزیز" اور "فتح قریب" کا ذکر اور پھر سورۂ حدید میں انفاق و جہاد فی سبیل اللہ کو "الفتح" کے قبل اور بعد کے ساتھ تقسیم درجات و فضائل کا تذکرہ اور پھر سورۂ نصر کی ایک آیت "نصر اللہ والفتح" میں "نصر و فتح" کا اجتماعی ذکر صاف صاف اس حقیقت کا اعلان ہے کہ ان مقامات میں ایسے واقعہ کا تذکرہ ہے جس کی ابتدا جہاد و قتال سے شروع ہو کر ایک ایسی فتح و نصرت پر نتیجہ خیز ہوئی ہو جس کے بعد سرزمینِ حجاز ہمیشہ کے لیے شرک و بت پرستی کی تلویث سے پاک ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ شرف بلاشبہ فتح مکہ کو ہی حاصل ہے البتہ اس میں بھی شبہ نہیں کہ صلح حدیبیہ کے وقت سورۂ الفتح کا نزول اور "انا فتحنا لك فتحا مبینا" کا اسلوبِ بیان یہ بھی واضح کرتا ہے کہ صلح حدیبیہ چونکہ اپنے اسباب و عواقب اور نتائج و ثمرات کے لحاظ سے فتح مکہ کا پیش خیمہ اور اس کے لیے تمہید ثابت ہوئی اس لیے وہ بھی "فتح مبین" کہلانے کی مستحق ہے یعنی جو واقعہ "فتح قریب" "نصر عزیز" اور "الفتح" "و نصر" کا باعث ہو وہ یقیناً "فتح مبین" کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

---

[1] فتح الباری جلد ۸ ص ۳۵۵ [2] ص ۳۵۵۔

غزوۂ حُنین

"فتح عظیم" کے بعد مشرکینِ عرب کی شوکت وصولت کا قریب قریب خاتمہ ہوگیا اور اب عرب قبائل جوق درجوق اسلام میں داخل ہونے لگے یہ دیکھ کر دو قبائل کی حمیتِ جاہلیت بھڑک اٹھی اور وہ اسلام کی ترقی کو برداشت نہ کرسکے، ہوازن و ثقیف دونوں قبائل کے سرداروں کا اجتماع ہوا اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم (قریش) کو مغلوب کرکے مطمئن ہوگئے ہیں لہذا اب ہماری باری ہے پس کیوں نہ ہم ہی پیش قدمی کرکے مسلمانوں پر حملہ آور ہوجائیں اور اُن کا قلع قمع کرکے رکھ دیں، دونوں نے یہ منصوبہ باندھا اور مالک بن عوف نضری کو اپنا بادشاہ تسلیم کرکے آتشِ حسد کو مسلمانوں کے خون سے بجھانے کی کوشش کی، مالک نے بہت سے قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کی تیاری شروع کردی۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب یہ حال معلوم ہوا تو صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو جمع فرمایا اور بعد مشاورت مدافعت کے لیے آمادہ ہوکر حنین کو روانہ ہوگئے۔ اس وقت لشکر اسلامی میں بارہ ہزار جاں نثار موجود تھے، ان میں سے دس ہزار مہاجرین وانصار اور مدنی جاں نثار تھے اور دو ہزار وہ تھے جو فتح مکہ کے وقت مشرف باسلام ہوئے اور اسی دہ مشرکین (طلقاء) تھے جو اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود رحمۃ للعلمین کے مظاہرے دیکھ کر خود اپنی خواہش سے مسلمانوں کے رفیقِ جنگ بن گئے تھے۔

۱۰ شوال ۸ھ ہجری مطابق فروری ۶۳۰ء کو ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں مجاہدین اسلام کا لشکر حنین جا پہنچا آپ نے دشمن کے مقابلہ میں جب اسلامی فوج کو صف آرا ہونے کا حکم دیا تو مہاجرین کا پرچم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمایا

ف فتح الباری جلد ۸۔

اور انصار میں سے بنی خزرج کا پرچم خباب بن منذر کو بخشا اور اوس کا اُسید بن حضیر کو عنایت فرمایا اور اس طرح مختلف قبائل کے سرداروں کو اُن کی فوج کا پرچم عطا فرمایا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنفس نفیس ہتھیار سجے، دو زرہ ملبوس کیے، خود سر پر رکھے، اپنے مشہور خچر پر سوار اسلامی فوج کی کمان کر رہے تھے۔

ابھی جنگ نے قتل و قتال کی صورت نہیں دیکھی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے لشکر کی اکثریت اور فوج کی فراوانی اس درجہ اثر کر گئی کہ بعض مسلمانوں کی زبان سے ان شاء اللہ کہے بغیر ہی اپنی قوت کے گھمنڈ پر یہ نکل گیا کہ آج ہماری قوت کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

مسلمان خدائے واحد کا پرستار مسلمان، اور خدائے قدوس پر بھروسہ کی بجائے اپنی عددی اکثریت پر گھمنڈ کرے یہ اُس کی بھول ہے اس لیے خدا کو مسلمانوں کا یہ فخر پسند نہیں آیا، اور اس لیے اُن پر یہ تازیانۂ عبرت لگا کہ جب جنگ کا افتتاح ہوا اور مسلمانوں کے لشکر نے پیش قدمی کی تو اچانک دشمن کی اُن ٹولیوں نے جو گوریلا جنگ لڑنے کے لیے پہاڑ کی مختلف گھاٹیوں میں گھات لگائے بیٹھی تھی چہار جانب سے اسلامی لشکر پر بارش کی طرح تیر باری شروع کر دی، اسلامی لشکر اس بے محابا تیر باری کا متوقع نہ تھا اس لیے اُس کی صفوں میں تزلزل پیدا ہو گیا اور تھوڑی سی دیر میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشہور مہاجرین و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ تمام بدوی قبائل اور مدنی لشکر کی اکثریت نے راہِ فرار اختیار کی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں بھی یہ رجز پڑھتے اور شجاعانہ مظاہرہ فرماتے جاتے تھے "انا النبی لا کذب، انا ابن عبد المطلب"

غرض اسی وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ پر حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے بلند آواز سے مفرور مسلمانوں کو للکارا "یا معشر الانصار!" "یا اصحاب بیعۃ الرضوان"

حضرت عباس کی صدائے حق گونجی ہی تھی کہ ایک ایک مسلمان اپنی حالت پر متاسف ہو کر پلٹ پڑا اور منٹوں میں تمام جان نثار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو کر دادِ شجاعت دینے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ شکست مبدل بہ فتح و نصرت ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم نے ہزیمت کو "نصرِ عزیز" سے بدل دیا۔

مشرکین کی جماعت میں ایک مشہور ذی رائے دُرید بن صمّہ نامی تھا، اس نے مالک کے اس طرزِ عمل کی سخت مخالفت کی تھی کہ میدان میں عورتوں، بچوں، اور مال و دولت کے خزانوں کو ساتھ نہ لے جائے مگر مالک نے اس کی رائے پر عمل نہ کیا اور سب کو ساتھ لے کر آیا تھا چنانچہ یہ سب مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور مشرکین کی رہی سہی طاقت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

بہت سے مشرکین اور ان کے قبائل پر اگرچہ اسلام کی صداقت روشن ہو چکی تھی مگر پھر بھی وہ اپنے خیال میں مادی شوکت کو ہی مدارِ صداقت تسلیم کرتے تھے چنانچہ مسلمانوں پر خدائے تعالیٰ کے اس فضل و کرم کو جب اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھ لیا تو اب وہ بھی برضا و رغبت حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

غزوۂ حنین اور قرآن غزوۂ حنین میں مسلمانوں کے اپنی کثرت پر عُجب و غرور اور اس کے انجام میں ابتداءً شکست اور پھر خدا کے فضل سے فتح و نصرت کا حال قرآن حکیم نے سورۂ توبہ میں اپنے معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ اس طرح کیا ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىْ مَوَاطِنَ	بلاشبہ اللہ بہت میدانوں میں تمہاری مدد کر چکا
كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ	ہے اور حنین کے دن بھی (جب تم اپنی کثرت پر اترا
كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا	گئے تھے تو دیکھو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی
وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا	اور زمین اپنی پوری وسعت پر بھی تم پر تنگ ہوگئی
رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ثُمَّ	اور آخر کار ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے

اَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلٰی	پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی جانب سے
رَسُوْلِہٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَ	دل کا سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اُتار
اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا وَ	دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور اُن لوگوں کو عذاب
عَذَّبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ	دیا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی، اور جو کفر کی راہ
ذٰلِکَ جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ ۝	اختیار کرتے ہیں اُن کی جزا یہی ہے۔ اس کے بعد اللہ
ثُمَّ یَتُوْبُ اللّٰہُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ	جس پر چاہیگا اپنی رحمت سے لوٹ آئیگا اور اللہ
عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ	بڑا ہی بخشنے والا رحمت والا ہے۔

رَّحِیْمٌ ۝ (توبہ)

غزوۂ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ

(علی الثلثۃ الذین خلفوا)

تبوک "شام" کا ایک مشہور شہر ہے ۹ سنہ ہجری میں سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ اطلاع ملی کہ قیصر روم ہرقل ایک عظیم الشان لشکر مسلمانوں پر چڑھائی کے لیے طیار کر رہا ہے اور کئی لاکھ نبرد آزما والنٹیر اب تک بھرتی ہو چکے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے یہ وقت بہت ہی کٹھن تھا، سرزمینِ حجاز میں قحط پڑا ہوا تھا، زمین پیداوار سے خالی، نہریں اور تالاب خشک، اور گرمی نہایت شدت کی پڑ رہی تھی اور تمام آدمی عُسرت کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔

اس کے باوجود موسم بہار تھا، باغوں میں کھجوریں پک رہی تھیں، کھجور کے پتوں سے سائبان تیار کیے جا رہے تھے اور عرب کے دستور کے مطابق لوگ باغوں میں خیمہ زن موسم کی بہار لوٹنا چاہتے تھے کہ اچانک یہ خبر آئی۔

سخت آزمائش کا وقت تھا، سیکڑوں میل کی راہ، بادِ سموم اور تپتے ہوئے

ریت سے واسطہ مگر فداکارانِ اسلام عیش دنیا اور مصائب موسم سے بے پروا اور بے خوف ہوکر پروانہ وار اسلام پر نثار ہونے کے لیے مدینہ میں جمع ہو رہے تھے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عموماً یہ دستور تھا کہ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو عام طریقہ سے یہ ظاہر نہ ہونے دیتے کہ کہاں کا قصد ہے تاکہ دشمن صحیح حالات نہ پا سکے لیکن غزوۂ تبوک میں چونکہ سخت موسم، حجاز میں قحط سالی، ناسازگاری حالات، اور دشمن کی زبردست قوت کا مقابلہ کرنا تھا اس لیے اس کڑی آزمائش میں ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام قبائل عرب میں اصل حقیقت کا اعلان کرا دیا تاکہ جو شخص بھی اس وادیِ پُرخار میں قدم رکھے سوچ سمجھ کر رکھے۔

مالی استعانت | مسطورہ بالا نازک حالات کے پیش نظر یہ پہلا غزوہ ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین کی مالی استعانت کے لیے ترغیب دی اور جلیل القدر جان نثارانِ اسلام کو اپنی مالی فداکاری کا ثبوت دینے کے لیے موقعہ بہم پہنچایا چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار دینار سُرخ، تین سو اونٹ اور پچاس گھوڑے پیش کیے اور ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن کے اس جذبۂ اخلاص پر یہ دعا فرمائی "اللھم ارض عن عثمان فانی راض عنہ، خدایا! تو عثمان سے راضی ہو اس لیے کہ میں اُس سے راضی ہوں"

اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنا نصف مال پیش کر دیا، حضرت عبد الرحمن بن عوف نے سو اوقیہ، اور حضرت عاصم بن عدی نے ساٹھ وسق کھجوریں پیش کیں اور حضرت عباس و حضرت طلحہ (رضی اللہ عنہما) نے زرِ کثیر پیش کیا اور عورتوں نے بھی اپنے حوصلہ سے زیادہ زیورات پیش کیے۔ حتیٰ کہ حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے تو اپنا کل مال ہی اسلام پر قربان کر دیا، صدیق اکبر جب اپنا مال لے کر حاضر خدمت ہوئے تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دریافت کیا: ابوبکر! تم اپنے اہل و عیال کے لیے بھی کچھ چھوڑ کر

لئے ہو، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "ہاں یا رسول اللہ! میں اپنے گھر میں اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں"

غرض ان عظیم الشان طیاریوں کے بعد جب مسلمانوں کا لشکر جرار، اعلاء کلمۃ اللہ کا فدا کار ولولہ اور جوش کے ساتھ تبوک کی طرف بڑھا تو ہرقل کو بھی جاسوسوں نے خبر کردی۔ ہرقل یا تو کروفر کے ساتھ جنگ کی طیاریوں میں مشغول تھا اور یا یہ خبر سنتے ہی ہوش وحواس کھو بیٹھا اور رومی مسلمانوں کے عدیم النظیر جذبۂ ایثار و فداکاری سے متاثر و خائف ہو کر تبوک میں مسلمانوں کے پہنچنے سے قبل ہی منتشر ہوگئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راہ کے چند عیسائی امراء کو امن کا پروانہ دیتے اور معاہدات کرتے ہوئے کامرانی کے ساتھ واپس آگئے۔

عذر خواہی جب آپ مدینہ جلوہ افروز ہوئے تو منافقین نے اس عظیم الشان آزمائش میں عدم شرکت کے لیے جھوٹے اعذار تراش کر خدمتِ اقدس میں عذر خواہی کی اور ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے جماعتی نظام کی مصالح کے پیش نظر اُن سے درگذر فرمایا۔

مگر عذر خواہ جماعتوں میں تین اشخاص مخلصین اسلام میں سے بھی تھے اور وہ کعب بن مالک، ہلال بن اُمیہ اور مرارہ بن کعب جیسی ہستیاں تھیں، اُنھوں نے حاضر ہو کر منافقین کی طرح کذب بیانی سے کام نہیں لیا اور صاف صاف عرض کر دیا کہ اے خسرو دین و دنیا میں چاہتا تو منافقین کی طرح کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے آپ کے مواخذہ سے بچ جاتا لیکن اگر کسی دنیادار سے ایسا معاملہ پیش آتا تو کر بھی لیتا، خدا کے نبی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا سچ بات یہ ہے کہ میں محض اپنی کاہلی کی وجہ سے "محروم الجہاد" رہا ہر دن یہ خیال کرتا رہا کہ آج اپنے باغوں کے لطف سے اور سیر ہو لوں کل ضرور روانہ ہو جاؤنگا اور لشکرِ اسلام کو ایک دو منزل ہی پر جا پکڑونگا، آخر کار اس کاہلی کا نتیجہ محرومی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اب جو حکم ہو اُس

کے لیے سرِ تسلیم خم ہے۔ یہی ہلالؓ اور مرارہؓ نے بھی کہا اور اس طرح تینوں مجرموں کی طرح حکمِ رسول سُننے کے لیے گوش بر آواز ہو گئے۔

معاشرتی مقاطعہ یہ تینوں حضرات اسلام کے فدائی، اخلاص کے پیکر، اور عاشقانِ رسولؐ تھے۔ اس لیے ان کا معاملہ منافقین کا سا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ نظامِ جماعت کی خلاف ورزی کر گزریں اور جہاد جیسے عظیم ترین رکنِ ملت کو محض کاہلی اور سستی پر قربان کر دیں اور پھر اُن کو معمولی معذرت پر معاف کر دیا جائے اس لیے ضرورت تھی کہ اس معاملہ میں ایسا فیصلہ دیا جائے کہ آئندہ کسی مخلص مسلمان کو ایسی غلط کاری اور نظام کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو سکے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اما ھٰذا فقد صدق فقم حتٰی یقضی اللّٰہ فیک۔ "تم نے سچ سچ بات کہہ دی اب جاؤ اور خدا کے فیصلہ کا انتظار کرو"

تینوں اس حکم کے بعد گھر واپس آ گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہؓ کو حکم فرمایا کہ ان تینوں سے کلام و سلام سب ترک کر دیا جائے چنانچہ تمام مسلمانوں نے اُن کا معاشرتی مقاطعہ کر دیا۔

ضبط و نظم کی عدیم النظیر مثال کعبؓ خود فرماتے ہیں کہ اس واقعہ نے ہم تینوں پر جو کچھ اثر کیا اُس کا اندازہ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا میرے دونوں رفیقوں پر تو اس درجہ اثر پڑا کہ اُنھوں نے باہر نکلنا ہی ترک کر دیا۔ مگر میں سخت جان تھا برابر نمازوں کے اوقات میں مسجد نبوی میں حاضر ہوتا رہا۔

جب میں مسجد میں حاضر ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا اور دیکھتا رہتا کہ لبِ مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں مگر بدقسمتی اور محرومی کے سوا کچھ نہ پاتا البتہ یہ محسوس کرتا تھا کہ جب میں نماز میں مشغول ہوتا تو آپ میری جانب دیکھتے رہتے اور جب میں فارغ ہو کر آپ کی جانب متوجہ ہوتا تو میری جانب سے رُخِ مبارک پھیر لیتے۔

لیکن اس تمام واقعہ میں مسلمانوں کی اسلام دوستی اور امرِ رسولؐ پر امتثال و اطاعت

استقامت کا یہ حال تھا کہ جب میں لوگوں کی اس سختی سے اُکتا گیا تو ایک روز اپنے سب سے محبوب عزیز اور چچا زاد بھائی ابوقتادہ کے پاس گیا، اُس ابوقتادہ کے پاس جو اس سے قبل مجھ پر جان چھڑکتا تھا اور میرا عاشق و جان نثار تھا، میں نے اس کو سلام کیا مگر قسم بخدا کہ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس حالت کو دیکھ کر تڑپ گیا اور ابوقتادہ سے کہا، ابوقتادہ! میں خدا کی قسم دے کر تجھ سے دریافت کرتا ہوں کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں اور میں عاشقِ خدا و رسول ہوں؟ ابوقتادہ پھر بھی خاموش رہا اور کوئی جواب نہیں دیا، میں نے دو مرتبہ پھر اس بات کو دُہرایا مگر اس نے سکوت ہی اختیار کیا اور کوئی جواب نہ دیا آخر جب تیسری مرتبہ کہا تو صرف یہ کہہ کر چپ ہوگیا" اللہ و رسولہ اعلم ؛ خدا اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے" یہ سُن کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں کہ اللہ اکبر یہ انقلاب اور صرف یہیں تک معاملہ ختم نہیں ہوا بلکہ چالیس دن گذرنے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ ان تینوں کی رفیقۂ حیات کو بھی چاہیے کہ شوہروں سے مقاطعہ کرکے الگ ہو جائیں چنانچہ ان اللہ کی بندیوں نے ہمارے ساتھ قلبی تعلق کے باوجود حکم رسول کو مقدم سمجھا اور اپنے میکے چلی گئیں، البتہ ہلال بن اُمیہ کی رفیقۂ زندگی نے دربار رسالت میں جا کر عرض کیا: یا رسول اللہ ہلال بہت بوڑھے ہیں اُن کی خدمت گذار صرف میں ہوں دوسرا کوئی نہیں اگر وہ میری خدمت سے محروم ہوگئے تو ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے اب کیا حکم ہے؟" تب آپ نے فرمایا خدمت کرتی رہو باقی تعلقات کو سردست منقطع کردو" یہ سُن کر اُس نے سر تسلیم خم کردیا اور اس کے باوجود کہ شوہر اور بیوی یا عزیزوں اور رشتہ داروں کے درمیان دوسرا کوئی موجود نہیں ہوتا تھا، تب بھی کیا مجال کہ ایک لمحہ کے لیے بھی کسی نے امرِ رسول سے انحراف کرنے کی جرأت کی ہو سبحان اللہ یہ ہے سچی شانِ انقیاد اور اطاعتِ خدا و رسول۔

عشقِ رسول اور صداقتِ اسلام کا حیرت انگیز معیار | کعب بن مالک (رضی اللہ عنہ) کا چالیس دن

سے مسلسل معاشرتی مقاطعہ ہے، غیروں کا تو ذکر ہی کیا قریبی عزیز و رشتہ دار حتیٰ کہ رفیقۂ زندگی بھی اسلام اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم پر پروانہ وار نثار ہوتے ہوئے "کعب" کا مقاطعہ کیے ہوئے ہیں گویا اس طرح کعب پر خدا کی زمین تنگ ہو گئی ہے وہ اس مایوسی اور حیرانی کی حالت میں مدینہ کے بازار سے گذر رہے ہیں کہ اچانک شام کا ایک نبطی پکارتا ہوا نظر آیا "مَن یدلّ علیٰ کعب بن مالک۔ مجھ کو کوئی کعب بن مالک تک پہنچا دے" لوگوں نے ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ کعب وہ جا رہے ہیں، نبطی آگے بڑھا اور کعب کی راہ روک کر اُن کی خدمت میں ایک خط پیش کیا، کعب نے پڑھا تو شاہ غسان کا خط تھا، اُس میں لکھا تھا:

امّا بعد۔ فانہ قد بلغنی ان صاحبك قد جفاك و لم يجعلك الله بدار هوان و لا مضيعة فالحق بنا نواسك[1]	اما بعد۔ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم پر بڑا ظلم کر رکھا ہے، خدا نے تم جیسی ہستی کو اس ذلت اور ضیاع کے لیے نہیں بنایا پس تم فوراً یہاں چلے آؤ ہم تمہاری خاطر خواہ عزت کریں گے۔

حضرت کعب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں خط پڑھتے ہی مجھ کو سخت رنج و ملال ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ یہ آزمائش و بلا پہلی آزمائش سے بھی زیادہ کٹھن ہے ہیں اور شاہ غسان کو میرے متعلق یہ گمان کہ اس امتحان سے گھبرا کر اس کے پاس بھاگ جاؤں اور خدا اور خدا کے رسول سے منہ موڑ لوں، آہ! یہ بہت ہی تکلیف دہ صورت حال ہے، بہر حال شاہ غسان کی اس ذلیل حرکت پر مجھے ایسا غصہ آیا کہ میں لیک تنور کے سامنے پہنچا اور اُس کے خط کو اس میں جھونک کر نبطی سے کہا، یہ ہے تیرے بادشاہ کے خط کا جواب اور میں خدمت اقدس میں حاضر ہو کر بےچینی کے ساتھ عرض رساں ہوا، شاہ ہر دو سرا! آخر یہ اعراض کیوں اس درجہ کو پہنچ گیا کہ اب مشرکین تک مجھے پھسلانے کی جرأت کرنے لگے[2] غرض اسی طرح پچاس راتیں گذر گئیں اور ہماری محرومی کی گرہ نہ کھلی اور ارشادِ

---

[1] بخاری غزوۂ تبوک [2] فتح الباری جلد ۸ ص ۹۸۔

خداوندی کے بموجب خدا کی زمین وسیع ہونے کے باوجود ہم پر تنگ ہوگئی اور اپنی جان وبال نظر آنے لگی کہ یک بیک صبح کی نماز کے بعد سلع کی چوٹی پر سے ایک پکارنے والے نے پکارا: "اے کعب! بشارت ہو" میں تو انقلاب حال کا منتظر ہی تھا فوراً سمجھ گیا کہ درگاہِ الٰہی میں توبہ قبول ہوگئی، اب کیا تھا مسرت وخوشی سے پھولا نہ سمایا اور وہیں سجدہ میں گر گیا۔

اب جوق جوق لوگ آرہے ہیں اور قبولِ توبہ کا مژدہ سنا رہے ہیں اور کل تک جو اجنبی نظر آتے تھے اس وقت جان نثار اور محب بن کر اظہار مسرت کر رہے ہیں اور رفیقۂ حیات کی جانب سے بھی مبارکباد پیش کی جارہی ہے، سب سے پہلے جس شخص نے مجھ کو قبولِ توبہ کی مفصل بشارت سنائی وہ ایک سوار تھا میں نے انتہاءِ خوشی میں جو کپڑے پہنے ہوئے تھا اتار کر اس کو دے دیے، خدا کی شان کہ میرے پاس اور کپڑے بھی نہیں تھے اس لیے مستعار مانگ کر پہنے اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا راہ میں بھی لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور مجھ پر مبارکبادیوں اور بشارتوں کے پھول برسائے جارہے تھے۔ دربارِ رسالت پہنچا تو حضرت طلحہؓ آگے بڑھے اور مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارکباد پیش کی۔ اسی مسرت کے ساتھ میں جلوۂ جہاں آرا کا طالب ہوا دیکھا تو چہرۂ مبارک مسرت وشادمانی سے برق کی طرح چمک رہا ہے۔ مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: "ابشر بخیر یوم مر علیک منذ ولدتک امک۔ اس مبارک دن میں بشارت حاصل کر تیری ولادت سے آج تک جس سے بہتر کوئی دن نہیں آیا" میں نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! یہ قبول توبہ آپ کی جانب سے ہے یا خدا کی جانب سے" حضور نے فرمایا: میری جانب سے نہیں خدا کی جانب سے ہے"

آپ نے یہ جواب مرحمت فرمایا اور رُخِ انور قمر کی طرح روشن نظر آنے لگا۔ میں نے مسرت کے لہجہ میں عرض کیا: "اے خدا کے رسول! میری قبولِ توبہ کا ایک جزء یہ بھی ہو جائے

کہ میں اپنا کل مال خدا کی راہ میں تصدق کر دوں" آپ نے ارشاد فرمایا "بہتر یہ ہے کہ کچھ حصہ اپنے لیے بھی رکھ لو" میں نے عرض کیا: "بہتر ہے خیبر کا جو حصہ میرے پاس ہے اُس روکے لیتا ہوں" میں نے یہ بھی عرض کیا: "رسول اللہ! یہ سچائی کا صدقہ ہے کہ آج اس نعمتِ بیکراں سے مالامال ہوں اس لیے عہد کرتا ہوں کہ عمر بھر صدقِ مقال کے ماسوا میرا شعار کچھ نہ ہوگا۔"

حضرت کعب فرماتے ہیں میرے اس معاملہ میں رنج و غم کے ہر دو رفقا کا بھی مسرت و بہجت سے یہی حال ہوا اور ہماری قبول توبہ پر جو آیاتِ فضل نازل ہوئی تھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ان کی تلاوت فرمائی

قبول توبہ اور سورۂ توبہ	لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (توبہ)	بیشک اللہ اپنی رحمت سے نبی پر متوجہ ہوگیا اور مہاجرین اور انصار پر بھی جنہوں نے بڑی تنگی اور بے سروسامانی کی حالت میں اس کے پیچھے قدم اٹھایا اور اس وقت اٹھایا کہ قریب تھا اُن میں سے ایک گروہ کے دل ڈگمگا جائیں پھر وہ اپنی رحمت سے اُن سب پر متوجہ ہوگیا، بلاشبہ وہ شفقت رکھنے والا، رحمت کرنے والا ہے، اور اُن تین شخصوں پر بھی (اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہوا) جو معلق حالت میں چھوڑ دیے گئے تھے، حتی کہ نوبت یہ آگئی کہ زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود اُن پر تنگ ہوگئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آگئے تھے اور اُنہوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انہیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی مگر خود اسی کے دامن میں۔ پس اللہ ان پر اپنی رحمت کے ساتھ لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں بلاشبہ اللہ ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے بڑا ہی رحمت والا۔

قرآنِ عزیز اور غزوۂ تبوک

قرآن عزیز نے صرف اسی واقعہ کا ذکر نہیں کیا بلکہ غزوۂ تبوک کی اہمیت کے پیش
نظر اس کی بہت سی تفصیلات بیان کیں اور اس سلسلہ میں پند و موعظت
کے ذریعہ مسلمانوں کی رشد و ہدایت کا سامان مہیا کیا ہے چنانچہ اس سورہ میں چھٹے رکوع
سے لے کر آخر سورہ تک اسی غزوہ اور غزوہ سے متعلق حالات و مواعظ کا تذکرہ ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ (الیٰ) فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا
هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ۔

اہم غزوات اور نتائج و بصائر

بدر الکبریٰ

(۱) عقائد اسلامی و افکار ملی کے بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ فتح و
شکست کا مدار عددی اکثریت و اقلیت پر نہیں ہے بلکہ صرف عنایتِ خداوندی اور اس کے
فضل و کرم پر ہے "کم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃً باذن اللہ"

(۲) جو جماعت احساسِ فرض کے ساتھ عدل و نصفت کے لیے میدان میں نکلتی
ہے کبھی ناکام نہیں ہوتی اور انجام اسی کے ہاتھ رہتا اور خدا کی نصرت کا پیغام اسی کو نصیب
ہوتا ہے "ولقد نصرکم اللہ ببدر وانتم اذلۃ"

(۳) اگر قلب میں اخلاص اور صداقتِ حق کا جذبہ موجود اور خدا اور اس کے رسول
پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم و ارشاد کے سامنے گردن خم ہے تو با اسبابِ دنیوی بشری
تقاضے کے پیش نظر اپنی جانب سے خوف دہراس قابلِ ملامت نہیں ہے اور خدائے برتر متردد
اس کو ثبات و استقامت عطا فرماتا ہے۔

(۴) "صبر و استقامت" ایسے میٹھے پھل ہیں جن کی شیرینی دنیا و دین دونوں ہی

میں لذت وسکون اور رفعت وسعادت سے ہم کنار کرتی ہے، چنانچہ غزوۂ بدر الکبریٰ اس حقیقت کے لیے زندۂ جاوید شہادت ہے۔

(۵) باطل سے برسرِ پیکار رحاملِ حق وصداقت جماعت جب اسباب دنیوی جس قدر زیادہ بے یار ومددگار ہوتی ہے خدا کی نصرت وحمایت اسی قدر زیادہ معجزانہ کرشمے دکھا کر حمایتِ حق کا ساتھ دیتی اور باطل کو ناکام بنا کر حق کو شادکام کرتی ہے، چنانچہ بدر میں ابرِ رحمت کا نزول، ملائکۃ اللہ کا ورود، نظرِ مسلم میں دشمن کی کثیر تعداد کا مشاہدۂ قلیل اور مشرکین کی نگاہ میں مسلمانوں کی تعدادِ قلیل کا مشاہدۂ کثیر یہ سب معجزانہ امور اسی قانونِ الٰہی کی کرشمہ سازیاں تھیں۔

اُحد (۱) "جہاد" مخلص ومنافق کی معرفت کے لیے بے نظیر کسوٹی ہے چنانچہ غزوۂ اُحد اور غزوۂ تبوک میں یہ حقیقت نمایاں نظر آتی ہے چنانچہ اُحد کے موقعہ پر راس المنافقین عبد اللہ بن اُبی اپنی جماعت کے ساتھ لشکرِ اسلامی سے یہ کہہ کر جدا ہو گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چونکہ ہمارا مشورہ نہیں مانا اس لیے ہم کیوں میدانِ جہاد میں جا کر ہلاکت میں پڑیں اور غزوۂ تبوک میں یہ کہہ کر لوگوں کو فداکاری اور جان نثاری سے روکتا رہا "لاتنفروا فی الحر۔ گرمی کی شدت میں جنگ کی آگ کے اندر نہ کودو" اور اس حقیقت کو قطعاً فراموش کر دیا: "نارُ جھنم اشد حرًا۔ جہنم کی آگ کی شدت دنیا کی گرمی کی شدت سے کہیں زیادہ سخت ہے"

(۲) "امیر" "خلیفہ" اور اس کے نائبین کا فرض ہے کہ اہم امور میں مسلمانوں سے مشورہ کرے اور باتفاق رائے یا بہ کثرت رائے جو فیصلہ ہو اسی کو اپنا "عزم" بنائے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نزول وحی ہوتا تھا اس لیے آپ اگر صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مشورہ نہ بھی فرماتے تو کوئی قباحت نہیں تھی تاہم "اسوۂ حسنہ" کو شعار بنانے کے لیے آپ اہم امور میں برابر مسلمانوں سے مشورہ فرماتے رہے، چنانچہ غزوۂ اُحد میں بھی مشورہ فرمایا اور اس مشورہ کی یہ خصوصیت ہے کہ خود ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) اور معمرِ

تجربہ کار صحابہ کہ جن کی قوت و اصابتِ رائے پر آپ کو اعتماد تھا" کی رائے یہ بھی کہ غزوۂ احد کے موقعہ پر مسلمانوں کو مدینہ سے نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہیے مگر اکثریت کے لحاظ سے اُن صحابہ کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کا اصرار تھا کہ ہم کو مدینہ سے باہر میدان میں نکل کر جنگ کرنی چاہیے تو آپ نے اکثریت کے فیصلہ کو برقرار رکھتے ہوئے باہر نکل کر جنگ کرنے کو ہی ترجیح دی اور اس عملی اسوۂ حسنہ کو اپنے مسطورۂ ذیل ارشادِ مبارک سے محکم و مضبوط بنا دیا۔

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے یہ استفسار کیا: "ما العزم یا رسول اللہ۔ اے خدا کے رسول! (قرآن میں مذکور) "فاذا عزمتَ" میں "عزم" سے کیا مراد ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا "مشاورۃ اھل الرأی ثم اتباعھم۔ اہل الرائے سے مشورہ کرنے کے بعد (امام و خلیفہ کا) اُن کی دی ہوئی رائے پر عمل پیرا ہونے کا نام "عزم" ہے[1]۔

(۳) تمام معاملات میں عموماً اور جہاد و میدانِ جنگ میں خصوصاً "ضبط و نظم" اہم اُمور میں سے ہے، اگر کسی جماعت میں اس کا فقدان ہے تو وہ جماعت حاملِ حق و صداقت ہی کیوں نہ ہو کامرانی و کامیابی کا سہرا اُس کے سر نہیں ہو سکتا اور جس درجہ اس بنیادی حقیقت کا رہیں کمی ہو گی اُسی قدر اُس جماعت میں اضمحلال اور ضعف غالب ہو گا۔

غور کیجیے کہ غزوۂ احد میں مشرکین کے مقابلہ میں تیرانداز مسلم جماعت کے نظم و ضبط کی خلاف ورزی نے کس طرح مسلمانوں کی فتح و نصرت کو اچانک شکست کے ساتھ بدل دیا، پیغمبر خدا ہادیٔ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) شریکِ جنگ ہیں، مسلمان مشرکین پر غالب اور مشرکین ہزیمت سے دوچار ہو رہے ہیں کہ مالِ غنیمت کے شوق میں اپنے سردار کے منع کرنے کے باوجود جب تیرانداز جماعت نے گھاٹی چھوڑ دی تو یک بیک فتح شکست سے بدل گئی اور صرف یہی نہیں بلکہ سردارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی چشم زخم پہنچا اور

---

[1] تفسیر ابن کثیر و درمنثور بسندِ صحیح "تفسیر آیت فاذا عزمت فتوکل علی اللہ"

دندان مبارک تک شہید ہوگیا" فاعتبروا یا اولی الابصار"

(۴) یہ ضروری نہیں ہو کہ جب کبھی حق و باطل میں معرکہ آرائی ہو تو حق ضرور جیت جائے اور ابتدا، کار میں بھی اس کو کبھی شکست نہ ہو اگر ایسا ضروری ہو تو حق و باطل کی آزمائش و امتحان کی کوئی سبیل باقی نہ رہے اور قبول حق و باطل اختیاری نہ رہے اضطراری بن جائے، یہی وہ حقیقت ہے جس کو ابوسفیان کے اس جواب پر الحرب سجال. جنگ ان دو ڈولیوں کی طرح ہے جو ایک رسی میں اس طرح بندھے ہوں کہ کبھی ایک نیچے پانی میں چلا جاتا اور دوسرا ابھر آتا ہے اور کبھی پہلا ابھر آتا ہے۔ روم کے شاہنشاہ ہرقل (ہرکلس) نے کہا تھا کہ تیرا یہ قول سچ ہے کہ کبھی تم کو فتح ہو جاتی ہے اور کبھی اس مدعی رسالت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور کبھی تم شکست کا منہ دیکھتے ہو اور کبھی وہ تو اے ابوسفیان! نبی و رسول کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جنگ کے موقعہ پر کبھی بھی اس کو شکست نہ ہو ہاں البتہ بیاز بس ضروری ہے کہ اس معرکہ آرائی کا آخری انجام حق کی فتح اور باطل کی شکست پر جا کر ختم ہو جائیگا"

(۵) میدانِ جہاد میں منافق اور ضعیف اعضاء کا جدا رہنا ہی مفید اور کامیابی کے لیے ازبس ضروری ہے۔ اسی لیے جن غزوات میں منافقین نے مسلمانوں میں ضعف پیدا کرنے کے لیے شرکتِ جنگ سے پہلوتہی کی یا میدان میں نکل کر واپس گئے تو ان کی یہ ناپاک حرکت مسلمانوں کو ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچا سکی بلکہ اس کے برعکس مخلص فداکاروں اور جان نثاروں کی چھوٹی سی چھوٹی تعداد نے بھی وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ باطل کا قلع قمع ہو کر رہ گیا۔

غزوۂ احزاب (۱) کائنات انسانی پر خدا کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ذاتِ اقدس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ "اخوت و مساوات" کا وہ عظیم الشان علمی و عملی نقشہ پیش کیا کہ جس کی مثال عالم انسانی کی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔

غزوۂ خندق میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جان نثار رفقاء کے ساتھ بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھودنے اور ٹوکری میں بھر کر اس کی مٹی منتقل کرنے میں جس طرح برابر کا حصہ لیا وہ اگر ایک طرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیوی بادشاہ شہنشاہ اور ہادی اعظم (نبی و رسول) کے درمیان کس قدر عظیم فرق ہے اسی طرح یہ بھی روشن کر دیتا ہے کہ اسلام کے مقدس جھنڈے کے نیچے خدمتِ حق کے لیے خلیفہ، امام اور ہادی برحق تک بھی کس طرح ایک سپاہی کے دوش بدوش ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں برابر کا شریک و سہیم بنجاتا ہے

(۲) کفار کی تمام جماعتوں کے متفقہ حملہ کے وقت حضرت سلمان فارسی کا مشورہ دینا کہ ایسے نازک وقت میں اہل فارس کا یہی دستور ہے اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اُن کے دیے ہوئے مشورہ کو قبول فرمانا دلیل ہے اس امر کی کہ ہر زمانہ میں وقت کے ترقی یافتہ وسائلِ دنیوی کو امرِ حق کی حمایت کے لیے اختیار کرنا اور اپنانا اسلام سے انحراف نہیں بلکہ بہترین اسلامی خدمت ہے بشرطیکہ وہ اسباب و وسائل اسلامی اصول و احکام سے متصادم نہ ہوں۔

(۳) "جہاد" اسلام کا اس درجہ عظیم الشان رکن اور اس کی بقاء و حفاظت کے لیے ایسا اہم فریضہ ہے کہ اس ادائِ فرض و مشغولیت میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا نماز جیسا اہم فرض بھی قضا ہو گیا اور آپ نے اور صحابہ نے عصر کی نماز مغرب کے وقت ادا فرمائی۔

اور نماز کیسا اہم سے اہم تر فریضہ ہے اس حقیقت سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد جیسے عظیم الشان فداکارانہ اور جان نثارانہ عمل کے وقت بھی جبکہ انسان میدان جہاد میں جان ہتھیلی پر لیے مشغولِ جنگ ہوتا ہے عباداتِ الٰہی سے غافل نہیں رکھا گیا اور ایسے وقت میں نصِ قرآنی نے "صلوٰۃ خوف" کی طرح ڈال کر نماز کی اہمیت اور جلالتِ قدر پر مہرِ تصدیق

ثبت کردی۔

(۴) جنگ میں ایسے طریقے اختیار کرنا صحیح ہیں جن میں کذب او خلف وعد جیسے قبیح امور کا دخل نہ ہوتے ہوئے دشمن کو بغیر جنگ ہی کے نقصان و ہزیمت کا مُنہ دیکھنا پڑجائے یا وہ یہ صحیح اندازہ نہ کرسکے کہ اسلامی لشکر کا رُخ کس جانب ہے اور اس طرح حقیقت حال مستور ہوکر وہ دھوکے میں پڑجائے۔ چنانچہ غزوات اسلامی میں یہ دونوں پہلو عملی لباس میں صاف نظر آتے ہیں اور یہی مفہوم ہے ارشاد نبوی "الحرب خُدعۃٌ" کا

صلح حُدیبیہ

(۱) اجتماعی مصالح اسلامیہ اگر متقاضی ہوں تو خلیفہ اور امیرالمومنین کو اختیار ہے کہ وہ کفار و مشرکین سے ایسی صلح کرلے جو اگرچہ بظاہر حال شکست خوردہ نظر آتی ہو مگر دقتِ نظر اور فکر عمیق کا یہ فتویٰ ہو کہ ثمرہ اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ مسلمانوں کے حق میں فتح مُبین اور ظفر و نصر کا سبب ثابت ہوگی جیسا کہ حدیبیہ کے صلح نامہ کی دفعہ سے ظاہر ہوتا ہے

(۲) بسا اوقات ہماری ظاہر بیں نظریں ایک معاملہ کو موجبِ توہین سمجھتی اور اُس کو کراہت سے دیکھتی ہیں لیکن وہ خدا کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر اور موجب عزت بننے والی ہوتی ہے اسی طرح بسا ایسا ہوتا ہے کہ جس شے کو ہماری نگاہیں خیر اور موجب فلاح سمجھتی ہیں وہ ثمرہ اور نتیجہ کے اعتبار سے باعثِ شر اور موجب ذلت و رسوائی ہوجاتی ہے اس لیے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو ہر معاملہ میں اسوہ حسنہ بنائے اور اپنی عقل و خرد پر اعتماد کرکے اُن کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ ہوجائے "عسیٰ ان تحبوا شیئًا وھو کرہ لکم وعسیٰ ان تکرھوا شیئًا وھو خیر لکم"

(۳) معاہداتِ اقوام و امم میں اسلام کی امتیازی شان یہ ہے کہ "نقضِ عہد" کو "غدر" سمجھے اور یقین کرے کہ عہد کی خلاف ورزی کرنے والا نہ دنیا میں صاحبِ عزت ہوسکتا ہے اور نہ عالمِ آخرت میں اس کو فلاح نصیب ہوسکتی ہے بلکہ روزِ قیامت اس کے ہاتھ میں

غداری کا جھنڈا ہوگا تاکہ کائنات انسانی کے سامنے اس کے غدر کا مظاہرہ ہوسکے" اوفوا بالعہد ان العہد کان مسئولا"

(۴) جو لوگ قلت تعداد اور فقدان اسباب ظاہری کے باوجود خدا کے رسول کے ہاتھ پر فداکاری اور جان نثاری کے لیے حدیبیہ میں بیعت کر رہے تھے خدا نے ان کے اس ایثار اور عقیدت حق کی جزاء عظیم یہ عطا فرمائی کہ قرآن حکیم میں بصراحت ان کو اپنی خوشنودی کی سند بخشی اور اسی مبارک استناد کی بنا پر وہ بیعت "بیعت رضوان" کے نام سے رہتی دنیا تک موسوم ہوئی پس یہ واقعہ برہان قاطع ہے اس امر کے لیے کہ "ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین"

(۵) اگر آزادی ضمیر نصیب ہو اور تعصب راہ میں حائل نہ ہو تو اسلام ایسا دین فطرت ہے کہ خود بخود کائنات انسانی کو اپنے اندر جذب کرتا چلا جاتا ہے، چنانچہ "صلح حدیبیہ" نے اس لیے "فتح مبین" کا لقب پایا کہ جب مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ایک معاہدہ کے ذریعہ جنگ کا التوا ہو گیا تو مشرکین کو امن و اطمینان کے ساتھ مسلمانوں سے میل جول کا موقعہ ملا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دعوت اسلام کے وقت سے حدیبیہ کے وقت تک فداکاران اسلام کی جو تعداد تھی تقریباً اٹھارہ یا بائیس مہینوں کے اندر اندر اس سے زیادہ شمع اسلام کے پروانے نظر آنے لگے۔ ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ مشرکین نے دیکھا کہ قوم مسلم اپنے اخلاق و اعمال اور کردار و گفتار بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں صادق و عادل حق پسند و حق آگاہ ہیں اور ان کی جماعتی و انفرادی حیات کا پایہ وقت کی تمام اقوام و ملل سے بلند تر ہے

فتح مکہ

(۱) مسلمان جب کسی غیر مسلم طاقت سے معاہدہ کرلیں تو جس مدت کے لیے معاہدہ ہوا ہے ان کا اسلامی فرض ہے کہ اس مدت کو اپنی جانب سے پورا کریں اور نقض عہد کا تصور بھی نہ کریں البتہ اگر معاہد طاقت کی جانب سے خلاف ورزی ہو تو پھر مسلمان بری الذمہ ہیں بلکہ بعض حالات میں نقض عہد کرنے والی طاقت کا استیصال ازبس ضروری ہے جیسا کہ فتح مکہ کے

اسباب سے ظاہر ہوتا ہے

(۲) فتح مکہ کی خصوصیت ہے کہ وہ عنوۃً (بزور طاقت) فتح ہونے کے باوجود خونریزی سے محفوظ رہا اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرم کعبہ کے احترام و عظمت کے پیش نظر خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) کو ہدایات دیتے ہوئے ابتدا ہی میں ارشاد فرمایا تھا کہ داخلہ حرم کے وقت ہرگز کسی پر تلوار نہ اٹھائی جائے اِلّا یہ کہ مشرکین میں سے کوئی از خود اقدام کرے اور اسی لیے حضرت سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) کے ذریعہ رجز کے خلاف "الیوم یوم المرحمہ" فرما کر اس حقیقتِ حال کو خوب روشن کر دیا۔

(۳) دنیوی شہنشاہ اور نبی الرحمہ کے درمیان اگر فرق و امتیاز معلوم کرنا ہو تو "فتح مکہ" اس کے لیے روشن برہان ہے۔ تاریخ سے دریافت کرو کہ جب کوئی بادشاہ، شاہنشاہ کسی ملک کو فتح کرتا تو اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا تھا، یہی کہ مفتوح قوم پر مظالم کرے قتل و غارت کر کے اُن کو غلام بنائے یا تلوار کے گھاٹ اُتارے لیکن جب نبی الرحمۃ کو اقتدار اعلیٰ نصیب ہوا اور فتح مکہ کی صورت میں مشرکین و کفار پر یہ قدرت حاصل ہوا تو اس مقدس ہستی نے کیا کیا؟ صرف یہ کہ اُن کو جمع کیا اور اعلان کر دیا "لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا انتم الطلقاء۔ آج تم پر گذشتہ بداعمالیوں اور سفاکیوں پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو"

ایک شخص عمر بھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود جب فتح مکہ کے وقت کانپتا، خوف کھاتا اور لرزتا ہوا حاضر خدمت ہوتا ہے تو اس وقت بھی نبی الرحمہ کی زبان اقدس اس حقیقت کا اعلان کرتی جس سے آپ کی شانِ پیغمبری نمایاں نظر آتی ہے آپ فرماتے ہیں۔

خوف نہ کر! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں بلکہ تمہاری طرح خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔

(۴) کافر و مشرک گروہ اگر اسلامی طاقت کا حلیف بننا چاہے تو بہ تقاضائے مسلم مفاد اُس کو حلیف بنایا جا سکتا ہے بلکہ بعض حالات میں حلیف بنانا ازبس ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ حلیف کے مال اور اُس کی جان و آبرو سب کو اپنے مال، جان، اور آبرو کی طرح سمجھے اور اسی قسم کا معاملہ کرے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

حنین | (۱) ایک لمحہ کے لیے بھی کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ فتح و شکست کا مدار "کثرتِ تعداد" پر سمجھے بلکہ اُس کا یقین راسخ ہر حالت میں خدا کی نصرت کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیے چنانچہ بدر میں اعتماد علی اللہ نے ذلت و قلت کو عزت و کثرت کے ساتھ بدل دیا اور حنین میں اپنی کثرتِ تعداد پر اعتماد نے کثرت و شوکت کو مبدل بہ ہزیمت بنا دیا" ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ"

(۲) اگر اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کا تقاضا ہو تو ایک غیر مسلم طاقت کے مقابلہ میں دوسری غیر مسلم طاقت یا غیر مسلم جماعت کا تعاون واشتراک حاصل کرنا بلاشبہ درست اور مشروع ہے اسی لیئے حنین میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم نے "طلقاء" کو شریک جنگ رکھا۔ اور جنگ میں "استعانت من المشرکین" کے مسئلہ میں بلحاظ دلائل اگرچہ قبول و عدم قبول دونوں قسم کے اقوال موجود ہیں لیکن قرآن وحدیث کی روشنی میں جمہور کا مسلک جواز و قبول ہی کا ہے، چنانچہ محدثین و فقہاء امت نے کتاب الجہاد میں اس کی تصریح کردی ہے۔[1]

تبوک | (۱) مفاد اسلامی کے پیشِ نظر جب خلیفۃ المومنین نفیر عام (جہاد عام) کا اعلان کردے تو ادائے فرض کے مقابلہ میں ہر قسم کی مشکلات ہیچ در ہیچ ہو جانی چاہئیں اور اسباب و وسائل کی پریشانیاں ہرگز راہ میں حائل نہ رہنی چاہئیں غزوۂ تبوک ہم کو اسی جانب راہنمائی کرتا ہے۔

---

[1] فتح الباری، کتاب الاُم امام شافعی، مبسوط، البدائع والصنائع۔

(۲) جہاد اور نفیرِ عام کے موقعہ پر مالی اعانت بھی جہاد ہی کا اہم شعبہ ہے اور "گر زر طلبی سخن درینست ؛ گر جان طلبی مضائقہ نیست" کے خلاف عزم و عمل اخلاص و صداقت کی روشن دلیل ہے اس لیے جلیل القدر صحابہ نے غزوۂ تبوک میں مالی اعانت کی اپیل پر ایک دوسرے سے مسابقت کی اور ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے اپنا کل مال راہ خدا میں دے کر صرف اللہ اور اس کے رسول کا نام گھر میں باقی چھوڑا۔

(۳) جماعتی زندگی میں جن لوگوں کے متعلق شروع سے ہی یہ معلوم ہو کہ جماعت میں ان کی شرکت از رہِ خلوص نہیں بلکہ از رہِ نفاق ہے وہ اگر جہاد جیسے فداکارانہ عمل سے پہلو تہی کرنے کے لیے کوئی بہانہ کرکے میدانِ جہاد سے جی چرا جائیں تو ان سے درگذر کی جا سکتی ہے کہ ان کی عدم شرکت مفید ہی ہے نہ کہ مضرت رساں لیکن مخلص و ایثار پیشہ فردِ جماعت اگر ایسے نازک موقعہ پر کوتاہی کر جائے جیسا کہ غزوۂ تبوک کا اہم معاملہ تھا تو یہ کوتاہی ناقابلِ معافی جرم ہے تاوقتیکہ ماضی پر ندامت اور مستقبل میں ایسی شنیع حرکت سے پرہیز کے عزم کے ساتھ درگاہ الٰہی میں عجز و نیاز سے تائب نہ ہو جائے۔

(۴) اسلامی احکام کی کھلی خلاف ورزی پر مسلمانوں کا کسی فردِ مسلم یا جماعتِ مسلمہ کے خلاف سوشل اور معاشرتی مقاطعہ درست ہے بلکہ بعض اہم اور نازک حالات کے پیشِ نظر کبھی واجب اور ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ایک جانب مسلمانوں میں ضبط و نظم کا صحیح جذبہ پیدا ہو جائے اور دوسری جانب مخلص و منافق کے درمیان بیّن تفاوت نظر آنے لگے۔

تبنّی

رسومِ جاہلیت میں سے ایک رسم تبنّی (گود لے کر بیٹا بنانا) بھی ہے۔ یہ رسم مشرکینِ عرب و عجم میں یکساں رائج تھی، اس رسمِ قبیح کے ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچہ اپنے حقیقی ماں باپ کے انتساب سے کٹ کر ایک اجنبی کے لیے صلبی بیٹے کی طرح ہو جاتا اور اس کے خاندان

کے تمام محارم اُس کے محارم بن جاتے ہیں۔ نیز اس اجنبی کے حقیقی ورثاء کو محروم وراثت بناکر خود اُس کی تمام جائداد کا مالک بن جاتا ہے یا اپنی موت پر اپنے حقیقی ورثاء کو محروم رکھ کر اجنبی کو اپنا وارث بناتا ہے۔ اس لیے بلاشبہ یہ "رسم" نسبی انتساب اور معاشرتی نظام دونوں لحاظ سے مذموم وقبیح اور خلافِ فطرت ہے۔

اسلام جو کہ انسان کے ہر شعبہ حیات کو مکروہ جراثیم سے پاک کرنے اور اُن میں انقلاب واصلاح کی روح پھونک کر نظام کائنات کو بہتر وخوب تر بنانے آیا ہے اُس نے اس رسم بد کے انسداد پر بھی توجہ کی اور ایک خاص واقعہ کو سامنے رکھ کر ارادہ کیا کہ معاشرت میں گندھی ہوئی اس رسم پر ایسی ضرب کاری لگائے کہ مسلمانوں میں سے ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ ہو جائے اور غیر مسلم بھی اس کی معقولیت پر سر تسلیم خم کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں

انسداد تبنی کے لیے خدائے برتر نے جس واقعہ کو منتخب فرمایا اُس کی رُوداد حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) کی زندگی سے وابستہ ہے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ

حضرت زید کا تعارف اُسد الغابہ میں ابن اثیر جزری نے اس طرح کرایا ہے۔

زید بن حارثہ بن شراحیل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آزاد کردہ غلام (مولی) ہیں اور بہت ہی محبوب صحابی ہیں، یہ عرب کے معزز قبیلہ بنی کلب کے ایک فرد تھے مگر بچپن ہی میں ایک حادثہ کی وجہ سے غلام بنا لیے گئے صورت یہ پیش آئی کہ ان کی والدہ ان کو ساتھ لیے اپنے خاندان بنی معن میں جا رہی تھیں راہ میں قبیلۂ بنی قین نے ان کو لوٹ لیا اور زید کو بھی لے گئے، اور عکاظ کے بازار میں لاکر فروخت کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ کے برادر زادہ حکیم بن حزام نے ان کو اپنی پھوپھی کیلئے خرید لیا۔ یہ ابھی آٹھ سال ہی کے تھے کہ حضرت خدیجہؓ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیقۂ حیات ہونے کا شرف حاصل ہو گیا اور انھوں نے زید کو حضور اقدسؐ کی خدمت میں ہبہ کر دیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں ہم اُس دن سے زید کو ابن محمد

(صلی اللہ علیہ وسلم) کہنے لگے اور اس وقت تک کہتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "ادعوھم لآبائھم۔ مسلمانو تم لے پالکوں کو ان کے باپ دادا کی نسبت سے ہی پکارا کرو"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید اور اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا اور دونوں حقیقی بھائیوں کی طرح رہنے لگے۔ ادھر زید کی گم شدگی نے ان کے والد حارثہ کو غم سے نڈھال بنا رکھا تھا حسن اتفاق کہ بنی کلب کے چند آدمی حج کی نیت سے مکہ آئے تو زید کو دیکھا اور پہچان لیا، زید نے بھی ان کو پہچانا اور اپنے قبیلہ کو اپنی موجودگی کا پیغام دیا، حارثہ اور ان کا بھائی کعب دونوں نے جب یہ سنا تو فوراً بھاگے ہوئے مکہ آئے اور دربار قدسی میں حاضر ہو کر عرض کیا آپ زید کو ہمارے حوالہ کر دیجیے اور زر فدیہ لے لیجیے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اس سے بہتر بات یہ ہے کہ زید آجائے اور اس کے سامنے دونوں صورتیں پیش کر دی جائیں وہ تمہارے ساتھ جانا قبول کرتا ہے یا میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے اور جو اس کی مرضی ہو اس پر ہم بھی راضی ہو جائیں" حارثہ بخوشی اس پر رضامند ہو گئے کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ بیٹا بہرحال باپ کو ہی ترجیح دیگا چنانچہ زید بلائے گئے ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا ان کو پہچانتے ہو؟ زید نے کہا کیوں نہیں یہ میرے والد ہیں اور یہ چچا، آپ نے فرمایا یہ لینے آئے ہیں، اب تم مختار ہو ان کے ساتھ چلے جاؤ یا میرے پاس رہو، زید نے عرض کیا: میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا میرے باپ، چچا جو کچھ بھی ہیں آپ ہی ہیں، حارثہ نے یہ سنا تو رنج و تکلیف کے ساتھ کہا: "زید کس قدر افسوس ہے تجھ پر کہ غلامی کو آزادی پر اور باپ دادا اور خاندان پر اجنبی کو ترجیح دے رہا ہے" زید نے کہا: "اس ہستی کے ساتھ رہ کر میری آنکھوں نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے اس کے بعد میں دنیا و ما فیہا کو اس کے سامنے ہیچ سمجھتا ہوں" تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حارثہ کو اور حاضرین کو بتلایا کہ میں نے زید کو آزاد کر دیا ہے،

اب وہ میرا غلام نہیں بلکہ بیٹا ہے، حارثہ نے یہ سُنا تو بہت خوشی کا اظہار کیا اور باپ اور چچا دونوں مطمئن واپس گئے[2] اور گاہے گاہے آکر دیکھ جاتے اور آنکھیں ٹھنڈی کر جایا کرتے تھے

ترمذی کی ایک مختصر روایت میں حارثہ کی جگہ اُن کے دوسرے بیٹے جبلہ کی آمد اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسطورۂ بالا گفتگو کا ذکر ہے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت زید کی مزید قدر افزائی کے لیے اُن کا نکاح اپنی دودھ پلائی (حاضنہ) ام ایمن کے ساتھ کر دیا جن کے بطن سے حضرت اسامہ پیدا ہوئے اور اس کے بعد ارادہ کیا کہ اُن کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنتِ جحش کے ساتھ کر دیں، یہ ہاشمی خاندان کی بیٹی اور آپ کی پھوپھی اُمیہ بنت عبدالمطلب کی لخت جگر تھیں، اس لیے زینبؓ اور زینبؓ کے بھائی اس عقد پر راضی نہیں تھے تب وحی الٰہی نے نازل ہو کر یہ حکم دیا کہ جس بات کا حکم اللہ اور اُس کا رسول دے پھر اُس کی خلاف ورزی کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝	جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو پھر کسی مرد مومن اور عورت مومنہ کو ان کے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے بلاشبہ وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

وحی الٰہی کے نزول پر حضرت زینب (رضی اللہ عنہا) اور اُن کے بھائیوں نے آپ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح آپ نے خاندان سے ہی عملی طور پر فخر بالانساب کی جڑ کاٹ دی تاکہ آپ کا عمل اسوۂ حسنہ بنے۔

حضرت زید کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ قرآن میں اُن کا نام بصراحت مذکور ہے یہ شرف کسی صحابیِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نصیب نہیں ہوا۔

---

[1] جلد ۲ صفحہ ۲۲۴ - ۲۲۵۔ [2] یہ قبل از نبوت کا واقعہ ہے۔

انسداد تبنی | حضرت زید اور حضرت زینب اگرچہ حبالۂ عقد میں منسلک ہو گئے تھے لیکن حضرت زینب کا یہ فطری رجحان مٹ نہ سکا کہ وہ قریشی ہاشمی ہیں اور اُن کا شوہر آزاد شدہ غلام، اسی طرح حضرت زید کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ بہرحال عرب کے معزز قبیلہ کے فرد اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ بولے بیٹے ہیں اور زینب پر اُن کو قوام ہونے کا شرف حاصل ہی چنانچہ ان دو متضاد ذہنیتوں نے ان کے آپس میں محبت کا رشتہ قائم نہ ہونے دیا اور آخر کار زید اس پر آمادہ ہو گئے کہ حضرت زینب کو طلاق دے دیں، حضرت زید نے متعدد مرتبہ اس ارادہ کا حضور اقدس سے تذکرہ کیا مگر آپ نے یہ سمجھ کر کہ شاید دیر پا مدت ازدیاد محبت کا باعث ہو جائے۔ زید کو طلاق دینے سے روکا۔

حضرت زید اور حضرت زینب کی نا چاقی نے اب صورت حال بدل دی اور وحی الٰہی نے یہ فیصلہ کیا کہ وقت آگیا ہی کہ اب "تبنی کی رسم بد" کا خاتمہ کر دیا جائے اور جس طرح آپ نے فخر بالانساب کے پہلو کو اپنے خاندان ہی میں سب سے پہلے شکست دی اسی طرح اس کی ابتدا بھی خود ذات اقدس کے ہی عمل سے ہو اور یہ اس طرح کہ زید جب طلاق دے دیں تو پھر زینب کا عقد آپ سے ہو جائے کیونکہ اس سے ایک طرف زینب اور اُن کے خاندان کو جو صدمہ پہنچے اُس کا اندمال ہو سکے اور دوسری جانب تبنی کی رسم بد کا انسداد ہو جائے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب وحی الٰہی نے یہ نقشہ بتلایا تو بر بناء بشریت آپ کے قلب میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ زید اگر زینب کو طلاق نہ دے تو اچھا ہی تاکہ زینب کے خاندان کو بھی توہین محسوس نہ ہو اور ہم بھی منافقین اور مشرکین کے اس طعن و تشنیع سے محفوظ رہوں کہ وہ یہ کہیں گے "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے بیٹے کی بیوی کو اپنی بیوی بنا لیا حالانکہ دوسروں کے لیے بیٹے کی بیوی کو حرام بتاتے ہیں" چنانچہ آپ برابر زید کو طلاق سے باز رکھتے رہے، مگر جب کسی طرح باہم موافقت نہ ہو سکی تب زید نے طلاق دے

ہی دی اور عدت گذرنے پر خدا کا حکم ہوا کہ اب زینب کو آپ اپنی بیوی بنائیں تاکہ آئندہ مُنہ بولے بیٹے کی رسم کا خاتمہ ہو اور مسلمانوں کی معاشرت میں یہ تنگی نہ پیدا ہو سکے کہ مُنہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کو صلبی بیٹے کی بیوی کی طرح حرام سمجھا جائے اور ساتھ ہی اللہ تعالےٰ کی وحی نے یہ بھی واضح کر دیا کہ خدا جو فیصلہ کر چکا ہے وہ تو ظاہر ہو کر ہی رہیگا اور تمہارے بشری خوف سے وہ ٹلنے والا نہیں ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ حکم الٰہی کے مقابلہ میں سماجِ انسانی کا خوف ہیچ در ہیچ ہے۔

قرآنِ عزیز نے انسدادِ تبنّی کے معاملہ کو دو شقوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک ذہنی و علمی انقلاب اور دوسرا عملی، چنانچہ ذہنی اصلاح و انقلاب کے لیے حسب ذیل آیات نازل فرمائیں:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ (احزاب)	اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی) بیٹا نہیں بنا دیا، یہ قول تمہارے اپنے منہ کی بات ہے اور اللہ سچ بات کہتا ہے اور وہی سیدھی راہ دکھاتا ہے تم ان مُنہ بولے بیٹوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت سے پکارا کرو یہی اللہ کے نزدیک انصاف کا طریقہ ہے اور اگر تم کو ان کے باپ دادوں کا نام معلوم نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

چنانچہ صحابہ تصریح کرتے ہیں کہ ہم نے اُسی وقت سے حضرت زید کو ابن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا چھوڑ دیا اور زید بن حارثہ کہنے لگے۔

اور انسدادِ تبنّی کے عملی پہلو کو روشن کرنے کے لیے ان آیات کا نزول ہوا۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِىْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ	اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب تم اُس شخص سے کہتے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے انعام کیا۔ کہ اپنی

زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ
نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى
النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ
فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا
زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى
الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ
اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ
اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (احزاب)

بیوی کو روکے رکھ (اور طلاق نہ دے) اور اللہ سے
ڈر اور صورت حال یہ تھی کہ تم اپنے جی میں اس بات
کو چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا
اور تم لوگوں (کے طعن و تشنیع) سے ڈرتے تھے اور
اللہ زیادہ مستحق ہو کہ اس سے خوف کیا جائے سو جب
زید اپنی حاجت پوری کر چکا (اور اس نے طلاق دیدی)
تو ہم نے اُس (زینب) کا تجھ سے نکاح کر دیا تاکہ (آئندہ)
مسلمانوں پر یہ تنگی نہ رہے کہ وہ اپنے مُنہ بولے بیٹوں کی
بیویوں سے نکاح نہ کر سکیں جب اُن کے مُنہ بولے بیٹے
اپنی حاجت پوری کر لیں (یعنی طلاق دیدیں) اور اللہ کا یہ حکم اٹل ہو

قرآنِ عزیز کی ان آیات کا مفہوم اپنے متعلقہ مسئلہ کے ساتھ اس قدر صاف اور واضح ہو کہ اس میں کسی دوسرے مفہوم کی گنجائش تک نہیں اور نہ کسی قسم کی کوئی پیچیدگی ہی ہو کہ جو معاملہ کے رُخ کو کسی دوسری جانب پھیرنے کا موجب ہو مگر حیرت اور حیرت سے زیادہ رنج و ملال ہو اُن راویانِ روایت پر جنھوں نے روایت و درایت کی کسوٹی پر کسے بغیر ہی یہودِ بنی اسرائیل کی اسلام دشمنی اور رسول دشمنی میں گڑھی ہوئی خرافی داستان کو ان آیات کی تفسیر کے ضمن میں درج کر دیا اور یہ قطعاً محسوس نہ کیا کہ جبکہ ان بے سروپا روایات کا نہ قرآن کی آیات سے جوڑ لگتا ہو اور نہ ذخیرۂ حدیث میں کوئی ایک صحیح روایت بھی اس کی جانب اشارہ کرتی ہو تو پھر ہمارے لیے کس طرح یہ جائز ہو سکتا ہو کہ ہم ایسی روایات کو بیان یا نقل کر کے ایک جانب دشمنانِ اسلام کے لیے غلط اور پُراز بہتان نکتہ چینی کا سامان مہیا کریں اور دوسری طرف بے علم مسلمانوں کے دینی و ذہنی انتشار کا باعث بنیں۔

خرافی داستان اگر یہ خرافی داستان کتب تفسیر میں نقل نہ ہوتی اور اُس کے مفاسد کا اثر موافق و

مخالف دونوں جانب پہ نہ پڑا ہوتا تو ایک لمحہ کے لیے بھی قلم اس کے لیے آمادہ نہ ہوتا کہ اس ہرزہ سرائی کو روایت کہہ کر پیش کرے مگر اصل حقیقت کو واشگاف کرنے کے بعد محض اس لیے اس داستان کو سپرد قلم کیا جا رہا ہے کہ جب کبھی اس پر نگاہ پڑے تو فوراً ذہن میں آ جائے کہ یہ ایک خرافی داستان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اس لیے دشمنان اسلام کو اس کی سند لینا محض تعصب اور اسلام دشمنی پر مبنی ہے نہ کہ حقیقتِ حال کی طلب و جستجو کے پیش نظر۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب کے یہاں تشریف لے گئے۔ اتفاق سے حضرت زید موجود نہیں تھے حضرت زینب پر اچانک نظر پڑی تو وہ بہت حسین نظر آئیں آپ فوراً ہی یہ پڑھتے ہوئے "سبحان مقلب القلوب۔ پاک ہے وہ ذات جو دلوں کو کیسے پھیر دینے پر قابو رکھتی ہے" واپس ہو گئے۔ جب زید آئے تو زینب نے ان سے پورا واقعہ کہہ سنایا، زید یہ سن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں زینب کو طلاق دینا چاہتا ہوں، حضور نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو تو کہنے لگے اور کوئی وجہ نہیں ہے وہ خود کو بہت بلند مرتبہ سمجھتی اور مجھ کو زبان سے ایذا پہنچاتی ہے یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں (العیاذ باللہ) اگرچہ یہ آیا کہ زید طلاق دیدے مگر زبان سے منع کیا کہ خدا سے ڈر اور ایسا نہ کر تب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا اور کہا کہ تیرے دل میں جو بات تھی اُس کو تو نے چھپایا، مگر اللہ تعالیٰ اُس کو ظاہر کر کے رہیگا۔ (اعاذنا اللہ من ہذہ الخرافات)

اس روایت کو ابن ابی حاتم اور طبری نے قتادہؒ اور ابن عباسؓ کی نسبت کے ساتھ روایت کیا ہے مگر قاضی عیاض نے شفاء میں، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں،

ابن کثیر، ابن حیان، سید محمود آلوسی نے اپنی تفاسیر میں، اور خفاجی نے نسیم الریاض میں اس کو روایت و درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار اور ناقابل قبول ثابت کیا ہے اور ان دونوں بزرگوں کی جانب اس روایت کے انتساب کو باطل اور غلط قرار دیا ہے

فتح الباری میں ہے۔

وورودت آثار اخرجها ابن ابی حاتم والطبری ونقلها کثیر من المفسرین لا ینبغی الاشتغال بها والذی اوردته منها هو المعتمد[1]

اس سلسلہ میں اور بھی آثار بیان کیے جاتے ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور بہت سے مفسرین نے اس کو نقل کر دیا ہے یہ آثار ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی جانب کوئی توجہ بھی دی جائے اور قابل اعتماد آثار وہی ہیں جن کو ہم نے اس جگہ بیان کر دیا ہے۔

اور سید محمد آلوسی اس داستان کو نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

وللقصاص فی هذه القصة کلام لا ینبغی ان یجعل فی حیز القبول[2]

اور داستان سراؤں کے پاس اس واقعہ کے متعلق بھی گڑھی ہوئی باتیں ہیں جو ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو قبولیت کا درجہ دیا جائے۔

اور ابن کثیر نے تو اس داستان کو اپنی تفسیر میں نقل کرنا بھی پسند نہیں کیا اور اس کا حوالہ دیتے ہوئے اپنا یہ محققانہ فیصلہ صادر فرما دیا۔

ذکر ابن ابی حاتم وابن جریر ههنا آثاراً عن بعض السلف رضی الله عنهم احببنا ان نضرب عنها صفحاً لعدم صحتها فلا نوردها[3]

ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض سلف رضی اللہ عنہم کی جانب منسوب چند آثار کو ذکر کیا ہے، ہم نے یہ پسند کیا کہ ان کی جانب مطلق التفات نہ کریں اس لیے کہ وہ قطعاً صحیح نہیں ہیں اور اس لیے ہم ان کا اس جگہ ذکر نہیں کرینگے۔

[1] جلد ۸ کتاب التفسیر صفحہ ۴۲۵ [2] جلد ۲۳ - ص ۱۹۸-۱۹۴ [3] جلد ۴ ص ۱۲۳۔

اور پھر یہ تمام اہل تحقیق اُن آثار کو نقل کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں بسند صحیح ثابت ہیں اور جو آیات کی وہی تفسیر کرتے ہیں جس کو سطور بالا میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زید کے طلاق دینے سے قبل اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتلا دیا تھا کہ انسداد تبنی کے سلسلہ میں خدا کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ زینب کو زید طلاق دیگا اور تم کو اس سے نکاح کرنا ہوگا، یہ بات تھی جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بربنا بشریت دشمنوں کے طعن سے بچنے کی خاطر کہ "کہینگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا" اپنے دل میں چھپائے رکھا اور آپ کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح زید زینب کو طلاق نہ دے اسی کو قرآن نے "تخفی فی نفسك" کہا ہے، اور زید کا طلاق دینا اور پھر زینب کا حرم نبوی میں داخل ہونا اس حقیقت کا اعلان ہے جس کو "ما الله مبدیه وتخشی الناس والله احق ان تخشٰه" میں کہا گیا ہے۔[1]

اور عمرو بن فائد نے بھی امام زہری سے یہی تفسیر نقل کی ہے اور اسی پر تمام محدثین و مفسرین کا اعتماد ہے اور یہی صحیح ہے۔

لیکن یہ صورت حال کیوں اختیار کی گئی اور معاملہ کو اس خاص رنگ میں کیوں رکھا گیا جو قرآن عزیز کی ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے تو حافظ ابن حجرؒ اس کے متعلق یہ حقیقت واضح فرماتے ہیں۔

والحاصل ان الذی کان تخفیه النبی هو اخبار الله ایاه انها ستصیر زوجته والذی کان یحمله علی اخفاء ذلك خشیة قول الناس تزوج امراۃ ابنه	حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس بات کو پوشیدہ رکھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انسداد تبنی کے سلسلہ میں یہ خبر دی ہے کہ زینب تمہارے نکاح میں آئیگی، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے اس بات کو پوشیدہ رکھا کہ آپ لوگوں کے اس طعن سے بچنا چاہتے

[1] نسیم الریاض جلد ۴ ص ۲۹۹

واراد الله ابطال ما كان اهل الجاهلية عليه من احكام التبنى بامر ابلغ فى الابطال منه وهو تزوج امراة الذى يدعى ابنا ووقع ذلك من امام المسلمين ليكون ادعى لقبولهم وانما وقع الخبط فى تاويل متعلق الخشية والله اعلم ۱؎

تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیٹے کی بیوی سے شادی کرلی اور اللہ تعالیٰ یہ ارادہ کرچکا تھا کہ لے پالک کے جو احکام زمانۂ جاہلیت میں نافذ تھے اُن کو باطل کردے اور اس کے لیے اس طریقہ سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا کہ عملاً کسی منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کرائی جائے اور اس کے لیے ذات اقدس کو اس لیے چنا گیا کہ آپ امام المسلمین ہیں پس آپ کا عمل مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ اتباع اور قبولیت کا داعی ہوگا اور مسلمان اچھی طرح اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ جائینگے (لہٰذا صورتِ حال یہ اختیار کی گئی کہ پہلے زینب کی آپ کے منہ بولے بیٹے زید سے شادی ہو اور پھر وہ طلاق دے اور بحکم خداوندی پھر وہ آپ کے نکاح میں آئیں) یہی وہ اصل بات کہ جو اس لیے خبط میں پڑگئی کہ تاویل کرنے والوں نے یہ قیاس آرائیاں کرڈالیں کہ آیت میں خشیۃ کا متعلق کیا ہے

غرض اسرائیلی داستانوں میں سے یہ بھی ایک خرافی داستان تھی جس کا پردہ فاش ہونا ازبس ضروری تھا ورنہ تو یہ روایت خرد و عقل کے نزدیک یوں بھی ناقابل اعتماد اور لغو ہے کہ زینب جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور بچپن سے جوانی تک مسلسل آپ کے سامنے رہیں اور شادی کے بعد بھی آپ سے پردہ نہیں کرتی تھیں تو اس واقعہ کے دن کون خاص بات تھی کہ زینب آپ کی نگاہ میں اجنبی بن کر نظر آنے لگیں اور آپ نے اخلاق کریمانہ کے خلاف دل وزبان کی مطابقت بھی چھوڑ دی۔ اگر قرآن کی آیت کا یہ مطلب لے لیا جائے تو کیا پھر ایک لمحہ کے لیے بھی قرآن کو یہ حق ہے کہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نبی، رسول اور اولوالعزم پیغمبر کی حیثیت میں پیش کرسکے

۱؎ جلد ۸ ص ۴۲۵۔

سبحنك هذا بهتان عظيم۔

بصائر (۱) باوجود اس امر کے کہ پیغمبر و رسول اس حقیقت سے آشنا ہونے اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا کا فیصلہ اٹل اور ناقابل رد ہوتا ہے تاہم اگر کوئی امر ایسا ہو جس میں اُن کی ذات وقت کے خود ساختہ اخلاقی پہلو کی بنا پر مورد طعن و تشنیع بنتی ہو تو بہ تقاضائے بشریت وہ اس کی زد سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور متوقع رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مقصدِ خیر کے لیے اس صورت حال کو رونما کرنا چاہتا ہے کاش کہ وہ کسی ایسی صورت میں نمودار ہو کہ ان کی ذات اس طعن و تشنیع سے بچ جائے۔ لیکن جبکہ خدا کی مصلحت اسی خاص صورت حالات میں مضمر ہوتی ہے تو وقت آنے پر نبی و رسول اپنی خواہشات ذاتی کو پس پشت ڈال کر خدا کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے، قرآن عزیز نے زیر بحث واقعہ میں اسی حقیقت کو معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

(۲) قرآن عزیز کی تفسیر خصوصاً واقعات پر مبنی آیات کی تفسیر میں اجمال اُس تفصیل سے بدرجہا بہتر ہے جو محض عقلی احتمالات کے پیش نظر آیات کے حقیقی مفہوم کو بھی بدل ڈالے اور لفظی تعبیرات کے اجمال سے غلط اور باطل عمارت طیار کرلے، بلاشبہ ایسی تفصیل تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے اور اس لیے ہر مفسر کا فرض ہے کہ اُس سے اپنا دامن بچائے۔

قرآنی حقائق سے آگاہ محققین مفسرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تفسیر قرآن میں لفظی تعبیرات سے حقیقت کی جستجو کیے بغیر عقلی احتمالات بیان کر کے متضاد اقوال پیدا کر دینا تفسیر قرآن کی محمود خدمت نہیں ہے بلکہ قلوب میں تردد و اضطراب پیدا کر دینے کا موجب ہے

تفسیر قرآن کی بہترین خدمت یہ ہے کہ اول قرآنِ عزیز کی تفسیر خود قرآن سے ہی کی جائے "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" اور ساتھ ہی صحیح و مستند احادیث رسول سے اس کے اجمال کی شرح کرتا جائے، اور پھر اگر مزید تشریحات صحیح آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے حاصل ہو سکیں تو ان سے بھی استفادہ کیا جائے اور ان تمام تحقیقات کے بعد ایک مضبوط و مدلل اور محقق قولِ فیصل نقل

کرنا جائے اور احتمالات کی کشا کش سے اضطراب اقوال کا شکار نہ بنے اور اگر لطائف وحکم اور نکات پر قلم اٹھائے تو اُن میں بھی یہ پیش نظر رہے کہ آیت کی حقیقی روح سے جُدا نہ ہو جائے بلکہ اُس کے اندر محدود رہے، نیز دور از کار لفظی اور تخمینی احتمالات کی راہنمائی میں بعید تاویلات سے اپنا دامن محفوظ رکھے اور غیر مستند روایات (احادیث وآثار) اور اسرائیلیات سے ہرگز ہرگز احتمال کے طور پر بھی کبھی استشہاد و استناد نہ کرے بلکہ اُس کا فرض ہو کہ حسب موقعہ اُن کی تردید اور اُن کا ابطال کرتا جائے تاکہ اربابِ مطالعہ کو قرآنی ہدایات سے حصولِ سعادت اور اخذِ بصیرت وموعظت کے لیے آسان ہو۔

بنونضیر

یہ واقعہ ۴ھ ہجری میں پیش آیا۔ جو قبائلِ یہود یمن سے بھاگ کر حجاز (مدینہ) میں آبسے تھے اُن میں سے یہ بھی مشہور قبیلہ ہے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مدینہ تشریف فرما ہوئے تو آپ نے مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے یہود سے عہد وپیمان کرکے "صلح وعہد" کی طرح ڈالی یہ انصار میں سے بنی خزرج کے حلیف بھی تھے۔

یہود نے اگرچہ ظاہراً اس صلح وعہد پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن اُن کے روایتی حسد وبغض اور تاریخی منافقت نے اس عہد پر اُن کو تادیر قائم نہیں رہنے دیا اور انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف اندرونی اور بیرونی سازشوں کا جال بچھانا شروع کر دیا، اسی اثنا میں بنونضیر کے ذمہ دار افراد نے ایک روز یہ سازش کی کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں جا کر عرض کریں کہ ہم کو ایک معاملہ میں آپ سے مشورہ کرنا ہے اور جب آپ تشریف لے آئیں تو دیوار کے قریب اُن کو بٹھایا جائے اور جب وہ گفتگو میں مصروف ہو جائیں تو اوپر سے ایک بھاری پتھر آپ پر گرا کر آپ کا خاتمہ کر دیا جائے۔

چنانچہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) مدعو ہو کر تشریف لائے ابھی آپ دیوار کے قریب بیٹھے ہی تھے کہ وحی الٰہی نے حقیقت حال سے مطلع کیا اور آپ فوراً خاموشی کے ساتھ واپس تشریف لے گئے اور وہاں جا کر محمد بن مسلمہ (رضی اللہ عنہ) کو بھیجا کہ وہ بنو نضیر تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ چونکہ تم نے غداری کی اور نقض عہد کیا ہے اس لیے تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ حجاز مقدس کی سرزمین سے جلد جلا وطن ہو جاؤ۔ منافقین نے یہ سنا تو جمع ہو کر بنو نضیر کے پاس پہنچے اور کہنے لگے، تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہرگز تسلیم نہ کرو اور یہاں سے ہرگز جلا وطن نہ ہو ہم ہر طرح تمہارے شریکِ حال ہیں

بنو نضیر نے یہ پشت پناہی دیکھی تو حکم ماننے سے انکار کر دیا اور حالات کا انتظار کرنے لگے تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی طیاری کی اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ کا امیر بنا کر بنو نضیر کی گڑھی (چھوٹا قلعہ) پر حملہ آوری کے لیے نکلے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ میں اسلامی پرچم تھا اور صحابہ جلو میں تھے۔

بنو نضیر نے یہ دیکھا تو قلعہ بند ہو گئے اور یقین کر لیا کہ اب مسلمان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے چنانچہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) چھ شبانہ روز اُن کا محاصرہ کیے رہے اور پھر حکم دیا کہ ان کے اُن درختوں کو کاٹ ڈالو جو اُن کے لیے پھل مہیا کرتے ہیں اور اُن کا وجود اُن کی رسد رسانی کے لیے تقویت کا باعث ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر بنی نضیر کے دلوں میں رعب اور خوف طاری ہو گیا اور اُن کو منافقین کی جانب سے مایوسی اور رسوائی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر مجبور ہو کر اُنھوں نے درخواست کی کہ ہم کو جلا وطن ہونے کا موقع دیا جائے۔ لہٰذا اُن کو اجازت دی گئی کہ سامانِ حرب کے علاوہ جس قدر سامان بھی وہ اونٹوں پر لاد کر لیجانا چاہتے ہیں لیجائیں۔

اجازت نامہ حاصل ہونے کے بعد یہ منظر بھی قابل دید تھا کہ کل کے باغی سرکش اور فتنہ جو غدار آج اپنے ہاتھوں سے اپنے مکانات کو برباد کر کے اس وطن کو خیرباد کہہ رہے

تھے جس جگہ محفوظ و مامون رہنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنفسِ نفیس ایک عہد نامہ کے ذریعہ اُن کو دعوت دی تھی۔

بنو نضیر نے اپنے مکانات کو اس لیے برباد کر دیا کہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اُن کے بعد مسلمان ان کے گھروں میں آباد ہوں

بہر حال بنو نضیر جلا وطن ہو کر جب چلے تو اُن میں سے بعض اکابر قوم مثلاً حیی بن اخطب اور ابی الحقیق تو خیبر میں مقیم ہو گئے اور اکثر شام کے نواح میں جا بسے اور دو سردار یامین بن عمرو اور ابو سعد مشرف با سلام ہو کر مدینہ ہی میں رہ گئے۔

قرآن عزیز اور بنو نضیر

اسی واقعہ کے سلسلہ میں قرآن عزیز کی سورۂ حشر نازل ہوئی ہے اور اس میں بنو نضیر کی غداری، منافقین کی فتنہ پردازی، مسلمانوں پر خدا کا احسان و کرم، اور جنگ کے موقعہ پر سبز درختوں کے کاٹنے کا حکم اور ایسی صورت میں جبکہ جنگ نہ پیش آئی ہو مالِ غنیمت کا مصرف اور فَی کا حکم ان تمام امور کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

بصیرت

(۱) "منافق" کا نفاق ایک خود فریبی ہوتی ہے جو انجام کے لحاظ سے نہ خود اپنے لیے مفید ثابت ہوتا ہے اور نہ منافقین پر اعتماد کرنے والا بھی اُس سے کوئی فائدہ اُٹھا سکتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنی اور اپنے حلیفوں کی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کا سامان مہیا کر دیتا اور ابدی خسران کا سبب بن جاتا ہے چنانچہ منافقینِ مدینہ، یہود بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے حالات و واقعاتِ تاریخی اس کے لیے زندۂ جاوید شہادت ہیں۔

(۲) جس قوم میں شر و فساد اور مکر و فریب "اخلاق" کا درجہ لے لیتے ہیں اُن کے قویٰ جسمانی و روحانی سے صلاح و خیر کی تمام استعداد فنا ہو جاتی ہے اور وہ نہ دنیا میں کسی عزت و شوکت کی مالک رہتی ہے اور نہ آخرت میں اُس کے لیے کوئی حصۂ خیر باقی رہتا ہے چنانچہ سامیتی (سیمیٹک) اقوام میں سے اگر کسی قوم میں اس کو نمایاں دیکھنا ہو تو "یہود" کو دیکھ

لینا کافی ہے۔

(۳۳) عام طریقے پر جنگ میں سبز درختوں اور ہری کھیتیوں کو کاٹنا اور برباد کرنا اصلاحاتِ جنگ کے منافی اور ممنوع ہے لیکن جب یہ اشیاء زمانۂ جنگ میں دشمن کی مزید تقویت کا باعث ہو کر فساد و شر کے بقاء میں معاون ہوں تو ایسی حالت عام حکم سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ "بنو نضیر" کے واقعہ میں نصِ قرآنی ناطق ہے۔

واقعۂ افک

شعبان ۵ھ ہجری مطابق دسمبر ۶۲۶ء میں بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی فتنہ سامانیوں کی وجہ سے غزوۂ بنی المصطلق پیش آیا، منافقین کا یہ دستور بن گیا تھا کہ جس غزوہ کے اسبابِ ظاہری سے غالب گمان فتح کا ہوتا اُس میں مالِ غنیمت کے لالچ سے ضرور ساتھ ہو جاتے۔ چنانچہ اس غزوہ میں بھی منافقین کا گروہ مع اپنے سردار عبداللہ اُبیّ کے موجود تھا، واپسی پر ایک معمولی حادثہ پیش آگیا اور عبداللہ بن اُبی اور اس کے منافق گروہ نے اُس پر افتراء اور بہتان کی ایک عمارت تیار کرلی مگر قرآنِ عزیز نے جلد ہی اس افتراء کی حقیقت آشکارا کردی اور مفتریوں کو ذلیل و رسوا ہو جانا پڑا۔ بخاری میں اس واقعہ کی جو تفصیلات مذکور ہیں اُن کا حاصل یہ ہے کہ جب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کامیابی کے ساتھ غزوۂ بنی المصطلق سے واپس ہوئے تو مدینہ کے قریب ایک منزل پر پڑاؤ تھا کہ آخرِ شب میں کوچ کا اعلان ہوا۔ حضرت عائشہؓ اعلان سُن کر رفعِ حاجت کے لیے عجلت کے ساتھ قیام گاہ سے ذرا دور چلی گئیں، فارغ ہونے کے بعد واپس ہوئیں تو گلے میں جو ہار پہنے ہوئے تھیں وہ سینہ پر نہ پایا وہ یہ سمجھ کر کہ ٹوٹ کر وہیں گر گیا ہوگا جہاں رفعِ حاجت کے لیے گئی تھیں اُس کو تلاش کرنے کے لیے واپس گئیں اسی اثناء میں جو جماعت اُن کے

ہودج کو اونٹ پر سوار کراتی تھی اُس نے ہودج اُٹھا کر اونٹ پر کس دیا اور چونکہ اُس زمانہ میں کم خوری کی وجہ سے عورتیں عموماً فربہ اندام نہیں ہوتی تھیں اور اس لیے وہ بھی بہت لاغر تھیں لہذا ہودج پر مامور جماعت نے اُن کی عدم موجودگی کا مطلق احساس نہیں کیا اور اونٹ پر ہودج رکھ کر روانہ ہو گئے، حضرت عائشہ جب ہار کو تلاش کرتی ہوئی واپس ہوئیں تو قافلہ جا چکا تھا اور اب ہار بھی ہودج کے قریب ہی مل گیا، وہ سخت پریشان ہوئیں مگر پھر سوچا کہ جونہی مسلمانوں کو محسوس ہوگا کہ میں ہودج میں نہیں ہوں تو نورًا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ سواری بھیج دینگے اس لیے مناسب یہ ہے کہ قافلہ کا پیادہ پا پیچھا کرنے کی بجائے اسی جگہ انتظار کیا جائے، رات آخر تھی، سپیدۂ صبح نمودار ہونے والا تھا کہ اُن کی آنکھ لگ گئی۔

ادھر صفوان بن معطل سہمی اس خدمت پر مامور تھے کہ وہ قافلے سے بہت پیچھے رہ کر نگرانی کرتے ہوئے اور جو چیز بھی قافلہ کی رہ جائے اُس کو لیتے ہوئے آئیں۔ دو پیچھے سے چلتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی انسان موجود ہے قریب آئے تو اُن کو پہچان لیا کیونکہ آیتِ حجاب سے پہلے وہ اُن کو دیکھ چکے تھے۔

اُنہوں نے دیکھتے ہی فوراً بآواز بلند "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا۔ حضرت عائشہ آواز سُن کر بیدار ہو گئیں اور سمٹ کر بیٹھ گئیں، صفوان نے ایک لفظ کہے بغیر اونٹ کو بٹھا دیا اور وہ بھی خاموشی کے ساتھ اونٹ پر ہودج میں سوار ہو گئیں اور صفوان مہار پکڑے ہوئے روانہ ہو گئے۔ اور دوپہر کے قریب لشکر میں جا پہنچے۔

جب یہ خبر عبداللہ بن اُبی کو معلوم ہوئی تو اُس نے اور اُس کی جماعت نے موقعہ کو غنیمت جانا اور تیزی کے ساتھ افترا اور بہتان کو لشکر میں پھیلا دیا، مگر مسلمانوں نے کسی طرح اس کو باور نہیں کیا البتہ صرف تین مسلمان (دو مرد اور ایک عورت) حسان بن ثابت، مسطح بن اُثاثہ اور حمنہ بنت جحش اپنی سادہ لوحی سے منافقین کے جال میں

پھنس گئے۔

خدا کا کرم و فضل دیکھیے کہ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی (قرآن عزیز) کے ذریعہ منافقین کی خباثت کو آشکارا کر دیا اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی پاکدامنی اور عصمت مآبی پر مہر تصدیق ثبت کر کے بہتان لگانے والوں پر کوڑوں کی سزا (حد قذف) جاری کرنے کا حکم دیا اور اس طرح کذاب اور مفتری کیفرِ کردار کو پہنچے۔

اس واقعہ پر بعض مستشرقین اور یورپین مورخین نے بہت جولانیِ طبع کا ثبوت دیا ہے اور خوب آب و نمک لگا کر اس کو بیان کیا ہے، جس کو پڑھ کر اسلام اور داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ان کے قلبی عناد کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بہرحال قرآنِ عزیز نے اس واقعہ پر مسلمانوں کو صاف طور سے یہ بتلا دیا کہ یہ کذب و افترا پر مبنی داستان سن کر تم نے خود ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ "یہ محض جھوٹ اور بہتان" ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ	جن لوگوں نے بہتان کا یہ طوفان اٹھایا ہے وہ تم ہی میں
مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ	سے ایک جماعت (منافقین کی جماعت) ہیں (اسے
خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ	بیغمبر!) تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے
مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ	حق میں بہتر ہے (یعنی خدا کی مصلحت کے راز نے اس
مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ لَوْلَا اِذْ	میں تمہاری بہتری کا انجام پوشیدہ رکھا ہے۔ ان میں سے
سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ	ہر ایک آدمی کے لیے وہ سب کچھ ہے جو اس نے گناہ
الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا	کمایا ہے اور جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے۔
هٰذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ لَوْلَا جَآءُوْا	اس کے واسطے بہت بڑا عذاب ہے، جب تم نے اس
عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا	(بہتان) کو سنا تھا کیوں نہ ایمان والے مرد اور ایمان

بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ
الْكٰذِبُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
لَمَسَّكُمْ فِىْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ۝ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ
وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ
لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا
وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝ وَلَوْ
لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ
لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ
هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ
اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ
لَكُمُ الْاٰيٰتِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝
اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ
الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَ
الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا
تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ۝

والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر نیک خیال قائم
نہ کرلیا اور کیوں یہ نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان کا طوفان
ہے، وہ (طوفان) اٹھانے والے اپنے بہتان پر کیوں
چار گواہ نہ لائے پس جب وہ گواہ نہ پیش کرسکے تو
یہی لوگ اللہ کے یہاں سرتاسر جھوٹے ہیں۔ اور اگر
اللہ کا فضل اور اس کی رحمت دنیا اور آخرت دونوں
میں تم پر نہ ہوتے تو پڑجاتی اس جھوٹا چرچا کرنے میں
تم پر کوئی بڑی آفت، جبکہ تم اس (بہتان) کو اپنی
زبانوں پر جاری کرنے لگے اور ایسی بات منہ
سے نکالنے لگے جس کی تم کو خبر تک نہیں اور تم
اس کو ہلکی بات سمجھتے ہو حالانکہ (بہتان اور افترا)
اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے۔ اور جب تم
نے اس کو سُنا تھا تو کیوں نہ کہا ہمارے لیے زیبا
نہیں کہ ایسی جھوٹ بات مُنہ سے نکالیں" اللہ کے
لیے پاکی ہے" یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تم کو سمجھاتا
ہے کہ ایسا کام پھر کبھی نہ کر بیٹھنا اگر تم واقعی سچے ایمان
والے ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے لیے پتہ کی باتیں واضح
کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا حکمت والا ہے۔ جو لوگ
چاہتے ہیں کہ بدکاری کا چرچا ہو ایمان والوں میں
اُن چاہنے والوں کے لیے دردناک عذاب ہے دنیا میں
بھی اور آخرت میں بھی اور بلاشبہ اللہ حقیقت حال کا

جاننے والا ہے اور تم جاننے والے نہیں ہو، اور اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا، اُس کی
رحمت نہ ہوتی تم پر اور یہ بات نہ ہوتی کہ وہ نرمی کرنے والا ہے اور مہربان تو کیا
کچھ نہ ہو جاتا۔

سورۂ نور کی ان آیات نے عائشہ صدیقہ کی طہارت و پاکدامنی کا ہی صرف اعلان نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو یہ تنبیہ بھی کی کہ اُن کو ایک لمحہ کا انتظار کیے بغیر اس قسم کے افترا پردازوں کے افترا، پر صاف صاف یہ کہہ دینا چاہیے تھا کہ "یہ محض افترا، اور بہتان ہے۔

یہ آیات اس بنا پر "آیاتِ براءۃ" بھی کہلاتی ہیں کہ ان میں حضرت عائشہؓ کی براءۃ کا اعلان ہے اور منافقین اور معاندین کی ذلت و خذلان کا اظہار۔

موعظت اس واقعہ نے قرآنِ عزیز میں جن مواعظ و بصائر کا سامان مہیا کیا ہے اُن میں سے یہ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں۔

(۱) فاسق و فاجر یا بد باطن انسانوں کی دی ہوئی خبر خصوصاً جبکہ وہ باعصمت و عفت اور صاحبِ تقویٰ و خیر افراد کے خلاف ہو ہرگز قابل توجہ نہیں اور اس کے لیے صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہ محض افترا، ہے تاوقتیکہ خبر دینے والا اُس پر روشن دلیل و حجت قائم نہ کر دے۔

(۲) بے گناہ پر الزام اور تہمت لگانا بہت بڑا گناہ ہے اور چونکہ اس گناہ کا مرتکب حق العباد میں سے ایک اہم حق کا تہتک کرتا ہے اس لیے نہ صرف اخلاق کی نگاہ میں بلکہ اجتماعی قانون کی نگاہ میں بھی حد درجہ مجرم ہے، قرآنِ عزیز کی نصوص نے اس لیے حدِ قذف (بے گناہ پر تہمت لگانے کی سزا) کے لیے اسّی کوڑے تجویز کیے ہیں تاکہ آئندہ کسی کو بھی یہ جرأت نہ ہو سکے کہ وہ ایک پاکباز انسان پر بہتان لگائے یا بغیر قانونی شہادت کے اُس کی تشہیر کرے۔

(۳) یہ واقعہ گو آغاز کے اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت سخت ایذا کا باعث ہوا اور اہل بیت کو اُس نے بیحد پریشان خاطر بنایا لیکن انجام کے پیش نظر اہل بیتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ سرتاسر خیر ثابت ہوا کیونکہ اس سے ایک جانب منافقوں کی منافقت کا راز فاش ہو گیا اور دوسری جانب صدیقہ عائشہ اور اہل بیتِ رسول کی عظمتِ شان کا بے نظیر مظاہرہ عمل میں آگیا کہ قرآن کی دس آیات نے اُن کی برات کے لیے نازل ہو کر اُن کی عصمت و عظمت دونوں پر عدیم النظیر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

(۴) بعض مرتبہ اشرار اور خبیث النفس انسانوں کی ہفوات اس درجہ آب و رنگ رکھتی ہیں کہ سادہ لوح مسلمان اور نکوکار انسان بھی مغالطے اور دھوکے میں آجاتے ہیں اس لیے مسلمان کا فرض ہے کہ سُنی ہوئی بات پر اُس وقت تک ہرگز یقین نہ کرے جب تک کہ اسلامی اصولِ شہادت کے مطابق شنیدہ خبر کی تصدیق نہ ہو جائے۔ قال رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایاك والظن فان بعض الظن اثم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سوءِ ظن سے بچو اس لیے کہ بعض بدگمانیاں گناہ کا مرتکب بنا دیتی ہیں"

(۵) حقوق العباد میں خدائے برتر نے جو حدود و قصاص اور تعزیرات مقرر فرما دیے ہیں جرائم کے ارتکاب پر اُن میں مسلم و غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے اور قانونِ اسلامی کی نگاہ میں اس حیثیت سے تمام مجرم یکساں قابل گرفت ہیں۔ اس لیے واقعہ افک میں منافق مفتریوں کے ساتھ تین مسلمان (مرد و عورت) حضرت حسّان، حضرت مسطح اور حضرت حمنہ بنت جحش کو بھی جھوٹی تہمت لگانے کے الزام میں کوڑے کھانے پڑے۔

نبأ فاسق[1]

غزوۂ بنی المصطلق[2] میں جب مسلمان فتحیاب ہوگئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ کی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سردار قبیلہ کی بیٹی حضرت جویریہ (رضی اللہ عنہا) سے نکاح کرلیا تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رشتۂ مصاہرت کی وجہ سے تمام صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اسیرانِ جنگ کو رہا کردیا، اور مسلمانوں کے اس حسنِ سلوک واخلاقِ کریمانہ اور اسلامی محاسن سے متاثر ہوکر تمام قبیلہ مشرف باسلام ہوگیا۔ تب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ولید بن عقبہ کو اس لیے اُن کے پاس بھیجا کہ وہ قبیلہ کے دولتمندوں سے "زکوٰۃ" وصول کرکے اُن ہی کے فقراء ومساکین پر تقسیم کردیں۔

اہلِ قبیلہ کو جب ولید کی اس آمد کا علم ہوا تو وہ عاملِ اسلام کے استقبال کے لیے تیاریاں کرنے لگے اور ایک معزز ترین ہستی کے استقبال کی طرح ساز وسامان کے ساتھ میدان میں نکلے۔

زمانۂ جاہلیت میں اس قبیلہ کے اور ولید کے درمیان کچھ ناچاقی رہ چکی تھی اور پُرانی عداوت کا رشتہ چلا آتا تھا، اس لیے استقبال کے اس اہتمام کو ولید نے دوسری نظر سے دیکھا اور سمجھا اور اپنی غلط رائے پر جمود کرکے اہل قبیلہ سے معاملہ کیے بغیر ہی مدینہ واپس آگیا اور دربار قدسی میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ بنی المصطلق تو مرتد ہوگئے اور اُنھوں نے زکوٰۃ دینے سے بھی انکار کردیا اور وہ تو سرکشی پر آمادہ ہیں

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ سُن کر بنی المصطلق کے طرزِعمل سے رنجیدہ ہوئے اور مسلمان تو برافروختہ ہوگئے اور جہاد کی تیاریاں ہونے لگیں تاکہ مرتدین کا مقابلہ کیا جائے

---

[1] فاسق کی دی ہوئی خبر۔ [2] یہ غزوہ ۵ھ ہجری میں پیش آیا۔

حتیٰ کہ وہ اسلام پر واپس آجائیں یا کیفرِ کردار کو پہنچ جائیں۔

ادھر بنی المصطلق کو ولید کے اس عجیب طرزِ عمل نے حیرت میں ڈال دیا اور جب اُن کو معلوم ہوا کہ ولید نے کس بیجا جسارت کے ساتھ اُن کے متعلق دربارِ نبوی میں غلط بیانی کی ہے تو وہ بیحد پریشان ہوئے کیونکہ اُن کے تو وہم و خیال میں بھی یہ نہیں تھا کہ اُن جیسے پختہ کار اور ثابت قدم مسلمانوں پر اس قسم کی تہمت بھی لگائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے فوراً خدمتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایک مؤقر وفد بھیجا جس نے حاضر ہو کر کل ماجرا کہہ سنایا۔

ایک جانب اپنے عامل (ولید) کا وہ بیان اور دوسری جانب حدیث العہد مسلم جماعت کا یہ بیان اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی اور وحی الٰہی کا انتظار کیا۔

آخر وحی الٰہی نے راہنمائی کی اور قرآن عزیز (سورۂ حجرات) کی ان آیات نے نازل ہو کر نہ صرف زیرِ بحث معاملہ کی حقیقت ہی واضح کر دی بلکہ اس سلسلہ میں ایک مستقل قانون یا "معیارِ تحقیق" عطا فرما دیا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ	اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق (غلط
فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا	کار) خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ نادانی
قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ	کی وجہ سے کسی قوم پر (جہاد کے نام سے) حملہ آور ہو جاؤ
نٰدِمِیْنَ ۝ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ فِیْكُمْ	اور پھر کل کو (اصل حال معلوم ہونے کے بعد) اپنے
رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ یُطِیْعُكُمْ فِیْ كَثِیْرٍ	کیے پر پچھتانے لگو، اور جانو کہ تم میں اللہ کا رسول
مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ	موجود ہے اگر وہ تمہاری بات اکثر معاملات میں مان
اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ	لیا کرے تو تم (اپنی غلط روی کی وجہ سے) مصیبت
وَكَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَ	میں پڑ جاؤ لیکن اللہ نے (اپنے فضل سے) تمہارے

الْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ	لیے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور تمہارے دلوں میں اس
الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا	کو زینت بخشی ہے اور تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور نافرمانی
مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ	کے لیے نفرت پیدا کر دی ہے اور (درحقیقت) یہی لوگ ہیں
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ	اللہ کے فضل اور احسان کی وجہ سے راہیاب اور اللہ جاننے
	والا ہے، حکمتوں والا ہے۔

موعظت (۱) خبروں کے بیان کرنے میں عام طور پر سنجیدہ اور مہذب جماعت بھی اس کو معیوب نہیں سمجھتی کہ جو خبر بھی اُن کے کانوں تک پہنچے وہ اُس کو بے تکلف نقل کرتے رہیں اور حقیقتِ حال کی جستجو کی زحمت قطعاً گوارا نہ کریں خواہ اس خبر سے کسی ناکردہ گناہ پر افترا کیا جا رہا ہو یا کسی فرد و جماعت کو مضرت پہنچ رہی ہو حالانکہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پُرزور الفاظ میں یہ تنبیہ فرمائی ہے۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه	ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ
عن النبی صلی الله عليه وسلم	علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کے لیے یہ گناہ کافی ہے کہ
قال كفٰى بالمرء اثمًا ان يحدث	ہر شنیدہ بات کو نقل کرتا رہے۔ یعنی یہ بھی گناہ کی
بكل ما سمع (ابوداؤد و مسلم)	بات ہے کہ سُنی سنائی جھوٹی بات کی تشہیر کرے۔

(۲) جب کوئی ایسی خبر سُنی جائے جو بلحاظ مفاد یا مضرت خبر دینے والے پر یا دوسروں پر اثرانداز ہوتی ہو تو اسلامی آدابِ اجتماعی کا تقاضا ہے کہ پہلے اُس کی تحقیق ہونی چاہیے اور جب وہ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تب اُس سے متعلق نتائج و ثمرات کی جانب متوجہ ہونا چاہیے۔

"خبر" سے متعلق یہ حکم اخلاقی حیثیت رکھتا ہے اور معاشرتی زندگی میں روزمرہ واجب العمل ہے لیکن محاکم شرعیہ میں جب کوئی معاملہ جائے اور "خبر" "شہادت" کی حیثیت اختیار کرلے تو اُس کے قبول و عدم قبول میں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرے مزید شرائط ہیں جو فقہ

اسلامی کے "باب الشہادۃ" میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

مسجدِ ضرار

منافقین کو یہ تو جرأت ہوتی نہ تھی کہ علانیہ اسلام کی مخالفت کر کے اُس کو نقصان پہنچائیں، البتہ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح در پردہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر کے اُن کو ضعف و انحطاط کی راہ پر لگا دیں چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے جہاں اور بہت سی فتنہ سامانیاں بپا کر رکھی تھیں اُن میں سے ایک واقعہ رجب ۹ھ سنہ میں بھی رونما ہوا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو معلوم ہوا کہ تبوک کے میدان میں —— جو کہ مدینہ سے چودہ منزل پر براہِ دمشق واقع تھا —— ہرقل شاہ روم نے مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے لشکرِ جرار جمع کر لیا ہے اور اُس کا مقدمۃ الجیش آگے بڑھ کر بلقاء تک آ پہنچا ہے۔ آپ نے عرب میں قحط اور گرمی کی شدت کے باوجود جہاد کے لیے منادی کرا دی اور مسلمان جوق درجوق شوقِ جہاد میں مدینہ میں جمع ہونے لگے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ابھی تیاریوں ہی میں مصروف تھے کہ منافقین نے وقت سے فائدہ اُٹھا کر سوچا کہ مسجد قباء کے مقابلہ میں —— جو ہجرت کے بعد سب سے پہلی مسجد تھی۔ اس حیلہ سے ایک مسجد تیار کریں کہ جو لوگ ضعف یا اور کسی عذر کی وجہ سے مسجدِ نبوی میں نہ جا سکیں تو یہاں نماز پڑھ لیا کریں کیونکہ اس طرح مسلمانوں کو ورغلانے کا بھی موقعہ ہاتھ آئیگا اور ایک قسم کی تفریق بھی پیدا ہو جائیگی۔

یہ سوچ کر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم نے ضعیف و ناتوان اور معذوروں کے لیے قریب ہی ایک مسجد بنالی ہے اب

ہماری خواہش ہے کہ حضور وہاں چل کر ایک مرتبہ اس میں نماز پڑھ دیں تو وہ عند اللہ مقبول ہو جائے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس وقت تو میں اہم غزوہ کے لیے جا رہا ہوں واپسی پر دیکھا جائیگا۔

مگر جب آپ بخیر و کامرانی مراجعت فرما ہوئے تو وحی الٰہی کے ذریعہ اس مسجد کی تعمیر کے حقیقی سبب سے آگاہ ہو چکے تھے چنانچہ واپس تشریف لا کر سب سے پہلے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور اس "مسجد" کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیں۔

چونکہ حقیقۃً اس مسجد کی بنیاد "تقویٰ" اور "وجہ اللہ" کی جگہ "تفریق بین المسلمین" پر رکھی گئی تھی اس لیے بلاشبہ وہ اسی کی مستحق تھی اور اس کو "مسجد" کہنا حقیقت کے خلاف تھا، اس لیے قرآن عزیز نے اس بظاہر مسجد و بباطن بیت الشر کی تعمیر کے متعلق حقیقت حال کو روشن کرتے ہوئے بتلا دیا کہ یہ مسجدِ تقویٰ نہیں بلکہ مسجد ضرار کہلانے کی مستحق ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ

(توبہ)

اور (منافقوں میں سے) وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس غرض سے ایک مسجد بنا کھڑی کی کہ نقصان پہنچائیں، کفر کریں، مومنوں میں تفرقہ ڈالیں، اور اُن لوگوں کے لیے ایک کمیں گاہ پیدا کریں جو اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکے ہیں۔ وہ ضرور قسمیں کھا کر کہینگے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی ہو، لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں (اے پیغمبر!) تم کبھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا، اس بات کی کہ تم اُس میں کھڑے ہو (اور بندگانِ الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) وہی مسجد حقدار ہے جس کی بنیاد اوّل دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قبا اور مسجد نبوی) اُس میں

ایسے لوگ آتے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک وصاف رہیں اور اللہ بھی
پاک وصاف رہنے والوں کو ہی پسند کرتا ہے۔

موعظت (۱) منافقت ایک ایسا مرض ہے جو انسان کی تمام خصائلِ حمیدہ او اخلاقِ حسنہ کو تباہ و برباد کر کے اُس کی انسانیت کو حیوانیت سے بدل دیتا ہے اور اس کے افکار و اعمال میں مطابقتِ باہمی نہ رہنے سے اُس کی زندگی کو اسفل السافلین میں گرا دیتا ہے۔

(۲) ایک ہی "عمل" عامل کی نیت کے فرق سے "پاک" بھی ہو سکتا ہے اور "ناپاک" بھی "طیب" بھی بن سکتا ہے اور "خبیث" بھی، تعمیرِ مسجد ایک عمل خیر ہے اور باعثِ اجر و ثواب مگر جب کہ لوجہ اللہ ہو اور عبادتِ الٰہی کا حقیقی مقصد پیشِ نظر رہے "انما یعمر مساجد اللہ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ (۹ع)" اللہ کی مسجدوں کو تو بس وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور نماز ادا کی اور زکوٰۃ دی اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرا" اور یہی عمل خیر "عملِ شر" اور "لائق نفرت" بن جاتا ہے، جب کہ اُس کا مقصد کارِ شیطان ہو یعنی تفریق بین المسلمین یا نماز کی آڑ میں اسلام کے خلاف کمیں گاہ اور جاسوسی کا مرکز بنانا۔ اسی لیے یہ عملِ خیر کافروں کے ہاتھ سے انجام پانا غیر مقبول اور مردود ہے "ماکان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ شٰھدین علیٰ انفسھم (۹ع)" مشرکوں کا حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجد کو آباد کریں حالانکہ وہ اپنی جانوں پر کفر کی گواہی دیتے ہیں[1]۔

[1] "یعمر مساجد اللہ" میں مساجد کی آبادی اور اس کی تعمیر دونوں کا مفہوم شامل ہے۔

وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ

انك میّتٌ وانهم میّتون

آخر وہ وقت بھی آ پہنچا جس کے تصور کے لیے نہ صرف مسلمان بلکہ دنیاے انسانیت بھی طیار نہ تھی، یہ وقت کائناتِ انسانی کے لیے مصیبتِ عظمیٰ اور داہیۂ کبریٰ ثابت ہوا، چار دانگ عالم پر حیرت طاری تھی کہ وہ کس طرح غیر متوقع طور پر ہادی اکبر، مصلح اعظم کے فیضِ صحبت سے محروم ہو گئے؟ آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، قلب اُس کے باور کرنے کو تیار نہ تھا اور قلب جو کچھ چاہتا تھا آنکھیں اُس نظارہ کو واپس نہ لا سکتی تھیں، دل پاش پاش تھے، جگر شق ہو رہے تھے، چشمِ گریاں اشک کے سیلاب بہا رہی تھی کیونکہ آج روحانیت کے آفتابِ عالمتاب کے اور کائنات انسانی کے درمیان موت کا لکۂ ابر حائل ہو چکا تھا

اگر دنیا کا کرۂ آفتاب درحقیقت کبھی غروب نہیں ہوتا اور رہتی دنیا تک غروب نہیں ہوگا بلکہ دیکھنے والوں کے اور اُس کے درمیان پردۂ شب حائل ہو جاتا ہے تو کس کی مجال اور کس کی جرأت ہے کہ وہ آفتاب رسالت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق غروب ہونے کا دعویٰ کر سکے کیونکہ یہاں تو پردۂ شب کو بھی حائل ہونے کی اجازت نہیں ہے "الدین السمحۃ البیضاء لیلھا و نھارھا سواء۔ دینِ اسلام آسان و روشن دین ہے جس کے رات اور دن دونوں یکساں طور پر روشن ہیں۔ یعنی یہاں شب تاریک کا گذر ہی نہیں ہے"

البتہ "موت" کل نفسٍ ذائقۃ الموت کا پیغام بن کر اس آفتاب رسالت کے اور ہمارے درمیان لکۂ ابر بن کر حائل ہوگئی۔

اس لیے اس مصیبت کبریٰ میں بھی مسلمانوں کے زخمی قلوب کے لیے مرہم اور کشتگان فراق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہترین اکسیر و تریاق موجود تھا، اور وہ یہ

یقین واذعان ہے جس کو قرآنِ عزیز نے یہ کہہ کر پہلے ہی قلب مسلم کو عطا کر دیا "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ" یعنی "موت" اس حقیقت کا نام ہے جو نبی مرسل بلکہ خاتم المرسلین کو بھی پیش آکر رہیگی اور بقاء حقیقی تو ذات احدیت کا ہی بلا شرکت غیرے طغرائے امتیاز ہے۔

"اللہ اللہ" وہ کیا عجیب سماں تھا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "اللھم الرفیق الاعلیٰ" فرماتے ہوئے جان جانِ آفریں کے سپرد فرمادی تو تمام صحابہ رنج وغم اور صدمۂ جانکاہ سے اس درجہ متحیر اور مصیبت زدہ ہو رہے تھے کہ اُن کے ہوش وحواس تک بجا نہ تھے اسی عالم میں حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرطِ غم سے تلوار سونت کر یہ نعرہ لگایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو اسی تلوار سے اُس کی گردن اڑا دونگا۔

اسی اضطراب انگیز عالم میں خدا کا ایک بندہ صدیق اکبر آتا ہوا نظر آتا ہے سب سے پہلے وہ حجرۂ عائشہ (رضی اللہ عنہا) میں پہنچتا اور دلِ بریاں وچشم پرنم کے ساتھ سرور دو عالم کی جبینِ نور کو بوسہ دیتا اور فراقِ رسول سے کرب وبیچینی کا اظہار کرتا ہے اور اس فرضِ عشق سے فارغ ہو کر جب باہر آتا ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس حالت کا جائزہ لے کر کہ جس میں جاہلیت واسلام دونوں ادوار کی بے نظیر شخصیت عمر بن الخطاب بھی شامل ہے تو آگے بڑھ کر کہتا ہے "اے خطاب کے بیٹے بیٹھ جا" حضرت عمر وہیں بیٹھ جاتے اور انتہاءِ حزن وغم سے حضرت ابو بکر کا منہ تکنے لگتے ہیں۔

صدیق اکبر اب منبر نبوی پر کھڑے ہو کر صدائے حق بلند کرتے ہوئے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے مجمع کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔

لوگو! جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتا تھا اُس کو معلوم ہو جانا چاہیے "اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ" کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ذائقۂ موت چکھ لیا اور جو خدائے واحد کا پرستار ہے تو بلاشبہ "اِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ" اللہ تعالیٰ زندۂ جاوید ہے اور موت سے پاک اور

بری، اُس کو موت نہیں ہے۔ ابوبکر رضی اللہ کی یہ صدائے حق جب فضا میں گونجی تو سب سے اوّل حضرت عمر اور اُن کے بعد تمام صحابہ پر سکون واطمینان طاری ہوگیا اور وہ سمجھ گئے کہ بلاشبہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا فرضِ رسالت پورا کر کے رفیق اعلیٰ سے جا ملے اور اب اسلام مکمل ہو چکا اس لیے اب ہمارا فرض ہے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور زندۂ جاوید معجزہ کلام اللہ "قرآن" کو پیشوا بنا کر خدمتِ اسلام کا فرض انجام دیں۔

حضرت عمر بن الخطاب کی کیفیت تو یہ ہوئی کہ فرمانے لگے قسم بخدا صدیق اکبر نے یہ صدائے حق بلند کرتے ہوئے جب یہ آیت تلاوت کی مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ" (الآیہ) تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا ابھی اس آیت کا نزول ہو رہا ہے اور عشقِ رسول نے فراقِ رسول سے جو مبہوت کر دیا تھا قرآن اور تعلیم رسول کی روشنی میں جو کچھ رفیق محترم نے کہا وہ یک بیک مثل آفتاب میرے سامنے آگیا۔

تمام کتبِ احادیث وسیر کی روایات متفق ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ماہ ربیع الاول روز دوشنبہ کو ہوئی البتہ کس تاریخ کو ہوئی؟ اس بارہ میں متعدد اقوال پائے جاتے ہیں۔

واقدی اور ابن سعد صاحبِ طبقات الکبریٰ کی روایات ۱۲۔ ربیع الاول ظاہر کرتی ہیں اور یہی قول مشہور و معروف ہے اور بیہقی اور ابن کثیر میں منقول بعض روایات میں ہے کہ ۲۔ ربیع الاوّل تھی اور بعض میں ۱۰ ۱۵ اور یکم ربیع الاول بھی منقول ہے۔ لیکن ابوالقاسم سُہیلی اپنی مشہور کتاب روض الأنف میں دعویٰ کرتے ہیں کہ سنہ ۱۵ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن بالاتفاق متعین ہونے کے بعد حسابی اعتبار سے وفات کی تاریخ کسی طرح ۱۲۔ ربیع الاول نہیں ہو سکتی البتہ ۲، یا ۱۳ ، یا ۱۴ یا ۱۵، ربیع الاوّل میں سے کوئی تاریخ ہو سکتی ہے اور یہ اس لیے کہ جمہور کا اس پر اجماع ہے کہ رسولِ اکرم

۱۔ تاریخ ابن کثیر جلد ۵ ص ۲۵۵۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں حج (وقوف عرفہ) جمعہ کے دن کیا ہے پس جبکہ ۹۔ ذی الحجہ کو جمعہ کا دن تھا تو خواہ بعد کے تمام مہینے صرف انتیس دن کے مان لیجیے یا صرف تیس دن کے یا بعض انتیس کے اور بعض تیس کے کسی صورت میں بھی دوشنبہ کو ۱۲۔ ربیع الاول نہیں ہوتی اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

البتہ ابن جریر طبری نے ابن کلبی اور ابو مخنف کی روایت سے ۲۔ ربیع الاول نقل کی ہے تو یہ اس صورت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ محرم، صفر، ربیع الاول تینوں مہینے انتیس کے تسلیم کر لیے جائیں ورنہ تو قیاس صحیح سے قریب تر روایت خوارزمی کی ہے جس میں تاریخ وفات یکم ربیع الاول منقول ہے کیونکہ یہ تاریخ تینوں مہینوں میں انتیس اور تیس دن کے فرق سے بھی صحیح ہو جاتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے سہیلی کے اعتراض کو اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ علماء نے اس کے جوابات دیے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تسکین بخش نہیں ہیں البتہ جواب کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ "اختلاف مطالع" کا اعتبار کیا جائے یعنی یہ تسلیم کیا جائے کہ مکہ اور مدینہ میں رویتِ ہلال مختلف رہی ہو کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اہل مدینہ نے ذی الحجہ کا چاند جمعہ کے دن دیکھا اور مکہ میں جمعرات کو رویت ہوئی تو پھر اگر باقی تینوں مہینوں کو تیس تیس کا ہی تسلیم کر لیا جائے تب یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلاشبہ دوشنبہ کو ۱۲ ربیع الاوّل تھی۔

تو کیا مدینہ میں ذی الحجہ کا چاند جمعہ کو دیکھا گیا؟ اس کی تصدیق و تائید حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے جب مدینہ سے نکلے تو ذی قعدہ کے ختم ہونے میں پانچ دن باقی تھے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے نکلنے لگے تو ظہر کی چار رکعات پڑھ کر نکلے اور ذوالحلیفہ پہنچ کر عصر کی دو رکعات

پڑھیں، پس ان دونوں مستند روایات سے واضح ہوا کہ آپ کی روانگی نہ جمعرات کو ہوئی اور نہ جمعہ کو بلکہ سنیچر کے دن ہوئی تھی لہذا اس صورت میں تسلیم کرنا پڑیگا کہ اہل مدینہ نے جمعہ کے دن ذی الحجہ کا چاند دیکھا۔

پس یہی ایک شکل نبتی ہو جس سے تاریخ وفات ۱۲- ربیع الاول سے متعلق مشہور روایت تسلیم کی جاسکتی ہو۔[1]

عبرت و موعظت

(۱) قرآنِ عزیز سورۂ فاتحہ میں ہو "اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم" اور دوسری جگہ سورۂ نساء میں "انعمت علیھم" کی تفسیر اس طرح مذکور ہو "فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصٰلحین وحسن اولٰئک رفیقا" یہی وہ رفقاء ہیں جن کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "اللھم الرفیق الاعلٰی" کہہ کر وقتِ آخر اشارہ فرمایا سہیلی کہتے ہیں کہ چونکہ اہل جنت جنت میں مختلف القلوب نہیں ہونگے بلکہ ایک انسان کے قلب واحد کی طرح ہونگے اس لیے "الرفقاء العلیا" نہیں فرمایا "الرفیق الاعلیٰ" فرمایا تاکہ اہلِ جنت کی "وحدتِ قلبی" کی جانب اشارہ ہو جائے۔

(۲) "موت" خدائے برتر کا وہ اٹل فیصلہ ہو جس سے نبی و رسل اور خاتم الانبیاء والرسل بھی مستثنیٰ نہیں ہیں اور بقاء و حیاتِ سرمدی و ابدی صرف ذات حق کے لیے ہی مخصوص ہو۔

(۳) صدیق اکبر کی عظمت شان و جلالت مرتبہ کا اس ایک واقعہ سے بھی واضح اعلان ہو جاتا ہو کہ وفات النبی کے قریبی وقت میں نزاکت حالات نے صحابہ کے عقل و خرد پر جو اثر ڈالا اگر خدانخواستہ وہ دیرپا ہو جاتا تو اسلام اپنی حقیقت سے خالی ہو کر رہ جاتا (عیاذ باللہ) مگر یہ سعادت ابوبکر کے ہی حصہ میں تھی کہ مسلمانوں کی اس ڈگمگاتی کشتی کو قرآن کی روشنی میں پار لگادیا اور "اسلام" کو ایک عظیم الشان فتنہ سے بچالیا، "وذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم"

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۵۔